مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۃ القمر۔ سورۃ الرحمٰن

سورۃ واقعہ۔ سورۃ الحدید

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۂ القمر۔سورۂ الرحمن
سورۂ واقعہ۔سورۂ الحدید

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25بی گلبرگ 2لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25بی 2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	نومبر 2014ء
مطبع	....	باقر یونس پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؑ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق' دل بند و راہ مصطفےؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۷۴ از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوعِ اسلام۔اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رہبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو

آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیرو ہدایت ابتدا ست

رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفرؔ]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ القمر

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: سورۃ القمر (آیات 1 تا 8)

حضور کی انگلی سے چاند کے دو ٹکڑے ہو جانے کے سلسلہ میں تواتر کی سند کی حقیقت ___ 26

حضورؐ سے معجزے کے مطالبات کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا ارشاد اور دلیل و برہان کی اہمیت ___ 27

قرآن حکیم کی تعلیم کا غیر متبدل بنیادی اصول یہ ہے کہ انسانی عقل کو ماؤف کر کے، اس کی آزادی کو سلب کرنا نہیں ___ 28

معجزوں کے مطالبے پر قرآن حکیم کا دوٹوک جواب ___ 29

ہمارے ہاں شق القمر کے متعلق لکھی گئی قدیم اور جدید تفاسیر وضعی روایات پر مبنی ہیں ___ 29

لفظ الساعۃ کا لغوی مفہوم: ایسا عظیم انقلاب جو ذریز میں، گھڑی کے سیکنڈ کی طرح، تغیر پذیر ہو رہا ہے ___ 30

قرآن حکیم نے مکے سے مدینہ منورہ کی طرف آپ کی ہجرت کو الساعۃ کے الفاظ سے پکارا اور اس کا نتیجہ بھی بیان کیا ___ 31

القمر دورِ جہالت میں عربوں کے جھنڈے کا نشان تھا، اس کا سرنگوں ہونا شکست کے مترادف ہوتا تھا اور یہ ہوا ___ 31

عربوں کی اور ایران کی باہمی مخاصمت اور پھر ان کے اکٹھے ہونے کا ذکر ___ 32

شق القمر میں ایک متضاد کیفیت کا بیان کچھ جنگ احزاب، جنگ بدر اور ہزیمت و شکست کا ذکر اور قرآنِ حکیم کی شہادت ___ 33

عربوں کے ہاں قمر کے معنی غلبہ کے بھی ہیں اور کہا یہ گیا تھا کہ تمہیں ہزیمت اٹھانی پڑے گی ___ 34

خدائے رحیم و کریم کے حضور میدان بدر میں نبی اکرم ﷺ کی وہ التجا اور اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ کی علامات ___ 34

لفظ سحر کے معنی جادو نہیں ہوتے بلکہ فریب ہوتے ہیں اور ایک روپے کے دو روپے نہیں بنتے ___ 35

جذبات کی تسکین انسان کو فریب کاری میں مبتلا کر دیتی ہے اور وہ تباہی کو نظر انداز کر دیتا ہے ___ 35

حق بات پر یقین محکم اور استقامت ہی کامیابی کی ضمانت ہے 36

ہر عمل اور ہر واقعہ کے نتیجہ خیز ہونے کے لیے بتدریج ارتقائی مراحل سے گزرنا لازم گردانا جاتا ہے ___ 36

نظریۂ ارتقا میں مہلت کا وقفہ انسانی فکر کے لیے کارآمد ہوتا ہے 37

قرآنی فکر، فکرِ انسانی کے تصورات کو فلک بوس بلندیوں سے ہم کنار کر دیتی ہے ___ 38

دلوں کے روگ (باہمی تعصب) حکمت بالغہ کو قبول نہیں کرتے 38

فکرِ قرآنی کی راہنمائی انسانیت کو خوف و حزن کے عذاب

سے کوسوں دور لے جاتی ہے ______ 39
لفظ حزن کی ایک دل خراش مثال اور پھر جنت ارضی کا ذکر ___ 40
ہم نے یہاں کے معاشرتی جہنم کو جہانِ فردا کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے ______ 41

دوسرا باب: **سورۃ القمر** (آیات 9 تا 32)

حق و باطل کی داستان ازل سے جاری ہے، اس کی نشاندہی اور اثرات ______ 42
قوموں کے عروج و زوال کے پرکھنے اور نپٹنے کا غیر متبدل قرآنی اصول ______ 43
حضور ﷺ کی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت، نظام کے قیام کے روشن امکانات اور اثرات ______ 44
قرآن حکیم کے پیش کردہ نظام حیات کے پیش نظر سورۃ القمر کا ابتدائیہ ______ 45
قرآنِ حکیم کے نزدیک عرب کے گرد و نواح اُجڑی بستیوں کی داستانوں میں داستانِ قوم نوحؑ ______ 46
قرآن حکیم کی بیان کردہ داستان کسی نہ کسی آیت کی غماز ہوتی ہے اور اس کے مقابل انسانی سوچ اور اس کا ماحصل ______ 48
اگر مجرد Truth (سچائی) کو دل و دماغ تسلیم نہ کرے تو انسان کی یہ بلند فکری کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتی ______ 49
لفظ ذکر کا مفہوم اور مقصد یہ ہے کہ بیان کردہ احکامات کو ہر وقت سامنے رکھا جائے ______ 49
قوم نوح کے جرائم کو بیان کرنے کا مقصد کسی کہانی کا بیان کرنا نہیں بلکہ طبقاتی تفاوت کو ختم کروانا مقصود ہے ______ 49
قرآنِ حکیم انسانی کیریکٹر کو دولت کے ترازو میں نہیں تولتا ___ 50
قوم نوحؑ کا دوسرا جرم تقلید پرستی تھی جو انسانی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتی ہے ______ 50
قوم نوحؑ کا تیسرا جرم: قومیت کی بنیاد کا نسل پرستی پر ہونا آج بھی یہی کچھ ہے ______ 50
قرآن حکیم اپنی آیات کو پھیر پھیر کر مختلف انداز میں پیش کرتا ہے لہٰذا قوم نوح کے بعد قوم عاد کا ذکر ______ 51
قوم نوحؑ قوم المجرمین تھی یعنی دوسرے کے درخت کا پھل کاٹ کر اپنے گھر لے آنے والی یا بھیڑ کی اون تک مونڈ کر لے جانے والی۔ اس استحصالی قوم کی جڑ تک کاٹ دینے کا ذکر ___ 52
اس دور میں دوسروں کا استحصال کرنے کا طریق قوت کا حصول ہے 53
قوم ثمود کے ذکر کے دوران اور کفار کی طرف سے کیے گئے اعتراضات کا جواب ______ 53
قوم ثمود کا سب سے بڑا جرم رزق کے سرچشموں پر ذاتی قبضہ تھا حالانکہ وہ نشو و نما کے لیے بلا مزد و معاوضہ ملا ______ 54
قوم ثمود سے ماخوذ قوموں کے عروج و زوال کا ایک سنہری اصول جسے ابدیت کا درجہ حاصل ہے ______ 55
خدا کی اونٹنی کے نام پر ہونے والے ایک معاہدے کا، بنیادی مقصد حدیث مبارکہ ہے کہ خدا کی زمین خدا کے بندوں کے لیے کھلی رکھو ______ 55
سوات کی مسجد میں زمین کی ملکیت کو صرف خدا کی ملکیت کہنے والے مولوی ہٹلر اور والیٔ سوات کا تذکرہ ______ 56
نَاقَۃُ اللّٰہِ اور اَرْضِ اللّٰہِ کے باہمی معاہدہ کا حشر ______ 57
دنیا میں بھوک سے مرنے والوں کے علاج کے لیے روم میں ایک کلب کا قیام اور اس کا پروگرام ______ 57

زمین پر ذاتی نظامِ ملکیت کی آب یاری کے انجام کو سمجھنے کے لیے قرآن حکیم کی ایک محسوس مثال ____ 58

تیسرا باب: سورۃ القمر (آیات 33 تا اختتام)

قومِ لوط کی سرگزشت کا انجام اور ہم سے خطاب جو قوانین خداوندی کے غیر متبدل اصولوں کا نتیجہ ہے ____ 60
قومِ لوط کے جنسی بدنہادی کے انسانیت سوز جرم کا قومی تمدن پر اثر ____ 60
آج یورپ انگلینڈ اور اب امریکا میں اس اخلاقی اصول کی قانوناً تکذیب کیوں ہے؟ ____ 61
کسی بات کو سمجھانے کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا انداز بیان بڑا آسان بھی ہے اور واضح بھی ____ 62
فرعون کے ظالمانہ شخصی نظامِ حکومت کا تذکرہ ____ 63
فرعون کے ہاں بچوں کو ذبح کرنے سے مراد ان کی صلاحیتوں کو غیر موثر بنا دینا تھا: فرعون کا پہلا جرم ____ 64
فرعون کی حکمرانی کو مضبوط بنانے میں مذہبی پیشوائیت یعنی ہامانیت کے باہمی مفاد کے آئینہ میں نیز فرعون کا دوسرا جرم ____ 65
نظامِ سرمایہ داری یعنی قارونیت مروّج تھا: فرعون کا تیسرا جرم ____ 65
فرعون کے دربار میں صداقت کی فتح پر فرعون کا اعتراض: مجھ سے پوچھے بغیر صداقت کو کیوں قبول کیا ____ 66
کیا فرعون کی ستم ظریفی کے مقابلے میں آج دنیا کی حالت زیادہ حیران کن نہیں؟ ____ 66
خدائے عزیز کی گرفت کو بیان کرنے کا انداز ____ 67
ملوکیت کے قوانین میں بادشاہ سوائے قتل کی سزا کے ہر طرح سے آزاد ہوتا ہے اور اس کا انجام؟ ____ 67
آبادی کے لحاظ سے دنیا کی عظیم الشان ایک ارب سے زیادہ آبادی کی قوت کی مالک مسلم قوم کا حشر ____ 67
انسانیت کا سفر غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں ہی تیہ ہو سکے گا 68
قرآن حکیم میں الساعۃ کا لفظ پوری نوع انسانی کے لیے برابری کی سطح پر استعمال ہوا ہے: یہ ہے انقلاب کی گھڑی! ____ 69
انقلابات کی گھڑیں تو غیر محسوس شکل میں گھڑی کی سوئی کی طرح آگے سے آگے چلتی چلی جاتی ہے ____ 69
عربوں کے ہاں لفظ جرم کا وہ مفہوم جسے فرعون کی مثال میں ایک محسوس شکل میں بیان کیا گیا ہے ____ 70
قرآن حکیم کے الفاظ میں عذاب کا وہ مفہوم جو ہماری نظروں سے اوجھل ہے ____ 70
ساعت کو ظاہر ہونے کے لیے آخر کسی وقت کا انتظار کیوں؟ یہ ہے اس کی قدر اور وقفہ مہلت! ____ 71
قانون خداوندی میں جرم کے سرزد ہونے کا معیار اور تطہیر قلب و نگاہ کی اہمیت اور تقویٰ کا مفہوم ____ 72
متقی کے لیے انسانی زندگی ایک جوئے رواں کی نوید ہے ____ 73

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ الرحمٰن

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: سورۃ الرحمٰن (آیات 1 تا 12)

ہم آہنگ ہونے کی صفات کے زیور سے آراستہ سورۃ الرحمٰن اپنی مثال آپ ہے ____ 76

علم وحی اور علم انسانی میں ایک بنیادی فرق ہے ____ 77

ہمارے دور کا پیدا کردہ نظریہ ارتقا ____ 78

نظریہ ارتقا کی دو قسمیں: بتدریج اور یکلخت ____ 79

سائنس کے بالمقابل وحی حقائق کا ازخود انکشاف کرتی ہے ____ 80

وحی کے لیے عربی زبان کی آبیاری اور اس کی خصوصیت ____ 80

مادہ کے تحت لفظ رحمان کی تشکیل اور اس کا مفہوم ____ 81

رحیم اور رحمان کے مفہوم میں فرق ____ 82

نبوت اور تصوف میں رات دن کا فرق ہے ____ 83

حیوانی سطح سے انسانی صلاحیتوں کی طرف ارتقا کی ایک اہم کڑی اور قیامت تک وحی کا ابلاغ ____ 83

ختمِ نبوت کے لیے صرف ایک ہی دلیل کافی ہے ____ 84

خارجی کائنات میں نبوت کی ضرورت نہ تھی ____ 85

حقائق کو بیان کرنے اور سمجھانے کے لیے قرآن حکیم کا ایک اپنا انداز ہے ____ 85

قرآن کریم کے نزدیک شمس اور قمر کے ذریعے کیلنڈر کا حساب 86

انگریزی وقت اور شرعی وقت کا قصہ ____ 86

عقلِ انسانی کے لیے آسمانی کرّوں کی مثال ____ 87

کائنات کی وسعتوں پر عقلِ انسانی جس قدر آج حیرت زدہ ہے پہلے کبھی نہ تھی ____ 88

پوری کائنات میں توازن کی اہمیت ____ 88

جہاں انسان واجب التکریم نہ رہا، وہیں عملِ توازن بگڑ گیا ____ 89

انسان کو اپنی زندگی میں خود ہی خارجی کائنات کی طرح توازن قائم کرنا ہے نیز شرک کی بنیاد ____ 89

معاشی مسئلہ کا بنیادی حل زمین پر ذاتی ملکیت کے شرک کو ختم کرنے میں ہے ____ 90

صدیوں سے ہمارے ہاں ملوکیت کے دور کا اسلام رائج ہے ____ 90

دوسرا باب: سورۃ الرحمٰن (آیات 13 تا 18)

قرآن کریم کے خلاف ایک گہری سازش: وحی کی دو قسموں والا معاملہ ____ 92

اس سورۃ میں ہر جگہ لفظ ''الآء'' کا ترجمہ نعمت کرنا صحیح نہیں ہے 93

''الآء'' کا ترجمہ ''قدرت'' کے علاوہ ''کرشمہ'' کے بھی ہوتے ہیں ____ 94

لغت کے بغیر قرآن کا مفہوم خود تراشنا شرک ہے ____ 94

آدم کی پیدائش کا مروجہ قصہ ____ 95

ایک الجھن اور بُری داستان ____ 95

اپنی کم مائیگی اور لاعلمی کو نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کر دیا گیا ____ 96

زندگی کے سلسلہ میں کرّہ ارض پر پیدا ہونے والا پہلا سوال ____ 97

نظریہ ارتقا 98
قرآن فہمی کے لیے تصریفِ آیات کے طریق کو اپنانا لازم ہے 98
پیدائشِ آدم کے سلسلہ میں ریڈرز ڈائجسٹ میں شائع
ہونے والا ایک مضمون 98
تخلیقِ انسانی اور قرآن کریم 99
طین لازب سے خلاصے کا حصول 100
ایک منزل سے سامانِ نشوونما حاصل کرنے کے بعد دوسری
منزل کے لیے رواں دواں 101
اختیار و ارادے کی نعمت 102
قرآن حکیم کے نزدیک لفظ ''جن'' کا مفہوم اور ہمارا پیدا کردہ تصور 104
جن وانس دو قبیلے تھے 104
انسانوں سے پہلے والی مخلوق جو اب ناپید ہو چکی ہے 105
آج کے سائنٹسٹ سے ایک کھلا چیلنج 105
سورج کے نکلنے اور غروب ہونے کے دو گوشے 105
موسموں کے تغیرات کا دارومدار زمین اور سورج کی باہمی
گردش پر ہے 106

تیسرا باب: سورۃ الرحمٰن (آیات 19 تا 30)

سابقہ درس کے مطابق لفظ رحمانیت کی مزید وضاحت 107
میٹھے پانی اور نمکین پانی کی دو الگ الگ روئیں 108
پانی کی تہہ میں موتیوں کا ذکر 109
لفظ ربوبیت اور رب کا استعمال 110
سینہ بحر پہ تیرتی ہوئی کشتیوں کا نظارہ 110
ہمارے ہاں کے تراجم میں ان آیات کا مفہوم 112
ذاتِ خداوندی اور انسانی ذہن کی محدودیّت 112
قرآنی الفاظ ''فان اور فنا'' کا مفہوم 113
کائنات کی ہر شے میں ہر آن تغیر رونما ہو رہا ہے 113
انسانی جسم کے اندر انسانی ذات کے وجود کی کیفیت اور حقیقت 114
تغیرات کی دنیا اقبالؒ کی نظر میں 115
انسانی ذات جو تغیر نا آشنا ہے، حسین سے حسین تر ہوتی چلی جاتی ہے 117
انسانی ذات کی نشوونما انسانی جسم کی نشوونما سے بالکل مختلف ہے 118
خدا کے متعلق ہمارے ہاں کا تصور 118
اسمآء الحسنٰی یا صفاتِ خداوندی کی اہمیت 119
کائنات کی نشوونما کے تقاضے ہر آن تبدیلی کے متقاضی ہوتے ہیں 119
رزق کا قرآنی مفہوم 120
یہ سب کچھ اس تغیر نا آشنا ذات کی کرشمہ سازی ہے جسے رب کہتے ہیں 121
کائنات کی ہر شے اپنی نشوونما کے لیے اس کی محتاج ہے 121

چوتھا باب: سورۃ الرحمٰن (آیات 31 تا 49)

نشوونما کے تقاضے، نظامِ ربوبیت اور انسانوں کا استحصالی نظام 123
تذکرہ کچھ جن وانس کا 124
''جن'' کی کوئی الگ مخلوق نہیں ہے 126
یہ ''جن'' دراصل پہاڑی علاقے کے ہی لوگ تھے 127
بچوں کے ذہنوں پر T.V پروگرام الف لیلیٰ کی کہانیوں کا اثر 127
انسان کی پرواز اور کائنات کی لامحدود وسعتیں 128
کائنات کی وسعتوں کو محدود کر سکنے کا مفہوم 129
جرم کرنے سے کیونکر بچا جا سکتا ہے 130
جنت اور جہنم اسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے 131
مکافاتِ عمل کی حقیقت اور کیفیت 131
ہمارے ہاں کے غلط تراجم سے پیدا ہونے والی مشکلات 133
قرآن کریم میں لغوی اور مجازی معنی 133
آج کے مخلوط معاشرے کے برعکس قرآنی معاشرے
کی امتیازی خصوصیات 135
جسم انسانی کے اندر انسانیت کے بیج کی قدر و منزلت 136
قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں دو جنتوں کا ذکر کیا ہے 137

پانچواں باب: سورۃ الرحمٰن (آیات 50 تا 59)

خدائے حکیم کی طرف سے عطا کردہ دو جنتوں کا تفصیلی ذکر ___ 139

صحرائے عرب میں پانی کی دستیابی کی قدر و منزلت ___ 140

پانی کے چشموں کی خصوصیت ___ 141

دعویٰ اسلام کا لیکن روٹی کے چند ٹکڑوں کی محتاجی ___ 141

تکذیب دین کی عملی شکل ___ 142

جنتی معاشرے کی پہلی خصوصیت محنت اور مشقت میں فرق ___ 143

نزول قرآن کا نکتۂ ماسکہ ___ 144

جہنمی زندگی میں اطمینانِ قلب کا حصول ایک واہمہ ہے ___ 144

ترکِ دنیا کی آرزو کو بھی ترک کرنا اور قرآنِ کریم کی دو جنّتیں ___ 145

جنّتی زندگی کی سب سے بڑی واضح اور اہم نشانی ___ 145

جنّتی معاشرے میں کوئی شخص کسی شے سے محروم نہ ہوگا ___ 146

انتیسویں اور تیسویں پارے میں جنّتی زندگی کی پُرتکلف نعما کا ذکر ___ 146

آج عزت، عفت، عصمت اور پاکیزگی کے یہ تمام تقاضے صرف عورتوں سے ہی کیوں کیے جاتے ہیں؟ ___ 147

نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دینے کا حکم پہلے مردوں کے لیے ہے ___ 148

بیٹیو! میں دل کی گہرائیوں سے معذرت خواہ ہوں ___ 148

خلیفۃ المسلمین کہلانے والے کے حرم میں تین تین ہزار لونڈیاں 149

پاکستان کی قومی اسمبلی میں کم از کم ایک لونڈی رکھنے کا مطالبہ ___ 149

تفسیر ابن کثیر میں ابھرے ہوئے سینوں والی عورتوں کی بارش 149

بخاری شریف کی ایک روایت ___ 150

اس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق معاذ اللہ، معاذ اللہ 151

سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی تفسیر میں حوروں کا تذکرہ ___ 151

ہماری ان پیش کی جانے والی تفسیروں پر اٹھنے والے اعتراضات کا جواب بن نہیں پڑتا ___ 152

لفظ حور کا قرآنی مفہوم ___ 152

چھٹا باب: **سورۃ الرحمٰن** (آیات 60 تا اختتام)

احسان کا بدلہ احسان نہیں بلکہ حسن ہوتا ہے ___ 155

کسی کی مدد کرنے والے کے لیے قرآنِ حکیم کی تعلیم ___ 156

عمر بھر کی ذلت ___ 157

عمل کا بدلہ تو ہمیشہ عمل کے اندر ہی پوشیدہ ہوتا ہے ___ 157

خودی کی پرورش اور ذات کی تقویت کا راز ___ 157

اپنے حسنِ عمل کا بدلہ کسی دوسرے سے طلب کرنا' کاروبار کہلائے گا 158

قرآن کریم کے نزدیک خوبصورت زندگی کا معیار Balanced Personality (متوازن شخصیت) ہے ___ 159

قرآن کریم میں نیکی کے لفظ کی بجائے "حسنات" کا لفظ آیا ہے 159

کسی دوسرے کے توازن کو صحیح کرنے والے کا اپنا توازن صحیح ہو جاتا ہے ___ 160

صحت نام ہی حسنِ توازن کا ہے ___ 160

حکمت میرا مشغلہ بھی رہا ہے: پرویزؒ ___ 161

قرآنِ حکیم کے نازل کرنے کا مقصد قرآن حکیم کے اپنے الفاظ میں ___ 161

ابتدائی دور میں اسلامی نظام کو متشکل کرنے والے لوگ ___ 162

بعد میں آنے والے لوگ ___ 163

السابق تو السابق ہی ہوتے ہیں ___ 163

قرآنِ حکیم کی ایک اہم بات ___ 165

قرآن حکیم کے نزدیک مُصَلّین کا جرم ___ 166

اعمالِ صالحہ کے جوشِ دروں سے انسانی ذات کے لیے استقامت ارتقائی منازل کی نوید ہے ___ 168

علامہ اقبالؒ کی قرآنی بصیرت ___ 169

مذہبی پیشوائیت کا زوال عورت کے ہی ہاتھوں آئے گا ___ 170

حوروں کے متعلق مودودی مرحوم کی کہی ہوئی ایک اور بات ___ 170

لفظ برکت کا قرآنی مفہوم ___ 172

انسان کے لیے اکرام یا کریم کے لفظ سے بڑھ کر اور کوئی لفظ ہی نہیں ___ 172

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورة الواقعة

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: سورة الواقعة (آیات 1 تا 19)

خارجی کائنات میں ہونے والے حوادث کا بیان اور مفسرین کا تصور مگر ان کا مقصد کیا؟ ایک سوال _______ 175

عربی زبان کے مطابق قرآن حکیم الفاظ کے لغوی اور مجازی معنی پیش کرتا ہے مثلاً جبل، ارض، سما _______ 176

حق و باطل کی کشمکش اور صاحبِ قوت کا نشہ شروع سے آج تک جاری و ساری ہے _______ 177

زوالِ ظلم اور پروازِ حق ہر آن اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتے ہیں: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثال _______ 178

تباہ حال قوم میں پیدا ہونے والا ایک فردِ مومن ان کے لیے جہانِ نو پیدا کرنے کا موجب بن جاتا ہے _______ 179

قرآن حکیم کے پہلے 27 پارے ایک انقلابِ عظیم کا نصاب پیش کرتے نظر آتے ہیں اور اگلوں میں وہ انقلابِ عظیم آ گیا ہے 179

جنگِ بدر میں ابوجہل کے تکبر اور تفاخر کی ذہنیت کا عالم _______ 180

کسی بات کو موثر انداز میں پیش کرنے کے لیے مجازی معنی زیادہ مفید ثابت ہوتے ہیں _______ 180

قرآنی الفاظ کے مجازی مفہوم کی بلاغت اور وضاحت اور ہمارے مفسرین کا ماجرا _______ 180

خدائے علیم و خبیر نے تو اپنی کتاب کے اجمال کی وضاحت خود ہی کر دی ہے _______ 182

ان پہاڑوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے سے مراد بڑے بڑے طرے باز مکذبین کا انجام ہے _______ 183

قرآن حکیم کے احکام کا عملی نتیجہ: دو الفاظ میں وضاحت _______ 183

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے قرآنی لغت کی اہمیت اور مثال سے وضاحت _______ 184

جابر قوتوں کا نظام کبھی دوسرے کے اندر حرکت پیدا ہی نہیں ہونے دیتا مگر قرآن کریم کچھ اور کہتا ہے _______ 184

انقلاب کی نوید کے لیے قدمِ اول کی وضاحت اور پہلے انقلاب لانے والوں کے مدارج کا ذکر _______ 185

جن کے رہتے میں سوا ان کی سوا مشکل ہے: تین گروہوں کا ذکر 185

قرآن حکیم کے فرمان کے برعکس بخاری شریف کی ایک روایت کا انکار دائرۂ اسلام سے خارج _______ 187

ہمارے ہاں کفر کے فتوؤں کی نوعیت اور کامرانی کا راستہ _______ 187

یہاں ان پہاڑوں کا ٹوٹنا یا زمین کا پھٹ جانا مجازی معنی لیے ہوئے ہے _______ 188

نبی اکرمؐ کے دل سے بے ساختہ نکلنے والی دعا کی کیفیت، خدا کا

جواب اور مصاف زندگی کے تیسرے گروہ کے بعد
بقیہ قلیل سے اُٹھیں گے ____ 188
قرآن حکیم جن نعمتوں کو یہاں حلال قرار دیتا ہے یہ
حضرات ان کو حرام کہتے ہیں: جنت کی کیفیات ____ 189
قرآن حکیم کے نزدیک جنت کی خصوصیات ____ 190
جنتی معاشرے کے مخلدون وہ ہوں گے جن کی جوانیاں
دیرپا ہوں گی ____ 190
حضرت عمرؓ کے دور میں ایران کی فتح پر عربوں کی زندگی کا ذکر _ 191

دوسرا باب: **سورۃ الواقعۃ** (آیات 20 تا 40)

امروز، جنتِ ارضی اور فردا، آخرت کی جنّت میں فرق ____ 192
حور کا لفظ مذکر اور مونث، دونوں کے لیے ہے، جس کے معنی پاکیزہ
عقل کے ہوتے ہیں یہی عقل انسان اور حیوان میں امتیاز کرتی ہے 193
ہزار برس سے مذہب کے پیدا کردہ تصورات کی نوعیت ____ 194
دین اور دنیا کے ان دو الفاظ کو اگر عملاً یک جا کر دیا جائے تو دین
کی شکل وصورت نکھر کر سامنے آ جائے گی ____ 194
لغو کا قرآنی مفہوم: تعمیری طور پر نتیجہ خیز نہ ہونے والی زندگی
لغو میں آتی ہے ____ 195
قرآن حکیم کے لفظ اثم کا لغوی مفہوم: تکان، اضمحلال، کمزوری 195
قرآنی معاشرے کی تعمیر السلام علیکم کی محکم بنیاد پر
استوار ہوتی ہے ____ 196
سلام اور اسلامی معاشرے کا قرآنی مفہوم اور مشکلات ____ 196
Life after death کی اصطلاح اور برکت و یمن
کا قرآنی مفہوم ____ 198
وحی کی زبان نہ شاعری اور نہ نثر اور بقول نیٹشے نابغہ کی بھی ____ 198
قرآن حکیم اور اس کے اسلوبِ بیان کی چند ایک
بے مثل خصوصیات: جنّتی معاشرے کے نعماء ____ 199
خدا نے رزق کے تمام سرچشمیں نوعِ انسان کے لیے
بلا مزد و معاوضہ پیدا کیے مگر زمین پر ملکیت کی لکیریں ہیں ____ 200
ارض کے متعلق قرآن حکیم کے غیر متبدل اصول کی وضاحت _ 201
دورِ اولیٰ میں عرب دنیا کے علاوہ دوسری جگہ لونڈیوں کا ہجوم تھا 202
عورت کے معاشرتی اور تمدنی حقوق کی خاطر مرد کا مروجہ کردار 202
قرآنی معاشرے میں ہر عورتوں کی حیثیت بیگمات کی
سی ہوتی ہے ____ 203
خون بہا کا معاملہ ہو یا عورت کی گواہی کا، اس کے لیے
ایک حیران کن آرڈیننس کا نفاذ ____ 203
زیورات کے سائے میں پرورش پانے والی عورت کی
نفسیاتی کیفیت اور اس کا تدارک ____ 204
عدالت میں عورت کی گواہی کے دوران کسی دوسری
عورت کی موجودگی صرف ایک نفسیاتی سہارے کے لیے ہوتی ہے 205
قرآنی معاشرے میں عورت کی تعلیم وتربیت کا معیار اور
اس کے اثرات ____ 206
جنّتی معاشرے میں ہم خیال ہونے کے ثمرات ____ 207

تیسرا باب: **سورۃ الواقعۃ** (آیات 41 تا 57)

جنّتی زندگی کے بعد جہنمی زندگی کا تذکرہ ____ 208
جہنم اور جحیم کا لغوی مفہوم اور اس کا منظر نامہ ____ 209
حقیقی جہنم جہاں انسانیت ذبح ہو یا اس کی نشوونما رک جائے، انسانوں
کا محکوم بنا لیا جائے: یہ یہاں بھی ہے اور آخرت میں بھی ____ 210
انسان کا یہ فریب نفس ہے کہ جہنمی ہونے کے باوجود جہنم کو

محسوس نہیں کرتا اور اس سے نکل بھی نہیں سکتا ______ 211
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا کیونکہ شعلے
دلوں کو لپیٹ رہے ہیں ______ 212
قرآنِ کریم نے جس طرح جنّتی زندگی کی تفصیل دی ہے
اسی طرح جہنّمی زندگی کی بھی دی ہے ______ 212
جہنم میں جانے والے تین گروہوں کا تعارف ______ 213
پہلی کیٹیگری کی فکر و نظر اور اس کا ماحصل ______ 214
جہنمی معاشرے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہاں انسان
کا مالک انسان ہوتا ہے اور ایک مزید اہم شق بھی ہے ______ 215
اصحاب الشمال اور اصحاب الیمین کا فرق ______ 216
دلوں کو لپیٹنے والی آگ کا وہ عذاب جسے قرآن حکیم نے
صحرا کی لُو کہہ کر پکارا ہے ______ 217
نظام سرمایہ داری کے عذاب کی ایک شکل جو کارخانے کی
چمنی کے دھویں کی مانند ہے: اس میں نہ عزت، نہ توقیر ______ 217
قانون خداوندی کی گرفت تو لامحدود قوتوں کی حامل ہے ______ 218
مکافاتِ عمل پر یقین محکم میں نگاہ کی خیانت ______ 218
اگر قانون کی پاسداری نہ کی جائے تو مسجدیں بنا بنا کر ثواب
کا حصول چہ معنی؟ ______ 219
موت کا فرشتہ صرف انسانی جسم کو چھوتا ہے، اس کے مرکز سے
ہمیشہ دُور رہتا ہے مگر یہ بات دیدۂ بینا کے لیے ہے ______ 219
الزقوم: جہنمی زندگی کی کیفیت کا بیان ______ 220
لفظ اثم کا لغوی مفہوم اور قوموں کی تباہی اور بربادی کے
بنیادی اسباب کی وضاحت: طعام الاثیم ______ 221
اگر اپنی صلاحیتوں کو زنگ آلود کرنا مقصود ہو تو محنت کے عمل
کو خیرباد کہہ دو: یہ ہے گروہ مترفین ______ 221
محنت کے بغیر حاصل کردہ رزق سے انسان جفاکشی کی
لازوال نعمت سے ہی محروم ہو جاتا ہے ______ 222
مادی ذرایع کے سلسلہ میں انسانی ہوس گیری وہ کھولتا ہوا
پانی ہے جو ہر چیز کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے ______ 223
قرآن حکیم کے تحت انسانی زندگی ایک جوئے رواں ہے ______ 224

چوتھا باب: **سورة الواقعة** (آیات 58 تا 74)

مترفین کی زندگی، تسلسلِ حیات اور انسانی جسم ______ 225
جہانِ فردا کی زندگی کے وجود کو باور کرانے کا قرآنی انداز:
اس محسوس دنیا کے پیکروں پر گفتگو ______ 226
رحمِ مادر میں انسانی زندگی کی ابتدا: محسوس پیکر کی مثال ______ 226
کچھ بھی ہو کوئی آخری انسان بھی رحمِ مادر میں سانس کو پیدا
نہیں کر سکے گا ______ 227
انسانی دماغ کے متعلق ہونے والی تحقیق جو بڑی ہی
حیران کن ہے ______ 228
انسانی پیکر کے ختم ہونے یا اس کے بدلنے سے زندگی
تو ختم نہیں ہوتی ______ 228
اس زندگی کے بعد آئندہ کی زندگی کس قسم کا پیکر اختیار کرے
گی آج ہمیں اس کی سمجھ آ بھی نہیں سکے گی ______ 228
موجودہ زندگی کی حقیقت کو ماننا لیکن دوسری سے
انکار کرنا چہ معنی؟ ______ 229
زندگی اور انسان کا پیکر دو الگ الگ وجود ہیں، کھیتی کی
مثال بھی اور ملکیت زمین کا مسئلہ بھی ______ 229
پیدا ہونے کے ساتھ ہی ماں کی چھاتی میں دودھ کے

چشموں کی بہار کا اور ہاضمے کی قوت کا ذکر ________ 230
رزق کے حصول کے سلسلہ میں کھیتی کی مثال اور کاشت
کے سلسلہ میں بٹائی کی نوعیت ____________ 231
فصل کی پیداوار کے سلسلہ میں کائناتی عوامل کا وہ کردار
جو قدم قدم پر غور وفکر کا متقاضی ہے: عملِ تقطیر ________ 232
سبز شاخوں کے اندر آگ کے شعلوں کو پنہاں کر دینے والی ہستی _ 234
قرآن حکیم کے پیش کردہ معاشی نظام کے خدوخال اور
ہماری حالتِ زار ______________ 236
خالق کائنات کے پیدا کردہ بڑ کے ایک ایک درخت کی
تخلیق اور ایک ایک بیج کی نوعیت: نظامِ ربوبیت ______ 237
اسلامی نظام کا فریضہ اور اس کو اپنانے یا نافذ کرنے کا طریق _ 237
روٹی کھانے سے پہلے ایک غور وفکر کا مقام ________ 238
متاع کا لفظ قرآنِ حکیم کے پورے معاشی نظام کو اپنی
آغوش میں لیے ہوئے ہے ______________ 238
بنک بیلنس کروڑوں کا لیکن کھانے کے لیے صرف پردہ چھلکے کا 239
لفظ تسبیح کا لغوی مفہوم تو اپنے اندر ربوبیت عالمینی کا
پروگرام لیے ہوئے ہے ______________ 240

پانچواں باب: **سورة الواقعة** (آیات 75 تا 82)

قرآن حکیم کی ساری تعلیم خدا تعالیٰ کے غیر متبدل اصولوں
کے گرد گھومتی ہے ______________ 242
اَبلہ مسجد کے بجائے کائناتی علم عقل انسانی کو حقیقت کے
قریب تر لے آتا ہے ______________ 242
قرآن حکیم ہو یا گردشِ افلاک، ان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی
کوئی انسان کر ہی نہیں سکتا ______________ 243
لوح کا لغوی مفہوم اور ہمارے ہاں کی تفسیروں میں
روایات پر مبنی بیان کا تجربہ ______________ 244
لوح محفوظ کے سلسلہ میں تفسیر ابن کثیر کا بیان اور
علامہ غلام احمد پرویزؒ کی ایک التجا ____________ 245
قرآنِ حکیم ہی وہ قندیل آسمانی ہے جو لوح محفوظ ہونے
کے باعث تا قیامت انسانیت کی راہنمائی کا سہارا بنی رہے گی 246
قرآن حکیم کی تحریم وتکریم کا عملی انداز اور ہمارے ہاں کے
تراجم کی کیفیت ______________ 247
لفظ یمسّہٗ کا وہ مفہوم جو بڑا غور طلب ہے ____________ 247
مطہر کے لفظ کا استعمال یہاں قرآنی تعلیم کو سمجھنے کے لیے
پہلے خالی الذہن ہونے کے معنوں میں آیا ہے ________ 248
علامہ غلام احمد پرویزؒ نے قرآن حکیم کو کیسے سمجھا اور انہیں
کن کن گھاٹیوں کو سر کرنا پڑا ______________ 249
قرآن حکیم کا پیغام اپنی تعلیم میں کسی کو شریک نہیں کرتا جب
کہ مذہبی فرقہ بندی سب سے بڑا شرک ہے ________ 249
فرقوں کی موجودگی میں قرآن کیونکر سمجھا جا سکتا ہے ______ 250
اقبالؒ کا پیغام فرقوں کے نام: ادراک کا بے رنگ ہونا ہے ___ 251
فرقہ واریت کے وہ بت جنہوں نے ذہنی طور پر ملت کو
صدیوں سے انتشار میں مبتلا کر رکھا ہے ____________ 251
مختلف فرقوں کے مختلف عقائد تو معیوب ترین متاع تصور
کیے جاتے ہیں اور ہمارے تراجم!! ____________ 252
لفظ دھنیت کی عملی شکل سے محفوظ رہنے کی تاکید اور
نبی اکرمؐ کی سیرت مبارکہ ______________ 253
حق کی عظمت اور اس کا مقام ______________ 254

حق کے ساتھ باطل کی شرکت ہی فرقہ واریت کو جنم دیتی ہے
مگر باطل یہ شرکت کرتا ہے ____ 255
امت مسلمہ کی عملی شکل اور اطمینان قلب کے حصول کا ایک
عظیم فارمولہ ____ 255
دارالعلوموں کا دس دس سال کا کورس ان طالب علموں کو رزق معاش
کی خاطر گلی، گلی کوچہ کوچہ، مختلف مساجد میں لیے پھرتا ہے ____ 256
ہمارے ہاں دارالعلوموں کے علاوہ مکاتب اور مساجد کی
تعداد کا ذکر اور قیامِ پاکستان کے وقت کی ایک تجویز ____ 257
قرآن حکیم نے کسی جگہ بھی فرقہ بندی کی تائید نہیں کی ____ 258

چھٹا باب: **سورة الواقعة** (آیات 84 تا اختتام)

مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں انسان کی دوہری سوچ اور
قرآنِ حکیم کا بیان ____ 259
قرآن حکیم کا اندازِ بیان اور مکافاتِ عمل کے لیے موت کی مثال 260
خارجی کائنات کی طرح انسانیت کی دنیا کے لیے
غیر متبدل اصول کا ذکر ____ 261
اسلامی نظام کی عملی تشکیل کی خاطر کوشاں رہنے والوں کا ذکرِ خیر 261
قرآن مجید نے نظام حیات کے ارتقائی مراحل کے مقربوں
کے لیے السابقون اصحاب الیمین کے درجات حاصل
کرنے والے کہا ہے ____ 262
قرآنِ حکیم کے نزدیک اخروی جنت اور جہنم کی کیفیات کے
علاوہ جنت ارضی کے لیے قرآنی نظام حیات کا ذکر ____ 262
لفظ تقلید کا لغوی مفہوم اور قرآنی تعلیم اور پھر ہماری ہزار سالہ تاریخ 264
نظام ربوبیت کا قیام انسانیت کو منزل تک پہنچنے کے لیے ایک
احسن طریق بھی ہے اور انقلابی پروگرام بھی ____ 265
ہم نے قرآن حکیم کے انقلابی پروگرام کو تسبیح کے دانوں
میں پرو رکھا ہے ____ 265
ہمارا آج کا اسلام صرف دعاؤں تک محدود ہے ____ 265

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ الحدید

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: سورۃ الحدید (آیات 1 تا 5)

قرآنی سورتوں میں بھی تسلسل، عالمگیر ربوبیت کے لیے سرتوڑ کوشش کا حکم اور قوتِ نافذہ کی ضرورت ____ 268

خارجی کائنات میں فلکیات کی وسعت کا ادراک کون کرے گا 269

دنیا بھر کے ماہرین فلکیات ایک سوال کے جواب میں حیرت زدہ ہیں ____ 270

ایک سبز پتے کے اندر دھاریوں کی کیفیت کا بیان ____ 271

خداتعالیٰ کی ایک صفت عزیز کا مفہوم ____ 271

''خدا یہ کرتا ہے یا خدا یہ کہتا ہے'' کے معنی یہ لینے چاہیں کہ خدا کا قانون یہ ہے ____ 271

ہمارے ہاں کے تراجم کی پھیلائی ہوئی غلط سوچ کا نتیجہ ____ 272

انسانی زندگی کی راہنمائی کے لیے خدا کے صحیح تصور سے آگہی خشتِ اول ہے ____ 273

قرآن حکیم کے نزدیک خدا کے تصور کو سمجھنے کے سلسلہ میں مذہبی پیشوائیت اور ملوکیت کا کردار ____ 273

انسان اور کائنات کے مابین فرق صرف اختیارات کا ہے ____ 273

غیر متبدل اصولوں سے استفادہ لیے بغیر اطمینان قلب میسر ہو ہی نہیں سکتا ____ 274

خدا کی خدائی میں نہ خدا بدلتا ہے اور نہ ہی اس کے متعین کردہ اصول اور نہ ہی ان کے نتائج ____ 274

کائنات کا معاملہ ہو یا انسانوں کی دنیا کا' یہاں ہر قسم کا محسوس اور غیر محسوس تغیر خدا کے قانون کے ____ 275

مطابق ہوتا ہے ____ 275

تصوف کی دنیا میں وحدتِ وجود کا غلط تصور اور اس کی تباہ کاریوں کی ایک مثال ____ 275

ابن عربی اور علماء کی طرف سے بیان کردہ اور لکھی جانے والی سو سو جلدوں کی تفسیروں کا انداز ____ 276

انسانوں کے خودساختہ تصورات کی تردید ____ 277

تاریخ کے لیے اس کا حقیقی معیار متعین کرنا ازبس ضروری ہے 278

حقائق کی بجائے لطائف کی آبیاری کا نتیجہ نیز تورات کے پیدا کردہ تصورات ____ 278

انسانی زندگی میں تعطیل کا تصور جدوجہد مسلسل کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے ____ 279

خدا کی ذات' ٹائم اور Space کی حدود سے ناآشنا ہے؟ _ 279

دوسرا باب: سورۃ الحدید (آیات 4 مسلسل تا 8)

ہمارے ہاں کی تفسیروں کے مطابق خدا کی ذات عرش پہ مقیم

ہے جس کی تفصیل کچھ یوں ہے ____ 281
اس قسم کی تفسیروں سے نبی اکرم ﷺ کی ذات پر جو حرف
آ تا ہے اس کا آخر ذمہ دار کون ہے؟ ____ 282
لفظ تخت کا مجازی مفہوم کنٹرول ہوتا ہے ____ 282
خالق کی کائنات پر کنٹرول کی کیفیت اور مختلف تصورات ____ 283
خدا کے صحیح تصور کے بغیر قرآن حکیم کے بنیادی حقائق سمجھ
میں نہیں آسکتے اور لفظ ثُمَّ کے معنی ____ 283
خارجی کائنات کی خوبصورتی کا راز کنٹرولنگ اتھارٹی کے
غیر متبدل اصولوں کی بنا پر ہے ____ 283
خدا تعالیٰ کی انسان سے تعلقات کی نوعیت ____ 284
خدا کی ذات کا تعارف اس کی اپنی بیان کردہ صفات سے
ہی ہوسکتا ہے ____ 285
انسانی ذات کی نشوونما کا طریق صفات خداوندی کو
حدِ بشریت اپنے اندر منعکس کرنا ہے ____ 286
انسانی زندگی کا اندازِ زیست اقبالؒ کی نظر میں ____ 286
انسان کی بھرے معاشرے میں مَعَکُم اور ماورا کی دو الگ
الگ کیفیات کیسے؟ ____ 286
خدا تعالیٰ کی دو صفات معکم اور اَیْنَ مَاکُنتُم کی عملی تعبیر
اور ذات انسانی کا ذکر ____ 287
رہبانیت تو انسان کا خودساختہ تصور ہے ____ 288
تصوف کے علاوہ میکینکل معاشرے اور قرآنی
معاشرے میں فرق ____ 288
لفظ معیت کا لغوی مفہوم اور ہمارے ہاں شیطان کی
کیفیت اور اس کا عمل ____ 289
کراماً کاتبین کے متعلق ہمارے تصورات کی حقیقت ____ 289
انا للہ وانا الیہ راجعون جیسے ایک انقلابی اعلان کے برعکس
ہمارے ہاں پایا جانے والا تصور اور اس کا حقیقی مفہوم ____ 290
سورج کے غرب ہونے کی کیفیت کے متعلق ایک
خودساختہ روایت ____ 291
خدا تعالیٰ نے یہ پوری کائنات اس لیے پیدا کی کہ اس کی
روٹی کا انتظام ممکن ہوسکے ____ 291
تزکیہ نفس کے موجودہ تصور کے تحت پرویزؒ کی اپنی کہانی ان کی
اپنی زبانی اور پھر تزکیہ نفس کے علاوہ ارض وسما کا حقیقی مفہوم ____ 292
خدا کی اس کھلی زمین کو ذاتی ملکیت میں تبدیل کرنے کا عملی
نتیجہ انسانوں کو جیل خانے میں قید کرنے کے مترادف ہے ____ 292
زمین پر ذاتی ملکیت دراصل خدا کے مقابلے میں کسی کو
خدا بنانا ہے ____ 294
مقام رسالت کے پیش نظر اجتماعی طور پر ایک معاشرے
کی تشکیل ایک فریضہ کی بجا آوری ہے ____ 294
رسول کا اسوۂ حسنہ احکام خداوندی کا عکس ہوتا ہے ____ 295
امت واحدہ کی تشکیل کے لیے وحی پر مبنی تصورات، ذہنی طور
پر فولادیت کی نشوونما کا موجب بنتے ہیں ____ 295
ایمان وحی کی بنیادی اقدار کو عملی طور پر اپنانے کا دوسرا نام ہے ____ 296

تیسرا باب: **سورة الحديد** (آیات 9 تا 13)

نبی اکرم ﷺ کی قرآنی دعوت میں آپ کے ذاتی تصورات
کا ذرہ بھر بھی دخل نہیں تھا ____ 297
نوعِ انسانی کی حد تک قرآن حکیم کے نزول کا حقیقی مقصد
پیغام موت ہے ہر نوع غلامی کے لیے ____ 298

خدا تعالیٰ نے قرآن حکیم کی راہنمائی کو ایک ایسا النور کہا ہے
جس میں ہر قسم کی ظلمات کا علاج مضمر ہے 299
ظلمات سے وادیٔ نور کے لیے نورانی سفر کی داستاں کا ذکر 299
آزادیوں میں سب سے بڑی آزادی انسانیت کو انسانوں
کی غلام سے آزادی دلانا ہے 300
پاکستان کی تحریک بنی اسرائیل کی تاریخ سے مماثلت رکھتی ہے 300
لا کے بعد الا کے مقام کی اہمیت 301
قائداعظمؒ کا احسان عظیم ہے کہ پاکستان کے وقت تک کسی
کو قطرہ خون تک نہ بہانا پڑا 301
قرآن حکیم اپنے ہاں انسان کو اپنا مال دوسروں پر خرچ کرنے کے
بجائے اسے کھلا رکھنے کا حکم دیتا ہے' لفظ نیفق کا یہی مفہوم ہے 302
قرآن حکیم کے معاشی نظام کا ابتدائی قدم 302
خیرات کے متعلق نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی 303
قدرت نے پوری کائنات کے خزانے تمام نوع انسانی کی
انتظامی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے عطا کیے ہیں 303
قرآن حکیم میں صحابہ کرام کے مقام کی وضاحت 304
قرآنی نظام حیات کے قیام کی خاطر اپنے وسائل کو کھلا رکھنے
والوں کے لیے اجرِ عظیم 305
خدا کی راہ میں کھلا رکھنے والوں کے لیے اجر عظیم کی
شکل وصورت 306
خدا کو قرض دینے کے بدلے میں یہ زندگی اپنے ارتقائی
مراحل کی نعمتوں سے سرفراز ہو جائے گی 306
جنت کے متعلق ہمارا موجودہ تصور 307
جنت کی زندگی کسی سکوت کی متحمل ہونے کی بجائے عمل پیہم
سے بھرپور ہوگی 307
جنت میں مومنین اور محسنات کا ہر قدم نت نئی منزل کی
طرف رواں دواں ہوگا 307
مذہب کی ساری تعلیم اور اس کے تصورات نجات کے
گرد ہی گومتے ہیں 308
عیسائیت کے لیے جنت کے حصول کا فارمولہ 308
جنت کے سلسلہ میں بنی اسرائیل کا عقیدہ 309
قرآن حکیم نجات کی بجائے فوز کا تصور پیش کرتا ہے 309
کوئی انسان اصلاح عمل کے لیے اس دنیا میں نہیں آسکے گا 310
جہانِ فردا میں مومنین کے مقابلے میں منافقین کی حالت زار 310
منافق کے سینے کی آگ اسے مسلسل عذاب میں مبتلا رکھتی ہے 311

چوتھا باب: **سورۃ الحدید** (آیات 14 تا 18)

مومن کی تعریف اس کی پہچان اور پھر اس کا انجام 313
مومن کی سیرت خود اس کی اپنی پہچان ہوتی ہے 313
ایک ہندو کے نزدیک مسلمان ہونے کا معیار اور ایک تیلی
کا کردار اور مومن و منافق میں فرق 313
لفظ مذبذبین کا لغوی مفہوم اور اس کی عملی زندگی 315
مومن' منافق اور کافر میں فرق کا تعین 315
جہانِ فردا میں منافقین کی مومنین سے التجا اور ان کا جواب 316
قرآن حکیم نے Dual Personality (دوہری شخصیت)
کی اس نفسیاتی اصلاح کو دلوں کا روگ کہا ہے 316
عربی زبان میں اصطلاحات کی نوعیت اور پھر ان میں
باہمی فرق کی شکل وصورت 317
قرآن حکیم میں شک کے لیے ریب کا لفظ استعمال کیا ہے 318

ذاتی مفاد کی کیفیت انسان کو ہمیشہ اضطراب میں مبتلا رکھتی ہے 318
بینک میں سودی روپے کو پاکیزہ کرنے کی خاطر زکوٰۃ کی
کٹوتی کا مسئلہ ______ 318
مومن کی زندگی کا تو ہر ہر قدم قانون کی نگہبانی سے وابستہ ہے 319
جنت کی زندگی رزق حرام کی سخاوت سے حاصل نہیں کی جاسکتی 320
قرآن حکیم نے دلوں کو لپیٹنے والی آگ کے شعلوں کو جہنم
کی آگ سے تعبیر کیا ہے ______ 320
دورِ اولیٰ میں اعراب کی ایک کیٹیگری کے وجود کے تذکرہ
کی ایک اہم بات ______ 320
آج ہم بیچارگی کے طور پر خود مسلمان کہہ رہے ہیں ______ 321
قرآن حکیم کے سامنے اپنے آپ کو Surrender کرنے
والوں کے متعلق ارشادِ خداوندی ______ 322
اور لفظ نخل کا مفہوم ______ 322
خود کو سرِ تسلیم کرنے کے بعد دوسری منزل کے سفر کی اہمیت
کو ملتوی نہ کرنے کی تاکید ______ 322
اس حسین منزل کے حصول کو التوا میں ڈالنے کا نتیجہ اپنی
ذات کو پتھر بنانا ہے ______ 323
قرآن حکیم کا انداز بیاں اور اس کی تعلیم عقل وشعور رکھنے
والوں کے لیے کافی ہے ______ 323
قرآن حکیم مذکر اور مونث دونوں کے لیے مخاطب ہوتا ہے ______ 324
قرآن حکیم نے ہر جگہ جان اور مال کی قربانی کو فضیلت دی ہے 325
مال کی قربانی کے سلسلہ میں انسان کا کردار اور
قرآن حکیم کا فرمان ______ 325
خدا کو قرض دینے کا معاوضہ دودھ کی شکل میں ______ 326
قرآنی نظام حیات کے خدوخال ذات انسانی کی
نشوونما کا بہترین ذریعہ ہے ______ 326
پانچواں باب: **سورۃ الحدید** (آیات 18 مسلسل تا 21)
قرآنی شعبۂ انفاق کو عملی طور پر اپنانے کی بجائے ہمارے
ہاں کی جانے والی سعی وکاوش کی شکل وصورت ______ 328
دنیا بھر میں مذہب کی دنیا نے ہمیشہ اپنے ہاں نظام زندگی
کی بجائے پرستش کا ہی تصور پیش کیا ہے ______ 329
ہر مسجد کا رخ قبلے کی طرف رکھنے کا مقصد قرآنی اور صرف
قرآنی نصب العین کو اپنانے کی ترغیب دیتا ہے ______ 330
قرآن حکیم پوری مسلم دنیا کو ایک نصب العین کے تحت
ایک امت کی نوید دیتا ہے ______ 331
ہزار سال سے ہمارا شیوہ عملی طور پر اس پروگرام سے
کوسوں بعید ہے ______ 331
مختلف ذرائع کو مقصود بالذات سمجھ لینا ہی کافی نہیں ہوتا ______ 331
مسلمان ہونے کے لیے یہ ایک معاہدہ کرنا لازم ہے ______ 332
قرآن حکیم کے نزدیک نیکی کی تعریف یا اس کی وضاحت ______ 332
جہاد کا ایک اپنا مقام ہے ______ 333
نظام دین کے بالمقابل مذہبی تصورات کا نتیجہ ______ 333
صدیوں سے قرآن حکیم کا بغیر مطلب سمجھے پڑھنا' ناظرہ اور
پھر اس کے اہتمامات ______ 334
کچھ ذکر تجوید القرآن کا ______ 334
ہر مسجد کا لاؤڈ اسپیکر الگ' مینار الگ' سوچ الگ اور
نتیجہ صرف انتشار ______ 334
ہماری اس سعی لاحاصل کے متعلق قرآن کریم کا فرمان ______ 335

صلوٰۃ کوصرف نماز تک محدود کرنے والوں کے متعلق
قرآن حکیم کا ارشاد ______ 335
ہماری مصلحت آمیز فرقہ بندی کے متعلق قرآن حکیم کا فتویٰ _ 336
شریعت کے بعد تصوف کی داستان ہے جس کو سمجھنا تو
اور بھی مشکل ______ 336
قرآن حکیم کے ان احکام سے اعراض برتنے کے نتیجہ
میں قرآنی فیصلہ ______ 337
قرآن حکیم کی طرف سے مومنین کے لیے اعلون ہونے کا
ایک واضح سرٹیفیکیٹ اور پھر ہماری حالت زیر دست نگری __ 338
قرآنی نظام کے لیے کی گئی Investment (سرمایہ کاری)
کا ذات کی نشوونما کی صورت میں ایک اجرِ عظیم ملے گا ____ 338
لفظ شہد کے لغوی یا قرآنی مفہوم نگرانی کرنے والا
کے ہوتے ہیں ______ 339
مومن کے لیے تو اس کی اخروی زندگی بھی ایک ستانے کا
مقام نہیں ہے ______ 339
قوم مسلم تو ہزار سال سے تقلید پرستی کے جہنم میں گرفتار ہے __ 340
انسانی زندگی کے لیے دو مختلف تصورات اور ان کی وضاحت _ 340
انسان کی یہ موجودہ زندگی مقصود بالذات نہیں اور نہ
یہ لہو ولعب ہے ______ 341
لفظ تفاخر یا فخر کا مفہوم اور پھر تکاثر کے جذبے کی حقیقت کو
سمجھنے کے لیے قرآنی مثالیں ______ 341
انسانی زندگی کے دو پہلو ایک طرف کھوٹے سکوں کے انبار اور
دوسری طرف انسانی ذات کی نشوونما کے لیے آبِ حیات کی نوید 342
قرآن حکیم کے نزدیک دوسروں سے بڑھ جانے کا جذبہ محرکہ 343
جنت کسی خاص مقام کا نام نہیں ______ 343
جنت ہو یا دوزخ، یہ دو الگ الگ کیفیات کے نام ہیں،
مقام کے نہیں ہیں ______ 343
اگر یہ سب کچھ خدا نے خود ہی کرنا ہے یا چاہنا ہے تو
پھر مکافاتِ عمل کیا ہے ______ 344
اگر خدا کا تصور بدل جائے تو قرآن حکیم کی تفسیر بدل جاتی ہے 344
مذہب میں تقدیر کے ایک غلط تصور نے ہمارے ہاں
فکرِ قرآنی کو ہی بدل کر رکھ دیا ______ 345

چھٹا باب: **سورة الحديد** (آیات 22 تا 24)

لفظ من یشاء کے ایک غلط ترجمے نے قرآن حکیم کی بنیادی
تعلیم کو ہی بدل کر رکھ دیا ہے ______ 346
حضور ﷺ کا اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ اور اپنی
پھوپھیؓ کے لیے پیغام ______ 348
حضرت عمرؓ کے نزدیک خلافت کی ذمہ داریوں کا احساس ___ 348
خلافت میں ملوکیت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا ______ 348
عباسیوں کے ہاں کا یہ عقیدۂ تقدیر ایران سے آیا تھا ____ 349
برامکا کا وضع کردہ عقیدہ تقدیر اور پھر شب برات کا قصہ ___ 349
پہلے سے لکھی گئی تقدیر کے باوجود سال کے بعد الگ الگ
حساب اور فیصلے کا دن ______ 350
تقدیر کے غیر قرآنی تصور کے علاوہ شب برات اور
نوروز کے تہوار کا جائزہ ______ 350
شب برات کی یہی وجہ تسمیہ ہے ______ 351
اسلامی حکومت کی تعریف اور اس کے بنیادی خدوخال ____ 351
قرآنِ حکیم کسی انسان کو بھی انسانوں پر حکومت کرنے کی

اجازت نہیں دیتا ____ 352

خدا کا دین جب مذہب میں بدلا تو خلافت نے اپنے
سر پر ملوکیت کا تاج رکھ کر من یشاء کا قرآنی مفہوم ہی بدل دیا ____ 353

ہمارے موجودہ مذہبی اسلام نے ہر جرم کو بے لگام چھوڑ دیا ____ 353

قرآن حکیم کے صراط مستقیم کے برعکس مذہب' اسلام کے
بعد طریقت کا سفرِ حیات بڑا ہی کٹھن سنگ لاخ اور
کانٹوں کی پیچ سے الجھا ہوا ہے ____ 355

قرآن حکیم کی ایک اہم آیت کے غلط ترجمہ کی پھیلائی ہوئی
گمراہی اور اس کا نتیجہ ____ 355

ہمارے ہاں قرآن حکیم کو پیش کرنے کا طریق نکاح نامے
پر لکھی جانے والی ایک آیت کی مثال ____ 357

ہم نے قرآنِ حکیم کو نظروں سے اوجھل بھی رکھا اور اسے بیچا بھی 357

قرآن حکیم کی طرف سے انسانوں کی فریب دہی یا کم مائیگی
کا تفصیلی جائزہ ____ 358

معاشرتی طور پر پیدا ہونے والے مسائل کا ذکر اور
ان کی وجہ جواز ____ 358

خدا کی طرف سے ملنے والا ضابطہ حیات تمام مشکلات
کا واضح حل اپنے اندر لیے ہوئے ہے ____ 359

نظام سرمایہ داری کی نوعیت جو بخل کی ترجمانی کرتی ہے اس کا علاج 360

سرمایہ داری ایک نظام کے سہارے پروان چڑھتی ہے ____ 360

بخل کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا ارشاد ____ 360

قوموں کے عروج و زوال کا انحصار تمام تر اختیار کردہ
نظام پر مبنی ہوتا ہے ____ 361

جیسا نظام ویسی قوم ویسی زندگی ____ 361

قانون مکافاتِ عمل کی آنکھ ہر لحہ قوموں کی موت و حیات
کے پیمانے پر نظر رکھے ہوئے ہے ____ 361

ساتواں باب: سورة الحديد (آیات 25 تا 27)

ہنگامی حالات کے لیے قانونِ خداوندی کی وضاحت'

امت کا فریضہ اور نظام عدل کی اہمیت ____ 363

لفظ حدید کا مفہوم قوت ہے جبکہ قوت خیر بھی ہے اور شر بھی ____ 364

عہد ملوکیت کے اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے جو قرآنی
احکام کے خلاف ہے ____ 365

غیر مسلم کے تحفظ کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا ارشاد ____ 365

پوری نوع انسانی کی بقا قرآن حکیم کا واضح ترمنشور ہے ____ 366

حضرت عمرؓ فاروق کی خلافت کے چند ایک تاریخی واقعات ____ 366

فکرِ قرآنی کی روشنی میں غیب کا وہ مفہوم جو عقل و فکر کے
راستوں کو روشن کر دیتا ہے ____ 367

خدا کے پروگراموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا' اپنی زندگی کے
الجھے مسائل کو ہی آسان بنانا ہے ____ 368

خدا کی مدد حاصل کرنے کی ایک بنیادی شرط ____ 369

حضرت نوح u کے ذکر کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق
ایک غلط فہمی کا ازالہ ____ 369

کچھ ذکر اورنگزیب کی شخصیت کا ____ 370

ہمارے ہاں پھیلائے ہوئے اسلام کی نوعیت اسلام
یا تلوار اور پھر تصوف ____ 370

ربانیت کے متعلق قرآن حکیم کا اعلانِ عظیم ____ 371

کسی غلط کام کے لیے نیک نیتی کی سند عطا نہیں کی جاسکتی ____ 371

اسلحہ سازی کے سلسلہ میں عیسائیت کا جنون اور ہندو کے

ہاں کی نمستے بھی اور اسلحہ کے ڈھیر بھی ____________ 372
پادریوں سے جان بخشی کروا کر سیکولرازم کا حدود
فراموش نظریہ حیات ____________ 372

آٹھواں باب: **سورۃ الحدید** (آیات 28 تا اختتام)

شب برات کی مزید وضاحت ____________ 373
کوئی ان سے پوچھے کہ شب برات کا ذکر قرآن حکیم کی
سورۃ الدخان میں کہاں ہے؟ ____________ 373
ہمارے علمائے کرام کے فیصلے کچھ اسی طرح کے ہوتے ہیں ___ 374
علامہ غلام احمد پرویزؒ کا مشن اور غیر مسلم دانشوروں کے نزدیک
اسلام کی شکل وصورت ____________ 375
خلیل جبران (1931-1883ء) کی شاعری ______ 375
کیا قرآن حکیم کے نزول کا ذکر سورۃ الدخان میں موجود ہے؟ 375
موجودہ اسلام عہد رسالت کے اسلام سے ہٹ کر عجمی
اسلام کا رہین منت ہے ____________ 376
عرب کے اعراب کی مانند یاایھا الذین امنوا کے الفاظ ہم
موجودہ مسلمانوں سے متعلق ہیں ____________ 376
خوف وحزن میں پرورش پانے والی قوم ذہنی طور پر مفلوج ہو کر
عقل وفکر کی لازوال دولت سے محروم ہو جاتی ہے ______ 377
شر کا عمل ہمیشہ خوف وحزن کو جنم دیتا ہے جب کہ تقویٰ کے
دیئے گئے مفہوم میں اس کا بہترین علاج مضمر ہے ______ 377
قوانین خداوندی پر عمل کرنے کے عوض دہرے
ثواب کی وضاحت ____________ 378
قرآن حکیم تو خود روشنی کا مینار ہے اس کے باہر سے روشنی
مستعار لینے کی ضرورت نہیں ____________ 379
جس گھر میں یا جس محفل میں جہاں بھی قرآن حکیم ہوگا'
وہاں روشنی یقیناً ہوگی ____________ 379
ہاتھ میں قرآن حکیم لیے ایک اونٹ کی سواری کے ساتھ دنیا
بھر کی تاریک راہوں کو منور کر دینے والی ہستی کا شہر ______ 379
اقبالؒ کی دل خراشی کا منظر ____________ 381
قندیل آسمانی کے روشن چراغ کی ترجمانی قرآن حکیم کی زبانی 382
آج یہودی سرمایہ داروں کے تاج بادشاہی کی کیفیت ____ 382
عہد رسالت میں یہودیوں کی کیفیت اور قرآن حکیم کی
طرف سے نوید سحر ____________ 382
غیر قرآنی معاشرے میں حضرت انسان کی حالت ______ 383

سورة القمر

پہلا باب: **سورۃ القمر** (آیات 1 تا 8)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج دسمبر 1982ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القمر سے ہو رہا ہے۔ یہ 54 ویں سورۃ ہے:(54:1)۔

حضور کی انگلی سے چاند کے دو ٹکڑے ہو جانے کے سلسلہ میں تواتر کی سند کی حقیقت

سابقہ سورۃ النجم میں آپ نے دیکھا تھا کہ مقامِ نبوت اور منصبِ رسالت کو کس اعجاز اور ایجاز کے ساتھ قرآن کریم نے بیان کیا۔ یہ سورۃ اسی کے تسلسل میں ہے لیکن بات جہاں سے شروع ہوتی ہے اور جو کچھ اس کے متعلق مشہور ہے اس میں تو کوئی تسلسل ہی نہیں رہ جاتا۔ کہا ہے کہ اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ (54:1)۔ شقِ قمر کا معجزہ تو آپ نے سنا ہوگا۔ الفاظ ہر وعظ میں، ہر میلاد کی مجلس میں، قرآن حمید کی ہر قدیم تفسیر میں، یہ ہیں کہ حضورﷺ نے انگلی کی اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ بعض باتیں ایسی ہیں جنہیں کہا جاتا ہے کہ وہ متواتر چلی آ رہی ہیں۔ ان کے ہاں شریعت میں، دین میں، تواتر بھی سند ہوتا ہے یعنی جن چیزوں کو یہ سند مانتے ان میں ایک چیز تواتر بھی ہے کہ ایک چیز متواتر چلی آئے تو وہ بھی سند ہو جاتی ہے۔ یہ اس قسم کی چیزیں تواتر میں آ جاتی ہیں اور یہ متواتر قوم میں چلی آ رہی ہے۔ ان میں ایک حضورﷺ کی انگشت سے چاند کا پھٹنا بھی ہے اور اس سے دلیل لائی جاتی ہے: الساعت قریب ہوئی اور چاند پھٹ گیا۔ یوں تو احادیث کی کتابوں میں اس کے متعلق ہے، بخاری اور مسلم تک کے اندر یہ چیز ہے کہ ان کے سارے عرب نے آپؐ سے کوئی معجزہ مانگا تو

آپ ﷺ نے انگلی سے چاند پراس طرح اشارہ کیا' چاند دوٹکڑے ہوگیا' اب اس کے بعد اس کی جو تفصیل ہے' اس میں ذرا اختلاف ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ اس کا آدھا حصہ پہاڑ کے ایک طرف اور آدھ حصہ پہاڑ کے دوسری طرف ہوگیا۔ بعض میں یہ بھی ہے کہ آدھا ٹکڑا حضور ﷺ کی بغل کے نیچے سے نکل گیا اور دوسرا ٹکڑا اُدھر سے نیچے نکل گیا اور پھر جا کر مان لیا تو گویا آپ ﷺ کی انگلی کے اشارے سے چاند کے دوٹکڑے ہونے کا جو معجزہ ہے' یہ شروع سے آخر تک تواتر سے چلا آتا ہے۔ اسے ہم شق القمر کا معجزہ کہتے ہیں اس میں آگے پھر روایات میں بھی' تفسیر میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حضور ﷺ کی زندگی میں واقعہ ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے معجز دکھایا تھا' بعض کہتے ہیں کہ نہیں' یہ قیامت کے قریب ایسا ہوگا' اس کے متعلق پیشن گوئی ہے۔

حضورؐ سے معجزے کے مطالبات کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا ارشاد اور دلیل و برہان کی اہمیت

قرآن حکیم کی تو بہر حال چاند کے دوٹکڑے ہونے کی جو چیز معجزے کے طور پہ ہے' یہ زیادہ تواتر سے چلی آرہی ہے کہ یہ حضورؐ کے زمانے میں' حضور ﷺ نے ایسا کیا تھا اور بطور معجزہ چاند پھٹ کر دوٹکڑے ہوگیا تھا۔ پہلی بات تو یہ لیجیے کہ اس کی ابتدائی روایت میں یہ ہے کہ ان لوگوں نے حضورؐ سے معجزہ طلب فرمایا اور آپؐ نے معجزے کے طور پر یہ دکھایا۔ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر یہ ہے کہ اے رسول! تجھ سے معجزہ طلب کرتے ہیں' ان سے کہو کہ جس چیز کی میں دعوت دیتا ہوں' وہ تو ایمان ہے' میں علیٰ وجہ البصیرت دلائل اور براہین کے طور پر اس چیز کو پیش کرتا ہوں اور تم سے بھی یہ کہتا ہوں کہ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (2:111) جو میں کہتا ہوں اگر تمہیں اس سے اختلاف ہے تو تم بھی دلائل لاؤ' قرآن پیش کرو' یہ علم وبصیرت کا معاملہ ہے اور بار بار قرآن حکیم نے ان کے اس مطالبے کا انکار کیا ہے اور کہا یہ ہے کہ مومن تو وہ ہے جو خدا کی آیات کے سامنے بھی آنکھیں بند کر کے اور کان بند کر کے جھکتا نہیں ہے۔ وہ آیاتِ خداوندی پر آنکھیں کھول کر' کان کھول کر' علم وبصیرت کی بنیادوں پر ایمان لاتا ہے۔ تو ایک طرف تو یہ ہے کہ قرآن حکیم نے ہر مقام پہ کہا ہے کہ یہ تجھ سے معجزہ مانگتے ہیں کیونکہ یہ بات چلی آرہی ہے کہ جو بڑے بڑے انبیائے کرامؑ تھے' وہ معجزے دکھایا کرتے تھے' تم سے بھی معجزہ مانگتے ہیں۔ ان سے کہو کہ بابا! میں تو علم وبصیرت کی بنیاد پر' دلائل و براہین کی رو سے ایک چیز پیش کرتا ہوں۔

معجزہ کے تو معنی یہ ہیں جہاں عقل عاجز آجائے یعنی میں جو کچھ پیش کرتا ہوں وہ عقل کی رو سے پیش کرتا ہوں' عقل کی رو سے منوانے کا مطالبہ کرتا ہوں اور تم ایک ایسی چیز کا مطالبہ کرتے ہو جس کے معنی ہی یہ ہیں کہ عقل وہاں اس کے سمجھنے میں عاجز آجائے کہ یہ تو بنیادی طور پہ اس کے اثرات ہیں اس لیے قرآن حکیم نے کہا کہ معجزے کی رو سے ایمان لانا تو ایمان ہی نہیں ہوسکتا یعنی اگر کسی کو اس طرح سے' کسی طریق سے بھی' کسی کی عقل کو عاجز کر دیا جائے وہ اس قابل نہ رہے کہ سمجھ سکے تو اس سے کوئی چیز منوالی جائے تو یہ تو جبراً منوانے

والی بات ہوئی اس نے برضا و رغبت تو نہیں مانا' دل کی رضامندی سے تو نہیں مانا' قلب اور دماغ کے اطمینان سے تو نہیں مانا' وہ تو آپ نے ان کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ماؤف کر کے ایک چیز منوالی۔ یہ اس صلاحیت کو ماؤف کر کے ماننا' خواہ کسی طریق سے بھی ہو' ماننا ہی نہیں کہلا سکتا۔ یہ تو اکراہ ہے' یہ تو زبردستی کسی سے کچھ منوانا ہے اور اس کے متعلق قرآنِ کریم میں خاص طور پہ یہ کہا کہ یہ اس قسم کا مطالبہ کرتے ہیں۔

قرآن حکیم کی تعلیم کا غیر متبدل بنیادی اصول انسانی عقل کو ماؤف کر کے' اس کی آزادی کو سلب کرنا نہیں ہے

کہا کہ وَ لَوْشَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّھُمْ جَمِیْعًا(99: 10) اے رسولؐ! اگر تمہارے دل میں یہ بات ہو کہ کسی طرح سے بھی ان کو ایسا کیا جائے کہ یہ سب کے سب ایمان لے آئیں' تو ہمارے لیے یہ مشکل ہی کیا تھا کہ ہم انہیں پیدا ہی اس طرح کرتے کہ یہ ایمان لائے ہوئے ہوتے لیکن یہ ہمارے پروگرام کے خلاف ہے۔ حیوانات کے درجے تک تو یہ صورت تھی کہ ان کو اختیار و ارادہ نہیں تھا' انہیں پیدا ہی اس طرح کیا گیا تھا کہ جو طریق ان کے لیے تجویز کیا' وہ اسی پہ چلتے ہیں' ان کو اختیار ہی نہیں ہے۔ انسانوں کی صورت میں ہم نے انہیں راستہ دکھا دیا ہے' دونوں ہی راستے دکھا دیئے: وَھَدَیْنٰهُ النَّجْدَیْنِ (10: 90)۔ اور اس کے بعد انہیں کہا کہ ان کا جی چاہے تو یہ راستہ اختیار کریں' ان کا جی چاہے تو غلط راستہ اختیار کریں' جس قسم کا راستہ اختیار کریں یہ اس قسم کا نتیجہ بھگتیں گے۔ سارے قرآن حکیم میں اسی چیز پہ زور دیا گیا ہے کہ ہم انسان کی اس آزادی کو سلب نہیں کرتے' وہ نتیجہ خود بھگتے گا اور اگر یہ صورت ہو کہ کوئی ایسی شکل پیدا کی جائے جس سے یہ اپنے اختیار و ارادے سے راستہ اختیار نہ کرے' کسی طرح سے بھی جبر کر کے کوئی راستہ اس سے منوا لیا جائے تو وہ تو ایمان ہی نہیں ہے۔

اس لیے فرمایا کہ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (10:99) اے رسول! کیا تُو چاہتا ہے کہ کچھ ان کو مجبور کیا جائے' ان پہ جبر کیا جائے کہ کسی طرح سے مان جائیں' یہ کسی طرح سے ہماری بات پر ایمان لے آئیں۔ کیا تم یہ چاہتے ہو؟ اگر ایسا ہی ہونا ہوتا تو ہم سب کو ایماندار ہی پیدا کیوں نہ کرتے۔ ہمارے لیے مشکل کیا تھا تو یہ طریق نہیں ہے یعنی خاص طور پہ یہ کہا گیا ہے۔ معجزے کے تو معنی یہ ہیں کہ ایسی بات سامنے دکھائی جائے جس سے عقل عاجز آ جائے۔ یہ کبھی نہیں' اور اس کے بعد وہ کہے کہ ہاں صاحب! ٹھیک ہے اور اگلی بات یہ ہے کہ اگر معجزہ دکھا بھی دیا' فرض کرو جیسا یہ کہتے ہیں' انہوں نے کہا کہ کوئی معجزہ دکھائے' اتنا بڑا معجزہ کہ ان کے سامنے چاند دو ٹکڑے ہو گیا اور وہ آدھا پہاڑ کے ایک طرف' آدھا پہاڑ کی دوسری طرف یا آدھا اس طرف حضورؐ کے نیچے سے' آدھا اس طرح سے' ان

کے سامنے چاند دوٹکڑے ہوگیا اور وہ ویسے کے ویسے ہی کافر رہے، یعنی یہ ہوا کیا؟ ایسی چیز ہوئی کہ ان کی خاطر ان کے مطالبے پر قوانینِ فطرت کو بدل دیا حالانکہ قرآن حکیم نے بار بار کہا ہے کہ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحۡوِیۡلًا (35:43)۔ قطعاً تم ان قوانین میں تبدیلی نہیں پاؤ گے، جو ہم نے مقرر کیے ہوئے ہیں۔ تو اتنی بڑی تبدیلی بھی کی، اس میں استثنٰی بھی کیا، قانونِ فطرت کو بدل بھی دیا اور اس بدلنے کے بعد بھی ان کی کیفیت یہ رہی کہ وہ ویسے کے ویسے ہی کافر رہے۔ یہ تو بیکار گیا۔ چلیے! جبراً ہی سہی، اس دکھانے کے بعد بھی اگر وہ سارے مسلمان ہوجاتے تو جب بھی کہیے کہ چلیے صاحب! تدبیر کارگر تو ہوئی، یہ کچھ کیا بھی اور وہ ویسے کے ویسے ہی رہے۔ می نہ سزد خدائے را۔

معجزوں کے مطالبے پر قرآن حکیم کا دوٹوک جواب

خدا اس قسم کی چیزیں کرے گا اسی لیے اس نے یہ کہہ دیا۔ جہاں ان کی طرف سے کسی معجزہ دکھانے کا مطالبہ آیا ہے، وہیں ان سے کہا گیا ہے کہ معجزہ دکھانے سے ایمان نہیں لایا جاسکتا۔ یہ تو جس قدر زیادہ عقل وفکر سے تم کام لو گے، اسی انداز سے ایمان لایا ہوا ایمان کہلائے گا۔ تو اب اگر ان چیزوں کو دیکھیے کہ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پہ ان کے معجزہ کے مطالبہ کے جواب میں یہ کہا ہے کہ اے رسول! تم ان کے سامنے آسمان پہ بھی چڑھ جاؤ اور وہاں سے لکھی لکھائی کتاب بھی لے آؤ تو جب بھی یہ بات نہیں بنے گی اس لیے ہم یہ اس قسم کی چیز کرتے ہی نہیں ہیں۔ کہا ہے کہ اَدۡعُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیۡرَۃٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیۡ (12:108) ہم تو علیٰ وجہ البصیرت ایک حقیقت پیش کرتے ہیں، تمہاری عقل وفکر کو دعوت دیتے ہیں، اس کی رو سے تم دیکھو اور پھر یہ جو شقِ قمر کا جہاں یہ ذکر آیا ہے، میں ابھی عرض کرونگا کہ یہ کیا ہے۔ عقل وفکر کو اپیل کرنے والی یہ جو چیز ہے، اس کے متعلق کہا کہ حِکۡمَۃٌۢ بَالِغَۃٌ (54:5). یہ اسی سورۃ میں پانچویں آیت ہے کہ ''یہ تو ایک ایسی دلیل ہے جو دل میں اتر جانے والی ہے''۔

تو یہاں تو اس کا نام ہی حکمت کہا، عقل وفکر کی بات، علم وبصیرت کی بات، بالغۃ دل میں پہنچ جانے والی، دل کے اندر اتر جانے والی حکمت کی بات ہے۔

ہمارے ہاں شق القمر کے متعلق لکھی گئی قدیم اور جدید تفاسیر وضعی روایات پر مبنی ہیں

معجزہ تو دو متضاد چیزیں ہوتی ہیں، اس میں تو دلیل ہوتی نہیں ہے لیکن آپ یہ دیکھیے کہ یہ ایسا تواتر ہے، جسے یہ کہتے ہیں کہ پہلے دور کی جو بھی کوئی تفسیر اٹھائیے، اس میں تو آج تک اور اپنے دور میں آپ دیکھیے تو جس جگہ بھی آپ کوئی وعظ سنیں گے، کوئی میلاد کی مجلس ہوگی، شق القمر کے معجزے کو بڑی تفصیل سے بیان کیا جائے گا، جھوم جھوم کر بیان کیا جائے گا یعنی حضورﷺ کی جو عظمت ہے، اس کی دلیل میں

ایک چیز یہ پیش کی جائے گی کہ یہ معجزہ دکھایا۔ بہرحال اس سے زیادہ تنقید کی ضرورت نہیں۔ نظر آتا ہے کہ یہ وضعی روایات ہیں۔ جس زمانے میں یہ روایات وضع کیں، عام طور پہ اگر آپ ان روایات کے مجموعوں کو خود پڑھیں تو نظر آتا ہے کہ ان لوگوں کی ذہنی سطح بھی بڑی پست سی تھی۔ ان کے ذہن میں چاند کے متعلق کچھ ایسا تھا کہ یہ کوئی اتنا بڑا گول سا طباق ہے جو دو ٹکڑے ہو سکتا ہے اور آدھا ٹکڑا اِدھر آ سکتا ہے آدھا اُدھر آ سکتا ہے۔ ان کے ذہن میں چاند کے متعلق اس قسم کا ہی تصور ہوگا جب ہی یہ روایت بنی ورنہ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ چاند ہے کیا، تو وہ چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا، آدھا اس طرف، آدھا اس طرف، آدھا بغل کے اس طرف نیچے سے، آدھا اس طرح سے نہ کہا جاتا۔ نظر آتا ہے کہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ چاند ہے کیا چیز؟ یہ ایک اتنا بڑا عظیم کرہ ہے وہ چونکہ گول سا ایک تھال نظر آتا تھا۔ جنوں کیندے نیں پنجابی اچ (جسے پنجابی زبان میں یہ تھال کہتے ہیں) تو یہ تصور تھا اس لیے ذہن میں یہ آیا کہ اس کے دو ٹکڑے ہو سکتے ہیں اور پھر آگے یہ بات بھی دیکھی گئی کہ چاند کوئی مقامی چیز تو نہیں تھا کہ وہیں عرب کے لوگ یا مکے والے ہی اس کو دیکھ سکتے۔ وہ تو آسمان پر کم از کم آدھی دنیا پر نکلا ہوا ہوتا ہے۔ جہاں تک وہ چاند نظر آتا ہے اگر کسی وقت ایسا ہو کہ چاند آسمان سے دو ٹکڑے ہو کر نیچے گرے، پھر اس کے بعد اوپر جا کر پھر دو ٹکڑے ملیں، تو وہ تو کم از کم آدھی دنیا اس کو دیکھتی ہے۔ کسی اور نے یہ دیکھا نہیں، جنہوں نے دیکھا، جس مقصد کے لیے ان کو دکھایا، وہ مقصد پورا ہوا نہیں، یہ ایمان نہیں لائے، تو یہ ہے کیا؟

لفظ الساعۃ کا لغوی مفہوم: ایسا عظیم انقلاب جو زیرِ زمیں، گھڑی کے سیکنڈ کی طرح، تغیر پذیر ہو رہا ہے

الساعۃ کے معنی تو وہی ہیں جو میں نے عرض کیا تھا کہ جہاں بھی یہ آتا ہے وہ اس کے معنی صرف قیامت لیتے ہیں یعنی یہاں کا جو انقلاب ہے، وہ ان کے ذہن میں ہی نہیں آ رہا۔ ''کوئی عظیم واقعہ، جو اچانک نمودار ہو جائے'' یہ لفظ اس کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ ساعت تو آپ کو پتہ ہے گھڑی کو کہتے ہیں۔ واقعات کی رفتار آگے بڑھتی رہتی ہے۔ یہ عرب عجیب قوم تھی۔ یہ پتہ نہیں کہاں سے یہ باتیں لے آتی تھی۔ جو واقعات ہیں، وہ گھڑی کے سیکنڈ کی طرح تغیر پذیر ہوتے ہیں۔ سیکنڈ آگے کی طرف چلتا رہتا ہے جو حوادث یا واقعات ہیں، وہ اس طرح سے آگے آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ قرآن کریم میں حضرتِ موسیٰؑ سے فرمایا تھا، میں نے غالباً پچھلے درس میں بھی یہ عرض کیا تھا کہ ان سے کہا تھا کہ وہ انقلاب، جو اس وقت تک پسِ پردہ بتدریج آگے آ رہا تھا، اب ہمارا پروگرام یہ ہے کہ وہ نمودار ہو کر سامنے آ جائے۔ تم فرعون کی طرف جاؤ۔ وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے۔ وہاں الساعۃ کا لفظ ہے اور کہا ہے کہ یہ اس لیے ہم انقلاب چاہتے ہیں کہ ہر محنت کرنے والے کو اس کی محنت کا پورا پورا صلہ ملے۔ یہاں یہ لفظ الساعۃ ہے اور کہا ہے کہ اس وقت تک یہ جو الساعۃ تھی، یہ پنہاں تھی، مضمر تھی، پوشیدہ تھی، نیچے نیچے تھی، انڈر گراؤنڈ چلی آ رہی تھی، جسے آپ کہتے ہیں۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ یہ پختہ ہو گئی ہے، اب اس کو نمودار ہو جانا چاہیے

اور وہ نمودار ہوئی‘ وہ انقلاب آیا‘ تو الساعۃ تو انقلابِ عظیم کا نام ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ جو نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبّہ اور وہاں کی زندگی ہے‘ اسے بڑی تدریج سے بیان کیا گیا ہے۔ مکے کی زندگی کے بعد یہاں وہ جو الساعۃ تھی‘ وہ جسے آج کل زیرِ زمین کہتے ہیں‘ وہ اندر ہی اندر‘ دلوں کے اندر‘ دماغوں کے اندر‘ ذہنوں کے اندر تھی۔ اب یہ ایک انقلاب پیدا کیا جا رہا تھا۔ تیرہ سالہ زندگی خاموشی میں نہیں بسر ہوگئی تھی بلکہ اس تربیت میں بسر ہوئی تھی کہ اس انقلاب کے متعلق ذہنوں‘ قلوب کو تیار کیا جائے اور جب یہ چیز یہاں تک پہنچ گئی تو اس کے بعد مدینہ کی فضا اس کے لیے زیادہ سازگار تھی‘ وہاں ہجرت کی اور یہ انقلاب وہاں نمودار ہوا۔ یہ دوسرا ہی سال بدر کا میدان تھا۔

قرآن حکیم نے مکے سے مدینہ منورہ کی طرف آپ کی ہجرت کو الساعۃ کے الفاظ سے پکارا اور اس کا نتیجہ بھی بیان کیا

اب آیئے انقلاب کی طرف۔ پچھلی سورۃ کی جو آخری آیات ہیں ان میں کہا ہے کہ هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى (53:56) یہ تنبیہ ہے۔ اے رسول! ان کو کہہ دو کہ اگر یہ اپنی اس غلط روش سے باز نہ آئے اور انہوں نے اس حق کے راستے میں اسی طرح سے رکاوٹیں ڈالیں‘ تو پھر ہمارا قانونِ مکافاتِ عمل آئے گا‘ وہ الساعۃ آئے گی‘ یہ تنبیہ کر دو‘ یہ وارننگ دیدو‘ ممکن ہے اب بھی یہ باز آجائیں‘ اس سے باز نہ آئے تو پھر ان سے کہہ دو کہ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ (53:57)۔ یہ پچھلی سورۃ کی 57ویں آیت ہے کہ ”وہ پھر آنے والا انقلاب آجائے گا“ اور لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ (53:58) کوئی اسے روک نہیں سکے گا صاحب! اس تسلسل میں ذرا آؤ۔ آگے ہے اور پھر کس انداز سے ہے‘ کہا ہے کہ اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ (53:59) تم یہ کہتے ہو‘ تمہیں حیرت ہوتی ہے کہ صاحب! ہم اتنی بڑی قوتوں کے مالک اور یہ کیا کہہ رہے ہیں‘ مٹھی بھر جماعت‘ بے سروسامان ہے اور یہ ہوگا۔ آپ کو یاد ہے کہ جب پچھلی دفعہ یہ آیتیں آئی تھیں تو میں نے قرآنِ حکیم کی یہ آیت پڑھی تھی کہ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ (53:60) یہ اس پہ ہنستے ہیں جو تُو کہتا ہے کہ تم تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ ہنستے ہیں۔ ان سے کہو کہ روتے کیوں نہیں ہو۔ کیا بات ہے! وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ (53:61) تم غافل اور بے خبر ہو کہ تمہاری یہ جو غلط روش ہے یہ تمہیں کس تباہی تک پہنچا رہی ہے۔ یہ وہی پچھلی سورۃ کی آخری آیات ہیں۔ کہا ہے کہ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ (53:57) وہ عنقریب آپہنچی ہے۔ جو اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ (54:1) آنے والی گھڑی ہے‘ یہ آگئی۔

القمر دورِ جہالت میں عربوں کے جھنڈے کا نشان تھا‘ اس کا سرنگوں ہونا شکست کے مترادف ہوتا تھا اور یہ ہوا

یہاں سورۃ القمر کی پہلی آیت میں ہے کہ انقلاب کی گھڑی پہنچ گئی‘ تمہارے سر کے اوپر آگئی‘ جس کے متعلق ہم کہتے تھے کہ اس کا

نتیجہ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (54:1) ہوگا۔ قمر عہدِ جہالت میں عربوں کے جھنڈے کا نشان تھا اور جو مملکتوں کا جھنڈا ہے' وہ شروع سے ہی بڑی اہمیت رکھتا تھا اور رکھتا ہے وہ آج بھی عجیب نشان ہوتا ہے۔ جھنڈے کا سرنگوں ہو جانا' جھنڈے کا جھک جانا شکست کے مرادف ہوتا ہے۔ یہ شکست کی محسوس نشانی ہوتی ہے۔ یہ انشق ہے' اس کے معنی صرف پھٹ جانا ہی نہیں ہوتا' ریزہ ریزہ ہو جانا بھی ہوتا ہے' اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا بھی اس کے معنی ہوتا ہے۔ یعنی کسی کے جھنڈے کے متعلق کہنا کہ وہ انقلاب کی گھڑی آ گئی اور دیکھو! یہ جو تمہارا اتنا وہ جھنڈا ہے' جس پر تمہیں اتنا ناز ہے' وہ کس طرح اب تمہارے سامنے ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ بدر کے میدان میں' تھوڑے ہی عرصے کے بعد' وہ جھنڈا پھر سرنگوں ہی نہیں ہوا' واقعی وہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اس کے بعد سات سال میں جتنی جنگیں ہوئی ہیں' ان تمام میں اس جھنڈے کی کوئی دھجی باقی نہیں رہی تھی تا آنکہ فتح مکہ کے دن یہ جو جھنڈا تھا وہ بالکل ہی ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ یہی جھنڈا ہے' جس کے متعلق یہاں تو یہ کہا ہے کہ وہ پھٹ گیا' جھنڈا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا' ریزہ ریزہ ہو گیا' وہ انقلاب کی گھڑی آ گئی' دوسرے مقام پہ یہ وَخَسَفَ الْقَمَرُ (75:8)۔ اس کے معنی گہن لگنا ہے جسے آپ ''گرہن'' کہتے ہیں۔ کسی چیز کا گہن میں آ جانا۔ یہ زوال کے لیے ہوتا ہے اس چاند یا سورج کی جو روشنی ہوتی ہے وہ گہنا جاتی ہے۔ یہ کسی چیز کا زوال پذیر ہو جانا' ہمارے ہاں محاورہ ہے۔ یہاں بھی یہ چیز کہی ہے کہ ان کا جو علم ہے' عربوں کی قوت کا جو نشان ہے' وہ زوال پذیر ہو رہا ہے۔

عربوں کی اور ایران کی باہمی مخاصمت اور پھر ان کے اکٹھے ہونے کا ذکر

عرب جاہلیت کے جھنڈے کا نشان قمر تھا اور ایران کا نشان شمس تھا' سورج تھا۔ اب بھی آپ ان کے جھنڈے میں دیکھیں گے کہ وہ نشانیاں ہوتی ہیں۔ اس ایران کا نشان شمس تھا۔ ایران کی سلطنت بہت بڑی تھی۔ عربوں کے ساتھ ان کی مخاصمت شروع سے جاری تھی۔ ایک دوسرے کے ساتھ سخت دشمنی تھی اور وہ ان عربوں کو نفرت کی نگاہ سے بھی دیکھتے تھے۔ سوال ہی نہیں تھا کہ یہ دو سلطنتیں کسی طرح سے مل جائیں' ان عربوں کی تو سلطنت ہی کوئی نہیں تھی' وہ تو قبائلی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہی جو کہا کہ وَخَسَفَ الْقَمَرُ (75:8) یہ جو جھنڈا ہے' اس کی تابناکیاں گہنا جائیں گی' اس کے اوپر زوال آ جائے گا۔ یہ صورت ہو جائے گی اور آگے کہا ہے کہ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (75:9) اور شمس اور قمر دونوں اکٹھے ہو کر ایک مملکت بن جائیں گے۔ یہ مدنی زندگی کی ابتدا میں بھی یہ کچھ کہا جا رہا تھا۔ کہا ہے کہ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (54:1) وہ انقلاب کی گھڑی آ پہنچی۔ ان کا یہ جھنڈا جو لہرا رہا ہے' اب جس کے اوپر ان کو اتنا ناز ہے' وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا' پھٹ جائے گا۔

شق القمر میں ایک متضاد کیفیت کا بیان کچھ جنگ احزاب' جنگ بدر اور ہزیمت وشکست کا ذکر اور قرآنِ حکیم کی شہادت

عجیب بات ہے کہ روایات میں جہاں یہ کہا گیا کہ یہ وہ معجزہ تھا جو حضورؐ نے وہاں دکھایا اور پھر یہ مکے کی زندگی کا معجزہ بتا رہے ہیں کیونکہ جو کہا جا رہا ہے کہ وہ آدھا ٹکڑا حرا کے ایک طرف پہاڑ کے اور دوسرا دوسری طرف کے پہاڑ سے' تو وہ تو مکے میں وہ پہاڑ حرا ہے' جسے جبل رحمت کہتے ہیں اور وہی اس کے ساتھ یہ چیزیں ہیں۔ یہ ہمارے ہاں کی عجیب چیز ہے' اپنے ہاں' اپنے ہی مجموعوں کے اندر' نہ تو وہ جو جامع احادیث ہیں' انہوں نے یہ کچھ کبھی دیکھا' نہ بعد والوں نے بھی کبھی کوئی غور کیا کہ ہم ایک ہی جگہ دو متضاد باتیں کہہ رہے ہیں۔ وہاں یہ لکھا ہوا ہے کہ یہ مکے کی زندگی کا حضورﷺ کا یہ معجزے کا واقعہ تھا' اسی سورۃ میں آگے چل کر یہ 44,45,46 کی آیات ہیں' جن میں کہا ہے کہ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ نَحۡنُ جَمِیۡعٌ مُّنۡتَصِرٌ (54:44)۔ ان کو اس کے اوپر بڑا ناز ہے جو یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے لشکر بڑے جری ہیں اور ہماری جمعیت بہت بڑی ہے۔ منتصر' ہم ایک دوسرے کی مدد کر کے متحدہ محاذ بنا کر تمہارے مقابلے میں آئیں گے اور آپ کو پتہ ہے کہ جنگِ احزاب کے اندر یہ کیا ہوا تھا؟ یہ جتنے مخالفین قبیلے تھے' وہ سارے مسلمانوں کے مقابلے میں جمع ہو گئے تھے۔ بدر کے میدان میں بھی ان کفار کی' قریش کی حمایت کرنے والے' بہت سے قبیلے تھے۔ کہا ہے کہ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ نَحۡنُ جَمِیۡعٌ مُّنۡتَصِرٌ (54:44)۔ ہم بہت بڑا جتھہ ہیں' بہت بڑی جماعت ہیں' ہمارے بہت بڑے احزاب اکٹھے ہونے والے ہیں' ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہیں' تم کیا مقابلہ کرو گے۔ قرآنِ کریم نے ان کا یہ قول نقل کرنے کے بعد وہیں کہا کہ سَیُهۡزَمُ الۡجَمۡعُ وَیُوَلُّوۡنَ الدُّبُرَ (54:45) تم دیکھو گے کہ یہ جو اتنی بڑی جمعیت اور لشکرِ جرار بتا رہے ہیں' کس طرح سے ان کو ہزیمت اور شکست ہوتی ہے اور کس طرح یہ پیٹھ دکھا کر بھاگتے ہیں۔ تم یہ کچھ دیکھو گے۔

آگے کہا کہ سَیُهۡزَمُ الۡجَمۡعُ وَیُوَلُّوۡنَ الدُّبُرَ (54:45)۔ یہ ساعت' یہ انقلاب' وہ ہے جس کے متعلق ان کو بار بار بتایا جاتا ہے' ان کو کہا جاتا ہے کہ یہ انقلاب' یہ ساعت آ کر رہے گی' یہ بڑی تلخ ہوگی' بڑی تباہ کن ہوگی۔ اسی سورۃ میں یہ آیتیں موجود ہیں کہ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ نَحۡنُ جَمِیۡعٌ مُّنۡتَصِرٌ (54:44)۔ مگر یہ کہتے ہیں کہ سَیُهۡزَمُ الۡجَمۡعُ وَیُوَلُّوۡنَ الدُّبُرَ (54:45)۔ تم دیکھو گے کہ کس طرح یہ شکست کھاتے ہیں اور کیسے پیٹھ موڑ کر بھاگتے ہیں۔ روایت میں ہے کہ حضورؐ بدر کے میدان میں اپنے خیمے میں بیٹھے ہوئے' یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے۔ یہ تو الساعة اس کے اندر ہے: بَلِ السَّاعَةُ مَوۡعِدُهُمۡ (54:46)۔ وہی ساعت' جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا' انہیں کہا جاتا تھا کہ آ جائے گی' ان روایتوں میں یہ چیز ہے کہ وہ ساعت تو بدر کے میدان میں آئی ہے اور یہ ہے کہ حضورؐ اپنے

خیمے میں بیٹھے ہوئے یہ آیتیں تلاوت فرما رہے تھے۔

عربوں کے ہاں قمر کے معنی غلبہ کے بھی ہیں اور کہا یہ گیا تھا کہ تمہیں ہزیمت اٹھانی پڑے گی

یہاں سب سے پہلی بار‘ ان کا جو قمر کا جھنڈا تھا‘ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوا بلکہ ان عربوں کے ہاں عجیب بات ہے‘ قمر کے معنی غلبہ کے بھی ہوتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ چاند نکلتا ہے تو سارے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں‘ یہ غالب آ جاتا ہے۔ اس طرح سے یہ اس معنی میں بھی لیا کرتے تھے۔ تو غلبہ ہو یا ان کے‘ جاہلیت عرب کے‘ جھنڈے کا نشان ہو‘ بہر حال یہ ان کی قوت تھی۔ اس قوت کے متعلق ہے کہ اب وہ انقلاب آنے والا ہے اور تم دیکھو گے کہ تمہاری قوت کس طرح زوال پذیر ہوتی ہے‘ تمہارا یہ علم کس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے‘ تمہاری کوئی قوت باقی نہیں رہے گی‘ تم کہتے ہو کہ ہم بہت بڑی جمیعت ہیں ہم ایک دوسرے کے مددگار ہیں‘ اکٹھے ہو کر تمہارے مقابلے میں آئیں گے۔ یہاں کہا گیا کہ آ ؤ! تم جتنا جی چاہے قبائل اکٹھے ہو کر مقابلے میں آ ؤ‘ تمہیں یہ ہزیمت اٹھانی پڑے گی‘ شکست اٹھانی پڑے گی‘ میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگو گے۔ یہ کہا جا رہا ہے۔

خدائے رحیم وکریم کے حضور میدان بدر میں نبی اکرم ﷺ کی وہ التجا اور اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ کی علامات

حضورؐ کے متعلق وہ روایت جیسے ہے وہ صحیح نظر آتی ہے کہ حضور ﷺ وہاں یہ تلاوت فرماتے تھے بلکہ وہاں تو جو روایت ہے وہ تو بڑی ہی جذباتی ہے کہ میدان میں کھڑے ہونے کے لیے صفیں سیدھی ہوئیں‘ کیا سیدھی ہوئیں!! یہ تو تین سو کے قریب‘ بے ساز وسامان مہاجر تھے اور اُدھر قریش کا ایک ہزار کا لشکرِ جرار مقابلے میں تھا لیکن بہر حال یہ صف آرائی ہوئی ہے تو روایتوں میں یہ ہے کہ حضور ﷺ ان سے پیچھے دعا مانگ رہے تھے اور محویت کا یہ عالم تھا کہ ردا کندھے سے نیچے گر رہی تھی اور آپ ﷺ یہ کہہ رہے تھے: رب العالمین! یہ پوری کی پوری جماعت‘ جو اس وقت تیرا نام لے رہی ہے‘ میں انہیں لے کر اس میدان میں آ گیا ہوں کہ تیرا نام اونچا رہے۔ میں اپنے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا‘ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر یہ جماعت آج یہاں ختم ہوگئی‘ تو قیامت تک تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا۔ یہ بڑی عجیب دعا ہے۔ یہ اپنی اور اپنی جماعت کے لیے نہیں‘ آخری رسول ﷺ اور اس کی آخری جماعت کے لیے نہیں۔ اس کے بعد تو ٹھیک کہا تھا کہ تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ وہاں یہ ہے کہ اس خیمے میں حضور ﷺ یہ آیتیں تلاوت فرما رہے تھے کہ آنے دو ان کو‘ یہ اتنے بڑے ایک جتھے کے ساتھ آئے ہیں‘ وہ ایک دوسرے کی نصرت کے ساتھ‘ ایک دوسرے کی مدد کرنے کے ساتھ‘ جتھہ بنا کر آئے ہیں‘ آنے دیجیے‘ ابھی دیکھو گے کہ کس طرح ان کو شکست ہوتی ہے‘ کس طرح پیٹھ دکھا کر بھاگتے ہیں۔ کہا ہے کہ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (54:1) ابھی تک ہم ان کو یہ چیز کہے جا رہے ہیں کہ یہ ہوگا اور تم باز آ ؤ۔ قرآن کریم بڑا مہلت کا وقفہ دیتا ہے

اور یہ ہونا بھی چاہیے کہ ممکن ہے وہ تباہی سے بچ جائیں۔ وہ بچانے ہی کی فکر کرتا ہے' مارنے کی فکر نہیں کرتا' آخری وقت تک بچاتا چلا جاتا ہے۔ کہا کہ یہ تو ان کی کیفیت ہے کہ وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَۃً یُّعْرِضُوْا وَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (54:2) ان کو یہ نشانیاں نظر آتی ہیں' وہ جو الساعۃ آتی ہے تو وہ یہی نہیں کہ اس سے پہلے کچھ نہیں ہوتا' دیکھنے والی آنکھیں ہوں' سمجھنے والا دل ہو' تعصب نہ ہو' مخالفت اور نفرت کے پردے نہ آنکھوں میں پڑے ہوئے ہوں' تو انسان دیکھ سکتا ہے کہ واقعی یہ ایک تباہی ہے جو آ رہی ہے۔ کہا کہ اس قسم کی علامات بھی ان کو نظر آ جائیں۔

لفظ سحر کے معنی جادو نہیں ہوتے بلکہ فریب ہوتے ہیں اور ایک روپے کے دو روپے نہیں بنتے

اب یہاں پھر کہا کہ وَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ [1] (54:2)۔ انہوں نے سحر کے معنی صرف جادو کیا اور کہا کہ یہ وہ جادو ہے جو چلا آ رہا ہے۔ جادو نہیں ہے۔ سحر کے معنی ''جھوٹ ہوتا ہے' فریب ہوتا ہے'' اور جادو بھی تو ایک فریب ہی ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ وہ چیز نہیں ہوتی' وہ دوسرے کو دکھایا ایسا جاتا ہے' اس کی نگاہوں میں' جیسا نظر آتا ہے' وہ ویسا ہوتا نہیں ہے۔ اب تو ہمارے ہاں ایسے مداری ہیں نہیں۔ وہ مداری آیا کرتے تھے۔ وہ ایک روپے کو یوں کر کے دو بنا دیتے تھے وہ دو کے ساتھ چار بنا دیتے تھے۔ آخر میں وہ جھولی اٹھا کر کہتے تھے کہ دے جا بابا! خدا کے نام پر۔ وہ یہ کہا کرتے تھے کہ اگر ہم ایک روپے کو واقعی دو بنا لیں' تو پھر ہم تم سے پیسے کیوں مانگیں' گھر میں بیٹھے ہی دگنے کرتے چلے جائیں۔ یہ سب تمہاری آنکھوں کا فریب تھا۔ وہ لوگ سحر کہتے تھے۔ کہا کہ یہ جو چیز ہے' یہ وہی ہے' جو چلی آ رہی ہے کہ حق پر' جو جماعتیں ہونگی' ان کو غلبہ ہوگا' باطل کا جو نظام ہے' وہ تباہی پر آئے گا۔ اس کو قرآنِ کریم نے دوسری جگہ اِفْکٌ قَدِیْمٌ (46:11) کہا ہے۔ اِفْکٌ کے معنی ہوتا ہے ''بناوٹی بات''۔ وہ کہتے تھے کہ یہ ساری چیزیں پہلے سے اس طرح سے چلی آ رہی ہیں کہ وہ یہ کچھ پہلے سے کہا کرتے تھے۔ اب یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ قدیم سے چلا آ رہا ہے حالانکہ یہ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو انہیں نظر آ جائے' اپنے تباہی کے سامان انہیں نظر آ جائیں لیکن آنکھوں پہ تعصب کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ حق کو دیکھنے ہی نہیں دیتے۔ وہ نظر آتا ہے کہ ایک روپے کے دو روپے بن رہے ہیں۔

جذبات کی تسکین انسان کو فریب کاری میں مبتلا کر دیتی ہے اور وہ تباہی کو نظر انداز کر دیتا ہے

کہا ہے کہ وَکَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَھْوَآءَ ھُمْ (54:3)۔ اس نظام میں یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے جو ان کو فریب کاریوں کے ذریعے سے مفادات حاصل ہو رہے ہیں' ان کے جذبات کی جو تسکین ہو رہی ہے' وہ انہیں حقیقت کو دیکھنے نہیں دیتی۔ کیا بات ہے! قرآن حکیم

---

[1] یہ اس انقلاب سے متعلق ہر بات کو جھٹلاتے ہیں' اور بدستور اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1248)۔

دولفظوں کے اندر، تباہ ہونے والی قوموں کی، جو غلط بینی ہوتی ہے، بیان کرتا ہے کہ ان کے ہاں کی جو مفاد پرستیاں ہیں، جب ان کے جذبات غالب آ جاتے ہیں پھر وہ سمجھنے سوچنے کی قوتوں کو، صلاحیتوں کو، برباد کر دیتے ہیں۔

اگر یہ سمجھ سے کام لیں، جذبات غالب نہ آئے ہوئے ہوں تو اس قسم کی علامات ارد گرد فضا کے اندر گھوم رہی ہوتی ہیں، جن سے پتہ چل جائے کہ ہم واقعی تباہ ہو جائیں گے۔ اتنی سی چیز ہے کہ یہ مکے کی زندگی میں بے کس و ناکس بے سروسامان جماعت تھی۔ جو شخص بھی اس پر ایمان لایا، یہ اس پر اتنی سختیاں کرتے تھے کہ بس وہ سانس ہی باقی رہتی تھی مگر اس کی یہ کیفیت تھی کہ ان میں سے کوئی ایک شخص بھی نہیں تھا جس نے یہ کہا ہو کہ ہاں میں اس صداقت سے انکار کرتا ہوں۔ ایک شخص نے بھی نہیں کہا۔ میں کہتا ہوں سوچنے والے کے لیے تو یہی بڑی بات ہوگی کہ جس جماعت کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کہیں میدانِ جنگ میں، ہمارے مقابل میں آ گئی تو ٹھہرنا مشکل ہو جائے گا اور یہ ہوا پہلی ہی جنگ کے اندر۔

حق بات پر یقین محکم اور استقامت ہی کامیابی کی ضمانت ہے

ایک ہزار کا عظیم لشکر، آج ایک ہزار کچھ بات نظر نہیں آتی ہے، اس زمانے کی بات دیکھیے! وہ پیدل تو سفر کرنا ہوتا تھا یا اونٹوں کے اوپر سفر کرتا ہوتا تھا، قبائلی زندگی تھی۔ وہ ایک ہزار کا عظیم لشکر پہلی دفعہ اسی بے بس اور بے سروسامان جماعت کے ساتھ میدان میں آیا ہے۔ مکے میں تو پھر ان کے اپنے گھر بھی تھے، مدینے میں تو گھر بھی نہیں تھے۔ وہ، جنہیں یہ پناہ گزیں کہتے ہیں، ہو چکے ہوئے تھے۔

یہ بظاہر بے سروسامان کی جماعت کے افراد میدان میں آئے۔ وہ کون سی چیز تھی جس سے انہوں نے اتنی بڑی جمعیت کو شکست دیدی؟ قرآن حکیم کہتا ہے کہ پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں گے۔ یہ جو حق پر ان کی استقامت تھی، جو ان کا ایمان تھا، اس میں استقامت تھی۔ یہ تھی جو ان کو میدانِ جنگ میں ملنے نہیں دیتی تھی۔ کہا کہ وَ كَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَ هُمْ (54:3) جذبات نے ان کی آنکھوں پہ پردے ڈال رکھے ہیں۔ باقی رہا یہ کہ بار بار یہ کہتے ہیں کہ جس تباہی سے تم ہمیں ڈراتے ہو کہ آ جائے گی، تو تم پھر اس کو لاتے کیوں نہیں۔ وہ جلدی مچاتے تھے اور دوسرے مقام پہ ہے کہ یہ یوں جلدی مچا رہے ہیں جیسے عید کا چاند دیکھنا۔ ان کو پتہ نہیں کہ وہ تباہی ہے جس کے لیے کہا جا رہا ہے۔ تم کوشش کرو کہ زیادہ سے زیادہ تاخیر ہو جائے اور زیادہ دیر کے بعد آئے۔ یہ کہتے ہیں کہ جلدی سے جلدی لاؤ۔

ہر عمل اور ہر واقعہ کے نتیجہ خیز ہونے کے لیے بتدریج ارتقائی مراحل سے گزرنا لازم گردانا جاتا ہے

کہا ہے کہ وَ كُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ (54:3) ہر واقعہ اور حادثہ اپنے وقت پر نمودار ہوتا ہے۔ کیا بات ہے صاحب! کہ یہ اپنے وقت پر نمودار ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ پہلے سے وقت لکھا ہوا ہوتا ہے بلکہ اس کے لیے اسباب و علل کی جتنی کڑیاں چاہئیں، وہ مرتب

ہو رہی ہوتی ہیں' ہلکا ہلکا' آہستہ آہستہ اس کے نمودار ہونے کا وقت ہوتا ہے' جب وہ کڑیاں آپس میں پوری مل جاتی ہیں تو وہ ہے مستقر۔ اور کیا بات ہے قرآن مجید کے لفظوں کی! مستقر کے لیے کسی رواں چیز کے Movement (حرکت) کا اس کے اندر ہونا شرط ہے۔ موومنٹ کے اندر کسی چیز کے کسی مقام پر رک جانے کو استقرار کہتے ہیں۔ اب ایک حادثے کے متعلق' ایک انقلاب کے متعلق یہ کہنا کہ وہ موومنٹ کے اندر ہے' رواں دواں چلا آ رہا ہے' بتدریج بڑھ رہا ہے' وہ جس مقام پہ آ کر رک گیا' وہ ہے جسے انقلاب کی گھڑی کہا جائے گا۔ تو یہ کہتے ہیں کہ وہ کیوں نہیں آ جاتا۔ انہیں پتہ نہیں ہے کہ وہ آ رہا ہے۔ یہ اتنی سی بات ہے۔ پھر رک کر وہ سامنے کیوں نہیں آتا؟ کہا ہے کہ اس کے لیے اسباب و علل (Cause&Effect) کی ایک شرط ہوتی ہے۔ اس کے مطابق یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ وقت پر آئے گا۔ اتنی تیز آگ ہو اور دیگچی پانی کی آپ اوپر چڑھا دیجیے جو جی میں آئے' وہ کر کے دیکھیے' اس نے تو اس ٹمپریچر پہ جا کر کھولنا ہے' جس پہ اس کا کھولنا مستقر ہے۔ وہ اس کا مستقر ہے۔ اس دوران میں یہ نہیں ہے کہ کچھ نہیں ہو رہا ہوتا' وہ پانی Heat (حرارت) کو' وہ گرمی کو Absorb (جذب) کر رہا ہوتا ہے۔ اس میں ایک تبدیلی آ رہی ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ تم نے کہا تھا کہ آگ پہ پانی رکھنے سے کھولنا شروع ہو جائے گا' تو یہ کھولتا کیوں نہیں ہے۔ کہا ہے کہ كُلُّ اَمۡرٍ مُّسۡتَقِرٌّ (54:3) اعمال کے نتائج اپنے وقت پر محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں۔ قرآن حکیم ہے' عزیزانِ من! قرآن حکیم ہے مگر

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

نظریۂ ارتقا میں مہلت کا وقفہ انسانی فکر کے لیے کارآمد ہوتا ہے

عزیزانِ من! نگاہیں ہوں تو پردے کے پیچھے دیکھ لیں کہ کس طرح سے اس کے اندر ایک تبدیلی آ رہی ہے' اس پانی کے اندر حرارت Absorb (جذب) ہو رہی ہے مگر كَذَّبُوۡا (54:3) یہ اس انقلاب سے متعلق ہر بات جھٹلاتے ہیں۔ یہ جھٹلاؤ نہیں ہے کہ غلط کہہ رہا تھا کہ یہ پانی کھول جائے گا' تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اس کے اندر وہ حرارت پیدا ہو رہی ہے۔ ایک خاص وقت پہ آ کر اس نے کھولنا ہے۔ یہ كُلُّ اَمۡرٍ مُّسۡتَقِرٌّ (54:3) اس کا مستقر ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ جیسا کہ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ لکھی ہوئی چیز ہے بلکہ یہ ہے کہ قانونِ تدریج کا تقاضا یہ ہے کہ وہ Cause & Effect (اسباب و علل) کی کڑیاں ملتی ہوئی آئیں اور وہ ایک وقت پر جا کر پھر اس کے اندر نمود ہو۔ فطرت کے یہ سارے جتنے بھی یہاں نظام و کاروبار ہیں' ان میں یہی وہ مہلت کا وقفہ ہے' کسی چیز کا بتدریج ہونا یہی ساری چیز ہے۔ درخت کا بیج ہے' وہاں سے کونپل ہے۔ وہاں سے پودا ہے' وہاں سے درخت ہے' اپنے وقت پر اس درخت کے اندر

پھر پھل لگتا ہے اور وہ اتنا اتنا سا پھل ہے آپ جو جی میں آئے کر کے دیکھیے' اپنے اس وقت سے پہلے اس کا پھل پکتا نہیں ہے' موٹا نہیں ہوسکتا۔ وہ تو اس دوران میں وہ سب کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ اس نے اپنے وقت پہ جا کر وہ پھل بننا ہے اور پکنا ہے۔ فطرت کے سارے کاروبار میں یہ قانون امہال (Law of Respite) مہلت کا وقفہ ہے' یہ اس کی بنیادی چیز ہے' مرض کا علاج اسی طرح سے ہو بلکہ پہلے تو کہیے کہ مرض اسی طرح سے آتا ہے۔ یہی نہیں ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب! ''راتی چنگا بھلا ستا سی' سویرے اُٹھ کے پتہ نئیں اینوں کی ہو گیا' اے پاگل جیا ہو گیا' اے۔ (رات کو اچھا بھلا سویا تھا۔ صبح اُٹھا تو معلوم نہیں کہ اسے کیا ہو گیا' یہ پاگل جیسا ہو گیا)۔ وہ رات پاگل نہیں ہو جاتا۔ وہ ڈاکٹر بتاتا ہے کہ اسے تو بہت پہلے لانا چاہیے تھا۔

قرآنی فکر' فکرِ انسانی کے تصورات کو فلک بوس بلندیوں سے ہم کنار کر دیتی ہے

کہا ہے کہ كُلُّ اَمۡرٍ مُّسۡتَقِرٌّ o وَلَقَدۡ جَآءَهُمۡ مِّنَ الۡاَنۡۢبَآءِ مَا فِيۡهِ مُزۡدَجَرٌ (54:3-4)۔ اعمال کے نتائج' اپنے وقت پر محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں۔ اس سے پہلے ان کے پاس ان کی یہ نگاہیں ہوتیں تو دیکھتے کہ اس کی سائنس' اس کی Symptoms (علامات)' اس کی خبریں' ان کے پاس آ رہی تھیں یہ ایسی چیزیں تھیں کہ وہ ان کو اس تباہی سے روک دیتیں' ان کو تباہی نہ آتی' وہ رک جاتے۔ یہ ان کے سامنے ایسی چیزیں آ رہی تھیں لیکن یہ سوچ سمجھ سے کام لیتے تو تباہی سے بچ جاتے' (ان علامات میں ایسی باتیں ہیں جو مفاسد سے روکتی ہیں)۔

دلوں کے روگ (باہمی تعصب) حکمت بالغہ کو قبول نہیں کرتے

عزیزانِ من! دیکھیے! یہ نہیں ہے کہ معجزے دکھائے جا رہے تھے اور یہ اس کو بھی نہیں مانتے تھے۔ یہ کیا چیز تھی جو اس طرح سے آ رہی تھی اور یہ اسے دیکھ نہیں رہے تھے؟ یہ تھی حِكۡمَةٌۢ بَالِغَةٌ (54:5) Argumentation اور Rationalism' دلائل و براہین' علم اور بصیرت کی رو سے یہ چیزیں ان کے سامنے آ رہی تھیں۔ بالغۃ کا لفظ یہی نہیں ہے کہ وہ باہر کی باہر رہ جاتی ہیں۔ وہ ایسی چیزیں ہیں کہ اگر انسان تعصب کے پردوں کو گول کرے' تو وہ دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والی چیزیں تھیں لیکن کہا ہے کہ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ (2:10) ان کے دلوں میں ایک مرض ہے' مریضِ قلب حکمتِ بالغہ کو بھی قبول نہیں کرتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فَمَا تُغۡنِ النُّذُرُ (54:5) جن چیزوں سے ان کو وارن کیا جاتا تھا' اس سے انہوں نے کچھ فائدہ نہ اُٹھایا بلکہ وہ اپنی روش میں آگے ہی بڑھتے رہے۔ فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ (54:6) سمجھانے کے لیے ان کو روکا' بجائے اس کے کہ وہ اس بات پہ کان دھرتے' بات سنتے' انہوں نے اعراض برتا' گریز کی راہیں نکالیں' منہ موڑ کر چل دیئے: فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ (54:6)۔ تو پھر کیا ہوا؟ کہا ہے کہ يَوۡمَ يَدۡعُ الدَّاعِ اِلٰى شَىۡءٍ نُّكُرٍ (54:6) تا آنکہ

پھر وہ دن آ پہنچا' آ پہنچے گا کہ جس دن آواز دینے والا' اس چیز کی طرف آواز دے گا جو بڑی ہی سخت ہے' جو بڑی ہی تباہ کن ہوگی کہا ہے کہ **خُشَّعًا اَبۡصَارُهُمۡ يَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ كَاَنَّهُمۡ جَرَادٌ مُّنۡتَشِرٌ** (54:7) اس جنگ کے لیے آواز دینے والا میدانِ جنگ میں آواز دے گا' پھر ان کے جھنڈے کی دھجیاں اڑ جائیں گی' ان کی قوت زوال پذیر ہو جائے گی۔ ان کے اوپر تباہی آ جائے گی۔ یہ جھکی ہوئی نظروں سے چلے آ رہے تھے' یہ اتنے بڑے بڑے سرکش سردار' جو کسی کو اپنی نگاہ میں نہیں لاتے تھے' ان کی یہ کیفیت ہوگی۔ اب میدانِ جنگ کے بعد' قیدیوں کی حیثیت سے' جب وہ اتنے اتنے بڑے آتے ہیں تو دیکھیے ان کا جو نقشہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جھکی ہوئی نظروں سے وہ ہوں گے۔

اب یہاں پھر انہوں نے کہا کہ يَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ (54:7)۔ کہا کہ یہ قیامت کی بات ہے۔ میں نے کہا ہے کہ یہاں تو بس شروع کی' ایک چیز تھی وہ جو حرفوں والا تالہ ہوتا ہے' اس میں ایک حرف ذرا آگے کر دیا جائے' تو بس اس کے بعد پھر جو جی میں آئے کر کے دیکھیے' ہمارے ہاں تو وہ تالہ کھلتا ہی نہیں ہے۔ انہوں نے ان تمام چیزوں پہ تالے ڈال دیئے اور وہ کھل نہیں رہے۔ جہاں قانونِ مکافاتِ عمل کہا' جہاں غلطی کا نتیجہ کہا' باطل نظام کا نتیجہ کہا' یہاں ایک ہی چیز تھی کہ انہوں نے کہا کہ وہ قیامت کو ہوگا اور اس کے بعد یوں ہے کہ اب تو آرام سے گزرتی ہے عاقبت کی خدا جانے۔ انہوں نے یہ کہا کہ یہ عاقبت کے لیے ہے۔ ہر چیز قیامت پہ اُٹھا رکھی ہے' اس دنیا سے ان چیزوں کا کوئی تعلق ہی نہیں اور پھر تھپکیاں دینے والے آ گئے' افیون پلانے والے آ گئے کہ اس دنیا میں جتنے ذلیل وخوار ہوں گے' اتنا ہی خدا کے ہاں مقرب ہو گے جناب! بھوک پیاس ننگ' خانہ خرابی' یہ سب خدا کے پیارے بندوں کی نشانیاں ہیں۔ جہاں کسی نے کہا کہ صاحب! دیکھیے' تو ہم غریب آدمی نمازیں پڑھتے' روزے رکھتے ہیں' کھانے کو روٹی نہیں ملتی' پہننے کو کپڑا نہیں' ان لوگوں کو دیکھیے! فسق و فجور کے اندر مبتلا ہیں اور ان کو جن کے کتوں کو وہ کچھ ملتا ہے' ہمارے بچوں کو نہیں ملتا۔ کہا کہ زبان نہ کھولیے' صاحب! چار دن کی بات ہے' ان کو کر لینے دیجیے' اس کے بعد آخرت میں ہم جنت میں' یہ جہنم میں ہوں گے۔ او میں رات دی روٹی دا پچھنا پیا ہیگا اں' تُوں ہائیکورٹ دی تاریخ دین ڈیاں ویں (ابھے! میں رات کی روٹی کا پوچھ رہا ہوں کب ملے گی اور تم مجھے ہائیکورٹ کی تاریخ دے رہے ہو)۔

فکرِ قرآنی کی راہنمائی انسانیت کو خوف وحزن کے عذاب سے کوسوں دور لے جاتی ہے

عزیزانِ من! ارشادِ خداوندی یہ تھا کہ لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ (2:62)۔ یہاں پر خوف کے ساتھ حزن بھی کہا تھا کہ یہ بھی نہیں ہوگا مگر شرط یہ تھی کہ فَمَنۡ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ (2:38) جو ہماری اس راہنمائی پر' اس راستے پہ چلے گا' ایک تو یہ ہے کہ اسے خوف نہیں ہوگا۔ خوف تو بیرونی خطرات کو کہتے ہیں۔ یہ ایک دوسری چیزیں بھی ہے جسے حزن

کہا ہے۔اس کی تفصیل میں' اسی پرچے کے اندر میرا مضمون آیا ہے' اس کا عنوان [1] ہی ''خوف: ایک حقیقت کشا' بصیرت افروز مقالہ'' ہے۔میں نے بتایا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے یہ کتنا بڑا عذاب ہے۔یہ جسے قرآن کریم نے خوف اور حزن ساتھ کہا ہے' تو حزن کے بعد اس کے اعتبار سے میں نے معنی دیئے ہیں۔یہ پرچے میں بھی آ گیا ہے اور پمفلٹ بھی شائع ہو گیا ہے۔عربوں کے ہاں حزن کہتے ہیں کہ جس کا پتہ نہ چلے کہ ہو کیا رہا ہے۔

ہے کوئی بات آج ہونے کو

بھئی! کیسے پتہ چلا تمہیں؟ پتہ تو نہیں چلا مگر

جی بہت چاہتا ہے رونے کو

تحت الشعور میں ایک افسردگی ہوتی ہے' جس کا ایک احساس ہوتا ہے اس کے شعور کو بھی علم نہیں ہوتا کہ کیا ہو رہا ہے' مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے۔آ ہاہاہا! کیا بات کہہ گیا ہے جگر:

وہ خود تسکینِ خاطر کر رہے ہیں
مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے

لفظ حزن کی ایک دل خراش مثال اور پھر جنت ارضی کا ذکر

یہ جو اس کے باوجود دل بیٹھا جا رہا ہوتا ہے' اسے حزن کہتے ہیں اور عرب اس کی جو مثال دیتے تھے وہ یہ ہے کہ ایک کام کرنے والا محنت کش مزدور صبح جاتا ہے کہ کہیں پہ محنت کے لیے ملے تو بچوں کے لیے روٹی لے آئے' گھر میں کھانے کو نہیں ہوتا' کام اس کو ملتا نہیں ہے' کہتے تھے کہ شام کو یہ مزدور جس انداز سے گھر کی طرف آتا ہے جو کچھ اس پہ بیت رہی ہوتی ہے' اسے حزن کہتے ہیں۔کہا ہے کہ **لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ** (2:62) اللہ اکبر! کیا کتاب ہے! یہ جماعت خوف سے ہی محفوظ نہیں رہے گی' جو ہمارے راستے پہ چلے گی' اسے حزن بھی نہیں ہو گا' دل گرفتگی نہیں ہو گی' افسردگی نہیں ہو گی' پژمردگی نہیں ہو گی۔یہ جو غیر محسوس خوف ہے کہ دل بیٹھا جا رہا ہے' یہ قطعاً نہیں ہو گا اور جہاں آگے جا کر جس کو جنت کی زندگی کہا گیا ہے' ان ''مفسرین'' کے نزدیک تو وہاں کی زندگی بس آخرت میں ہو گی' یہاں تو ہے ہی نہیں' کچھ وہاں ہے۔کہا ہے کہ یہ ہے سب سے بڑی چیز جو وہ اہلِ جنت خدا کا شکر یہ ادا کریں گے' وہ کہیں گے کہ وہ ہے جس نے ہمارا حزن دور کر دیا ہے۔

---

[1] اس کے لیے دیکھیے: طلوع اسلام دسمبر 1982' ص ص۔47-17۔

ہم نے یہاں کے معاشرتی جہنم کو جہانِ فردا کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے

خوف تو باہر کی طاقتوں سے بھی دور ہوجاتا ہے اور حزن ایک چیز ہے' وہ صحیح نظام کے اندر ہی دور ہوسکتا ہے' تا کہ کسی کو کسی طرف سے کوئی غائب کن خطرہ' کوئی گلہ' کوئی شکوہ نہ رہے۔ یہ وہ ہے جسے قرآن حکیم کہتا ہے کہ اس معاشرے کے اندر ان کے دلوں سے غِل دور کر دیا جائے گا۔ غِل کے معنی ہوتا ہے ایسی چیز جسے دوسرے سے چھپانے کی کوشش کی جائے۔ کہا کہ یہ معاشرہ ایسا ہوگا جس میں کوئی کسی دوسرے سے کچھ چھپائے گا ہی نہیں۔ حزن تو اس سے پیدا ہوتا ہے کہ پتہ نہیں' یار! ملا تو تھا بڑا ہنس کر' پتہ نہیں اس کے دل میں میرے لیے کیا چور نظر آتا ہے۔ اس کی ہنسی بھی افسردگی میں جاتی ہے کہ مجھے کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ اس کی ہنسی بھی منافقت کی تھی۔ کہا ہے کہ اس میں حزن نہیں ہوگا۔ میں نے کہا ہے کہ ان کی ہر بات قیامت سے وابستہ ہے۔ اب یہ جو چیز ہے کہ **خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ** (54:7)۔ (اس بلاوے پر یہ اپنے اپنے ٹھکانوں سے) جھکی ہوئی نگاہوں سے آئیں گے۔ اب قیدیوں کی بات ہو رہی ہے۔ اب انہوں نے کہا کہ وہ اس طرح سے قبروں سے نکلیں گے کہ ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی۔ اجداث ٹھکانے کو کہتے ہیں' جہاں جہاں بھی کوئی ہو' وہاں سے یہ نکلیں گے۔ مگر نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی۔ یہ اس طرح نکلیں گے گویا **كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ** (54:7)۔ ان کی کیفیت یہ ہوگی۔ یہ کیا بات ہے؟ یہ ٹڈی دل تو آپ نے دیکھا ہوگا۔ وہ جو قرآن حکیم نے **جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ** (54:44) کہا تھا (اُنہیں یہ زعم ہے کہ ان کے تمام قبائل' تمہاری مخالفت میں' ایک دوسرے کی مدد کے لیے اکٹھے ہوجائیں گے اور اس طرح ان کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا)۔ لیکن انجام یہ ہوا کہ ان کی یہاں کی ہر چیز منتشر ہوگئی' ان کی جمعیت اتنی بڑی تھی' انجام اس کا یہ ہے کہ سب ان کے ہاں کی ایک ایک ٹڈی الگ ہوگئی ہے۔ اندازہ لگایئے! ان قیدیوں کی نگاہیں جھکی ہوئی ہیں اور من من بھر کا قدم ہے' اس کو اُٹھائے ہوئے چلے آ رہے ہیں اور اس کے بعد بھی یہ کہا ہے کہ **مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ** (54:8) جس نے آواز دی ہے کہ جلدی چلے آؤ' جناب! یہ کہا ہے کہ پھر وہ مجرموں کی طرح' جھکی ہوئی نگاہوں سے' اس بلانے والے کی طرف تیزی سے قدم اُٹھاتے ہوئے چلے جائیں گے اور وہاں پہنچ کر یہ مخالفین کہیں گے کہ یہ دن بڑی ہی مشقت کا دن ہے' بڑی ہی سختی کا دن ہے جو آج ہمارے سامنے آیا۔

سورۃ القمر کی آیت 8 تک' عزیزانِ من! ہم آ گئے' 9 ویں آیت سے ہم اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀......❀......❀

دوسرا باب: **سورة القمر** (آیات9 تا32)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج دسمبر 1982ء کی 10 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القمر کی آیت 9 سے ہو رہا ہے: (54:9)۔

حق و باطل کی داستان ازل سے جاری ہے' اس کی نشاندہی اور اثرات

قرآن کریم میں آپ شروع سے آخر تک دیکھیں گے کہ اس کی تعلیم کا نکتہ ماسکہ نوعِ انسانی کی داستان' درحقیقت حق و باطل کی کشمکش' کی داستان ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

(اقبالؒ: بانگِ درا)

ابتدائی ادوار کے انسانوں سے لے کر آج تک یہی ایک کشمکش ہے جو ہر زمانے میں، ہر ملک میں، ہر قوم میں، جاری وساری رہی ہے۔ ابتدائی دور میں محدود پیمانے پہ تھی، جوں جوں انسانوں نے ترقی کی یا ان کی اکثریت ہوتی چلی ہوگئی، اس کی حدود وسیع ہوتی چلی گئیں، اس کی نوعیت بدلتی گئی، ذرائع اور حالات بدلتے گئے، لیکن اصل نکتہ وہی حق اور باطل کی کشمکش، اس کشمکش کی داستان رہا۔ قرآن کریم بیان کرتا ہے تو افراد کی بات نہیں کرتا، ایک فرد کا جرم، کمزوری، کوئی برائی، اس کی ذات تک محدود رہتی ہے، زیادہ سے زیادہ اس کے ماحول میں، اس کے اقرباء تک، میں اثر کرتی ہے، اس سے قوم نہیں ڈوبتی۔ قرآنِ کریم اقوام کی بات کرتا ہے کہ قوم تباہ ہوتی ہے۔ اس تباہی میں پہلی چیز یہ کہی ہے کہ قوموں کے اربابِ اقتدار میں جب کوئی جرائم آتے ہیں، تو اس سے وہ پوری قوم میں پھیل جاتے ہیں یا ان کا نظام اگر باطل پر ہوتا ہے تو اس کا اثر ساری قوم پر پڑتا ہے۔

قوموں کے عروج وزوال کے پرکھنے اور بچنے کا غیر متبدل قرآنی اصول

قرآنِ کریم نے قوموں کی تباہی کے، قوموں کی موت وحیات کے، عروج وزوال کے اصول بتائے ہیں۔ وہ اصول اور قوانین اٹل ہیں، غیر متبدل ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ابتدائی دور سے، جہاں سے قرآنِ کریم حضرتِ نوحؑ کی داستان کے سلسلے میں بات شروع کرتا ہے، اس وقت سے لے کر آج تک وہ جو قوموں کے جرائم گنا تا ہے، وہ یکساں چلے آرہے ہیں اور اب جو ہم کہتے ہیں کہ قرآن کریم قیامت تک کے لیے، ہر نوعِ انسانی کے لیے، ہر قوم کے لیے، ضابطہ حیات یا ضابطۂ قوانین ہے، اس کے معنی یہی ہیں کہ وہ جو جرائم ہیں، جن کی کشمکش کی داستان یہ بیان کرتا ہے، وہ آج بھی اسی طرح سے ہیں، وہ کشمکش آج بھی اسی طرح سے جاری ہے، اس کے بعد بھی اسی طرح سے جاری رہے گی۔ تو اس کے لیے قرآن کریم نے جو اصول بیان کیے ہیں، وہ بھی اسی طرح سے غیر متبدل ہیں۔ جب یہ داستانیں ہمارے سامنے آتی ہیں، تو اُن میں یہ نہیں دیکھنا چاہیے مثلاً یہ کہ فلاں قوم، قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود، کہاں تھیں، ان کا ملک کہاں تھا، یہ کس نسل سے تھیں۔ ٹھیک ہے تاریخی نکتہ نگاہ سے یہ چیزیں اہمیت رکھتی ہیں مگر اصل اہمیت یہ ہے کہ اس قوم کا جرم کیا تھا، جس کی وجہ سے وہ تباہ ہوگئی، اس کا نظام کس طرح سے باطل تھا جس کی وجہ سے وہ نظام ان کی تباہی کا باعث بنا۔ یہ جتنی داستانیں ہیں، اس میں یہ نکتہ ہے جو غور طلب ہوتا ہے اور وہ اس لیے غور طلب نہیں کہ اس سے ہماری معلومات میں کچھ اضافہ ہوجاتا ہے بلکہ یہ اس لیے غور طلب ہے کہ آج بھی قوموں کے وہی جرائم ہیں۔ جن قوموں میں وہ جرائم جاری وساری ہیں، جن کا نظام اس پر مبنی ہے، وہ تباہ ہوجائیں گی، جو قوم ان جرائم سے مجتنب رہ کر جو نظام قرآن کریم نے تجویز کیا ہے، اس کی طرف آجائے گی، وہ عروج اور زندگی کی شادمانیوں کی حامل قوم ہوگی۔

یہ ایک ہی اصول چلا آرہا ہے کہ جب بھی یہ داستانیں آپ کے سامنے آئیں، ان میں دیکھیے یہ کہ قرآن حمید وہ کون سا جرم بتاتا ہے،

وہ کون سا غلط نظام بتاتا ہے‘ جو اس قوم کی تباہی کا موجب بنا اور اس کے بعد جتنی اقوام کے متعلق جو قرآن حمید نے جرائم گنائے ہیں‘ آپ دیکھیں گے کہ ہمارے اس دور میں وہ سارے جرائم اکٹھے ہوگئے ہیں۔ یہاں قرآن حکیم ایک قوم کے سلسلے میں‘ کسی ایک جرم کا ذکر کرتا ہے کہ وہ جرم ان کو لے ڈوبا اور کچھ اس قسم کی یہ انسانوں کی داستان ہے کہ آگے بڑھتے ہیں تو پچھلی اقوام کے وہ جرائم بھی ساتھ لیتے ہیں اور اپنے ہاں اس میں ایک اور جرم بھی Add کر لیتے ہیں۔ اور یہ Accumulative ہے۔ وہ ایسا ہی ہے جسے Snow ball کہتے ہیں‘ وہ برف کا گولہ ہے جوں جوں چلتا چلا جاتا ہے اپنے حجم میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ جرائم بڑھتے چلے گئے اور آج کے دور میں تو ہم دیکھیں گے کہ قرآن حکیم نے اقوامِ سابقہ کے جتنے جرائم گنائے ہیں وہ ایک ہی دور کے اندر‘ ایک ہی نظام کے اندر‘ سارے کے سارے اب آ چکے ہوئے ہیں۔ تو قرآن حکیم اس اعتبار سے مکمل ضابطہ حیات بھی ہوا‘ غیر متبدل بھی ہوا‘ قیامت تک کے لیے جاری رہنے والا بھی ہوا‘ آج کے دور کی اقوام کی جو تباہیاں ہیں‘ ان کے جو جرائم‘ جو وجوہات ہیں‘ وہ سب قرآن حکیم کے اندر موجود ہیں اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان سے بچ کیسے سکتے ہو۔

حضور ﷺ کی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت‘ نظام کے قیام کے روشن امکانات اور اثرات

سورۃ القمر کی بات چلی آ رہی تھی کہ وہی کشمکش تھی جو یہاں تک آگے بڑھ گئی کہ یہ مختصر سی جماعت‘ جو حق کی آواز لے کر اُٹھی تھی‘ یہ حضور ﷺ کی مکے کی تیرہ سالہ زندگی‘ وہاں سے آپ ﷺ ہجرت کر کے دوسرے مقام پہ چلے گئے کہ وہاں جا کر اس نظام کو قائم کریں گے کیونکہ وہاں کی فضا زیادہ مساعد تھی۔ نظر بظاہر ان قریش کو‘ ان مکے والوں کو‘ اس میں کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ وہ یہاں وطن چھوڑ گئے‘ اپنا گھر بار چھوڑ گئے‘ تعلقات‘ عزیز و اقارب‘ کو چھوڑ کر یہاں سے چلے گئے اور اس زمانے میں اتنی دور چلے جانے کے تو معنی یہ تھے کہ ان سے Cut-off ہو گئے‘ جسے ہم کہتے ہیں کہ ان کا سلسلہ ہی منقطع ہو گیا لیکن وہ آرام سے نہیں بیٹھے‘ انہوں نے وہاں سے اُٹھ کر مدینے پر چڑھائی کی۔ عام مورخ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ان کو اب کیا تکلیف تھی جو اس طرح سے اپنا اتنا عظیم لاؤلشکر لے کر‘ اس زمانے کی مسافتوں کو طے کر کے‘ سفر میں بڑی صعوبتیں اور مسافتیں ہوتی تھیں‘ یہ چڑھائی کرنے آ گئے۔ اگر یہاں وہ نظام قائم ہو جاتا تو ان کا کیا بگڑتا تھا۔

یہی تو ساری بات ہے کہ یہ نظام کسی ایک خطہ زمین میں بھی قائم ہو جائے‘ تو اس کے انسانیت ساز‘ اتنے دلکش اور جاذب نتائج‘ دوسروں کے لیے اس قدر مفید ہوتے ہیں کہ دوسرے مقام میں رہنے والے مظلوم مقہور ضعیف و ناتواں‘ جن کو وہاں کچلا جا رہا ہو‘ وہ اس نظام کو دیکھ کر یا تو وہاں سے چھوڑ کر ہجرت کر کے‘ وہاں آ جائیں گے یا ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ یہ تو ساری دنیا میں جب یہ باطل کے نظام پھیل جاتے ہیں تو وہاں یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں ورنہ آج بھی دنیا کے کسی خطے کے اندر اگر

یہ صورت ہو کہ قرآن حکیم کا جو نظام ہے' وہ قائم ہو گیا ہو تو آپ دیکھیے گا کہ دنیا کا ستایا ہوا انسان کس طرح سے' اس خطے کی طرف کشاں کشاں چلا جاتا ہے۔قرآن کریم نے کہا ہے کہ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (3:97) جو اس میں آ کر داخل ہو گیا' اس کو امن مل جائے گا۔امن کی تلاش میں تو انسان آج مارا مارا پھر رہا ہے۔اگر اس کو کہیں سے یہ ضمانت مل جائے کہ یہاں آ جاؤ تو امن مل جائے گا' تو کون نہیں جو وہاں نہیں جائے گا۔بات دوسری طرف چلی جائے گی' یہ پاکستان کا خطہ زمین لیا ہی اس لیے تھا کہ یہاں اس نمونے کا نظام قائم ہو جائے۔ ایک دفعہ ہو جائے پھر دیکھو کہ دنیا کس طرح سے يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا (110:2) فوج در فوج اس کی طرف آئے گی۔یہ ہے' عزیزانِ من! جو قصے آئیں گے۔

قرآن حکیم کے پیش کردہ نظام حیات کے پیشِ نظر سورۃ القمر کا ابتدائیہ

سورۃ القمر کی بات یہاں سے شروع ہوئی کہ ان کی مخالفت کی انتہا ہو گئی اور دوسری طرف ان کے جو قومی جرائم تھے' ان کی بھی انتہا ہو گئی۔اب کشتی ڈوبنے والی تھی' انہوں نے اس میں اتنا بوجھ لاد دیا تھا کہ قانونِ فطرت کے مطابق وہ کشتی اب ڈوبنے والی تھی' اس لیے بات یہاں سے شروع کی کہ اب وہ انقلاب کی گھڑی آ گئی ہے۔وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (54:1) ان کا عَلَم' ان کا جھنڈا' ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا' پھٹ جائے گا' ریزہ ریزہ ہو جائے گا' اس کی دھجیاں بکھر جائیں گی۔اب یہ قریش تھے اور اس کے مقابلے میں یہ تھے: ذرہ ناچیز و تعمیرے بیابانے نگر۔اندازہ لگائیے کہ یہ للکار کس قوم کو رہے ہیں۔صاحب! لیکن یہ تو حق تھا' اپنی آواز بلند کر رہا تھا' کہ جاؤ ان کے جھنڈے کی دھجیوں کو اڑا دو اور جو شان و شوکت' لیے پھرتے تھے' وہ مٹی میں ملا دو۔

عزیزانِ من! آخر کار اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔آپ کو معلوم ہے گزشتہ آٹھ آیتیں اسی میں آئی تھیں کہ اب وہ وقت آ رہا ہے کہ ان کا جھنڈا سرنگوں ہو گا' یہ شکست کھائیں گے' یہ بڑے بڑے سردار قیدیوں کی حیثیت سے سرنگوں سامنے آئیں گے۔یہ بہت بڑی چیز تھی۔وہ قریش باور ہی نہیں کر سکتے تھے کہ ایسا بھی ہو جائے گا۔

سوال پیدا ہوا کہ کس طرح سے یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ ہو کر رہے گا اور قرآن حکیم نبی اکرم ﷺ کے زمانے کی اس کشمکش کی اور اس وقت کی' بات کر رہا ہے' کہ اب ان کے جھنڈے کے سرنگوں ہونے کا وقت آ رہا ہے' ان کے زوال کا وقت آ رہا ہے۔یہاں تک باتیں ہوتی چلی آ رہی ہیں۔یہاں تک پہنچنے کے بعد کہا کہ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ (54:9) یہ کوئی نئی بات نہیں ہے' یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے جو اب ہو رہا ہے' یہی کچھ' ان سے پہلے' اقوام گزشتہ نے کیا تھا۔(مثلاً) قومِ نوح علیہ السلام نے کیا اور اب کہا جا رہا ہے کہ ان کی تباہی کا وقت آ گیا ہے تو یہ چیز ایک اصول ہے جس کو ہم دہرا رہے ہیں' یہ کوئی نئی ہنگامی بات نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک عرب کے گردونواح اُجڑی بستیوں کی داستانوں میں داستانِ قومِ نوحؑ

عزیزانِ من! قرآن حکیم پہلے دن سے کشمکش کی بات شروع کرتا ہے۔ وہ ابتداء حضرتِ نوح علیہ السلام کے قصے سے کرتا ہے اور جیسا میں نے عرض کیا تھا ان قوموں کا ذکر اس لیے کرتا ہے کہ عرب کے گردونواح میں یہ قومیں بستی تھیں' ان کی بستیوں کے کھنڈرات ان کے راستوں میں پڑتے تھے' ان کے ہاں صبح شام ان کی داستانیں دہرائی جاتی تھیں' وہ قافلہ در قافلہ وہاں سے گزرتے تھے تو ان کی داستانیں ان کے سامنے آتی تھیں۔ یہ ان اقوام کی داستان سے واقف تھے اس لیے ان اقوام کی مثال پیش کی۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ ہم اتنی بڑی قوت وسطوت وشوکت کے مالک ہیں' ہمیں کس طرح سے زوال آ سکتا ہے۔ کہا کہ ان سے پوچھو کہ جب یہ داستانِ نوحؑ دہراتے ہیں' تو اس میں ان کے سرداروں کے یہ قصے بیان کرتے ہیں' ان سے زیادہ شان وشوکت تو ان کے سرداروں کی نہیں ہے' پھر یہ خود کہتے ہیں کہ اس کے بعد ان کی کشتی ڈوبی تو یہ تو اس کا خود اقرار کرتے ہیں۔ اتنی سی بات ہے کہ اپنے پر اس کو منطبق نہیں کرتے کہ ہمارے ہاں بھی وہی جرائم ہیں' اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو وہاں ہوا تھا۔ وہ یہ داستان بیان کرتے ہوئے فوراً اس پر آ گئے کہ یہاں ایسے ہی ہوگا۔ کہا کہ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَّازْدُجِرَ (54:9) وہ نوحؑ جو ان کی حفاظت وسلامتی کے غم میں گھلا جا رہا تھا' اور ان سے کہہ رہا تھا کہ تباہ وبرباد ہو جاؤ گے' یہ اس کا مذاق اُڑاتے تھے' اس کی تذلیل کرتے تھے' کہتے تھے کہ جھوٹ بولتا ہے' یہ پاگل ہو گیا ہے۔ واقعی وہ جو قوت کے نشے میں بدمست ہوتا ہے' وہ اپنے آپ کو کبھی نہیں کہتا کہ میں پاگل ہو گیا ہوں' وہ دوسروں کو ہی کہتا ہے کہ یہ پاگل ہو گئے ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ پاگل ہو گیا ہے' یہاں سے اس کو دھتکار کے نکال دو' صبح شام جب دیکھو' یہی بات کہہ رہا ہے کہ تباہ ہو جاؤ گے' برباد ہو جاؤ گے یہ ہے وہ کہ اس کی وجہ سے نحوست آتی ہے یعنی یہ اپنی تباہی کی بات سننے کو برداشت نہیں کرتے تھے' اس سے نحوست آتی ہے۔

یہ مجنون ہے' پاگل ہو گیا ہے۔ ہاں: فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (54:10) اس پر نوح علیہ السلام نے اپنے خدا کو پکارا۔ اس سے کہا کہ یہ تو اب بڑھتے اور چڑھتے چلے جا رہے ہیں اس لیے جسے عام کہیں گے کہ میری مدد کر' تو وہ تو آپ کو معلوم ہے کہ مدد کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ دوسرے معنی یہ بھی ہو جاتے ہیں کہ میں کمزور ہوں' میرا انتقام لینے کا انتظام کرو۔ مطلب یہی ہے کہ میں اس وقت مغلوب ہوں اور ہر نبی کی داستان میں یہ مقام آتا ہے جہاں وہ مغلوب ہوتا ہے' بظاہر ان کی قوت اتنی بڑھ گئی ہوتی ہے کہ اس کے مقابلے میں اس کی قوت اتنی ہوتی۔ ٹھیک ہے۔ کہا ہے کہ فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ [1] (54:11)۔ حضرتِ نوح علیہ السلام کی یہ داستانیں تو

---

[1] چنانچہ ہم نے موسلا دھار بارش کے لیے' بادلوں کے لیے' دروازے کھول دیئے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1249)۔

آپ کو اب معلوم ہی ہیں۔ اس لیے جب بار بار آئیں گی تو میں بار بار اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا اس لیے کہ یہ سب چیزیں آپ کو معلوم ہیں۔ ٹھیک ہے یہ چیزیں بھی میں بتا چکا ہوں کہ یہ جو قرآن نے بتایا ہے کہ اس کی تباہی بارش سے' سیلاب سے' ہوئی ان کی تباہی زلزلے سے ہوئی' ان کی تباہی کوہِ آتش فشاں کے لاوے سے ہوئی' یہ جو ساری چیزیں ہیں' ان کا تعلق اس قوم کے غلط نظام سے کیا تھا۔ یہ چیزیں بھی میں بتا چکا ہوں اس لیے بار بار ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ وہ جو قوم تھی تباہ ہوئی۔

کہا ہے کہ وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ❶ (54:12) یہ جو کہا جا رہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے لیے ایسا پہلے سے لکھا گیا تھا کہ یہ ہو جائے گا' یہ جو لکھا جاتا ہے' یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ پہلے سے قانون ہی یہی مقرر ہوا تھا کہ جب کسی قوم کے جرائم اتنے بڑھ جائیں تو پھر اس کی کشتی ڈوبا کرتی ہے۔ یہ معنی ہیں قدر کے۔ یہ خدا کے قوانین ہیں' جن کے مطابق یہ ہوتا ہے۔ یہ کچھ ہنگامی طور پر نہیں ہو جاتا' اس کے لیے قوانین مقرر ہیں اور وہ وہی بات ہے جو کشتی والی بات سامنے آئی ہے۔ کشتی سے تو بات سمجھ میں آئے گی' کشتی میں آپ اتنی سواریاں لادتے ہیں' کشتی تیر کی طرح پانیوں کے اوپر بطخ کی طرح تیرتی ہوئی دوسرے کنارے پہ پہنچ جاتی ہے۔ سالہا سال یہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھار جب وہ ڈوب جاتی ہے تو اس کی تحقیق کرنے پہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اوور لوڈ ہو گئی تھی' اس میں زیادہ وزن لاد دیا گیا تھا۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ وہی چیز ہے جسے مقدر کہتے ہیں۔ یہ ایک قانون میں ہے کہ اتنی ضخامت کی کشتی میں اتنا بوجھ لادو گے تو وہ حفاظت سے چلی جائے گی' اس سے زیادہ بوجھ لاددو گے تو ڈوب جائے گی۔ اسی کو تقدیر کہتے ہیں۔ اگر کوئی چیز پہلے سے لکھی ہوئی ہے تو پہلے سے یہی لکھا ہوا ہے کہ اتنے وزن تک یہ کشتی برداشت کرے گی' اس سے زیادہ لادو گے تو ڈوب جائے گی۔ اسے کہیے کہ یہ تو لکھا ہوا ہے۔ کوئی بھی کشتی ہوگی' کہیں بھی وہ ہوگی' کوئی بھی وقت ہوگا' جب یہ چیز ہوگی تو یہی اس کی تقدیر ہوگی۔ یہ ہے قَدْ قُدِرَ (54:12)۔ اگلی ہی آیت میں کہا کہ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ (54:13) اور ہم نے نوح علیہ السلام اور اس کے ساتھیوں کو اس کشتی میں سوار کرا دیا جو بڑے بڑے تختوں' لوہے کی میخوں اور رسّیوں سے باندھ کر تیار کی گئی تھی اور اس طرح انہیں بچا لیا گیا کیونکہ انہوں نے سیلاب سے بچنے کے لیے اپنی حفاظت کا سامان کر لیا ہوا تھا۔

عزیزانِ من! اگر تباہی آنے سے پہلے اپنی حفاظت کا سامان کر لیا جائے تو وہ بچتا ہے۔ کہا ہے کہ تَجْرِىْ بِاَعْيُنِنَا جَزَآءً لِّمَنْ

---

❶ اور زمین سے چشمے ابلنے لگے اور اس طرح' زمین اور آسمان کا پانی' اُس مقصد کے لیے' جس کا ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق' اندازہ ہو چکا تھا' یک جا جمع ہو کر' سیلاب کی شکل اختیار کر گیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 1250-1249)۔

کَانَ کُفِرَ (54:14) وہ ہماری زیرِ نگرانی پانی کے اوپر حفاظت سے چلی جارہی تھی۔ یہ جن کی صداقت کا انکار کیا جارہا تھا' جن کے خلاف سرکشی برتی جارہی تھی ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بچ گئے کیونکہ انہوں نے خدا کے قانون کے مطابق حفاظت کا سامان کرلیا اور یہ جو اس کی تکذیب کرتے رہے' جھٹلاتے رہے' مذاق کرتے تھے' پاگل کہتے رہے' وہ اس قانون کی خلاف ورزی سے جو خدا نے مقرر کیا ہوا ہے' ان کی تباہ آ گئی۔

قرآن حکیم کی بیان کردہ داستان کسی نہ کسی آیت کی غماز ہوتی ہے اور اس کے مقابل انسانی سوچ اور اس کا ماحصل

آگے کہا کہ وَلَقَدْ تَّرَکْنٰهَآ اٰيَةً (54:15) یہ ہے اصل چیز کہ یہ کہانی نہ سمجھو جو ہم نے بیان کردی اور آپ نے کہا کہ ہاں صاحب! یہ ٹھیک ہے کہ یہ Historical Fact (ہسٹری کی بات) ہے۔ دوسری رہی یہ بات کہ ہسٹری صرف معلومات (Information) دیتی ہے' صرف اس کا ذہن سے تعلق ہوتا ہے۔ یہ آپ کی ساری تعلیم' جتنی بھی ہے' یہ ایجوکیشن نہیں ہے' یہ صرف انفرمیشن دیتی ہے' آپ کو معلومات دیتی ہے کہ مثلاً فلاں سال میں ان دو قوموں کے اندر جنگ ہوئی' وہ وہاں سے آئی تھی' وہ یہاں سے آئی تھی' ان کے پاس سامان زیادہ تھا۔ یہ ساری چیزیں صرف معلومات تک محدود ہیں' جب کہ قرآنِ کریم نے یہ داستان یہاں بیان کرنے کے بعد یہ کہا کہ اس داستان کو ہم نے اس لیے محفوظ بنایا کہ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (54:15) کوئی ہے جو اس سے نصیحت حاصل کرے کہ یہ کیوں وہاں تھا۔ یہ ہے مقصد کہ وہ دیکھے اور غور کرے۔ آگے کہا کہ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ (54:16) وہ دیکھے کہ جن چیزوں سے' جن خطرات سے' ان کو آگاہ کیا گیا ہے' وہ کس طرح سے سچ ہوکر رہے اور اس کا کیا نتیجہ نکلا۔ ہماری وارننگ سے' اعراض برتنے کا نتیجہ' سوائے تباہی اور بربادی کے اور کچھ نہیں نکلا۔ یہ ہیں وہ تاریخی حقائق جنہیں قرآن حکیم آیت اللہ کہتا ہے۔ آیت کے معنی ہوتے ہیں ''دور سے کوئی چیز دیکھ کر اس نتیجے پہ پہنچنا کہ حقیقت کیا ہے' صحرا میں دور دور تک کوئی آبادی نہ ہو' دور سے آپ کو کہیں سے دھواں نظر آئے' تو وہ نیچے جو کچھ ہے' وہ نظر نہیں آتا' معلوم ہوتا ہے کہ آگ ہے اور جہاں آگ ہے' وہاں انسان ہوگا۔ میلوں تک وہاں پانی کا نشان نہ ہو' کسی جگہ سے کوّا اڑتا نظر آئے تو وہ سمجھ لیتے ہیں کہ نیچے کوئی چشمہ یا نخلستان ہے' پانی ہے کیونکہ پرندہ پانی کے بغیر زندہ نہیں رہتا۔ جو راستہ بھولے ہوئے ہیں' دور سے کہیں کتے بھونکنے کی آواز آجائے تو وہ اس طرف چل دیتے ہیں کہ وہاں کوئی بستی ہے۔

عزیزانِ من! یہ جو چیزیں ہیں کہ وہ دھواں' یہ کوا' یہ کتے کا بھونکنا' یہ آیت کہلاتا ہے۔ یہ بجائے خویش ایک چیز نہیں ہوتی بلکہ کسی اہم چیز کی موجودگی کی دلالت کرتی ہیں تو اس داستان کے متعلق' یا جتنی بھی داستانیں آئیں گی وہ یہ آیات ہیں' یہ جو واقعات آپ سن رہے

ہیں' یہ مقصود بالذات نہیں ہیں بلکہ یہ کسی مقصد تک پہنچنے کی نشانیاں ہیں۔ کہا ہے کہ ان سے بات سمجھو۔ آگے کہا کہ **وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ** (54:17) یہ طریقہ' یہ انداز ہم نے اس لیے اختیار کیا ہے کہ اس سے سمجھنا بڑا آسان ہوجاتا ہے۔ کیا بات ہے! پہلی بار جب بچہ سمجھنے یا بولنے لگتا ہے تو وہ رات کو نانی اماں سے کہتا ہے کہ مجھے کہانی سناؤ' یہ کہانی وہ ہوتی ہے۔ یہ بات کے سمجھانے کا بڑا موثر طریقہ ہوتا ہے۔ وہ بچپن کی کہانی ہوتی ہے اور کہانی بھی ہمیں صرف جن اور لال پری کی نہیں سنانی چاہیے۔ اسی طرح سے بچے کو کہانی وہ سنانی چاہیے جن میں آیات ہوں اور آخر میں نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ دیکھا! اس نے جھوٹ بولا تو اس کے بعد کیسے اس کی زبان کالی ہوگئی۔ یہ بات ہے۔

اگر مجرد Truth (سچائی) کو دل و دماغ تسلیم نہ کرے تو انسان کی یہ بلند فکری کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتی

وہ کہتا یہ ہے کہ یہی جو کہانی کا سننے کا جذبہ ہے' یہی ہے جو آپ کو ہسٹری کی طرف لے جاتا ہے' واقعات کی طرف لے جاتا ہے کہ یہ کسی بات کے سمجھانے کا بڑا آسان طریقہ ہوتا ہے ورنہ جسے مجرد Truth (سچائی) کہتے ہیں' جو Abstract Realities (مجرد حقیقتیں) ہوتی ہیں' ان کا تعلق مابعدالطبیعات سے ہوتا۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ ان کا تعلق Intellect (عقل) سے ہوتا ہے' شعور سے ہوتا ہے' دماغ سے ہوتا ہے' معلومات سے ہوتا ہے۔ اس کا کچھ نتیجہ نہیں نکلتا۔ اصل چیز یہ ہے کہ آپ کے دل پر اس کا کیا اثر ہوا ہے۔ تعلیم جو صرف دماغ تک رہتی ہے' وہ آپ کو معلومات تو دیتی ہے' دل و دماغ پہ اس کا اثر نہیں ہوتا۔ یہ جو آپ کے ہاں بڑے بڑے Historians ہیں' وہ بیٹھے ہوئے ٹھیکرے ہی گنا دیں گے' ہزار سال کی تاریخ گنا دیں گے لیکن اس کے بعد اُٹھیں گے تو اپنی جو روشِ زندگی ہے' وہ سب اس کے خلاف ہوگی اس لیے کہ وہ دماغی چیز معلومات کی چیز تھی' قلب تک وہ بات نہیں پہنچی تھی۔

لفظ ذکر کا مفہوم اور مقصد یہ ہے کہ بیان کردہ احکامات کو ہر وقت سامنے رکھا جائے

کہا ہے کہ **وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ** (54:17) یہ جو کچھ ہم بیان کرتے ہیں یہ معلومات کے لیے نہیں ہے۔ اس سے ایک نصیحت حاصل کرنی ہے' آپ نے اس بات کو سامنے رکھنا ہے۔ ذکر کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ ایک ایسی اہم چیز ہے جسے ہر وقت سامنے رکھا جائے تاکہ ہم سے کہیں اس کی خلاف ورزی نہ ہوجائے۔ یہ ہر وقت ان چیزوں کا سامنے رکھنا ہے یہ ہے کہ پھر انسان راستے میں اِدھر اُدھر نہیں ہوتا۔ اس لیے کہا ہے کہ ''ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے بڑا آسان بنا دیا ہے۔''

قومِ نوح کے جرائم کو بیان کرنے کا مقصد کسی کہانی کا بیان کرنا نہیں بلکہ طبقاتی تفاوت کو ختم کروانا مقصود ہے

اس لیے کہا ہے کہ **فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ** (54:17) یہ پھر وہی بات کہیے کہ کوئی ہے جو اس سے نصیحت حاصل کرے یعنی یہ معلومات نہیں ہیں' یہ نتائج اُخذ کرنے کی بات ہے۔ وہ تو جو بھی کہانی سنے گا' معلومات تو اس کو مل جائیں گی۔ یہ کہا کہ یہ نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ اس

سے نصیحت حاصل کرو کہ انہوں نے یہ کیا تو تباہ ہو گئے' ہم ایسا نہ کریں۔ قومِ نوح کے جرائم کیا ہیں؟ قرآنِ کریم نے مختلف مقامات میں تو ان جرائم کی تفصیل دی ہے۔ مختصراً یہ ہیں ان کے جرائم کہ ان کے ہاں عزت اور ذلت کا معیار دولت تھی' جو ان کے نزدیک چھوٹے چھوٹے کام کرتے تھے: دوکاندار کنجڑے وغیرہ' بڑے بڑے سردار' انہیں اپنے برابر نہیں بیٹھنے دیتے تھے' طبقاتی تفاوت کی یہ کیفیت تھی' حضرتِ نوحؑ کے ساتھ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ یہ ہمارے نزدیک ذلیل طبقے کے لوگ ہیں' ذلیل طبقہ' رذیل طبقہ ہے۔ ان کی ذلت اور رذالت کی وجہ کیا تھی؟ یہ کہ وہ ان کے مقابلے میں غریب تھے حالانکہ غور سے دیکھیے تو وہ تو ان کے مقابلے میں ہزار درجہ شریف ہیں' صاحبِ عزت ہیں۔

قرآنِ حکیم انسانی کیریکٹر کو دولت کے ترازو میں نہیں تولتا

قرآن حکیم نے کہا کہ عزت کا معیار تو انسان کا کردار (Character) ہے۔ یہ لوگ عزت کا معیار دولت کو قرار دے رہے ہیں۔ ان سرداروں کے پاس اپنی ذاتی کردار کی' کوئی چیز نہیں' یہ اضافی چیز ہے کہ ماں باپ کے ہاں سے وراثتاً کچھ آ گیا' تیزی سے اِدھر اُدھر اسمگل کر کے لے لیا۔ یہ جو چیز دولت ہے یہ اضافی چیز (Relative) ہے' کردار انسان کی ذاتی چیز ہے' قرآن حکیم نے پہلی داستان میں پہلا اصول یہ بیان کیا کہ یاد رکھو! عزت اور ذلت کا معیار دولت نہیں ہے۔ انسان کی سیرت اور کردار ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (49:13) جو قوانینِ خداوندی کی سب سے زیادہ پیروی کرتا ہے وہ سب سے زیادہ قابل عزت واحترام ہے' یہ معیار دولت نہیں ہے۔ تو ان کے ہاں پہلی چیز جو تھی وہ یہ تھی۔

قوم نوحؑ کا دوسرا جرم تقلید پرستی تھی جو انسانی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتی ہے

دوسرا جرم یہ تھا کہ جب ان سے کوئی بات کی جاتی تو وہ کہتے کہ نہیں صاحب! یہ ہمارے اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے' ہم اس کے خلاف سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان سے کہا جاتا کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے خود سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی ہے' تمہارے اپنے اندر یہ چیز موجود ہے' میں اس کو اپیل کرتا ہوں کہ سوچنے سمجھنے کے بعد تم سوچو کہ جو میں کہہ رہا ہوں' وہ صحیح ہے یا نہیں۔ تم کہتے ہو کہ ہم سننے کو تیار ہی نہیں ہیں اس لیے کہ ہمارے اسلاف کے مسلک کے خلاف جاتا ہے۔ عزیزانِ من! تواتر سے ہمارے ہاں بھی یہی آ رہا ہے' توارث سے ہم اسی مسلک کے اوپر ہیں' ہم کسی ایسی چیز کو سننے کو تیار ہی نہیں ہیں جو ان کے مسلک کے خلاف جائے۔ قرآن حکیم نے کہا کہ جو قوم خود غور و تدبر سے کام نہیں لیتی اور اس طرح سے اندھوں کی طرح' اگلے کی لاٹھی کے سہارے چلی آ رہی ہے' وہ قوم تباہ ہو کر رہتی ہے۔

قومِ نوحؑ کا تیسرا جرم: قومیت کی بنیاد کا نسل پرستی پر ہونا آج بھی یہی کچھ ہے

قومِ نوحؑ کے اندر تیسری چیز حضرتِ نوح علیہ السلام کا بیٹا تھی جس نے اس صداقت کو تسلیم نہیں کیا تھا' وہ ڈوبنے لگا تھا تو حضرتِ

نوح علیہ السلام نے بھی یہ بات کہدی تھی کہ یا اللہ! آپ نے تو کہا تھا کہ تمہارے اہل کو میں بچالوں گا' تو یہ تو سب سے قریب ترین میرا اہل ہے تو قرآن کریم نے اگلا معیار یہ بتایا کہ اپنے اور بیگانے کا معیار نسل نہیں ہے۔ اپنا وہ ہے جو ان اصولوں کی صداقت میں تمہارا ہمنوا ہے' جو ان سے انکار کرتا ہے وہ تمہارا نہیں ہے' وہ غیر ہے۔ قومیت کا معیار قرآن حکیم نے بتا دیا کہ ایمان کے اصولوں کا اشتراک ہے۔ اس سے ایک قوم بنتی ہے۔ اپنا بیٹا بھی اگر اس سے اشتراک میں تمہارے ساتھ شامل نہیں ہے' تو وہ تمہارا نہیں ہے۔ پہلی داستان میں' عزیزانِ من! غور فرمائیے کہ کتنی بڑی تین چیزیں قرآن کریم کہہ گیا ہے۔ پہلی ہی داستان جو بیان کی' بتایا یہ کہ یہ تھا ان کا نظامِ زندگی' یہ روش تھی' یہ ان کا مسلک تھا' اس طرح سے ان کے ہاں یہ عقائد تھے' اس وجہ سے وہ تباہ ہوئے۔ آج دنیا میں آجائیے' اپنے ہاں آجائیے' اپنے نظام کی طرف آجائیے' کیا یہ تینوں چیزیں آپ کے ہاں موجود نہیں ہیں؟ قرآن حکیم کہتا ہے کہ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ (54:17) تم میں سے ہے کوئی جو اس کو سننے کے بعد اس بات پہ آجائے کہ ہم بھی تباہ ہو رہے ہیں؟ کیا انداز ہے کہنے کا: فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ (54:17)۔ بات تو تم نے سن لی' میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ تم میں کوئی اب ایسا ہے کہ اس کے بعد کہے کہ ہاں صاحب! ہم بھی تباہ ہو جائیں' اگر ہم نے یہ روش نہ چھوڑی؟ تو ہے کوئی ایسا؟ واہ واہ!

قرآن حکیم اپنی آیات کو پھر پھیر کر مختلف انداز میں پیش کرتا ہے لہٰذا قوم نوح کے بعد قوم عاد کا ذکر

قومِ نوحؑ کے بعد قومِ عاد آتی ہے۔ یہ قرآن حکیم کی آیت ہے کہ كَذَّبَتۡ عَادٌ فَكَيۡفَ كَانَ عَذَابِىۡ وَنُذُرِ ٥ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ رِيۡحًا صَرۡصَرًا فِىۡ يَوۡمِ نَحۡسٍ مُّسۡتَمِرٍّ (54:18-19) اسی طرح قوم عاد نے بھی ہمارے قانونِ مکافاتِ عمل کو جھٹلایا۔ اس کے بعد دیکھ لیا کہ ہماری تنبیہ کس طرح سچی ہو کر رہتی ہے اور ہمارا عذاب کس طرح آیا کرتا ہے۔ یہ ایسی تباہی کا دن تھا۔ وہ تباہ ہوئے' اس قسم کی تباہ کرنے والی ہوا چلی۔ یہ ایسی تباہی کا دن تھا جو انہیں ہمیشہ کے لیے ختم کر گیا۔ یہ جو یومِ نحس ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ ہے کہ گھڑی بڑی منحوس تھی صاحب! وہ تو دور ہی ایسا تھا کہ ناس آ گیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ نحوست اس میں ہوتی ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے نحوست کہیں باہر نہیں ہوتی۔ یہ تباہی کا ہی نام نحوست ہوتا ہے۔ وہ جو کسی قوم کی تباہی آتی ہے' وہ تباہی لانے والی چیز نحس ہوتی ہے۔ آگے کہا ہے کہ تَنۡزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمۡ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ مُّنۡقَعِرٍ (54:20) وہ اُن کی داستان سنائی۔ وہ اتنا تیز جھکڑ تھا کہ ان کے گھر بار اڑا کر لے گیا' وہ گھر تو ایک طرف رہے' یہ بڑی بڑی جو کھجوریں تھیں' وہ اکھڑ کر یوں اُدھر چلی گئیں۔ یہ کھجور' ایک بہت زیادہ جڑوں والا' تنے والا مضبوط درخت ہوتا ہے۔ یہ آپ نے دیکھا ہے کہ محمد بن قاسم کے زمانے میں وہ سندھ میں جب پہلے مسلمان آئے' انہوں نے آ کر جو یہاں ہندوستان میں پودے لگائے تھے' یہاں تو کھجور ہوتی نہیں تھی' وہ اب بھی ہزار ہزار سال کی کھجور کھڑی ہے۔ جہاں کہیں بھی آپ دیکھیں

گے وہ یہی کھجور ہے' اس کی جڑیں بہت Deep Rooted ہوتی ہیں' جن جڑوں نے پانی جا کے بہت گہرائی میں لینا ہو' آپ سوچیے کہ وہ جڑیں کتنی مضبوط ہوتی ہیں۔قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ یہ اتنی مضبوط جڑوں والی قوم تھی' وہ یوں اکھڑ کر ادھر چلی گئی جیسے اس کی کہیں جڑ تھی نہیں۔ کہا ہے کہ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ (54:21) سوغور کرو کہ ہماری تنذیر کس قدر سچی اور ہمارا عذاب کیسا سخت تھا۔

قومِ نوحؑ قوم المجرمین تھی یعنی دوسرے کے درخت کا پھل کاٹ کر اپنے گھر لے آنے والی یا بھیڑ کی اون تک مونڈ کر لے جانے والی۔اس استحصالی قوم کی جڑ تک کاٹ دینے کا ذکر

کہا ہے کہ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (54:22) ہم نے قرآن حمید کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے بڑا آسان بنا دیا ہے۔سو ہے کوئی جو اس پر غور وفکر کر کے اس سے نصیحت حاصل کر لے؟ اس قوم کے جرائم کیا ہیں؟ یہ قرآن حمید نے گنائے ہیں۔پہلی چیز قرآن حمید نے ایک لفظ میں' یہ ساری داستان بیان کر دی صاحب! وہ کہا ہے کہ وہ قوم المجرمین تھی۔ہمارے ہاں تو مجرم اسی کو کہتے ہیں جو عدالت سے کچھ سزا پا جائے اور جرائم وہ ہوتے ہیں جو مروجہ قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔وہ قوم کی قوم مجرموں کی قوم تھی۔عربوں کے ہاں عربی زبان میں جرم کہتے تھے ''کسی دوسرے کے درخت کا پھل کاٹ کر اپنے گھر لے جانا' بھیڑ کی اون مونڈ لینا''۔آج کی اصلاح میں اسی کو Exploitation کہتے ہیں۔یہ وہی ہے جسے آپ استحصال کہتے ہیں۔وہ جو اقبالؒ نے کہا ہے کہ اس دور کا نظام' آج کی دنیا کا نظام یہ ہے :

اُمتے بر اُمتے دیگر چرد

دانہ ایں می کارد' آں حاصل بُرد

کوئی قوم اپنے کھیت میں سے نہیں کھاتی' دوسرے کے کھیت میں سے کھاتی ہے' جا کر بوٹا یہ لگاتا ہے' کاٹ کر کوئی اور لے جاتا ہے' محنت کوئی کرتا ہے' اس کے اوپر عیاشی کوئی اور کرتا ہے۔اسے عرب جرم کہتے تھے۔قرآن کریم نے قوم المجرمین کہہ کر ان کے معاشی نظام کا پورا نقشہ ایک لفظ میں کھینچ دیا اور یہ کیا عجیب قوم تھی یعنی یہ بات کہ دوسرے کے درخت کا پھل کاٹ کر لے جانا عام چیز ہے۔یہ جو بھیڑ کی اون مونڈ لینا ہے یعنی وہ جو اس بیچاری کے پاس سردی سے بچنے کے لیے ایک ہی چیز ہوتی ہے' دوسرا کپڑا ہی نہیں ہوتا' اور وہ کسی کا دیا ہوا نہیں ہوتا' اس کا اپنا ہوتا ہے' توڑا ہوا نہیں ہوتا' جسم کا حصہ ہوتا ہے' وہاں اس چیز کو بھی اپنے لیے گرم استر بنانے کے لیے' مونڈ کے لے جانا کہتے ہیں۔یہ ہے نظام ان کا۔آہاہا! کیوں؟ کہا ہے کہ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (54:22) ہے کوئی اس سے نصیحت حاصل کرنے والا۔

اس دور میں دوسروں کا استحصال کرنے کا طریق قوت کا حصول ہے

آج آپ کے دور کا نظام کیا ہے؟ یہ ہے کہ دوسروں کے درختوں پر سے پھل تو ہر روز کاٹ کر لے جاتا ہے‘ بھیڑ کی اون مونڈ کر لے جاتا ہے‘ وہ سردی میں ٹھٹھرتی رہے۔ اُسے تو تمہارے ہاں کا گدا بن جانا چاہیے‘ جناب! قرآنِ حمید کہتا ہے کہ یہ کیسے ممکن تھا؟ کہیے کہ وہ کیسے کرتے تھے؟ وہ یوں کرتے تھے کہ جو کمزور اور غریب تھے وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ (26:130) اس کو پکڑتے تھے تو ان کی ہڈیاں توڑ دیتے تھے۔ ان کے حکمرانوں کے متعلق جبار عنید (11:59;14:15) ہے یعنی کوئی اور ان کے اندر خصوصیت یا جوہر نہیں تھا‘ خصوصیت اتنی تھی کہ ان کے پاس دوسروں کے مقابلے میں قوت زیادہ تھی۔ ڈنڈا ان کے پاس تھا‘ بندوق ان کے پاس تھی‘ بس ایسا نظام جو کسی خصوصیات کے اوپر مبنی نہ ہو‘ محض قوت کے زور پہ مبنی ہو اور باقی وہ رہے‘ دوسروں کی بھیڑ کی اون مونڈ کر لے جانے کی‘ دوسروں کے درختوں کا پھل کاٹ کر لے جانے کی قوت اس کی بنیاد ہو اور یہ ہو اس کے استحکام کا ذریعہ۔ یہ ہے جو قرآن حمید نے قومِ عاد بتائی ہے۔ اب قرآنِ حمید قوم حضرت ھودؑ کی طرف آ گیا۔ کہا ہے کہ وہ قوم ویسے جسے آپ تہذیب و تمدن والے کہتے ہیں‘ اس دور میں بڑی مہذب قوم گنی جاتی تھی لیکن کتنی ہی مہذب متمدن قوم کیوں نہ ہو‘ جب وہ ان بنیادی قوانین کی خلاف ورزی کرتی ہے‘ تو کوئی چیز انہیں بچا نہیں سکتی۔

قوم ثمود کے ذکر کے دوران اور کفار کی طرف سے کیے گئے اعتراضات کا جواب

قوم عاد کے بعد قومِ ثمود آتی ہے۔ کہا ہے کہ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ (54:23) قوم ثمود کو بھی بڑی تنبیہہ کی گئی‘ وارننگ دی گئی‘ بہت سمجھایا گیا۔ قرآن کریم نے کہا کہ پہلی چیز یہ ہے کہ فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ (54:24) کہا کہ یہ وہی ایک شخص ہے‘ اس کے ساتھ کوئی جتھہ نہیں‘ کوئی گروہ نہیں‘ کوئی پارٹی نہیں‘ اس کی Voting Strength کچھ نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہمارے پیچھے چلو‘ ہماری بات مانو۔ بات تو اس کی مانی جائے جس کے ساتھ کچھ جتھہ ہو‘ کوئی گروہ ہو‘ کوئی پارٹی ہو‘ کوئی دماغ ہو۔ پہلی چیز تو یہی کہ یہ کچھ اس کے پاس نہیں ہے مگر وہ کہتا کیا ہے؟ وہ سنا جائے۔ کیا محض اس لیے ہم اس کی بات مان لیں کہ وہ کہتا ہے کہ جو میں کہہ رہا ہوں‘ یہ سچی حقیقت کی بات ہے؟ وہ اکیلا آدمی ہے۔ کیا ہم اپنے آپ کو چھوڑ دیں تو ہم تو تباہ ہو جائیں گے۔ کہا کہ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ (54:25) ایک معمولی انسان‘ غریب سا آدمی ہے‘ یعنی اللہ کا انتخاب ملاحظہ فرماؤ کہ اپنی پیغام رسانی کے لیے اس نے چننا تھا تو ہم میں سے کسی سردار کو چنتا‘ کسی بڑے کو چنتا‘ کسی امیر کو چنتا‘ اسے چن لیا۔ اس کی یہی بات اس کے جھوٹے ہونے کی علامت ہے کہ یہ بڑا سردار نہیں‘ دولت مند نہیں ہے‘ جو بات کہہ رہا ہے وہ بھی سن رہے اور دیکھ رہے ہیں‘ کہ کہہ کون رہا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ پورے پارہ کا ہی ذکر المعرف پہ چلا آتا ہے۔ یہ قرآن حکیم کا عجیب لفظ ہے۔ اس کا یہ ”سردار وغیرہ“

ترجمہ صحیح نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ یہ وہ ہے جن کے گھروں میں برتن اناج سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں' کیا بات ہے صاحب! سو وہ تو ٹھیک ہے' اسے دوسرے کو تو پاگل کہنا ہے' یعنی ایک لفظ میں قرآن حکیم ساری بات بتا جاتا ہے۔ کہا کہ یہ ان کی کیفیت تھی۔ جب تباہی کا وقت آیا تو ان کے تدبر کی فسوں سازی ان کے کسی کام نہ آسکی۔ وہ قوم راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔ قرآن مجید استعاروں میں بات کرتا ہے۔ قوم کی تباہی کے معنی یہ نہیں ہوتے ہیں کہ اس قوم کا کوئی ایک فرد بھی زندہ نہیں رہتا۔ یہ ان کی موت ایسی نہیں ہوتی۔ قوم کے کرنے کے معنی ہوتے ہیں کہ وہ ذلیل و خوار ہو جاتی ہے' قوت نہیں رہتی' دولت نہیں رہتی' حکومت نہیں رہتی۔ دوسری اقوام کے مقابلے میں یہ قوم مردہ ہوتی ہے' ان کے برابر نہیں چل سکتی۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ قوموں کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد قومِ ثمود آتی ہے۔ کہا ہے کہ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ (54:26) ہم نے صالح علیہ السلام سے کہا کہ تو ان کی ان جگر پاش باتوں سے افسردہ خاطر نہ ہو۔ کل ہی انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جھوٹا اور خود پسند کون ہے؟

قومِ ثمود کا سب سے بڑا جرم رزق کے سرچشموں پر ذاتی قبضہ تھا حالانکہ وہ نشوونما کے لیے بلا مزد و معاوضہ ملا

کہا ہے کہ اِنَّا مُرْسِلُو النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ (54:27) تم ذرا ہمت سے کام لو اور تھوڑا سا انتظام کرو۔ یہ اونٹنی' جس کے متعلق انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ اسے اپنی باری پر پانی پینے اور چراگاہ میں چرنے دیں گے' ان کا جھوٹ اور سچ نکھار کر رکھ دے گی اور جب یہ عہد شکنی کریں گے تو وہ ان کی تباہی کا موجب بن جائے گی۔ اس قوم ثمود کے معاشی نظام کی کیفیت کا جرم بتایا۔ ان کی معیشت گلہ بانی کی تھی' مویشی پالتے تھے' بڑی بڑی وسیع چراگاہیں تھیں لیکن چشمے بہت شاذ ہوتے تھے اور پانی پر تو مویشیوں کا دارومدار ہوتا ہے۔ کیفیت یہ تھی کہ یہ جو ان کے بڑے بڑے سردار تھے انہوں نے ان چشموں پر قبصہ کر رکھا تھا۔ چشمے پہ قبضہ کیا جائے تو چراگاہ پہ تو خود ہی قبضہ ہو جانا ہوا اور جو کمزور اور غریب رہ جاتے تھے' ان کی بھیڑوں کو پانی نہیں پینے دیتے تھے۔ یہ خدا کا دیا ہوا چشمہ تھا۔ ان سرداروں کا کوئی واٹر ریزروائر نہیں تھا کہ وہاں سے پانی آتا اپنے نلکے کو بند کر دیا یا وہاں میٹر لگا دیئے۔ یہ چشمہ تو زمین سے ابل رہا ہے اور خدا کی زمین ہے' خدا کا اس طرح سے دیا ہوا چشمہ ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ہم نے مخلوق کی پرورش کے لیے یہ انتظام کیے ہیں۔ زمین سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے اور یہ جو پانی آتا ہے' یہ ہم نے ساری مخلوق کے لیے دیا ہے تو اسے مخلوق کی پرورش کے لیے کھلا رہنا چاہیے۔ انہوں نے قبضہ کر لیا۔ قبضہ کرنے کے بعد کہا کہ یہ ہمارے ہیں۔ خدا نے ان کی طرف جو بات بھیجی' وہ یہی تھی کہ کس سند کی بنا پر تم کہتے ہو کہ یہ چشمے ہمارے ہیں۔ کیا تم نے یہ چشمہ خود بنایا ہے؟ نہیں' یہ تو ہمارے ہاں باپ دادوں سے وراثت سے چلا آ رہا ہے۔ کیا یہ تمہارے باپ دادا نے بنایا تھا؟

کس طرح سے یہ آیا؟ ہم نے فلاں سے یہ چشمہ خریدا۔ جس سے خریدا تھا وہ تو ڈاکو تھا' چور تھا۔ خدا کا چشمہ تمہارے ہاتھ بیچ گیا تو وہ تمہاری ملکیت کی سند ہوگئی۔ جو چوری کا مال لینے والا ہے' وہ بھی چور سمجھا جاتا ہے۔

وہ خدا کی چیزیں تھیں جو پرورش کے لیے مطلوب تھیں۔ اس نے بلامزد و معاوضہ' بغیر کسی قسم کی قیمت کے دی ہوئی تھیں' ان کی ذاتی ملکیت ہو نہیں سکتی۔ کہا کہ تم نے زمینوں پہ لکیریں کھینچ کر اسے ذاتی ملکیت بنا لیا' ان چشموں کے اوپر محض اس لیے بیٹھ گئے کہ تمہارے پاس لٹھ ہے' ان کے پاس قوت نہیں ہے' تم ان کے مالک بن بیٹھے ہو۔ کہا کہ ان چیزوں کے اوپر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔ یہ خدا کی چیزیں خدا کی مخلوق کے لیے ہونی چاہئیں۔ یہ تھی کشمکش حضرتِ صالح علیہ السلام اور ادھر قومِ ثمود کی۔ حضرتِ صالح علیہ السلام ان کی طرف پیغمبر تھے۔ وہ ان کے ہاں کا معاشی نظام تھا۔

قومِ ثمود سے ماخوذ قوموں کے عروج و زوال کا ایک سنہری اصول جسے ابدیت کا درجہ حاصل ہے

ان کے ہاں کا جو سیاسی نظام تھا' اس کے لیے بڑی عجیب بات کہی ہے۔ حضرتِ صالح علیہ السلام نے خدا سے کہا کہ یہ تو ساری قوم کی قوم بگڑی ہوئی ہے' ان کی اصلاح کس طرح سے ہو؟ کہا کہ گھبراؤ نہیں' یہ ساری قوم کی بات نہیں ہے۔ قرآنِ کریم نے سورۃ النمل میں بتایا ہے کہ وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (27:48) یہ اوپر جو کیپٹل سٹی ہے' اس کے اندر نو بیٹھے ہوئے ہیں' یہ صاحبِ اقتدار ہیں اور بگڑے ہوئے ہیں' وہ قوم کو سنورنے نہیں دیتے۔ یہ بہت بڑا اصول آ گیا صاحب! کہ قوم کے بڑے صاحبِ اقتدار' بگڑتے ہیں تو قوم بگڑ جاتی ہے۔ کہا ہے کہ اس کی فکر نہ کرو' یہ مغلوب ہو جائیں گے' قوم سنور جائے گی۔ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (26:152) وہ چاہتے یہ ہیں کہ ناہمواریاں رہیں' وہ اصلاح ہونے ہی نہیں دیتے؟ اس لیے تم تعداد کی بات نہ کہو۔

خدا کی اونٹنی کے نام پر ہونے والے ایک معاہدے کا' بنیادی مقصد حدیث مبارکہ ہے کہ خدا کی زمین خدا کے بندوں کے لیے کھلی رکھو

نظر آتا ہے کہ یہ جو حضرتِ ثمود علیہ السلام تھے' ان کا قبیلہ کچھ بڑا تھا یا بہرحال ان کی عزت تھی' وہ ان کے ساتھ مفاہمت کرنے کے لیے' صلح کرنے کے لیے آمادہ ہوگئے۔ کیا بات ہے قرآن کریم کی! کہ وہ جو مفاہمت نامہ یا وہ Compromise Statement لکھا گیا' اسے ہم آج کی زبان میں یہ کہیں گے کہ ان میں جو معاہدہ ہوا تو اس معاہدے کی شرطیں یہ تھیں کہ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ (11:64) یہ خدا کی اونٹنی ہے' اس کو نہ کسی امیر کی' نہ کسی غریب کی سمجھو' سمجھو کہ یہ خدا کی مخلوق ہے۔ یہ تم جو کہتے ہو کہ غریبوں کی اونٹنیوں کو پانی نہیں پینے دیں گے'

تو وہ جو اونٹنیاں ہوتی ہیں وہ تو غریب یا امیر نہیں ہوتیں' غریب کی اونٹنی تم غریب بنا دیتے ہو' امیر کی اونٹنی امیر ہو جاتی ہے' او! اونٹنیاں تو دونوں ہی برابر ہیں۔ کہا کہ میں یہ نہیں مانوں گا کہ یہ سردار تھے خان کی اونٹنی ہے' وہ تگڑم خان کی اونٹنی ہے۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے' یہ دونوں خدا کی مخلوق ہیں۔ نَاقَةُ اللّٰهِ (11:64) یہ ہے خدا کی اونٹنی۔ فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ (11:64) اور یہ زمین خدا کی ہے۔ خدا کی اونٹنی ہے' خدا کی زمین ہے۔ تسی چاچے لگدے او ایتھے؟ (کیا تم یہاں چچا لگتے ہو؟) کیا اصول ہے' عزیزانِ من! اب بات سمجھ میں آئی کہ قرآن کریم قیامت تک کے لیے ضابطہ حیات کس طرح سے ہے! آج بھی یہی اصول ہونا چاہیے کہ خدا کی مخلوق' خدا کی زمین' تم کون ہوتے ہو درمیان میں آنے والے!! فَذَرُوْهَا (11:64) ان غریبوں کی اونٹنیوں کو تم بند کر کے رکھ دیتے ہو' آگے بڑھنے ہی نہیں دیتے' کھول دو ان کی زنجیروں کو' ان کو آزاد کر دو تا کہ خدا کی مخلوق' خدا کی زمین میں برابر چرے پھرے۔ یہ تھا جی! وہ جو آپس میں ان کا معاہدہ ہوا تھا۔ اس معاہدے کی Terms (شرائط) یہ تھیں' عزیزانِ من! دیکھ رہے ہیں' قرآن کریم کی جامعیت کو آپ' آج بھی یہی معاہدہ لفظاً لفظاً چسپاں ہوتا ہے یا نہیں؟ دنیا میں اگر معاشی نظام نَاقَةُ اللّٰهِ (11:64) اور اَرْضِ اللّٰهِ (11:64) کا ہو جائے تو سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ یہاں تو چونکہ بات نَاقَةُ (11:64) کی ہو رہی تھی' اونٹنیوں کی ہو رہی تھی' تو نَاقَةَ اللّٰهِ (11:64) کہا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث ہے ابوداؤد کی' حضور ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ زمین اللہ کی اور یہ بندے اللہ کے' اللہ کی زمین کو اللہ کے بندوں کے لیے کھلا چھوڑ دو۔ یہ موجود ہے اور وہ قوم اسے بڑی مقدس حدیث کہہ کر دہراتی پھرتی ہے جو ہزاروں اونٹوں کا ایک مالک ہوتا ہے اور وہ بیچارے مزارعے اور کاشتکار وہاں پہ اس کے جو بچے ہیں' وہ بھوکے مر رہے ہوتے ہیں' خدا کی زمین' خدا کے بندوں کے لیے نہیں ہے۔

سوات کی مسجد میں زمین کی ملکیت کو صرف خدا کی ملکیت کہنے والے مولوی ہٹلر اور والیٔ سوات کا تذکرہ

خدا کی زمین ہے والی بات پھر یاد آ گئی' اگرچہ میرا خیال ہے ایک دفعہ پہلے بھی میں نے سنایا تھا لیکن اس سے بات سمجھ میں خوب آ جاتی ہے۔ اس سے پہلے سوات کے انتظام کے لیے والی تھے۔ زمین کا انتظام ان کے پاس ہوتا تھا۔ وہاں ایک مولوی صاحب رہتے تھے' وہاں کے لوگ انہیں مولوی ہٹلر[1] کہتے تھے۔ یہ بڑا دبنگ قسم کا آدمی تھا آپ سوچیے ریاست کے اندر' ریاست کا والی ہے' وہ ایک بہت بڑا جشن تھا وہاں بڑے بڑے آئے ہوئے تھے' یہ والی بھی وہاں تھے' مولوی صاحب بھی تھے' تلاوتِ قرآنِ کریم سے جشن شروع ہونا تھا۔ اس جشن کے اجلاس میں قرآنی کریم کی یہ آیت شروع کی: لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ (2:284) زمین و آسمان

---

[1] انہیں کہیں مولوی ہٹلر اور کہیں مولانا عرب کا نام دیا گیا ہے۔ ان کا اصل نام نور احمد ولد عبدالبصیر ہے۔ ان کا انتقال 1957ء میں ہوا۔

ساری خدا کی ملکیت ہے۔ قاری نے جونہی یہ آیت پڑھی' تو یہ مولوی ہٹلر بیٹھے ہوئے تھے' کہنے لگے: جھوٹ بولتے ہو' کوئی اور آیت تلاوت کرو۔ ارے! والی کے سامنے بیٹھے ہوئے جشن کا جلسہ ہے' قرآن کریم کی آیت ہے' وہ یہ کہہ رہا ہے۔ یہ جاہل نہیں ہے۔ بہت بڑا مولوی تھا۔ کہتا ہے کہ جھوٹ بولتے ہو۔ والی نے خود کہا کہ کیا کہہ رہے ہو' یہ خدا کی آیت ہے' اور اس کو کہتے ہو کہ جھوٹ بولتے ہو۔ وہ مولوی ہٹلر کہنے لگے کہ وہ خدا کی آیت تو سچ ہے' میں اس کا کہہ رہا ہوں' یہ کہہ رہا ہے' ارض وسما خدا کی ملکیت ہے' مجھے سما کا تو پتہ نہیں' یہ ریاست کے جتنے مال خانے کے دفتر ہیں' میں ایک ایک میں سے ہو کر آیا ہوں' میں نے وہ جتنی جمع بندی کے رجسٹر ہیں' وہ سارے دیکھ لیے ہیں' ساری ریاست کی زمین کے خانہ ملکیت کے اندر والیٔ ریاست لکھا ہوا ہے' کسی ایک ٹکڑے زمین کے نیچے بھی ملکیت کے خانے میں اللہ نہیں لکھا ہوا' تو یہ کیسے کہہ رہا ہے کہ زمین اللہ کی ہے' جھوٹ نہیں بول رہا تو کیا سچ بول رہا ہے؟ کیا بات ہے صاحب! ملکیت کے خانے میں خدا کا نام میں نے کہیں نہیں دیکھا اور کہیں بھی نہیں ہے۔

نَاقَةُ اللّٰهِ(11:64) اور اَرْضِ اللّٰهِ (11:64) کے باہمی معاہدہ کا حشر

عزیزانِ من! اس والیٔ ریاست ہی کی بات نہیں' بات اس زمانے کی نہیں' یہ اُس زمانے کی قومِ ثمود کی بات تھی اور کیا خوبصورت الفاظ ہیں: اللہ کی اونٹنی ہے اور ارض اللہ کے لیے ہے۔ یہ ان کے ہاں آپس میں معاہدہ ہوا ہے کہ ''نَاقَةُ اللّٰهِ ہے اور اَرْضِ اللّٰهِ' صرف اللہ کی ہے۔ یہ تھا جی! وہ جرم جس کے لیے پھر کہا کہ وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ (54:28) بات طے ہو گئی' ہر ایک اونٹنی اپنی اپنی پیاس کے مطابق' اپنی باری پہ پیئے گی' غریب اور یہاں پر امیر کی اونٹنی کا کوئی سوال نہیں ہے۔ کہا کہ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ (54:29) معاہدہ بھی کر لیا' دستخط بھی ہو گئے' لیکن ملکیت کو کون چھوڑتا ہے۔ یہ معاہدہ آپس میں تو ہو گیا' وہ بڑا تھا سردار' اس کو آواز دی' کہا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ اونٹنی کو ہی مار دو' نہ وہ پانی پینے والی رہے گی' نہ یہ جھگڑا رہے گا۔ اونٹنی کو ہی مار دو!

دنیا میں بھوکے مرنے والوں کے علاج کے لیے روم میں ایک کلب کا قیام اور اس کا پروگرام

آپ کو شاید پتہ نہیں' روم میں ایک کلب ہے' ساری دنیا میں اس کی شاخیں بنی ہوئی ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ اس دنیا میں' بہت زیادہ کھانے والے ہو رہے ہیں یعنی Over Population ہو رہی ہے۔ اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ کچھ زیادہ اگاؤ بلکہ یہ ہے کہ Population (آبادی) کم کرو۔ کلب کی ان کی شاخوں میں سازشیں یہ ہیں کہ وقتاً فوقتاً جنگ چھیڑتے رہا کرو۔ ان کی ایک باقاعدہ تنظیم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بیماریاں پیدا کرنے والے جراثیم چھوڑتے جاؤ۔ بڑے پیمانے پر Wars (جنگوں) کا انتظام کرو' آبادی کم ہوتی چلی جائے گی' کھانے والے کم رہیں گے۔ بس ٹھیک ہے۔ کیا علاج ہے!!!

زمین پر ذاتی نظام ملکیت کی آب یاری کے انجام کو سمجھنے کے لیے قرآن حکیم کی ایک محسوس مثال

انہوں نے کہا کہ اونٹنی کو ماردو۔اونٹنی کو ماردیا پھراس کے بعد جو ہوا اس کے لیے کہا کہ فَکَیْفَ کَانَ عَذَابِیْ وَنُذُرِ (54:30) جاؤان کھنڈرات کی اینٹوں سے پوچھو کہ پھروہ تباہی کس طرح سے آئی ہے۔آگے کہا کہ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَیْھِمْ صَیْحَۃً وَّاحِدَۃً فَکَانُوْا کَھَشِیْمِ الْمُحْتَظِرِ (54:31) آہاہا!باڑ لگائی جاتی ہے کہ وہ کھیتی کی حفاظت کرے۔اگر باڑ فرسودہ ہو جائے'اس کے پتے خشک ہو جائیں'اس کے کانٹے مرجائیں'ٹہنیاں اتنی کمزور ہو جائیں کہ وہ ہوا کے ایک جھونکے سے ہی گر پڑیں' کہا کہ یہ جوان کے ہاں کی ملکیت کی باڑیں تھیں'ان کے جرائم کی وجہ سے یہ اس طرح سے ہو گئیں' جو کھیتوں کے اوپر ملکیت کی باڑیں لگائی ہوئی تھیں'ان کے جرائم نے ان کو گھیر لیا۔بھیڑ بکریاں بنادیا۔وہی تباہی کا باعث بنتی ہیں۔کہا کہ وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ(54:32) دیکھا!ہم نے قرآن کریم کو بات سمجھنے کے لیے کیسا آسان اسلوب اختیار کیا ہے۔یہ بات قدیم نہیں ہے آج بھی یہ سچی بات ہے۔کہا کہ ھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ (54:32) سو کیا کوئی ہے جو اس سے فائدہ اُٹھا کر اپنی زندگی کو صحیح راستے پر لے آئے؟ یہ آپ کے لیے' ہمارے لیے بھی ہے۔صرف انہی لوگوں کے لیے تو نہیں تھی' یہ تو قیامت تک کے لیے ہے' یہ قرآن حمید تو زندہ جاوید ہے' ہمارے لیے یہ ہے' ہم سے کہتا ہے کہ ھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ (54:32) ہے کوئی تم میں سے اس سے نصیحت حاصل کرنے والا کہ ان جرائم کا نتیجہ قوموں کی اس قسم کی تباہی ہوا کرتا ہے' ہے کوئی؟ اگر ایسا نہیں ہے تو تباہ ہو جاؤ گے۔

عزیزانِ من! وقت ہو گیا' ہم سورۃ القمر کی آیت 32 تک آ گئے۔آگے بھی یہ سلسلہ دو چار اور اقوام کا چل رہا ہے اور اس کے بعد پھر قرآن حکیم انہی کی طرف آجائے گا کہ یہ سارے واقعات تمہارے سامنے ہیں۔سب کو کہہ رہا ہے کہ سوچو! اب اس کے بعد پھر تمہارا کیا حشر ہوگا ہے۔تمہارے ہاں بھی یہ تمام جرائم' جو ہم نے ایک ایک گنائے ہیں' اور آج ہم سے وہ کہتا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت کر کے مردوں کو بخشانے والو! سوچو کہ ھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ (54:32) ہے تم میں سے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا کہ اقوام کا یہ حشر ہوا کرتا ہے جن کے ہاں نظام اس قسم کا ہوتا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

تیسرا باب: **سورة القمر** (آیات 33 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج دسمبر 1982ء کی 17 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ القمر کی آیت 33 سے ہو رہا ہے:

(54:33)۔

آپ کو یاد ہوگا کہ سلسلہ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مخالفین جو بالخصوص قریش تھے، سے کہا جا رہا تھا کہ جس قسم کے نظام پر تم زندگی بسر کر رہے ہو اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے اور اس دعوے کی صداقت کے ثبوت میں قرآنِ کریم نے پھر اپنے معمول کے مطابق تاریخی شواہد پیش کیے ہیں۔ انہیں بتایا ہے کہ ان اقوام کی سرگزشتوں سے تم واقف ہو، ان کے مآل اور انجام تمہاری آنکھوں کے

سامنے ہیں' ان کی اجڑی ہوئی بستیاں' ان کی حکایات' تم دن رات دہراتے رہتے ہو۔

قومِ لوط کی سرگزشت کا انجام اور ہم سے خطاب جو قوانین خداوندی کے غیر متبدل اصولوں کا نتیجہ ہے

سابقہ آیات میں قوم نوحؑ کا ذکر آیا' قوم عاد کا ذکر آیا' قوم ثمود کا ذکر آیا اور اب آج قوم لوط کا ذکر آ رہا ہے۔ کہا ہے کہ كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍ بِالنُّذُرِ (54:33). میں نے یہ عرض کیا تھا کہ یہ داستانیں ان اقوام کی تو ہیں جو ہزار ہا سال پہلے گزریں مگر براہِ راست وہ قوم مخاطب تھی جو آج سے ڈیڑھ ہزار' چودہ سو سال' پہلے گزر چکی لیکن قرآنِ کریم تو قیامت تک کے لیے ضابطہ حیات ہے اس لیے یہ تاریخی کہانیاں نہیں ہیں جو وہ بیان کر رہا ہے۔ آج اس کے مخاطب ہم ہیں۔ وہ کہہ رہا ہے کہ یہ قوموں کے عروج و زوال اور موت و حیات کے اٹل غیر متبدل قوانین ہیں' جو ہر زمانے میں' ہر دور میں' ہر ملک میں' ہر قوم میں' اسی طرح نافذ العمل ہونگے جس طرح اقوامِ سابقہ کے سلسلے میں تم دیکھ چکے ہو تو اس لیے اس کے مخاطب آج ہم خود ہیں۔ دیکھنا ہمیں یہ ہے کہ جس غلط نظام کے نتیجے میں یا جن جرائم کی پاداش میں' وہ قومیں تباہ ہوئی تھیں' اگر وہی نظام' وہی ضابطہ حیات' وہی جرائم' ہمارے ہاں وقوع پذیر ہیں' رائج ہیں' متواتر ہیں' تو ہمارا انجام بھی وہی ہوگا جو ان اقوام کا انجام ہوا ہے اور یہ کہا اس لیے جا رہا ہے کہ ابھی تمہارے پاس مہلت کا وقفہ ہے۔ انہیں بھی یہ کہا تھا کہ اس مہلت کے وقفے میں اگر تم اپنی اصلاح کر لو اور جس صحیح نظام کی طرف تمہیں دعوت دی جا رہی ہے' اسے اگر تم اپنے ہاں اختیار کر لو تو تباہی سے بچ جاؤ گے۔

میں سمجھتا ہوں ہم سے کہا جا رہا ہے کیونکہ ابھی ہمارے لیے بھی وہ مہلت کا وقفہ ہے اور ہمیں کھڑے ہو کر جائزہ لینا ہوگا کہ قرآن کریم میں جو جرائم ان قوموں کے گنائے ہیں' وہ ہمارے ہاں موجودہ معاشرے میں' ہمارے نظام میں' تو کہیں نہیں ہیں اگر ہیں تو ابھی مہلت کا وقفہ ہے' اس کی اصلاح کر دینی چاہیے۔ اگر یہ جرائم ہیں اور مہلت کے وقفے سے ہم نے فائدہ نہیں اٹھایا تو اس کا انجام اور نتیجہ وہی ہوگا جو اس سے پہلے کی اقوام میں ہو گزرا ہے۔ وہی ہے وہ ایمان جسے ہم کہتے ہیں خدا کے قوانین پہ' مکافاتِ عمل پہ' قرآن پہ' خدا پہ ایمان۔ ایمان کے معنی ہی یہ ہیں ورنہ سمجھ لیں کہ وہ جو کچھ کہا جا رہا ہے' یہ اٹل ہے' غیر متبدل ہے' حقیقتِ ثابتہ ہے' ایسا ہو کر رہے گا۔ جب یہ یقینی بات بھی ہو کہ ایسا ہو کر رہے گا اور اس کے باوجود انسان اپنی اصلاح نہ کرے تو پھر تو وہ خود دعوت دے رہا ہے۔

قومِ لوط کے جنسی بدنہادی کے انسانیت سوز جرم کا قومی تمدن پر اثر

عزیزانِ من! پہلے تین اقوام کا ذکر آیا ہے۔ اب قومِ لوط کا ذکر آیا ہے' ان کا جرم جنسی بدنہادی گنایا گیا ہے جسے انگریزی میں Sex Perversion کہتے ہیں۔ اس کی تفصیل میں جانے کی مجھے زیادہ ضرورت نہیں ہے' یہ واقعات اس سے پہلے بھی بیان ہو چکے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ سمجھنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ یہ Perversion کا لفظ اس کے اندر جو آ جاتا ہے' وہ بڑا ہی جامع ہے۔

فطرت نے Sex یا جنسی خواہشات تحفظِ نسل کے لیے رکھی ہیں ۔ یہ انسانوں کے اندر بھی ہیں‘ حیوانات کے اندر بھی ہیں ۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ وہاں فطرت نے خود ایک قانون اور قاعدہ مقرر کیا ہے‘ یہاں انسان سے کہا ہے کہ اسی کے مطابق تم بھی اس کا استعمال اس مقصد کے لیے کرو اور اگر اس خواہش کی تسکین کے لیے غلط طریقے اختیار کیے جاتے ہیں تو وہ اسے Perversion کہتا ہے۔ قرآن کریم اسی کو یہ کہتا ہے کہ یہ Sex Perversion ہے تو اس لیے اس کا نتیجہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں۔ عام طور پہ اس غلط فہمی میں اقوامِ عالم اب تو مبتلا ہیں کہ یہ ایک انفرادی سا سوال ہے‘ ہر شخص کا پرائیویٹ سا مسئلہ ہے اور جس طرح سے جی چاہے اس جذبے کی تسکین کر لی جائے‘ زیادہ سے زیادہ وہ اس شخص کی طبعی زندگی پر‘ Physical Life پر‘ کچھ اثر پڑ جائے گا اور کیا لیکن حیرت ہے کہ یہی قومیں جو یہ مانتی چلی آ رہی تھیں‘ آج بھی یہ مان رہی ہیں‘ انہی اقوام کے مفسرین کی‘ محققین کی‘ تحقیق اس نتیجے پہ پہنچا رہی ہے کہ یہ پرائیویٹ ذاتی انفرادی معاملہ نہیں ہے۔ اس روش کا اثر پوری قوم پہ پڑتا ہے اور ان کی تحقیق کے مطابق تو وہ[1] یہ کہتا ہے کہ بدنہادی شروع ہوتی ہے تو زیادہ سے زیادہ تین نسلوں تک وہ قوم زندہ رہ سکتی ہے‘ اس کے بعد یقینی طور پہ وہ قوم ختم ہو جاتی ہے۔ یہ وہ کہہ رہے ہیں جن قوموں کے ہاں خود یہ Homo- Sexuality کے قوانین لیگل قرار دیئے جا چکے ہیں۔ ان کے مفسرین کی تحقیق یہ کہہ رہی ہے۔ عجیب بات ہے‘ سمجھ میں نہیں آتا تھا‘ جب قرآن حکیم کہتا ہے کہ ان اقوام کو اس طرح وضاحت سے سمجھایا‘ انہوں نے اس کے باوجود تکذیب کی کہ نہیں‘ تم جھوٹ بولتے ہو‘ ایسا نہیں ہو سکتا‘ وہ مخالفت کرتے رہے‘ دشمنی مول لے لی‘ وہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ایسی واضح بات کی مخالفت کیوں کرتے تھے۔ قرآن کریم نے ان کے متعلق بھی کہا ہے کہ وہ علم وبصیرت رکھنے والی قوم تھی‘ ان کے سمع اور بصر اور قلوب موجود تھے‘ ان کے باوجود وہ اپنی روش کو نہیں چھوڑتے تھے کیونکہ جذبات غالب آ جاتے تھے۔

آج یورپ انگلینڈ اور اب امریکا میں اس اخلاقی اصول کی قانوناً تکذیب کیوں ہے؟

آج مغرب کی اقوام میں اگر آپ دیکھیں تو میں نے عرض کیا ہے کہ انہی کے ہاں کے محققین یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ قوم تین نسلوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی اور اس کے علی الرغم ان کے اپنے ہاں‘ پہلے تو انفرادی طور پہ یہ اس قسم کے فعل ہوتے تھے‘ اب انہوں نے اُسے قانوناً جائز قرار دیدیا ہے۔ دونوں میں‘ یورپ میں بھی‘ خاص طور پہ انگلینڈ میں اور ادھر امریکا میں بھی اب نظر آتا ہے‘ جو قرآن حکیم کہتا تھا کہ عقل وفکر کے باوجود قوموں کی یہ حالت ہے کہ جب جذبات غالب آ جاتے ہیں تو پھر اس وقت عقل اور فکر کوئی کام نہیں دیتی‘ کوئی فائدہ نہیں

---

[1] یہ اشارہ ڈاکٹر جے- ڈی- اَنون کی کتاب Sex and Culture کی طرف ہے۔ یہ کتاب 1934ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے طبع ہو کر منظرِ عام پر آئی تھی۔

پہنچاتی' اور یہ بات تو واضح ہے جو قرآن کریم نے قومِ لوط کا قصہ بیان کیا ہے۔ یہ وہی ہے جو حضرتِ ابراہیمؑ کے پاس وہ مہمان آئے اور پھر انہی حضرت ابراہیمؑ والے راستے میں وہ حضرت لوطؑ کے پاس آئے اور پھر انہوں نے یہی بات کہی ہے کہ جنسی بدنہادی کا نتیجہ قومی اعتبار سے بھی قوم کی تباہی ہوتا ہے۔ ان سے یہ کہا گیا تھا۔ یہ آیات 33 سے 39 تک یہی کچھ قصہ قرآن کریم نے بیان کیا ہے' تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے ❶۔

کسی بات کو سمجھانے کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا انداز بیان بڑا آسان بھی ہے اور واضح بھی

اور پھر کہا کہ **وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ** (54:40) ۔ اب یہ ہمیں کہہ رہا ہے کہ ہم بات سمجھانے کا یہ جو انداز اختیار کر رہے ہیں کہ ایک قانون ہے' ایک اصول ہے' ایک نظریہ ہے' اس کی صداقت کے ثبوت میں تاریخی شواہد پیش کرتے ہیں' کیونکہ یہ طریقہ بات سمجھنے کے لیے بھی بڑا آسان ہوتا ہے تو اس کے بعد پھر وہ ہم سے کہہ رہا ہے کہ بتاؤ! ہے کوئی تم میں سے ایسا' جو اس بات کو سمجھ کر اس پہ عمل کرے' پھر ہے کوئی ایسا اور بھی جو ہم کہیں کہ نہیں صاحب! ایسا نہیں ہے تو وہ کہیں گے کہ ٹھیک ہے' جہنم میں جاؤ۔

---

❶ یہی آیات 33 تا 39 تک کا یہی قصہ مختصراً دیا جا رہا ہے۔ کہا کہ **كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍ بِالنُّذُرِ** (54:33) اسی طرح قوم لوطؑ نے بھی ہمارے مرسلین کی تکذیب کی' جو انہیں' ان کی غلط روش کے تباہ کن عواقب سے آگاہ کرتے تھے اور پھر **اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ** (54:34) اس پر ہم نے اُن آتش فشاں پہاڑ سے پتھراؤ کیا تو ان میں سے کوئی بھی نہ بچا' بجز لوطؑ اور اس کے ساتھیوں کے جنہیں ہم' صبح سویرے بچا کر' وہاں سے لے گئے تھے اور **نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ** (54:35) یہ چیز لوطؑ کے رفقا کے لیے ہماری طرف سے نعمت تھی لیکن یہ نعمت یونہی مفت نہیں مل گئی تھی۔ یہ نتیجہ تھی ان کی اس روش کا جس کی رو سے انہوں نے حق کو مانا اور اس طرح ہماری راہ نمائی کی قدر شناسی کی۔ جو لوگ یہ روش اختیار کرتے ہیں' انہیں اسی قسم کا بدلہ ملا کرتا ہے۔ وہ تمام آفتوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ کہا ہے کہ **وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ** (54:36) لوطؑ نے اپنی قوم کو بار بار تنبیہہ کی تھی کہ خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت سے ڈرو۔ لیکن انہوں نے اس کی پروانہ کی اور سمجھے کہ وہ یونہی خالی دھمکیاں دیتا ہے اس لیے اس سے اُلٹا جھگڑنے لگے۔ اور پھر **وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ** (54:37) جب لوطؑ کے پاس اس کے مہمان آئے تو وہ قوم لوطؑ کے لوگ اس کے مہمانوں کی طرف' بُری نیت سے آئے۔ وہ اپنے حیوانی جذبات کے جوش میں بالکل اندھے ہو رہے تھے اور لوطؑ کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ سو ہم نے ان سے کہہ دیا کہ بہت اچھا! تم اب اپنے اعمال کے نتائج کا مزہ چکھو کہ جس بات سے تمہیں متنبہ کیا جاتا تھا اور تم اسے جھوٹ سمجھتے تھے' وہ کس طرح واقع ہو کر رہتی ہے۔ پھر یہ ہوا کہ **وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ** (54:38) علی الصبح' انہیں ایک ایسے عذاب نے آلیا جو آ کر وہیں رہ جانے والا تھا' اور ان سے کہا گیا کہ **فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ** (54:39) اب میرے عذاب کا مزہ چکھو اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ میری تنذیرات کس طرح صحیح ثابت ہوتی ہیں۔

فرعون کے ظالمانہ شخصی نظامِ حکومت کا تذکرہ

اس کے بعد سیدھی سی بات ہے کہ پھر اگلی قوم قومِ فرعون آتی ہے۔ کہا کہ وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ (54:41) اور كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا كُلِّهَا (54:42) اسی طرح قومِ فرعون کے پاس بھی ہمارے مرسلین پہنچے جو انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے متنبہ کرتے تھے۔ انہوں نے ہمارے احکام کو ایک ایک کر کے جھٹلایا۔ یہاں یہ چیز خاص طور سے بتائی کہ ان اقوام میں چھوٹی چھوٹی کمزوریاں، چھوٹے چھوٹے جرائم، تو عام ہوتے ہیں، وہ جو بڑے بڑے جرائم تھے قرآن کریم نے ان کا ذکر کیا ہے۔

یہ فرعون کی قوم کی تباہی سے پہلے کہا ہے۔ جو بھی تباہی کی نشانیاں ان کے سامنے آتی رہیں اور انہیں ان سے منع کیا جاتا رہا، وہ ہر ایک کو جھٹلاتے رہے، ہر ایک کی تکذیب کرتے رہے، تو گویا جرائم بھی ایک دو نہیں اکٹھے ہو گئے اور وہ جس قدر وسیع اور عظیم ان کی سلطنت، اس کی مملکت تھی، فرعون تو دنیا میں ضرب المثل ہے۔ اسی اعتبار سے اس کے لیے یہ آیات اور یہ نشانیاں پیش کی جاتی ہیں۔ جرائم کیا گنائے ہیں جناب؟ اس قوم کے جو جرائم ہیں، خاص طور سے وہ ہمارے لیے ایسے ہیں کہ ہم غور کریں کہ اگر یہی نظام ہمارے ہاں بھی رائج چلا تو پھر اس کا نتیجہ تو وہی ہوگا، جو قرآن حمید نے کہا ہے۔ پہلی چیز تو یہی ہے کہ ان کے ہاں حکومت، انسان کی شخصی حکومت تھی، فردکی تھی، بادشاہت تھی، ملوکیت تھی۔ یہ پہلا جرم ہے۔ قرآن کریم کی رو سے کسی انسان کو دوسرے انسان پر حقِ حکومت حاصل نہیں ہے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ حکومت صرف خدا کے لیے ہے تو ہمارے ہاں تو یہ ایک لفظ بول دیتے ہیں اور پھر وہ حکومت اپنی ہی ہوتی ہے۔ خدا نے یہ کہا ہے کہ ٹھیک ہے، حکومت خدا کی ہے، اور وہ حکومت خدا کی کتاب کی محکومیت ہے، عملی بات اس نے بتادی۔ پہلا جرم تو وہاں یہ ہے کہ یہ شخصی حکومت ہے، ایک انسان کی دوسرے انسانوں پہ ملوکیت ہے یا انسانوں کے گروہ کی دوسرے انسانوں پر حکومت ہے، جسے مغربی جمہوریت کہتے ہیں۔ پہلا جرم تو اس کے ہاں کا یہ تھا کہ انہوں نے اپنی اس ملوکیت کو محض قوت کے زور پر قائم کیا تھا۔ اس کے مقابلے میں یہ دوسری مملکت یا حکومت ہوتی ہے، قرآن مجید کہتا ہے کہ وہ انسانوں کی مشاورت سے طے پاتی ہے۔ اس میں قوانین یا اصول تو غیر متبدل رہتے ہیں، جو خدا کی کتاب میں دیئے گئے ہیں۔ ان اصولوں پر عمل پیرا کس طرح ہوا جائے گا، ان کو نافذ کس طرح کیا جائے گا؟ یہ اس قوم یا امت کے باہمی مشورے سے ہے، جسے وہ صحیح اور جائز حکومت قرار دیتا ہے، جس کا نتیجہ تباہی نہیں بلکہ خوشحالیاں ہوتی ہیں۔ وہاں یہ صورت تھی کہ یہ فرعون کی شخصی ملوکیت تھی اور اسے قائم رکھنے کے لیے یہ قوم کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کرتا رہتا تھا، پارٹیاں بناتا رہتا تھا۔ یہ ہیں جو آپ کے ہاں مذہب کے فرقے بنتے ہیں، سیاسی پارٹیاں بنتی ہیں۔

قرآنِ کریم کے اسی معیار پر جو قوم ایک امت واحدہ ہے، تو پھر وہ غلط نظام کو قائم رہنے نہیں دیتی۔ اس کا طریقہ یہ ہے۔ غلط نظام

قائم رکھنے والے جو ہیں' وہ اپنے نظام کے استحکام کے لیے کرتے یہ ہیں کہ وہ امت کو پارٹیوں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور ایک دوسرے سے لڑاتے رہتے ہیں' کبھی کسی کو ابھار کر اوپر لے آتے ہیں' کبھی کسی کو نیچے لے جاتے ہیں۔ یہ کھیل کھیلتے رہتے ہیں۔ وہ اس بنا پہ ان کی جو حکومت ہے' جو مملکت ہے' وہ مضبوط رہتی ہے اور جو امت یا قوم ہے اس کی طاقت منتشر ہو جاتی ہے۔ پہلی چیز یہ ہے انسانی حکومت کی۔ دوسری چیز یہ ہے کہ اس کے لیے' امت کو' قوم کو' مختلف پارٹیوں اور گروہوں میں تقسیم کرتے جانا ہے' اور ان کو ایک دوسرے کے ساتھ لڑاتے چلے جانا ہے۔ سنتے جا رہے ہیں آپ! اب یہ بات ذہن میں ہے کہ اس کے مخاطب ہم بھی ہیں۔ یہ بولدوں جو پنجابی کا محاورہ ہے کہ ماں لڑکی کو مخاطب کر کے بات کر رہی تھی کہ دھیے! تو گل سن' نوحیں توں کن کر۔ بات تو میں بیٹیوں سے کر رہا ہوں۔ وہ بڑی بی کہہ رہی ہے کہ کان تم دھرو' یہ اصل میں تمہارے لیے ہے اور ہمارے لیے ہے۔ اس طرح یہ دو باتیں آ گئیں۔

فرعون کے ہاں بچوں کو ذبح کرنے سے مراد ان کی صلاحیتوں کو غیر موثر بنا دینا تھا: فرعون کا پہلا جرم

عزیزانِ من! اس کے بعد قرآنِ کریم یہ کہتا ہے کہ فرعون کرتا یہ تھا کہ بنی اسرائیل قوم میں جو افراد ایسے نظر آتے تھے' جن میں جوہر مردانگی تھا' حریت تھی' غیرت تھی' حمیت تھی' قوت تھی' کوئی اور انسانی صلاحیت تھی' ان کو ذبح کر دیتا تھا۔ یہ وہ وجہ نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ وہ اسرائیل کے بچوں کو پیدا ہوتے ہی ذبح کر دیتا تھا۔ چالیس ہزار کی تعداد میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی نکلے۔ اگر وہ ان کے بچوں کو ذبح کر دیتا تھا تو یہ کہاں سے آ گئے۔ وہ ہمارے ہاں یہ ہے کہ بس ذرا سا ادھر ذبح کا لفظ آیا تو ذبح کے معنی یہی ہوئے: چھری پھیر دینا۔ اس کے معنی ہوتا ہے: کمزور کر دینا' ضعیف بنا دینا' اس طرح وہ ان کو تو ذبح کر دیا کرتا تھا یعنی غیر موثر بنا کے رکھ دیا کرتا تھا' ایسے لوگوں کو ملوکیت کے بڑے طریقے ہیں۔ وہ جو میں مالی کی مثال دیا کرتا ہوں یہ جو آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ باغ کا مالی' یہاں وہاں ہاتھ میں قینچی لیے پھر رہا ہوتا ہے' کسی شاخ میں کوئی ایک پتی بھی اس کے نقشے سے مطابق ذرا اس میں اوپر پھیلتی ہے' اس نے اسے کتر دیا' وہ ہر شاخ کو اپنے نقشے کے مطابق' اپنے مقام پہ رکھنا چاہتا ہے۔ جس نے ذرا سر اٹھایا اس نے اُسے قینچی سے کتر دیا۔ یہ ملوکیت ہوتی ہے۔ وہ اپنے نقشوں کے مطابق قوم کو رکھنا چاہتی ہے۔ یہ جو سر اُٹھایا' پنجابی اچ اینوں سر کڈ کیندے نے' اور یہ جتنے ایسے اس قسم کے ہوں گے کہ جن میں یہ چیزیں نہ ہوں' وہ اس سے عاری ہوں' ان کو مقرب بناتا ہے مگر انداز حکومت یہ ہے کہ کہتے ہیں دیکھیے صاحب! ہم قوم کے مشورے کے ساتھ حکومت کر رہے ہیں۔ قوم سے یہ ایسے ہی افراد مراد ہوتے ہیں۔

فرعون کی حکمرانی کو مضبوط بنانے میں مذہبی پیشوائیت یعنی ہامانیت کا باہمی مفاد کے آئینہ میں کردار:

فرعون کا دوسرا جرم

قرآن حمید بتاتا ہے' اس نے اس کے جرائم گنائے ہیں اور وہ تو اس کے بغیر آگے نتیجے پہ پہنچاتا ہی نہیں ہے جب تک یہ جرائم نہ گنا لے۔ کہا کہ کیفیت یہ تھی' پھر اس نے بتایا ہے کہ یہ اتنا بڑا جو اس کا استبداد تھا' اس قدر مظالم تھے' ملوکیت ہی بجائے خویش کم نہیں ہے اور اس میں یہ کچھ ساتھ کرتا تھا تو یہ کس سہارے یہ بات قائم رہتی تھی۔ یہ جو اتنی بڑی قوم تھی' وہ کیسے اس طرح سے مسلسل مار کھاتی چلی جاتی تھی؟ کہا کہ یہ کام مذہبی پیشوائیت سے لیا جاتا ہے۔ یہ پہلی چیز تھی۔ لفظ فرعون کے معنی ہی یہ ہیں کہ ان کے ہاں سورج فرع تھا' سورج دیوتا تھا' اس کی پرستش ہوتی تھی اور یہ جو بادشاہ تھا' اس کو اس کا اوتار بنایا جاتا تھا۔ آپ کے ہاں کی جو ملوکیت ہزار برس سے چلی آ رہی تھی' اس میں کہا جاتا تھا کہ **السلطٰن ظل الله علی الارض** بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے۔ یہ مذہبی پیشوائیت بناتی ہے کہ وہاں اس میں فرعون کے ساتھ جو ہامان کا ذکر کیا ہے' وہ چیف ہے' ہیڈ ہے' اس مذہبی پیشوائیت کا اور اس کے جنود بتائے ہیں۔ اس کا اپنا لشکر ہے۔ کبھی غور کر کے آپ دیکھیے تو یہ بادشاہت' سلطنت' حکومت' کا لشکر اتنا بڑا نہیں ہوتا' جتنا یہ ہامان کا لشکر بڑا ہوتا ہے اور ہامان کے لشکر کی جو پروپیگنڈے کی Organization (تنظیم) ہے' اس کا تو جواب دنیا کی کسی قوم میں بھی نہیں ملتا۔ وہ ان کے ذریعے سے مستحکم رہتی ہے۔ یہ اس قسم کی استبدادی حکومت ہے؟ یہ دونوں حکومتیں متوازی (Parallel) ہوتی ہیں' آپس میں ان کا ساجھا ہوتا ہے' سمجھوتا ہوتا ہے کہ تم ہمارے معاملات میں دخل نہ دینا' ہم تمہارے معاملات میں دخل نہیں دیں گے' اور ایک دوسرے کی تقویت کا موجب بنتے ہیں۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ یہ تھی وہ جو مذہبی پیشوائیت کرتی تھی۔ جب فرعون حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے شکست کھا گیا' کوئی دلیل نہیں سوجھی' تو اس نے کہا کہ اچھی بات ہے' اپنے مشیروں سے کہا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ انہیں یعنی موسیٰ کو وہ اور سارے بنی اسرائیل کو' مذہبی پیشوائیت کے ساتھ بھڑا دو۔ ساری قوم میں اعلان کر دیا کہ آؤ! یہاں حق و باطل کا یہ اکھاڑہ جم رہا ہے' دیکھو! کیسے یہ شخص شکست کھاتا ہے جو اس طرح سے آیا ہے۔ کہنے لگے کہ یہ طریقہ ہے۔ ان کے ساتھ بھڑا دو اور جونہی وہ مذہب کو ساتھ لے کر آئے' عوام کے جو نازک جذبات ہیں' ان کو اپیل کر دی کہ دیکھیے صاحب! یہ تمہارے ایمان کو' تمہارے ہاں کے حضرت صاحب کو' تمہارے فلاں عقیدے کو' کیا کہتا ہے تو وہ کچھ سوچتے ہیں۔ پیشوائیت کا' ہامانیت کا تو وہ ایک بے پناہ لشکر ہوتا ہے۔

نظام' سرمایہ داری یعنی قارونیت مروّج تھا: فرعون کا تیسرا جرم

قرآن حمید نے کہا ہے کہ تیسری چیز اس کے ہاں قارونیت تھی' نظام سرمایہ داری کا تھا' محنت کوئی کرتا تھا' اس کو نچوڑ کر کوئی اور لے

جاتے تھے' پلٹا اس کے اوپر کوئی اور تھا جسے مترفین کہتے ہیں یعنی دوسروں کی محنت پر عیش کی زندگی بسر کرنے والا۔ قارون اس کا نمائندہ ہے۔ وہ جو دنیا کے اندر ضرب المثل ہے' یہ تینوں ہی استبداد ہیں' انسانیت کے لیے بلائیں ہیں یعنی یہ بلندی کی چوٹی کے استبدادی ہتھکنڈے ہیں: فرعون بھی' ہامان بھی' قارون بھی۔ یہ اپنے اپنے غلط نظام کے نمائندہ کی حیثیت سے بطور ضرب المثل چلے آ رہے ہیں۔ فرعون شخصی حکومت کا نمائندہ' ہامان مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ' قارون نظام سرمایہ داری کا نمائندہ تھا۔

فرعون کے دربار میں صداقت کی فتح پر فرعون کا اعتراض: مجھ سے پوچھے بغیر صداقت کو کیوں قبول کیا

عزیزانِ من! یہ اس کا نظام سرمایہ داری کا ہے کے لیے تھا' اس سے کیا ہوتا تھا؟ وہ ہوتا یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو بادشاہ کہتا تھا' حکومت والا کہتا تھا اور قرآن کریم نے فرعون کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24)۔ تمہاری روٹی' میرے ہاتھ میں ہے' رزق پر میرا کنٹرول ہے' تو سیدھی سی بات ہے کہ جب روٹی پر جس کا کنٹرول ہوگا' اس کے تو سارے ہی محکوم اور محتاج ہونگے۔ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24) فرعون نے کہا یہ تھا۔ یہ بڑا جرم تھا۔ استبداد کی کیفیت یہ تھی کہ حق کی بات کہنے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جب وہ جو مذہبی پیشوائیت والے بلائے تھے' ان میں کچھ ایسے تھے' وہ جسے ہم ساحرین دربارِ فرعون کہتے ہیں' تو انہوں نے جب صداقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا' اعلان کر دیا' اعتراف کر لیا کہ ہم ایمان لائے' یہ سچی بات کرتا ہے' فرعون بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرجا ہے کہ ہیں! مجھ سے پوچھے بغیر ہی تم اس کی صداقت کا اعلان کر رہے ہو' ابھی دیکھو! میں کیا کرتا ہوں۔ اپنے ضمیر کی آواز یا جسے آپ اپنی سچی بات سمجھتے ہیں' اس میں اسے زبان پر لے آیا کہ اس کی اجازت کے بغیر ہی مان لیا! یعنی سچ کہنے کے لیے اس کی اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ آپ عجیب دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں فرعونیت کی' ہامانیت کی اور قارونیت کی جرائم کی یہ لسٹ ہے کیونکہ اتنی بڑی قوم کی تباہی کے متعلق لکھنا چاہیے تھا کہ اس نے تو اپنے اس مملکت کے استحکام کے لیے بڑے بڑے انتظام کر رکھے تھے' تو پھر کیا بات تھی جس کی وجہ سے وہ ڈوبا ہے۔ قرآن حکیم نے وہ جرائم گنائے ہیں میں تو کہتا ہوں اور تاریخ بتا رہی ہے کہ ان میں سے ایک ہی جرم بھی ایسا ہے جو قوم کو ڈبو دیتا ہے اور وہاں تو یہ تینوں اتنے اکٹھے تھے۔

کیا فرعون کی ستم ظریفی کے مقابلے میں آج دنیا کی حالت زیادہ حیران کن نہیں؟

آج دنیا کی حالت پہ اپنے سمیت آپ غور کر لیجیے کہ ان میں سے کون کونسے وہ جرائم ہیں جو آج اب عام ہو رہے ہیں تو کیا اب خدا کا وہ قانون جو تھا وہ چلا گیا' اس کے ساتھ ہی وہ قصہ ختم ہو گیا۔ معاذاللہ ۔ وہ تو حی القیوم ہے' اس کا قانون تو زندہ و تابندہ ہے۔ یہ ہے وہ چیزیں جس کے لیے قرآن حمید ان کو دہراتا ہے۔ کہا ہے کہ وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ۝ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ

عَـزِيۡزٍ مُّقۡتَدِرٍ (54:41-42)۔ اتنے بڑے پہ ہاتھ ڈالنے کے لیے بڑے آہنی پنجے کی ضرورت تھی۔ کہا کہ ہاتھ ڈالا۔ یہ عزیز کا لفظ ہی کچھ کم قوت والا نہیں' اس میں تو مقتدر میں بھی ہے یعنی' بڑی سخت فولادی گرفت والا۔ یہ خدا کا قانون ہے۔ دیکھیے! اس نے پکڑا۔ اس کے لیے اتنے ہی سخت قانون کی ضرورت تھی۔

خدائے عزیز کی گرفت کو بیان کرنے کا انداز

عزیزانِ من! اب وہ یہاں آ کر ان سے مخاطب ہوتا ہے۔ بات یہاں تک چلنے کے بعد آپ دیکھیے کہ ایک قصیدے میں تشبید کے بعد اپنے مقصد دروغ پہ آنا ہوتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے کہا کہ کس انداز سے بات کر رہا ہے۔ یہاں تک ایسا تھا جیسے کوئی Historical Event کی کوئی تاریخی داستانیں پیش کرتا چلا آ رہا ہے اور فوراً ہی وہ کہتا ہے کہ اَكُـفَّـارُكُـمۡ خَيۡـرٌ مِّـنۡ اُولٰٓئِكُمۡ اَمۡ لَكُمۡ بَرَآءَةٌ فِى الزُّبُرِ (54:43) کہو کہ تمہارے یہ جو بڑے بڑے سرکردہ ہیں' ان سے بڑے تھے' جن کی بات ہم نے کی ہے' پوچھو ان سے۔ کیا بات ہے سمجھانے کی! کیا انداز ہے بات کرنے کا! کہو کہ قوت وشوکت میں تم ان سے بھی بڑے ہو' یہاں تمہارے پاس کوئی ایسی دستاویز آ گئی ہوئی ہے' اتھارٹی آ گئی ہے کہ ان کے ساتھ تو یہ کچھ ہوا تھا' تمہارے ساتھ نہیں ہوگا۔ کہیں سے تم نے ایسی کوئی سند لے رکھی ہے' کوئی Exception (استثناء) ہے کہ تمہارے لیے ہمارے صحیفوں میں معافی نامہ لکھا ہوا ہے۔

ملوکیت کے قوانین میں بادشاہ سوائے قتل کی سزا کے ہر طرح سے آزاد ہوتا ہے اور اس کا انجام؟

تمہارے لیے خدا کے قانون میں تو Exception (استثناء) ہو نہیں سکتی' کسی کو سند نہیں مل سکتی جب کہ ملوکیت کی اجارہ داری میں جو بادشاہ یا سلطان ہے' وہ جو جرم بھی کرے' قتل کے سوا' اس سے مواخذہ نہیں کیا جا سکتا اور کیا یہ خدا کے قانون میں ہے؟ یہ جو اس نے کہا تھا کہ تمہارے پاس کوئی سند ہے۔ عزیزانِ من! ہمارے ہاں کی ملوکیت نے تو وہ سند بھی تیار رکھی ہے اور انہوں نے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ یہاں مواخذہ نہیں ہوگا' وہ دوسرے تھے' انہوں نے آ کر کہا تھا کہ قیامت میں بھی مواخذہ نہیں ہوگا۔ معافی نامہ یہ ہے کہ کیا تمہارے پاس ہمارے صحیفوں میں کوئی ایسی سند ہے؟ ہمارے ہاں تو ملوکیت ہے' یہ چیلنج ہے۔ دورِ ملوکیت میں انہوں نے یہ سند لے رکھی ہوئی تھی کہ ہمیں کچھ نہیں ہوگا' پھر پوچھیے تو بغداد کی گلیوں سے' اور ہلاکو خان سے' کہ پھر کیا ہوا تھا' یہ سندیں کس کام آئی تھیں' اور وہ تو ہزار سال سے ہمارے ساتھ یہ ہوتا چلا آ رہا ہے۔

آبادی کے لحاظ سے دنیا کی عظیم الشان ایک ارب سے زیادہ آبادی کی قوت کی مالک مسلم قوم کا حشر

آج آپ غور فرمائیے کہ یہ دنیا کی عظیم الشان قوم ہے' ایک ارب کے قریب اس کی آبادی کا ایک بحرِ ذخار مراکش سے انڈونیشیا تک

ایک تلاطم انگیز سمندر ہے۔ اس میں آپ دیکھیے کہ وہ اتنی سی، چڑیا سی، جو ایک حکومت ہے، وہ بھی دوسروں کے ہاتھوں سے وضع کی گئی، اس تلاتم خیز مسلمانوں کے سمندر پر ان کے ہاتھوں ذلت آمیز سلوک ہو رہا ہے۔ یہ ایک ارب مسلمان ہیں۔ اب تم ہی آنکھیں نہ کھولو تو اور بات ہے ورنہ ذلت و پستی کی اس سے زیادہ اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔ یہ پوری امت ایک ارب کے قریب ہے، ان کے ہاتھوں سے جو کچھ ہو رہا ہے، اس سے روح کپکپا اُٹھتی ہے، عزیزانِ من! اس کی داستانیں سن سن کر وہ کیا کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں یاسر عرفات نے جا کر دعا مانگ لی اور یا پھر اس امریکا کے پاس اس کے خلاف مدد مانگنے کے لیے جا رہے ہیں۔ وہ امریکا جس کے بل بوتے پر یہ سب کچھ کر رہا ہے یہ عملی نہیں ہے، اب بھی غنیمت ہے، میں اپنی بصیرت قرآنی سے سمجھتا ہوں کہ اب بھی مہلت کا وقفہ ہے جو ہم زندہ ہیں لیکن وہ نتیجہ تو بدلے گا نظام کو بدلنے سے۔ کہا ہے کہ اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ (54:43) تم اپنے زمانے کے منکرین اور مخالفین سے پوچھو کہ کیا تم قوت اور شوکت میں اس سے بڑھ چڑھ کر ہو یا تمہارے لیے ہمارے صحیفوں میں معافی نامہ لکھا ہوا ہے۔ کہا کہ ان کا جواب سن لیجیے: اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ (54:44) یہ کہتے ہیں کہ ہمارا بڑا جتھہ ہے، ہمارے پاس بڑا لشکر جرار ہے، ہم مقابلے میں آئیں گے، ہمارے قبیلے اور مددگار بہت ہیں جو ہمارے ساتھ آئیں گے۔ جواب یہ ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ غلط نظام کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے مگر وہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے پاس بڑی قوت ہے، ہمارے پاس بڑی فوجیں ہیں۔

انسانیت کا سفر غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں ہی تہہ ہو سکے گا

عزیزانِ من! آپ کو یاد ہوگا میں نے شروع میں کہا تھا کہ جب قرآن مجید نے کہا تھا کہ ساعت آ پہنچی ہے اور وہ شقِ قمر، جہاں میں نے عرض کیا تھا، اور ساعت میں نے کہا تھا، کہ ہمارے ہاں تو وہ قیامت ترجمہ کر دیا، اور شقِ قمر ہو گیا وہ معجزہ، کہا تو قرآن مجید نے یہ تھا کہ وہ انقلاب کی گھڑی آ پہنچی ہے۔ جب یہ غلط نظام کے نتائج جو پہلے زیرِ زمیں چلے جا رہے ہوتے ہیں، پھر وہ ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں، اس کو الساعۃ کہتے ہیں، یہ کسی نتیجے کا اچانک سامنے آ جانا ہے، اسے الساعۃ کہتے ہیں۔ یہاں قرآنِ کریم نے یہ کہا کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے بڑے جتھے ہیں ہمارے ہاں بڑے لاؤ لشکر ہیں۔ کہا کہ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ (54:45) ان سے کہو کہ تم سب مل کر، میرے مقابلے میں متحدہ محاذ بنا لو اور میدان جنگ میں آ جاؤ۔ پھر دیکھو کہ تمہیں کس طرح شکست فاش ملتی ہے اور تم کیسے پیٹھ دکھا کر بھاگتے ہو۔ میں نے کہا تھا کہ ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ بدر کے میدان میں، نبی اکرم ﷺ جب لشکر آراستہ ہو رہے تھے تو حضورؐ اپنے خیمے میں یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے کہ اے خدا! تیرا وعدہ یہ ہے کہ کتنا ہی جتھہ بنا کر کیوں نہ آ جائیں، یہ شکست کھا کر بھاگیں گے۔

قرآن حکیم میں الساعۃ کا لفظ پوری نوعِ انسانی کے لیے برابری کی سطح پر استعمال ہوا ہے: یہ ہے انقلاب کی گھڑی!

میں نے اس وقت بھی عرض کیا تھا کہ ہمارے ہاں تو ان چیزوں کے لیے اول تو یہ بات ہے کہ یہ کوئی ہمارے لیے ہے ہی نہیں، یہ یہودیوں کے متعلق ہے، یہ نصاریٰ کے متعلق ہے، یہ مجوسیوں کے متعلق ہے، یہ تو شیخ عرب کے متعلق ہے، تمہارے متعلق اور ہمارے متعلق جنت ہے اور اس کی حوریں ہیں۔ قرآن حکیم میں ہمارے لیے بھی ضرور ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ دوسروں کے لیے ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ ہمارے ہاں نہیں ہے مگر انہوں نے الساعۃ کا ترجمہ قیامت کیا۔ شقِ قمر کا ترجمہ کیا وہ معجزہ حضورﷺ کا، ہمارے لیے یہ معجزات بیان کر کے اللہ میاں کی داد دینا ہے کہ کیا بات ہے۔ سبحان اللہ! کیا شعر کہا ہے! **معاذاللہ** . خود ان کے ہاں یہ چیز موجود ہے کہ بدر کے میدان میں حضورﷺ یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے۔ اس کے بعد آیا ہے کہ **بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ** (54:46) ہمارے قانون کے مطابق اس فیصلہ کن انقلاب کے محسوس طور پر سامنے آنے کا وقت مقرر ہو چکا ہے۔ یہ ان پر اچانک اور حیرت انگیز طریق سے آئے گا اور ان کے لیے بڑا ہی تلخ ہوگا۔ یہ دیکھو الساعۃ کا لفظ اسی آیت میں دو دفعہ آیا ہے، تو یہ ہے وہ الساعۃ، جو ہم جس سے تمہیں کہتے تھے کہ وہ آ جائے گی، اچانک انقلاب کی گھڑی آ جائے گی اور بڑی سخت ہوگی بڑی کڑوی کسیلی ہوگی، آسانی سے نگلی نہیں جائے گی، یہ الساعۃ ہے اور یہ آئی۔

انقلابات کی گھڑیں تو غیر محسوس شکل میں گھڑی کی سوئی کی طرح آگے سے آگے چلتی چلی جاتی ہے

یہ جو یہ حضرتِ موسیٰؑ کے قصے میں انقلابات آتے ہیں، آپ کو یاد ہے، وہ کہا تھا کہ فرعون کی طرف جاؤ۔ وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے اور وہاں یہ کہا تھا کہ اس سے پیشتر وہ الساعۃ نگاہوں سے مخفی، پوشیدہ چلی آ رہی تھی۔ اب ہمارا پروگرام یہ آ گیا ہے کہ وہ نمودار ہو کر سامنے آئے۔ اس کی طرف جاؤ۔ اسے الساعۃ کہتے ہیں تو قرآن حکیم کہتا ہے کہ یہ انقلابات یکلخت نہیں آیا کرتے، بہت دیر سے شروع ہو جاتے ہیں لیکن پہلے یہ نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں، جو تبدیلیاں آتی ہیں وہ ایسی غیر محسوس سی ہوتی ہیں کہ محسوس طور پر، مرئی طور پر، یہ نگاہیں ان کو نہیں دیکھ سکتیں، لیکن یہ تو رفتہ رفتہ، آہستہ آہستہ، بڑھتی چلی جاتی ہیں اور پھر ایک وقت آ جاتا ہے، جب میں نے کہا ہے کہ قدرت کے قانون کے مطابق ہر شے بتدریج ارتقائی طور پر، غیر محسوس طور پر، بڑھتی ہے، یہ اتنا سا بیج ہے، اس میں سے کونپل نکلتی ہے، کونپل اوپر چڑھتی ہے، پودا بنتی ہے، دن رات اس کے پاس بیٹھے رہیے، کبھی آپ کی نگاہیں اس چیز کو محسوس نہیں کر سکیں گی کہ یہ بڑھ رہا ہے، اس میں نشوونما آ رہی ہے تآنکہ اس میں پھر پھول آ جائیں گے، پھول کے بعد پھل آ جائے گا، اور پھل پھر آہستہ آہستہ بڑا ہوگا، پھر وہ پکنا شروع ہو جائے گا، خوردبین لے کر اس کے پاس بیٹھے رہیے۔ مجال ہے جو محسوس ہو جائے کہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ ہے وہ الساعۃ، جو آ رہی ہوتی ہے، محسوس طور پر

تمہیں دکھائی نہیں دیتی' بصیرت کی نگاہ تو دیکھ لیتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب پھر وہ نمودار ہو کر تمہارے سامنے آ جاتی ہے' تم اس وقت اس کو دیکھتے ہو۔ کہا ہے کہ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ (54:46)۔ یہ مَوْعِدُهُمْ (54:46) ہے کہ یونہی نہیں آ گئی' اس کے متعلق ان سے کہا جاتا تھا کہ وہ تباہی آئے گی' آ گئی ہے' چلی آ رہی ہے' اس کو تو صرف ایک وقت میں بے نقاب ہونا ہے' وہ کہیں باہر سے نہیں ہونا ہے اور پھر کہا ہے کہ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ (54:47)۔ اب ان کی آ گئی یہ تفصیل اس ساعت میں' اس انقلاب کے لیے یہ مجرمین یہاں پھر وہی لفظ آ گیا۔ مجرمین سب سے بڑی' سب سے بڑا تباہی کا موجب جو ہوتا ہے' وہ جرم ہے۔

عربوں کے ہاں لفظ جرم کا وہ مفہوم جسے فرعون کی مثال میں ایک محسوس شکل میں بیان کیا گیا ہے

ہمارے ہاں تو جرم کرائم (Crime) کو کہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ عربی زبان میں' عربوں کے ہاں' کسی دوسرے کے درخت کا پھل کاٹ کر لے جانا' یا بھیڑ کی اون مونڈ کر اپنے ہاں لے جانا اسے جرم کہتے ہیں۔ جرم تو ہے ہی ایک دوسرے کے پھل کو کاٹ کے لے جانا۔ یہ جو اس بھیڑ بیچاری کے لیے یہی تو سردی سے اپنے آپ کو بچانے کا لباس سامان ہوتا ہے' وہی غریب کے پاس بھی ہوتا ہے' کسی کا دیا ہوا نہیں ہوتا' کسی کا اوڑھایا ہوا نہیں ہوتا' اس کا اپنا ہوتا ہے' خود اپنے چار پیسوں کی خاطر سارا مونڈھ کر لے جاتے ہو اور اس کو ٹھٹھرتی ہوئی چھوڑ جاتے ہو۔ اندازہ لگایئے' عزیزانِ من! یہ قوم اور اس قوم کے جو الفاظ تھے' کیا اس سے بڑا جرم کوئی انسانیت میں ہو سکتا ہے کہ دوسرے کی محنت کا پھل بھی کاٹ کر لے جاؤ۔ یہ چیزیں فطرت نے اس کو دی ہوئی ہیں' کوئی چھین کر لے جائے اور اس کو برہنہ کر دے اور ننگا چھوڑ دے' یہ جرم ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ (54:47)۔ یہ تھے مجرم' آج دیکھو کہ کس قدر یہ مصیبت میں ہیں' تباہی میں ہیں' عذاب میں ہیں۔

قرآن حکیم کے الفاظ میں عذاب کا وہ مفہوم جو ہماری نظروں سے اوجھل ہے

یہ جو ہم اب لفظِ عذاب بولتے ہیں تو جھٹ سے ہمارے ہاں قیامت کا جو دوزخ ہے' اس کے شعلے آتے ہیں' گویا یہاں کچھ نہیں ہوتا۔ اس کا تباہی ترجمہ کرو تو کہتے ہیں کہ نئی بات ہے جی! اس لیے کہ پھر تو اپنے آپ کو مبتلائے عذاب سمجھنا پڑے گا کہ معاذ اللہ ہم اس کے محبوب کی امت ہیں۔ عذاب تو وہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ (1:7) کا ترجمہ چلا آ رہا ہے کہ صاحب! مغضوب علیہ یہودی ہیں۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ جن کے ہاتھوں ایک ارب مسلمانوں کی یہ حالت ہو رہی ہے' مغضوب علیہ آج بھی وہی ہے اور یہ ضآلین عیسائی ہیں۔ آپ مسلم ہیں اور مسلم ممالک میں ہیں۔ صراط یہ سیدھا راستہ تو ہے مگر ان کا نہیں ہے ہمارا وہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (1:7) ہے۔ ہم مغضوب علیہ اور ضآلین کا راستہ چل تو رہے ہیں' سیدھے ہی ہم ان کے اوپر ہیں بس اتنا سا فرق ہے کہ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ

فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوۡهِهِمۡ ذُوۡقُوۡا مَسَّ سَقَرَ (54:48) جب انہیں اُس تباہ کن عذاب میں منہ کے بل گھسیٹا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ اب جہنم کا مزہ چکھو۔ یہاں اب پھر وہی آگ اور اس کا عذاب ہے اور وہ جہنم' قیامت ہے اور اس عذاب کا ذکر ہے۔ عزیزانِ من! پچھلے دنوں دیکھیں کہ اخبارات میں یہ چیز آئی ہے۔ فلسطینیوں کے ساتھ لبنان میں' آخری مرحلے پر' جو کچھ ہوا ہے' اس سے شدید تر عذاب کی کوئی شکل اور بھی ہوسکتی ہے! کہا ہے کہ یہ اس عذاب کے اندر' آگ کے اندر گھسیٹے جائیں گے۔ یہ کہا جائے گا کہ ہم اب سب اتنے عرصے کہتے چلے آرہے تھے تم اس کو جھوٹا سمجھ رہے تھے' بار بار تمہیں دلائل اور بصیرت سے' شواہد سے' ثبوت سے وارن کیا جارہا تھا لیکن تمہارے کان پہ جوں نہیں رینگتی تھی۔ اب دیکھ لیجیے۔ ذُوۡقُوۡا مَسَّ سَقَرَ (54:48) اب جہنم کا مزہ چکھو۔

ساعت کو ظاہر ہونے کے لیے آخر کسی وقت کا انتظار کیوں؟ یہ ہے اس کی قدر اور وقفہ مہلت!

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ اتنے عرصے جو ہم یہ کچھ کر رہے تھے' تیرہ سال نبی اکرمؐ مکے میں بھی ان کو وارننگ دے رہے تھے' آخر میں جا کر مدینے کے پہلے دوسرے سال میں یہ ساعت نمودار ہوئی۔ اب یہ ہے کہ وہ پہلے ہی دن کیوں نہ ہوگیا' شروع میں ہی کیوں نہ ہوگیا؟ کیا بات ہے! کہا کہ اِنَّا كُلَّ شَیۡءٍ خَلَقۡنٰهُ بِقَدَرٍ (54:49)۔ یہ اس لیے ایسے نہیں ہوا کہ ہم نے ہر چیز کے لیے ایک پیمانہ بنا رکھا ہے' ایک قانون بنا رکھا ہے' بیج کے پھل تک جانے کو اس کی قدر کہتے ہیں' اسی کو تقدیر کہتے ہیں۔ بیج کی یہ تقدیر ہے جس میں سے وہ گزر کر پھل تک پہنچتا ہے۔ یہ ایک پیمانہ ہے جس کے مطابق ماپا جاتا ہے کہ اس کی نشو ونما ہو رہی ہے اور وہ کہاں تک ہوئی ہے۔ کہا کہ یہ بات ہے کہ یہ پہلے دن کیوں نہیں ہوگیا۔ اگر کوئی پوچھے کہ اب جو چھ مہینے کے بعد' یا آٹھ مہینے کے بعد' جا کر اتنا سا وہ آم لگا ہے جب ہم نے گٹھلی بوئی تھی' اسی دن کیوں نہیں ہوگیا؟ وہ کہا کہ اس کے لیے ہم نے قدر مقرر کی ہوئی ہے' ایک پیمانہ مقرر ہے۔

قوموں کے جرائم یا ان کے اعمال اور اس کے محسوس نتیجے کے درمیان جو وقفہ ہوتا ہے' وہ ہے جو پیمانہ ہوتا ہے' ایک قانون ہوتا ہے مکافاتِ عمل کا' اور اس میں قانون ہوتا ہے مہلت کا' اور یہ بھی اس کی بڑی رحمت ہے کہ وہ پہلی ہی لغزش پر ٹینٹوا نہیں دبا دیتا' مہلت کا وقفہ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم تو اپنے بندوں کے اوپر بڑے رحیم واقع ہوئے ہیں' ہم نے تم سے انتقام لینا ہے کہ ذرا سا ہمارے خلاف یوں کیا اور ہم نے پکڑا؟ او سوال تو اسی کا ہے کہ اس لیے ان کو یہ وارننگ دی جاتی ہے اور مہلت دی جاتی ہے اور دو چیزیں قوموں کی تباہی اور وارننگ کے سلسلے میں یاد رکھیے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پہ اور دو تین جگہ پہ نمایاں الفاظ میں یہ کہا ہے کہ اس کے لیے دو شرطیں ہوتی ہیں۔ پہلی چیز یہ ہے کہ ان تک یہ بات پہنچانے والا کوئی ہو یا یہ بات پہنچ گئی ہو کہ ان کا نظام غلط ہے' تباہ کن ہے اور وہ ایک دن اس کے ہاتھوں تباہ ہو جائیں گے۔ یہ بات پہنچائی جائے اور دوسری شرط یہ ہے کہ ان میں اس بات کے سمجھنے کی صلاحیت ہو۔ کیا بات ہے اور پھر

مہلت کا وقفہ ہو۔ کہا ہے کہ اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ o وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ (50-54:49) اس کے یوں سامنے آنے میں اتنی دیر اس لیے لگتی ہے کہ ہم نے ہر شے کے اندازے مقرر کر رکھے ہیں اس لیے ہر عمل کو نتیجہ خیز ہونے کے لیے وقت درکار ہے۔ ہمارے قانونِ مکافات کا یہی انداز ہے اور جو فیصلہ ہوتا ہے ہمارے قانون کا' وہ تو آنکھ جھپکنے میں سامنے آ جاتا ہے۔ وہ قدر کا جو مرحلہ ہے اس میں سے بھی تو گزرنا ہوتا ہے۔ یہ بات ہے کہ اس جرم کا نتیجہ تباہی ہے' وہ فیصلہ تو آنکھ کے پلک جھپکنے کی بھی دیر نہیں لگتی' سریع الحساب ہے' بڑی جلدی حساب کرتا ہے لیکن اس حساب کے ہی معنی یہ ہیں' یہ بتاتا ہے کہ اس کے لیے اتنا وقفہ ہوگا' ان مراحل میں سے یہ بات گزر کر آخر میں اس انجام تک پہنچے گی ورنہ ہمارے قانون کا فیصلہ تو آنکھ جھپکنے میں جو وقت لگتا ہے اس سے بھی کم ہے۔ ان سے کہو کہ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ (54:51) . یہ تھیں تمہارے جیسی اور قومیں جو اپنے جرائم کے نتائج میں ہمارے قانون کے مطابق یوں ہلاک ہوئیں' وہ ختم ہوئیں اور اس کے بعد کہا ہے کہ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (54:51) کیا کوئی ہے تمہارے ہاں ایسا کہ جو اس سے نصیحت پکڑے!

قانون خداوندی میں جرم کے سرزد ہونے کا معیار اور تطہیر قلب ونگاہ کی اہمیت اور تقویٰ کا مفہوم

عزیزانِ من! وَكُلُّ شَیْءٍ فَعَلُوْهُ فِی الزُّبُرِ (54:52) یہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں' ہم اسے' اپنے قانونِ مکافات کے رجسٹر میں محفوظ کیے جا رہے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ کر لیا ہے' حکومت ہماری ہے' مملکت ہماری ہے' قوت ہماری ہے' کارندے ہمارے ہیں' ہمیں کون دیکھ رہا ہے! کہا کہ انہیں پتہ نہیں کہ جو کچھ بھی یہ کرتے ہیں' وہ ہمارے قانونِ مکافات کے رجسٹر میں درج ہوتا ہے پھر کہا کہ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ (54:53) چھوٹی بات' بڑی بات' کوئی بھی ہو' اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہتی' ایسا نہیں ہوتا کہ اس میں کوئی چیز بھی چھوٹ گئی ہو۔ وہ تو کہتا ہے کہ ہم تو نگاہوں کی خیانت اور دل میں گزرنے والے خیالات تک سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ جرم یہ نہیں ہے کہ وہ سرزد ہو کر محسوس شکل میں سامنے آئے تو جرم کہلائے' اس سے پیشتر آپ کی نیتیں کتنی بھی ہوں' ارادے کچھ بھی ہوں' ان پہ تو گرفت ہی نہیں ہوسکتی' نہ وہ قانوناً جرم ہوتا ہے' لیکن وہ تو چور کو نہیں چور کی ماں کو مارتا ہے' وہ تو جب دل میں ارادہ پیدا ہوتا ہے' وہ کہتا ہے یہیں سے تو سارا شر اُٹھتا ہے' بیج تو یہی ہے اور اسی لیے وہ جو زور دیتا ہے' وہ تطہیر قلب ونگاہ پہ دیتا ہے کہ خیالات اور ذہنیت کے اندر' جذبات کے اندر' قلب کے اندر' صحیح تعلیم بھی ہو۔ یہاں سے وہ اپنی تعلیم شروع کرتا ہے تو اگر جرم کا خیال ہی نہ گزرے تو جرم سرزد ہی نہیں ہوسکتا۔ کہتا ہے کہ كُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ (54:53) اس میں ہر چھوٹی اور بڑی بات درج ہوتی رہتی ہے۔ یہ تو ان کی کیفیت ہے جنہوں نے غلط نظام کے مطابق زندگی بسر کی۔

یہ سورۃ القمر کی عزیزانِ من! آخری دو آیتیں آ گئیں۔ اس کے برعکس کہا ہے کہ اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ (54:54) جنہوں نے اس بات کی احتیاط برتی کہ غلط نظامِ زندگی نہ برتا، صحیح نظام کے اوپر رہے، تقویٰ کے معنی ہوتا ہے نگہداشت رکھنا، کسی غلط بات کے انجام سے ڈرنا، کہ آگ میں انگلی ڈال دی تو جل جائے گی۔ اس کو تقویٰ کہتے ہیں۔ یہ متقی پرہیز گار ہمارے ہاں تو آپ کو پتہ ہے کہ کون ہوتے ہیں۔ وہ ذہن میں تصور ہی نہیں ہے۔ ہماری اگلی نسل نے تو شاید وہ اس قسم کے دیکھے ہی نہ ہوں، وہ ہوتے تھے متقی پرہیز گار، وہی عاجز سے بندے، غریب سے بیچارے، معاف رکھیے، میں کسی کی تحقیر نہیں کرتا، وہ گاؤں میں عام طور پہ جولاہے ہوتے تھے ان کو بڑی تحقیر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، متقی پرہیز گار او ہندے سی، او ہی اذان دیندے سن، او ہی اذان پڑھوندے سن بیچارے، کہ او کمیاں دی لسٹ وچ اوناں داناں ہوندا سی، (وہ متقی پرہیز گار ہوتے تھے، وہی اذان دیتے تھے، وہی بیچارے اذان پڑھاتے تھے۔ ان کا نام کمیوں کی لسٹ میں درج ہوتا تھا) گاؤں کے کمی کمین ہوتے تھے ناجی! میں کسی کی تحقیر نہیں کر رہا، میں بات بتا رہا ہوں۔ ہمارے معاشرے کا نظام یہ تھا کہ وہ جو وہاں ہوتے تھے دھوبی، نائی اور کمہار ہوتے تھے اور یہ جو مردم شماری کا رجسٹر تھا اس میں، اس خانے میں، امام مسجد کا بھی نام ہوتا تھا۔ اب کام تو ہوتا تھا کہ اذان دی، جماعت کرا دی اور جو باقی وقت تھا، وہ سارا وقت، وہ ذرا سا بھی محلے میں، یا گاؤں میں ذرا سا جو کام ہوتا تھا، وہ سارے ان کے گھر کے آ جائیں کہ ذرا منڈے نوں او تھے کھلا لیا تھوڑا جیا، اے او تھے دے آ، او میاں وی جیہڑے سن او وی سارا دن اے کر دے پھر دے سن (کہ ذرا اس بچے کو تھوڑا سا گھما دو، کھیل کرا دو، یہ وہاں دے آ و، وہ جوان کے میاں تھے وہ بھی سارا دن یہی کام کراتے تھے)۔ ان کو کہتے تھے متقی پرہیز گار۔

متقی کے لیے انسانی زندگی ایک جوئے رواں کی نوید ہے

عزیزانِ من! کہاں سے بات کہاں جا پہنچی ہے۔ وہ متقی تو اس بات کا نگہداشت رکھنے والا تھا کہ غلط نظام قائم نہ ہو جائے۔ اس کو متقی کہتے ہیں۔ اس احتیاط کو تقویٰ کہتے ہیں۔ جرم کا سرزدہ ہونا تو ایک طرف، اتنی احتیاط برتنا کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے، جرم کرنا تو وہ آگے کی بات ہے۔ متقی تو وہ ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ (54:54) اسی قانونِ مکافات کے مطابق، صحیح اور غلط روش چلنے والوں کے فیصلے ہوں گے۔ غلط روش پر چلنے والے تباہی اور بربادی کے جہنم میں اور صحیح روش پر چلنے والے، متقین، سدا بہار، فراخیوں اور خوش حالیوں کی جنت میں۔ یہاں یہ نہر آیا ہے۔ یاد رکھے گا! یہ نہر ہوتی ہے، اس کے تو معنی ہوتا ہے آبِ رواں، یہ جو ہے یہ نَهر ہے، یہ جو شادابیاں ہیں، یہ نَهر ہے۔ کیا بات ہے اس زبان کی! میں تو کانپ اُٹھتا ہوں، ذرا سا فرق زبر ڈال دو تو اس کے معنی اور ہی ہو گئے۔ اس کی وجہ سے، اس پانی کی وجہ سے، جو شادابیاں، خوشحالیاں پیدا ہوتی ہیں، وہ اس کے لیے ذرا سا فرق ہے۔ وہ نُهر ہے، یہ نَهر ہے، یہ شادابیوں کی

زندگی کے اندر ہے۔ کہا ہے کہ فِیۡ مَقۡعَدِ صِدۡقٍ (54:55) یہاں مُّقۡتَدِرٍ (54:55) ہے۔ یہ بھی مقام یا مرحلہ ہے' آخری منزل نہیں ہے' صرف بیٹھنے کا مقام ہے' تھوڑے دیر یہاں بیٹھیے بھئی! تو پھر آگے چلیں گے۔

موت اک زندگی کا وقفہ ہے' آگے چلیں گے دم لے کر

یہ دم لینے کے لیے بیٹھنا ہے۔ کیا لفظ استعمال کیا! میں نے عرض کیا ہے' عزیزانِ من! بات تو یہی گزر جاتی ہے' وہ تو بہت بڑی حقیقت بیان کر جاتا ہے' اسے جو ذہن میں سمجھتے ہو' تو چلیے جنت کی جو زندگی ہے' وہ آخری منزل ہے اور اس کے بعد پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ صاحب! اتنا عرصہ اسی طرح کے طرزِ زندگی میں پانی پینے سے آدمی چند دنوں میں کمزور ہو جائے گا۔ انہیں پتہ نہیں ہے کہ وہ آخری منزل نہیں ہے' وہ تو صرف ستانے کا مقام ہے' تھوڑی دیر بیٹھنے کا مقام ہے' کیا بات ہے! اس کے ساتھ ملا ہوا کہا ہے کہ عِنۡدَ مَلِیۡکٍ مُّقۡتَدِرٍ (54:55) اب فرق بتا دیا' ایک نبی کے مقتدر' صاحبِ حکومت' صاحبِ اقتدار ہونے میں اور فرعون میں جس نے کہا تھا کہ میں ذبح کر دوں گا' ایک یہ خدا ہے' نبی کے مقتدر' خاص طور سے وہ وہاں یہ الفاظ لایا ہے کہ ایک اس کی حکومت ہے جس کی حکومت کے اندر جَنّٰتٍ وَّ نَہَرٍ ٥ فِیۡ مَقۡعَدِ صِدۡقٍ (54:54-55) ہے' یہ وہ مقام ہے جس میں زندگی کی تمام خوشگواریاں موجود ہیں اور جس کی ممکنات بے کراں ہیں' اسی لیے کہ یہ اس خدا کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ جو تمام اختیارات اور اقتدارات کا مالک ہے۔ یہ کیفیت ہے' دونوں میں فرق ہے' قوت بجائے خویش معیوب چیز نہیں ہے' یہ ذریعہ ہے کسی دوسری چیز کو حاصل کرنے یا پہنچانے کا' اس قوت کے ذریعے سے اگر استحصال کرنے والوں کی کلائی موڑ دی جائے' اگر ظالم کے سینے میں خنجر چبھو دیا جائے' یہی قوت جو ہے یہ ہزار نیکیوں کا باعث ہے' اگر مظلوم کی کلائی آپ نے مروڑ دی ہے تو آپ کی یہی قوت عذاب جہنم بن جاتی ہے۔ قوت تو وہی چیز ہوتی ہے' نبی کے مقتدر ہونے اور فرعون میں بھی ہے' جس کا پہلے ذکر کیا ہے' فرعونی قوت انسانیت کو نچوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ ایک خدا بھی ہے کہ جس کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے نظام پہ چلنے والے جو ہیں' وہ زندگی کی شادابیوں خوشحالیوں کے بے کراں ممکنات کے اندر رہیں گے۔ یہ ہوگا ان کا انجام' وہ ہوگا اس کا انجام۔

یہ سورۃ القمر کی آخری آیت آ گئی تھی۔ اب اگلے درس میں ہم سورۃ الرحمٰن لیں گے' صاحب! نام سے بھی دلوں کے اندر ایک وجد پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ہے الرحمٰن۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

سورة الرحمٰن

پہلا باب: سورۃ الرحمٰن (آیات 1 تا 12)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جنوری 1983ء کی 7 تاریخ ہے اور درس قرآن کریم کا آغاز سورۃ الرحمٰن سے ہو رہا ہے۔ یہ 27 ویں پارے کی 55 ویں سورۃ ہے: (55:1)۔

ہم آہنگ ہونے کی صفات کے زیور سے آراستہ سورۃ الرحمٰن اپنی مثال آپ ہے

یوں تو قرآن کریم اپنی تعلیم، پیغام، حقائق اور معارف میں بھی بے نظیر ہے، بے مثال ہے، اس کا اسلوب بیان بھی ایسا ہے کہ وہ بھی اپنے انداز کا واحد منفرد اسلوب ہے اور جو اس زمانے میں اہل عرب کو چیلنج دیا گیا تھا وہ آج تک چلا آ رہا ہے کہ تم اس کی مثل ایک سورۃ بنا کر لاؤ۔ اس میں حقائق اور معارف کا بھی تعلق ہے اور اندازِ بیان کا بھی۔ یہ عجیب چیز ہے کہ آج تک یہ چیز خود اہل عرب، جو زبان کے اعتبار سے اتنی بلندیوں پر پہنچے ہوئے تھے کہ اپنے سوا باقی دنیا کو وہ عجمی یا گونگا کہتے تھے اور اب تو تحقیق کی رو سے معلوم ہوا ہے کہ عربی زبان ساری دنیا کی مختلف زبانوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ وسیع تھی، سب سے زیادہ گہری تھی، ان کے لیے بھی یہ صورت ہے کہ وہ طے نہیں کر پائے کہ قرآن حمید کا اسلوب نثر ہے یا شعر ہے یا نظم ہے۔ اور اگر ہے تو اس کا یہ انداز کیا ہے۔ ویسے تو سارا ہی قرآن حکیم اس قسم کا فصیح و بلیغ ہے لیکن بعض سورتیں خاص طور پر اس میں اپنی اس خصوصیت کو نمایاں طور پر اپنی پیشانی پہ لیے ہوتی ہیں، انہی میں سورۃ الرحمٰن بھی ہے۔ اقبال (1938-1877ء) نے مردِ مومن کی جو صفات گنائی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ

آہنگ میں یکتا صفت سورۂ الرحمٰن ❶

(اقبالؒ: ضربِ کلیم' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996ص۔84)

آہنگ میں بھی یہی یکتا ہے۔ اگر کوئی الفاظ کو ہی سن پائے تو وہ بھی دیکھے گا کہ یہ آہنگ کس قسم کا ہے۔ کہا ہے کہ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ o عَلَّمَهُ الْبَيَانَ o اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ o وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ (55:2-6)۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ آہنگ کس انداز سے چلا ہے اور یہ ساری سورۃ اسی انداز کی ہے۔

یہ بات شروع ہو رہی ہے کہ اَلرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (55:1-2)۔ رحمٰن کا لفظ قرآن کریم میں بکثرت آیا ہے لیکن جو چیز ہے کہ رحمٰن نے یہ چیز کی' رحمٰن نے ایسا کیا' یہ یہیں آیا ہے اور اس میں بڑی خصوصیت ہے۔ کہا ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے رحمٰن نے دی۔ اب سوال یہ ہے کہ رحمٰن ہی کیوں ہے؟ اللہ کا لفظ بھی چلا آ رہا تھا' رب کا لفظ بھی چلا آ رہا تھا اور متعدد صفات خداوندی یعنی اسمآء الحسنٰی بھی چلے آ رہے تھے' اس میں خصوصیت سے یہ الرحمٰن کیوں آیا ہے۔

علم وحی اور علم انسانی میں ایک بنیادی فرق ہے

وحی کے معاملے میں خصوصیت سے یہ کہا گیا ہے کہ اَلرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (55:1-2) وحی جو عطا کی تو رحمٰن نے عطا کی۔ اس کے اندر عجیب چیز ہے۔ انسانوں کا علم اکتسابی (Acquired) ہوتا ہے' انسان دوسرے سے تدریجاً (Gradually) سیکھتا ہے' رفتہ رفتہ آگے بڑھتا ہے اور اسے یہ مشق مسلسل جاری رکھنا پڑتی ہے۔ بچے کو آپ الف ب سے ہی شروع کیجیے تو آپ دیکھیے پھر اس کو آگے ایم اے تک پہنچنے میں کن منازل سے گزرنا پڑتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ کتنا آگے بڑھتا ہے' بتدریج انہیں حاصل کرتا ہے۔ اس کے برعکس وحی ایک ایسا علم ہے۔ جو اس سے بالکل منفرد ہے۔ وہ نبی پر نازل ہوتا ہے' وہ خدا کی طرف سے یکلخت نازل ہوتا ہے' پہلے دن مکمل نازل ہوتا ہے جو کچھ کہا جاتا ہے۔ اس میں تدریج نہیں ہے' اس میں رفتہ رفتہ کسی مقام تک پہنچنا نہیں ہے' اس میں اکتساب (Acquiring) نہیں ہے' سیکھنا (Learning) نہیں ہے' یکلخت ایک چیز آتی ہے' پہلے دن ہی بذریعہ وحی اپنی حقیقت کو' اپنی مکمل شکل میں' خدا نازل کر دیتا ہے' یہ نہیں ہے کہ یہ تیئیس سال ❷ کے عرصے میں قرآن نازل ہو حضور پہ اور جو پہلے شروع میں نازل ہوا ہے' وہ ابتدائی چیز تھی پھر وہ

---

❶ فطرت کا سرود ازلی اس کے شب و روز۔ آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن۔

❷ یہ چیزیں بڑے گہرے غور و خوض کی متقاضی ہیں' نیز دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ حٰمٓ السجدہ (پہلا باب)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2008۔ مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الشعرآء' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2008' ص۔338۔ مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ البقرۃ (3)' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2011ء' باب' 51' ص ص۔ 263 تا 281 نیز

The entire Qur`an was revealed upon Prophet`s heart (down-loaded) n Ramadan of 610 CE in order as we see today. Thereafter, it was conveyed to people in stages. The Concepts therein are not. defunct theories and empty hypotheses. It has a Permanent Universal Code of Values and Laws. http://www.facebook.com/awais durrani1/posts/738610699531135, retrieved on 12.07.2014.

آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہوئی وہ چیز آخر تک پہنچ گئی جو کچھ خدا نے کہنا تھا پہلے دن کہا' آخری دن کہا' وہ اپنی شکل میں منفرد تھا' مکمل تھا' بتدریج وہاں نہیں پہنچا ہے' یکلخت وہاں پہنچا ہے۔ایک چیز یکلخت پہنچتا ہے۔

لفظ نزول کے اندر قرآن حکیم کا اعجاز ہے۔انسان کا علم سوچ اور فکر و غور اور تدبر کا بھی نتیجہ ہوتا ہے' انسان کچھ سیکھتا (Learn) کرتا ہے پھر اس پہ غور کرتا ہے۔یہ چیز اندر سے باہر آتی ہے' اس کے برعکس وحی انسانی فکر کی پیدا کردہ شے نہیں ہوتی کہ اس کے اندر سے باہر آئے' یہ خارج سے' اوپر سے' ایک علم ہے جو وحی کے مہبط سے قلب مبارک پر نازل کیا جاتا ہے' خود لفظ نزول کے اندر بھی یہ چیز ہے کہ یہ انسان کی فکر کا نتیجہ نہیں ہے' یہ تو وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى (53:3) ہے۔پیغمبر اپنے خیالات اور اپنی فکر سے یہ بات نہیں کہتا۔ یہ وَحۡىٌ يُّوۡحٰى (53:4) ہے' یہ وحی ہے۔اس میں اس کی اپنی فکر کا بھی دخل نہیں ہے اور یہ بھی نہیں ہے کہ یہ حقائق بتدریج اپنی تکمیل تک پہنچے ہوں۔جو بات بھی خدا نے کہی وہ پہلے دن مکمل تھی۔لَا تَبۡدِيۡلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (10:64) میں پہلے دن کی وحی بھی ہے اور آخری دن کی وحی بھی ہے۔تو وحی یکلخت آتی ہے۔وہ جو اکتساب علم کا انسانوں کا تدریجی طریق تھا' اس سے یہ بالکل ہٹی ہوئی' منفرد شے ہے یعنی خود وحی ایسی چیز نہیں ہے کہ بلا نظیر اور بلا مثال ہو بلکہ اس کا علم دینے کا خدا کی طرف سے بذریعہ وحی جو طریق ہے' وہ بھی منفرد ہے۔یہ چیز یکلخت ملتی ہے۔اس دور میں تو جہاں تک میری نگاہ نے کام کیا ہے سائنس کی دنیا میں بھی یہ بات ابھی نہیں آئی تھی کہ کیا چیز آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے آگے بڑھی ہے اور کیا چیز یکلخت آئی ہے۔

ہمارے دور کا پیدا کردہ نظریہ ارتقا

ہمارے اس دور میں جسے نظریہ ارتقا کہا جاتا ہے' جسے Theory of Evolution کہا جاتا ہے' وہ نظریہ ارتقا یہ ہے کہ زندگی سب سے پہلے جسے اولیں جرثومہ (سیل) کہتے ہیں' کے ذریعے آئی۔وہ Life Cell تو بظاہر' جسے آنکھ Nakd eye کہتے ہیں' سے بھی دیکھا نہیں جاتا' خوردبین کے ذریعے سے اس کو دیکھتے ہیں۔یہ ایک سیل ہے جس میں زندگی کی پہلی نمود ہوئی اور پھر وہاں سے وہ مختلف منازل طے کرتی ہوئی' منزل بہ منزل' رفتہ رفتہ' بتدریج آگے بڑھتی ہوئی چلی آئی۔زندگی (لائف) نے مختلف پیکر اور مختلف شکلیں اختیار کیں لیکن یہ بتدریج آگے بڑھتی چلی آئی۔یہ مختلف Species جنہیں انواع کہتے ہیں' ان میں سے ہر نوع نے اپنے اپنے مختلف ادوار میں شکل اور پیکر اختیار کیا اور ایک سے آگے دوسری کڑی' دوسری کڑی سے تیسری کڑی ملی تو یہ کڑیاں ملتی ہوئی آگے پہنچتی چلی گئیں تآنکہ زندگی پیکر انسانی میں نمودار ہوئی۔یہ Progressive Evolution (تدریجی ارتقا) کہلاتا ہے۔وہ اپنی تحقیق میں ہر کڑی کے متعلق بتاتے ہیں کہ پچھلی کڑی کی کونسی چیزیں اس میں آئیں اور کون سی چیزیں Progressively (بتدریج) آگے بڑھ کر اس کے اندر آئیں اور یہ کڑی پھر آگے کیسے چلی۔یہ بڑا Interesting (دلچسپ) علم ہے۔

نظریہ ارتقا کی دو قسمیں: بتدریج اور یکلخت

اس سلسلہ میں یا اس نظریئے میں ان محققین کے سامنے، تحقیق کے دوران، ایسے مقام بھی آئے، جہاں یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ یہ تو پچھلی کڑی کے بعد کی کڑی نظر نہیں آتی، اس میں تو کچھ ایسا تغیر ہوتا ہے کہ وہ جو Progrssive Evolution (تدریجی ارتقا) کا نظریہ تھا وہاں آ کر وہ فیل ہو جاتا تھا، وہاں کوئی چیز ایسی تبدیل ہوتی تھی کہ یک لخت ملی ہوتی تھی، ہنگامی ہوتی تھی۔ چنانچہ درس میں تو اتنا وقت نہیں ہوتا کہ میں درسی طور پر یا نصابی طور پر ان چیزوں کو سمجھا سکوں، اشارے ہی دیئے جا سکتے ہیں تو ان لوگوں نے Evolution یا ارتقا کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک تو وہی بتدریج آنے والی کڑی سے کڑی ملنے والی، اسے ان لوگوں نے Progrssive Evolution (تدریجی ارتقا) کہا اور ایک وہ چیز ہے کہ جسے ایک چیز کا یکلخت نمودار ہو جانا کہتے ہیں، اسے انہوں نے Emergent Evolution کہا۔ اس کے لیے عربی لفظ تو فجائی ہی ہے، آپ ہنگامی کہہ لیجیے یعنی یکلخت کوئی چیز جو نمودار ہو جائے۔ یہ نظریہ ارتقا اس دور کی تحقیق کا بڑا شاہکار مانا جاتا ہے۔ نظریہ ارتقا میں پھر یہ دو قسم کے ارتقا ہیں جو میں نے اپنی کتاب ''ابلیس و آدم'' [1] یا میرا خیال ہے ''مطالب الفرقان کی دوسری جلد'' [2] میں Discuss (شرح و بسط سے بیان) کیے ہیں۔ اس وقت تو مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ یہ سائنس کی Discovries (انکشافات) اس نتیجے پہ پہنچتی ہیں کہ Evolution (ارتقا) بھی دو قسم کی ہیں: ایک بتدریج آنے والی اور دوسری علم کی دنیا میں ہنگامی طور پر، فوری اتر آنے والی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ عام انسانی علم جو انسان اکتسابی طور پر حاصل کرتا ہے، وہ Progessive Evolution کے اندر آتا ہے، بتدریج آتا ہے اور یہ جو وحی ہے یہ اس Progressive (بتدریج) میں نہیں آتا۔ یہ کس میں آئے گا؟ یہ Emergent Evolution (فجائی ارتقا) میں آئے گا، یہ کڑیوں سے ہٹی ہوئی بات ہے، اور یہ چیز سائنس کی دنیا میں بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ جو نئی چیز جسے ہم Emergently (فجائی طور سے) کہتے ہیں، باہر آئی ہے، تو اس کا کیا Cause (سبب) تھا، کیا اسباب تھے، جن کی وجہ سے یہ چیز آ گئی؟ یہ چیز ابھی تحقیق نہیں ہوئی۔

وحی کے متعلق اگر سائنٹفک لینگویج (سائنسی زبان) میں کہا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ علم کی دنیا میں اکتسابی علم جو انسان حاصل کرتا ہے وہ کسی شعبہ اور گوشہ سے متعلق کیوں نہ ہو وہ تو اکتسابی اور Progessive Evolution (تدریجی ارتقا) کے ذریعے ہوتا ہے اور وحی کے متعلق اگر ہم اس Terminology (اصطلاح) میں کہنا چاہیں جو سائنس کی Evolution (ارتقا) کی ہے کہ یہ Evolve ہو کر نہیں آتا، اس طرح سے ارتقائی طور پر آگے نہیں بڑھتا، یہ Emergent Evolution (فجائی ارتقا) ہے، یکلخت حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، حقیقت اپنے آپ کو نبی پر خود منکشف کرتی ہے، نبی اس کا انکشاف نہیں کرتا۔

---

1. اس کے لیے دیکھیے پرویزؒ: ابلیس و آدم، ادارہ طلوع اسلام لاہور 1983، ص ص 2 تا 36 (عنوان: انسان)۔
2. دیکھیے: پرویزؒ: مطالب الفرقان، ادارہ طلوع اسلام لاہور 1983، ص ص۔ 3 تا 70 (عنوان: تمہید سرگزشتِ آدم)۔

سائنس کے بالمقابل وحی حقائق کا ازخود انکشاف کرتی ہے

سائنس کی ساری، جتنی بھی یہ Disoveries (انکشافات) ہیں، اس کو Discover (بے نقاب کرنا) کہتے ہیں کہ حقائق موجود ہوتے ہیں، اس پہ ایک Cover (نقاب) پڑا ہوتا ہے، ایک پردہ پڑا ہوتا ہے، یہ اس پردے کو اٹھا دینا ہے، حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ وحی کے معاملے میں یہ چیز نہیں ہے کہ نبی خود پردہ اٹھا دے اور حقیقت سامنے آجائے، نبی کا اس میں دخل ہی نہیں ہوتا، وہاں حقیقت اپنے آپ کو خود بے نقاب کر کے وحی کے ذریعے نبی کے سامنے لے آتی ہے تو اس کے لیے میں نے آپ سے کہا ہے کہ آج کی اصطلاح میں یوں کہیے کہ یہ ہنگامی Emergent Evolution (فجائی ارتقا) ہے۔

وحی کے لیے عربی زبان کی آبیاری اور اس کی خصوصیت

عربوں کے ہاں کی زبان ملاحظہ فرمائیے۔ آپ کو یاد ہے، میں نے بارہا یہ بات کہی ہے کہ زبان کے اعتبار سے بھی یہ جو عرب تھے، وہ اپنی زبان ہی بناتے رہے۔ حضرت ابراہیم ◆ کی اولاد میں سے بنی اسرائیل ہیں یا یوں کہیے کہ حضرت اسحاقؑ کی اولاد ہیں جو بنی اسرائیل یا یہودی کہلائی۔ اس کے حصے میں شوکتِ سلیمانیؑ اور سطوتِ داؤدیؑ کی حامل مملکتیں اور سلطنتیں آئی ہیں۔ یہ ان کی وارث چلی آئی۔ دوسرا بیٹا حضرت اسماعیل ◆ ہے جو آپؑ نے یہاں صحرائے حجاز میں آ کر بسایا، ان کی یہ اولاد اس تمام دوران نظر ہی نہیں آتا کہ یہ کرتی کیا رہی۔ انہی کھجوروں کے سہارے، انہی کھجوروں کی گٹھلیوں کے ستو بنا کر گزارہ کرنے والی یہ قوم، اتنے ہزاروں سال میں کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا کرتی رہی لیکن آج بھی علم الالسنہ (زبان کے) جو بڑے بڑے مغرب کے غیر مسلم محققین ہیں، وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں، کہ یہ زبان (Language) ہی بناتی رہی۔ رچرڈ مورس بک (Richard Maurice Bucke) کی کتاب ہے Cosmic Consciousness (آفاقی شعور)، انہوں نے کہا ہے کہ اس سارے دوران میں یہ قوم زبان ہی بناتی رہی۔ وہ گویا تیاری کر رہی تھی اس وحی کی جس کا انداز و اسلوب منفرد تھا: دنیا کے اندر بھی اور وحی کی دنیا کے اندر بھی صاحب! اس کے متحمل ہونے کے لیے ایک زبان کی ضرورت تھی۔ یہ قوم وہ زبان تیار کرتی رہی جس میں وحی خداوندی اپنی پوری شان کے ساتھ آجائے، اس کو اس کے لیے دقت ہی نہ ہو کہ یہ بات میں نے کہنی ہے اس کے لیے لفظ کہاں سے ملے گا۔ لفظ تو خدا نے نہیں بنائے، زبان تو انسانوں کی بنائی ہوئی ہوتی ہے۔ وحی خداوندی، جو ہنگامی لم تھا، اس کو دینے کے لیے زبان تو انسانوں کی بنائی ہوئی ہونی چاہیے تھی۔ انہوں نے اس دوران وہ زبان بنا دی۔ معاف رکھیے اگر میں یوں کہوں کہ خدا کو اپنا مقصد واضح کرنے کے لیے الفاظ تلاش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرنا پڑی۔

یہ عجیب زبان ہے عزیزانِ من! انہوں نے اس قسم کی یہ زبان کیسے بنائی جو وسیع زبان ہو، وسعتوں کے اعتبار سے بھی، گہرائیوں

کے اعتبار سے بھی، بلندیوں کے اعتبار سے بھی، اور ابدیت کی کیفیت یہ ہے کہ آج تک وہ خصوصیت لیے ہوئے چلی آ رہی ہے، آج بھی یہ نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں، کسی قسم کا کوئی انکشاف ہو، کوئی اصطلاح ہو، عربی زبان میں اس کے لیے لفظ مل جائے گا، آپ کو دوسری زبانوں میں نئے نئے الفاظ قائم کرنے پڑتے ہیں جو اس زبان میں ہوتے ہی نہیں۔

مادہ کے تحت لفظ رحمان کی تشکیل اور اس کا مفہوم

اس زبان کی ایک خصوصیت ہے کہ ایک چیز ہوتی ہے جسے مادہ یا Root کہتے ہیں، وہ عام طور پر تین حرفوں کا ہوتا ہے، بعض اوقات وہ چار بھی ہو جاتے ہیں، کبھی پانچ بھی لیکن عام طور پر تین حرفوں کا وہ ایک لفظ کہہ لیجیے، تین حرف ہی ہوتے ہیں، وہ اس کا مادہ Root ہوتا ہے۔ اس مادے کی ایک خصوصی معنویت ہوتی ہے، اس مادے میں پنہاں خاص ایک معنی ہوتا ہے۔ اس مادے سے آگے پھر ان کے ہاں مختلف، آپ ان کے ابواب کہیے یا اوزان [1] کہیے، ہوتے ہیں۔ اسی مادے سے الفاظ بنتے چلے جاتے ہیں اور وہ جو ان کے ابواب ہیں وہ متعین ہیں۔ ہر باب میں اس مادے کے بنیادی معنی کے اندر ایک تغیر واقع ہوتا ہے۔ ایک ہی مادے کا لفظ آپ اگر مختلف ابواب میں دیکھیں گے، اس میں دیکھیں گے کہ وہ تو معنویت جو بنیادی ہے، اس کی جھلک تو وہاں موجود ہے لیکن اس میں وسعت پیدا ہو گئی، اس میں گہرائی پیدا ہو گئی، اس میں بلندی پیدا ہو گئی۔ ہر وزن یا ہر باب کے ساتھ یہ خصوصیت ہے اور ابواب کی خصوصیت بھی مقرر ہے۔ ان کے ہاں اتنی بڑی Scientific Language (سائنسی زبان) ہے۔ کوئی لفظ دنیا کا آئے اس کا جو Root (مادہ) ہے، اس کے معنی آپ کو معلوم ہونے چاہئیں، پھر وہ معلوم ہو جائے گا کہ کس باب پہ آیا ہے، اس باب کی خصوصیت یہ ہے، اس لیے اس کے یہ معنی ہو گئے۔

سنیے! اب رحمٰن کیسے بنا؟ یہ ذہن میں آ گیا کہ یہ ہنگامی Evolution (ارتقا) ہے Emergent Evolution (فجائی ارتقا) ہے۔ یکلخت کوئی بات ہونے والی جو ہو وہ ہے، جسے وحی کہا جائے گا۔ اس لفظ رحمٰن کا مادہ "ر ح م" ہے، یہ وہی ہے جس سے رحم مادر کا لفظ آیا ہے۔ معنی اس کے ہوتے ہیں "نشو و نما اس انداز سے کہ وہ عام اسباب سے ہٹی ہوئی ہو، اس میں لطافت ہو، نرمی ہو، رحم مادر میں جس طرح سے بچے کی، جنین کی پرورش ہوتی ہے"۔ اس کے لیے بنیادی طور پر وہاں یہ لفظ آتا ہے۔ Root (مادہ) میں اس کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ رحمت کے معنی آپ دیکھ لیجیے، رحمِ مادر تو ہمارے سامنے آ گیا۔ رحم کا لفظ دیکھ لیجیے۔ عدل تو قانون کی زنجیروں کا نام ہوتا ہے، قانون کے اندر جکڑے ہوئے۔ رحم میں تو ایک خاص لطافت ہوتی ہے اور وہ اس سے ہٹی ہوئی چیز ہوتی ہے یعنی اگر آپ اس زبان کا مطالعہ اس نگاہ سے بھی کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ بڑی ہی دلچسپ چیز ہے۔ اب "ر ح م" رحم (Womb) تک بھی آ گیا، رحمت تک بھی آ گیا۔

---

[1] مادہ (Root)، اوزان، افعال، مشتقاق اور ابواب کے ان نکات کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ (منظور الحق مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الانبیاء، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور 2005، ص ص۔ 20 تا 21 مع انہی 2 صفحات کے فٹ نوٹ۔

رحیم اور رحمان کے مفہوم میں فرق

عزیزانِ من! اس کے آگے اوزان آتے ہیں۔ اس ''رح م'' کا ایک وزن ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں: کسی چیز کا Progressively یعنی بتدریج رفتہ رفتہ آگے بڑھتے ہوئے، مسلسل متواتر التزاماً ہوتے چلے جانا۔ اسی طرح سے اس باب کا یہ لفظ رحیم ہے۔ رحیم کے معنی ہوئے نشوونما کرنے والا لیکن مسلسل التزاماً ارتقائی طور پر، رفتہ رفتہ بتدریج آگے بڑھانے والا، نشوونما دیتے چلے جانے والا۔ انسان کی نشوونما میں یہ صرف بدن کی نشوونما ہی نہیں، جسمانی نشوونما ہی نہیں، اس کی جو انسانی خصوصیات ہیں ان کی نشوونما بھی تو ساتھ نہایت ضروری ہوئی۔ جسمانی نشوونما میں تو انسان اور حیوان ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ یہ انسانی خصوصیت آتی ہے جہاں انسانی صفات کی نشوونما یا صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہ ہدایت خداوندی کے ماتحت ہی ممکن ہے۔ اس کے لیے وحی ملتی تھی۔ پھر وہ جو رحم کا لفظ ہے ''رح م'' وہ یاد رکھیے۔ تو اب وہ اس طرح کی نشوونما ہوئی رحیم تو میں نے کہا کہ یہ ''فعیل'' کے وزن کے اوپر ہے۔ اس میں تسلسل ہے، تدریج ہے، رفتہ رفتہ آخر تک پہنچتا ہے اور ان کا ایک وزن ''فعلان'' ہے جس کے معنی ہوتا ہے کہ ''وہی شے جو رحم والی ہے، وہ یکلخت نمودار ہو کر سامنے آ جائے'' یہ جو الرحمٰن ہے یہ فعلان کے وزن کے اوپر ہے۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ [1] میں رحمٰن اور رحیم دونوں صفات خداوندی ہیں، دونوں ہی وہ رحم اور نشوونما دینے کے لیے آتے ہیں۔ نشوونما کے دو الگ الگ طریقے آ گئے۔

عزیزانِ من! اس بیسویں صدی کے اندر جہاں آخر تک آپ کی Scientific (سائنسی) تحقیق پہنچی ہے، اس کے لیے اس زبان کے اندر الفاظ موجود ہیں کہ رحیم کا لفظ Progressive نشوونما کے لیے آئے گا اور جہاں یہ نشوونما Emergent آئے گی، وہاں رحمٰن کا لفظ آئے گا۔ یہ بات سائنسی بن کر تکنیکی بن جاتی ہے تو مشکل آ جاتی ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ عام فہم الفاظ میں یہ بات آ جائے۔ یہ یکلخت آنے والی بات کے لیے ابھی میں نے کہا تھا کہ جو وحی ہے وہ اکتسابی علم نہیں ہے، وہ Emergent (فجائی) طور پہ ہوتا ہے تو کہا کہ اَلرَّحۡمٰنُ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ (55:1-2) قرآن کی وحی رحمٰن نے دی۔ ایک لفظ رحمٰن کے اندر، اس کے باب ''فعلان'' کے اندر، اس کے Root (مادہ) ''رح م'' کے اندر، ساری حقیقتیں آ گئیں۔ یہ قرآن کریم ہے، عزیزانِ من! قرآن کریم ہے۔ اس بدنصیب قوم نے اسے چھوڑ کر پتہ نہیں کیا کیا کھویا ہے۔ تعلیم قرآن کریم کے لیے ایک لفظ الرحمٰن استعمال کر دینے سے وحی کی ساری حقیقت اس کے اندر آ گئی۔

---

[1] اس کے معنی و مفہوم کے لیے دیکھیے: پرویزؒ (منظور الحق مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الفاتحہ، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور 2007، ص ص۔ 73 تا 76 (دوسرا باب)۔

نبوت اور تصوف میں رات دن کا فرق ہے

عزیزانِ من! پہلی چیز تو رحمٰن نے یہ کی کہ وحی عطا کی' قرآن حکیم عطا کیا۔ کیا یہ چیز نبی اکرمؐ کی ذات تک ہی تھی کہ حضور ایک منفرد شخصیت کو یہ علم مل گیا بس ٹھیک ہے آگے بات ہی نہیں ہے۔ یہ جسے آپ تصوف کہتے ہیں' اس میں اور نبوت میں فرق یہ ہے کہ تصوف میں جو کچھ بھی ہے' ان کا دعویٰ ہے کہ ان کو کشف ہوتا ہے' الہام ہوتا ہے' بہر حال جو کچھ بھی ہوتا ہے' وہ ان کی اپنی ذات تک رہتا ہے' وہ اسے آگے منتقل نہیں کر سکتے۔ اگر ان سے کہا جائے کہ صاحب! یہ جو آپ کہتے ہیں کہ الہام اور کشف کے ذریعے سے یہ کیفیت طاری ہوتی ہے' کچھ ہمیں بھی اس میں سے دیجیے' وہ کہتا ہے:

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تانہ چشتی!

یہ تو شراب ہے۔ اس کا نشہ تو اسے ہی آئے گا جو خود پیئے گا' دوسرے تک یہ بات نہیں ہے۔ نبوت میں اور اس تصوف میں فرق کر کے بتا دیا کہ یہ قرآن حکیم نبی کو دیا لیکن ادھر کہا کہ خَلَقَ الْاِنْسَانَ (55:3) ہم نے انسان پیدا کیے۔ یہ تو ان کے لیے ہدایت تھی جو ہم نے بذریعہ وحی دی اور اس کے لیے اگلی چیز پھر ہنگامی آئی۔

حیوانی سطح سے انسانی صلاحیتوں کی طرف ارتقا کی ایک اہم کڑی اور قیامت تک وحی کا ابلاغ

عزیزانِ من! Evolution (ارتقا) میں چلے آیئے' حیوانات تک آ جایئے۔ ان میں اپنے خیالات اور جذبات کے Expression کا مادہ نہیں ہوتا' ان کو زبان بھی نہیں ملی ہوئی ہوتی' تحریر بھی نہیں ملی ہوئی ہوتی' وہ حیوان کا درجہ تھا' یہ اپنی اپنی ذات تک ہی ہوتا ہے' تصوف کی طرح یہ سارے ہی صوفی ہوتے ہیں۔ ایک گائے جو کچھ محسوس کر رہی ہے' وہ دوسرے کو بتا ہی نہیں سکتی۔ انسان پیدا کیا تو یہ جو ابھی طبعی سلسلہ ارتقا (Physical Evolution) چلا آ رہا تھا' اس میں' میں عرض کر رہا تھا کہ یہاں حیوان سے آگے جو انسان کی کڑی آئی ہے' اس میں پھر Emergent Evolution (فجائی ارتقا) ہے' ہنگامی Evolution (ارتقا) ہے جس کی رو سے انسان کو Expression کی صفت عطا کی' صلاحیت عطا کی' اپنے مانی الضمیر کو' اپنے جذبات کو' کیفیات کو' خیالات کو دوسرے تک پہنچانے کی' اس کے لیے پہلی چیز جو انسان کے لیے ہے' وہ ہے خَـلَـقَ الْاِنْسَـانَ (55:3) اور یہاں نطق نہیں کہا کہ جس کے معنی صرف زبان ہی ہو بلکہ بیان کہا' جس کے معنی Expression ہوتا ہے۔ ادھر ہم نے یہ خصوصیت انسانوں کو دی۔ انسانوں میں تو نبی بھی شامل تھا' نبی کو یہ Expression کی خصوصیت ملی تھی تو یہ وحی ہے' جو خود اس کی اپنی تخلیق کردہ نہیں تھی' دوسروں تک اسی صورت میں پہنچا سکتا تھا کہ وہ بیان کی یا Expression کی صلاحیت اس کے اندر ہوتی ہے۔ انسان چنا گیا جس میں یہ Expression کی صلاحیت ہم نے

ودیعت کر دی کہ نبی کو یہ ملا اور نبی نے اس کو آگے انسانوں تک پہنچایا۔ غور فرما رہے ہیں کیا سلسلہ بیان ہو رہا ہے! وجد آ جاتا ہے اور پھر ایک انسان تک ہی نہیں پہنچا' ہر انسان کو یہ قوت دی' بیان کی یہ صلاحیت دی۔ Expression کے' بیان کے دو ہی طریقے ہیں: یا وہ تقریر کے ذریعے یعنی زبان کے ذریعے سے وہ بیان کرتا ہے یا تحریر کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ یہاں کہا کہ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (55:4) اور دوسرے مقام پہ کہا کہ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (96:4)۔ یہاں پورا دائرہ آ گیا۔

عزیزانِ من! اظہار بیان کا طریق تحریر ہو یا تقریر کے ذریعے ہو یا قلم کے ذریعے ہو' تحریر ہو یا تقریر ہو' دونوں آ گئیں۔ کہا کہ یہ جو خصوصیت ہے' یہ انسان ہی کو دی گئی ہے' حیوان کو نہیں دی گئی۔ وحی منفرد تھی' رحمٰن نے دی' جو خود اکتسابی علم نہیں تھا وہ نبی کو ملی نبی کو انسان بنایا اور اس کو یہ صلاحیتیں دیں کہ اسے دوسروں تک پہنچا دے: بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ (5:67) وہ بلغ کی بات اسی صورت میں ہو سکے گی کہ اس کے پاس اظہارِ بیان کی صلاحیت ہو۔ نبی کے لیے یہ نہیں تھا کہ وہ کہہ دے کہ ''ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشتی!'' خود پیے تو پتہ چلے۔ اب ہر ایک کو تو وحی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ تو نبوت کی خصوصیت تھی۔ اب باقی انسانوں کے لیے نبی کو وحی ملی بھی۔ اگر وہ دوسروں تک پہنچاتا نہیں ہے' تو یہ اس وحی میں خیانت ہے۔ وحی اسی طرح سے ملی۔ نبی کو بیان کی خصوصیت دی کہ وہ اسے دوسروں تک پہنچا سکے۔ اس نے دوسروں تک پہنچایا اور ان پر یہ فریضہ عائد کیا کہ جس تک یہ پہنچے' وہ اسے آگے پہنچائے۔ وحی کا سلسلہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر ختم ہو گیا اس لیے یہ جو اب قرآن حمید کی تبلیغ کا' ابلاغ کا' سلسلہ آگے پہنچانے کا ہوا' وہ جو یہ بیان ہے اور جو قلم ہے' اس کے ذریعے سے قیامت تک جاری رہ سکتا ہے تو ختم نبوت سے انسانوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا: تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ (6:115) اور لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (6:34) قرآن حمید مکمل غیر متبدل محفوظ' انسانوں تک پہنچا دیا گیا' انسانون کو اسے آگے پہنچانے کی صلاحیت دے دی' انسانوں کا سلسلہ قیامت تک جاری ہے' اس لیے یہ سلسلہ وحی یا اس کا جو ابلاغ ہے' قیامت تک کے لیے جاری ہے۔

ختمِ نبوت کے لیے صرف ایک ہی دلیل کافی ہے

ختم نبوت کی بڑی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ میں نے تو یہ ایک ہی دلیل دی تھی' اس کا انکے پاس کوئی جواب نہیں کہ خدا کی وحی کے مکمل غیر متبدل محفوظ ہونے کے بعد' اور انسانوں کو یہ چیزیں عطا کر دینے کے بعد' پھر نبوت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی ہے۔ اقبالؒ (1877-1938ء) کے الفاظ میں جو کہ بڑا عجیب انداز بیان ہے کہ ''نبوت نے اپنی خاتمیت کا خود احساس کر لیا' جب قرآن حکیم کے متعلق یہ کہہ دیا''۔ کیا بات ہے کہ ٹھیک ہے اب مزید وحی کی ضروت نہیں' یہ تَمَّتْ (6:115) کوئی اس میں تبدیلی نہیں کر سکتا: لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (10:64) یہ محفوظ ہے۔ کہا کہ جب یہ ہو گیا تو ''نبوت نے خود محسوس کر لیا کہ اب مجھے ختم ہو جانا چاہیے''۔ یہ چیزیں یعنی

وحی کا نزول، اس کا آگے انسانوں تک پہنچانا، پھر رفتہ رفتہ آگے پہنچانا، یہ سب کاہے کے لیے ہے؟ یہ سارا سلسلہ ہوا۔ (معاذ اللہ) کیا یہ کوئی شاعری تھی؟ نہیں، خدا کا کوئی پروگرام اس کی کوئی کڑی بھی، بلا مقصد نہیں ہو سکتی۔ اس نے کہا کہ یہ وحی انسانوں کی دنیا میں تو ایک خاص فرد کو دی گئی، اس نے اسے آگے پہنچایا، پھر یہ سلسلہ آگے پہنچتا رہا۔

خارجی کائنات میں نبوت کی ضرورت نہ تھی

خارجی کائنات میں تو یہ صورت نہیں ہے، نہ وہاں کوئی نبی ہوتا ہے، نہ ان میں ایک بات کو دوسرے تک پہنچانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ کہا کہ وہاں خارجی کائنات میں ہم نے ہر شے کے اندر خود وحی رکھ دی، وحی کیا، یعنی یہ ہدایت رکھ دی کہ تم نے یہ کام کرنا ہے۔ قرآن حکیم میں یہ ہے کہ سما میں وحی، ارض میں وحی، نحل میں وحی، کہ تمہارا یہ فریضہ ہے۔ آگ میں وحی رکھ دی کہ تم نے حرارت پہنچائے جانا ہے، پانی کو وحی کر دی کہ نشیب کی طرف بہنا ہے اور پیاس بجھانی ہے، سورج میں وحی رکھ دی کہ اس طرح سے تم نے طلوع ہونا ہے، اپنے راستے طے کرنے ہیں، غروب ہونا ہے، یوں موسموں کا تغیر ہونا ہے المختصر ہواؤں میں وحی، ارض میں وحی، کائنات کی ہر شے میں وحی۔ کہا کہ اس وحی سے تم نے غور کیا ہے کہ پھر آگے فریضہ کیا عائد ہوتا ہے جس کی طرف وحی کی جاتی ہے یا جسے وحی کی ہدایت ملتی ہے؟ فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس وحی کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے۔ کہا کہ کیسے یہ پتہ چلا کہ یہ فریضہ عائد ہوتا ہے؟

حقائق کو بیان کرنے اور سمجھانے کے لیے قرآن حکیم کا ایک اپنا انداز ہے

قرآن حکیم کا انداز یہ ہے کہ انسانی دنیا کے حقائق بیان کرنے کے بعد، فوراً خارجی کائنات کی طرف آتا ہے کیونکہ وہ محسوس مثال سامنے ہوتی ہے۔ کہنے لگے کہ یہ تو ہم نے بتایا ہے کہ سورج میں بھی یہ وحی ہے، چاند میں بھی وحی ہے، ستاروں میں بھی وحی ہے، درختوں میں بھی وحی ہے، پودوں میں بھی وحی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وحی سے ان کا ہوتا کیا ہے؟ کہا کہ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ٥ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ (55:5-6) چاند اور سورج جیسے عظیم الجثہ کرّے ہیں، انسان ان کرّوں کی بڑائی کا تصور نہیں کر سکتا کہ کتنے بڑے ہیں۔ یہاں يَسْجُدٰنِ آتا ہے یعنی یہ تمام ایک متعین قاعدے کے مطابق مصروف گردش رہنے والے ہیں۔ یہ کیسے رہ رہے ہیں؟ کہا کہ ان میں وحی کی ہوئی ہے اور ان کا فریضہ ہے کہ اس وحی کے مطابق زندگی بسر کریں اور جب وہ بسر کریں گے تو کہا کہ دیکھتے ہو کیسا حسن اسلوب سے یہ نظم و نسق چل رہا ہے، کہیں تصادم نہیں، تزاحم نہیں، ٹکراؤ نہیں، فساد نہیں، قتل نہیں، غارت گری نہیں، کوئی مزاحمت نہیں ہے، ہر ایک اپنے اپنے راستے پہ چلا جا رہا ہے، وحی کا اتباع یہ کرے گا۔ کہا کہ اگر آسمان کے کرّوں کی طرف جا کر تمہاری نگاہ فیصلہ نہیں کرتی، تو ان پودوں کو دیکھو، درختوں کو دیکھو، ان کی کیا کیفیت ہے؟ یہ کہ یہ يَسْجُدٰنِ (55:6) ہیں یعنی یہ سب اس وحی کے سامنے سجدہ ریز ہیں جو ان کو دی گئی ہے۔

اب وحی کا مقصد سامنے آ گیا۔ پہلے تو اس علم کا طریق آ گیا جو نبی کو دیا گیا' پھر اگلا طریق آ گیا کہ نبی سے آ گے وحی قیامت تک کیسے چلے گی اور پھر آ گے آ گیا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ مقصد ہے کہ یَسۡجُدٰنِ (55:6) اس وحی کے سامنے سر اطاعت خم کر دینا ہے۔

قرآن کریم کے نزدیک شمس اور قمر کے ذریعے کیلنڈر کا حساب

یہاں قرآن کریم نے الشّمس والقمر کو بحسبان کہا ہے یعنی حساب کے مطابق' قاعدے کے مطابق۔ یہ لفظ حساب سے ہی ہے۔ یہ لفظ دیگر مقامات میں بھی قرآن کریم نے استعمال کیا ہے۔ قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ تم زندگی کا اپنا حساب رکھنا چاہتے ہو جسے آپ کیلنڈر رکھتے ہیں تو سنو! یہ چاند سے بھی رکھا جا سکتا ہے' سورج سے بھی رکھا جا سکتا ہے۔ جونسا تمہارے ہاں زیادہ Convenient ہو' رکھ لو میں یہ بحث نہیں کرنا چاہتا کہ یہ جو ہمارے ہاں قمری طریقہ ہے یہ کیسا ہے اور یہ شمسی طریقہ تو وہ کیلنڈر ہے جس کو عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ انگریزوں کا کیلنڈر ہے' یہ ان کے باپ کا کیلنڈر نہیں ہے' خدا کے سورج کا کیلنڈر ہے اور وہ قمری اسی کے قمر کا کیلنڈر ہے۔ اسے آپ قمری کہتے ہیں۔ یہ دونوں خدا کے ہی کیلنڈر ہیں' لیکن یہ کہیں نہیں ہے کہ یہ جو ہے اسے جب شرعی کہہ دیا گیا تو اب اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ پوچھو کہ خدا نے کہا ہے کہ شمس کے مطابق بھی کیلنڈر بن سکتا ہے اور قمر کے مطابق بھی' جونسا Convenient ہو' بنا لو مگر نہیں یہاں تو جو چیز ذرا پرانی ہو جاتی ہے' وہ شرعی ہو جاتی ہے' اس میں تبدیلی ہی نہیں کی جا سکتی۔ یہاں تو کچھ ایسا فساد نہیں مچا' یہ دوسری جنگ کے زمانے (1939-1945ء) میں ابھی ملک کی تقسیم نہیں ہوئی تھی' میں دہلی میں ہوتا تھا' اس زمانے میں وقت کو آدھا گھنٹہ پیچھے کیا تھا' اب بھی پاکستان اور انڈیا کے وقت میں آدھے گھنٹے کا فرق ہے۔ ہم میں اور مشرقی پاکستان میں' یہ کیا کہہ دیا کلیجے پہ ایک زخم لگتا ہے جب مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش کہنا پڑتا ہے' ابھی بھی اس کا اور ہمارا ایک گھنٹے کا فرق ہے۔

انگریزی وقت اور شرعی وقت کا قصہ

پہلی بار یہ چیز ہوئی تھی کہ جنگ کے زمانے (1939-1945ء) میں آدھے گھنٹے کا فرق کیا گیا تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے' ہندوستان میں انہوں نے مسجدوں کے جو کلاک تھے ان میں وقت تبدیل نہیں کیا تھا کہ شرعی وقت تو وہی ہے جو چلا آ رہا ہے' یہ انگریزوں کا وقت ہے' اس کے مطابق ہم نہیں بنائیں گے یعنی جو کل تک وہ گھڑی چل رہی تھی وہ انگریزوں کا وقت نہیں تھا' آج جو اس میں تبدیلی ہوئی تو یہ انگریزوں کا ہوا اور وہ شرعی ہو گیا۔ راستہ چلتے ہوئے یہ کیفیت تھی کہ اگر کسی نے پوچھا: میاں صاحب! وقت کیا ہے تو گھڑی نکالی' اس نے کہا کہ جی وہ ساڑھے گیارہ بجے ہیں شرعی۔ اس قوم میں جو ایک مقام پہ کھڑی ہو جائے Evolution (ارتقا) میں ایک مقام کے اوپر ایک نوع کھڑی ہو جاتی ہے اور آگے نہیں چل سکتی' وہ پھر وہیں رہتی ہے: گائے گائے رہتی ہے' بکری بکری رہتی ہے۔ جامد جو ہوتی ہے'

وہیں رہتی ہے۔ جہنم کے متعلق قرآن حمید نے کہا ہے کہ یہ جحیم ہے اس کے اندر جمود ہے پروگریس نہیں ہے۔ جس قوم کی ذہنی کیفیت یہ ہو جائے اس کے نزدیک ہر چیز جو پرانی ہے وہ شرعی ہو جاتی ہے اس میں کوئی چیز جو نئی ہے وہ بدعت ہو جاتی ہے: كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلٰلَةٍ وَّ كُلَّ ضَـلٰلَةٍ فِى النَّارِ. یہ ہر خطبے کے اندر دہرایا جاتا ہے کہ ہر نئی چیز گمراہی ہوتی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جاتی ہے تو انہوں نے کہا تھا کہ یہ جو وقت آدھا گھنٹہ پیچھے کرنا ہے یہ بدعت ہے یعنی کل کا وقت جو تھا وہ (معاذ اللہ) وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقرر فرمودہ تھا اور یہ آج کا انگریز کا ہے۔ ہم یہ سنتے تھے اور جب وہ کہتے تھے کہ وقت بتائیں یعنی یہ کہ صاحب! آپ شرعی وقت پوچھتے ہیں یا انگریز کا وقت پوچھتے ہیں؟ اب کیا بتایا جائے۔

عزیزانِ من! قرآن کریم نے بتصریح شمس اور قمر دونوں کے متعلق کہا کہ جو حساب شمار جونسا بھی آپ کو Convenient (سہولت رساں) ہو اس کے مطابق رکھ لیجیے شمس کو بھی خدا نے یہ وحی کی ہوئی ہے کہ وہ یوں چلتا رہے اور اتنے میں وہ ایک دائرہ پورا کرے یا زمین اس کے گرد دائرہ پورا کرے، قمر کے منازل بھی تو ہم نے مقرر کیے ہیں تم ان کے مطابق اپنا حساب رکھ لو۔ کہا ہے کہ وَّالـنَّـجْـمُ وَالشَّـجَـرُ يَسْجُدٰنِ (55:6) زمین پر یہ بڑے بڑے تناور درخت اور چھوٹے چھوٹے پودے سب اس کے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ یہ ہر شے اس وحی کے سامنے جو ان کے اندر ودیعت کی ہے جھکی ہوئی ہے۔ انسانوں کی زندگی میں جو وحی ہے اب وہ اس طریق سے تمہارے پاس آرہی ہے۔

عقلِ انسانی کے لیے آسمانی کرّوں کی مثال

قرآن حمید کی طرف سے کہا کہ آسمانی کرّوں کی طرف نگاہ ڈالو۔ قرآن حکیم نے ایک بات اور کہی اور صحیح انسانی زندگی کا جو سارا نظم و نسق یا نظام ہے وہ اسی ایک لفظ کے اندر ہے۔ کہا کہ وَالسَّـمَـآءَ رَفَعَهَا (55:7) یہ آسمانی کرّے تمہارے سامنے ہیں بلندیوں کے اوپر ہیں ان بلندیوں کا تو اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ کہا ہے کہ رَفَـعَـهَـا (55:7) یہ فضا کی پہنائیوں میں رکھے ہیں لیکن اس کے باوجود وَوَضَـعَ الْمِيْزَانَ (55:7) ان میں میزان (Proportion) ہے ایک تناسب وزن توازن ہے۔ سارا سلسلہ کائنات عزیزانِ من! چل رہا ہے۔ سورج چاند کے درمیان آپس میں توازن ہے سورج اور زمین کے درمیان آپس میں توازن ہے سیکنڈ کے کروڑویں حصے تک کا حساب ہے جس میں توازن قائم ہوتا ہے اگر اس توازن میں اتنا سا فرق پڑ جائے تو یہ کرّے آپس میں ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں۔ کہا کہ اتنے عظیم الشان کرّے جو یوں اس نظم و ضبط کے ساتھ محوِ گردش چلے آرہے ہیں اور چلے جارہے ہیں یہ اس طرح سے یہ کیوں ہیں؟ یعنی وہ کیا بنیاد ہے جس کی وجہ سے یہ ایسا ہوتا ہے؟ اسی وجہ سے کہ وَضَـعَ الْـمِـيْـزَانَ (55:7) ان میں باہمی ربط و ضبط ہے

توازن ہے جس میں ذرہ برابر فرق نہیں ہوتا۔

کائنات کی وسعتوں پر عقلِ انسانی جس قدر آج حیرت زدہ ہے پہلے کبھی نہ تھی

ہم نے صرف یہی نہیں کیا ہے کہ ایک ایک کو الگ الگ قانون دیا ہے بلکہ ان کے باہمی ربط کے اندر' ایک Proportion یا توازن بھی قائم کیا ہوا ہے۔ ہم نے کہا ہے کہ باہر کی دنیا میں تم غور کرو' بڑے بڑے جتنے تمہارے محققین منکشفین سائنسدان ہیں' ان سے کہو کہ وہ اس پہ ریسرچ کر کے دیکھیں کہ ان کے باہمی توازن کا کتنا عجیب وغریب نقشہ سامنے آتا ہے۔ یہ جو اس دور میں علم الافلاک ہمارے ہاں آیا ہے اس نے بھی بڑی ترقی کر رکھی ہے۔ وہ ہمارے ہاں کا علم الافلاک یوں نہیں ہے کہ وہ ٹی وی کے اوپر موسم کی پیشن گوئی والے اطلاع دیتے ہیں کہ آج شام بالکل خشک رہے گا' موسم صاف رہے گا' باہر بارش ہو رہی ہوتی ہے۔ ان کے ہاں تو پوچھو نہیں کہ وہ کہاں پہنچے ہوئے ہیں' محیّر العقول ہیں' وہ لوگ محوِ حیرت رہ جاتے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ ان کے ہاں ایک ایک انکشاف کے اوپر دانتوں میں انگلیاں دبا کے بے ساختہ کہتے ہیں کہ عقل انسانی اس مقام پر پہنچ جاتی ہے کہ حیرت کے سوا اس کے حصے میں کچھ نہیں رہتا کہ یہ نظام کیسے چل رہا ہے! صحیح میزان ہے جسے آپ Balance (توازن) کہتے ہیں۔ میزان کا ترجمہ بھی انگریزی زبان میں Balance ہی ہے۔

پوری کائنات میں توازن کی اہمیت

کہا کہ یہ سارا نظام' جتنا بھی ہے' یہ سارا' میزان کے سہارے چل رہا ہے' آپس میں صحیح توازن' صحیح Proportion دیکھتے ہو' کیسا عمدگی سے چل رہا ہے! کہیں سے کسی قسم کا ٹکراؤ! نہیں ہے۔ تمہیں یہ کس لیے دیا گیا؟ یہ وحی تمہیں کیوں دی گئی جیسے ان کو دی گئی تھی؟ کہا کہ اَلَّا تَطۡغَوۡا فِی الۡمِیۡزَانِ (55:8) تاکہ تم بھی اس توازن اور بیلنس کے اندر ہیر پھیر نہ کرو' اس میں بگاڑ نہ پیدا کرو۔ بات ساری توازن کی ہے۔ عزیزانِ من! میرے عزیز ڈاکٹر صاحبان موجود ہیں' وہ اس امر کی تائید کریں گے کہ جسے صحت کہتے ہیں وہ قویٰ کے توازن کا ہی نام ہوتا ہے۔ جسے مرض کہتے ہیں وہ ذرا سا توازن میں بگاڑ ہوتا ہے' وہ علت ذرا کم ہوگئی ہے' کوئی زیادہ بڑھ گئی ہوتی ہے۔ جسے یہ علاج کہتے ہیں یہ صرف اس توازن کو برقرار کر دیتے ہیں۔ انسان کے جسم کے اندر توازن کا نام صحت ہے اور اس کے بعد جو انسانوں کا نظام ہے اسے تمدن کہیے' سیاست کہیے' عمرانیت کہیے' کوئی نظام بھی لیجیے' اس میں اگر آپ کے توازن برقرار رہے' تو وہ نظام نظام حسنا ہے۔ فساد اور بگاڑ کیا ہوتا ہے؟ اس کے اندر سے توازن اٹھ جاتا ہے' طبقات پیدا ہو جاتے ہیں' انسان اور انسان میں تمیز پیدا ہو جاتی ہے' کوئی بلند ہو جاتا کوئی پست ہو جاتا ہے۔ یہ توازن بگڑ رہا ہے اسی لیے کہا تھا کہ وَ لَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ (17:70) ہر انسان یکساں واجب التکریم ہے۔ یہ ہے توازن اور اس میں ذرا بھی فرق آیا کہ کوئی واجب التکریم اور کسی کی تذلیل وتحقیر ہوئی' توازن بگڑ گیا'

میزان بگڑ گئی، تکڑی دے وٹے وگڑ گئے ❶۔

جہاں انسان واجب التکریم نہ رہا، وہیں عملِ توازن بگڑ گیا

عزیزانِ من! کہا کہ کاہے کے لیے یہ سارا کچھ دیا ہے جو وحی کا سلسلہ ہے، جو انبیائے کرام کا سلسلہ رشد و ہدایت چلا آ رہا ہے؟ اس لیے کہ اَلَّا تَطۡغَوۡا فِی الۡمِیۡزَانِ ❷ (55:8) اور اس کے بعد کہا کہ اس وحی نے تمہیں یہ کہا ہے کہ وَاَقِیۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تُخۡسِرُوا الۡمِیۡزَانَ (55:9) اس وزن کو اپنی دنیا میں عدل و انصاف کے ساتھ قائم رکھو، تمہاری دنیا میں، تمہارے الفاظ یا اصطلاح میں، اس کو عدل کہا جاتا ہے، Justice کہا جاتا ہے، اس توازن کو، میزان کو، دل کے ذریعے سے قائم رکھو۔ آپ نے دیکھا ہے کہ ہائیکورٹ کے بلڈنگ کے اوپر، میرا خیال ہے، جب روشنی ہوتی ہے تو وہاں آپ ایک ترازو میزان بنا دیکھتے ہیں، جسے تکڑی کہتے ہیں۔ یہ عدل کا ایک بہت پرانا Symbol (علامت) ہے۔ یہ یونانیوں کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ انہوں نے یہ بات پہلے کہی تھی کہ توازن، عدل Justice کا نام Balance قائم رکھنا ہے، توازن کا قائم رکھنا ہے۔ یہ قرآن کریم کی اصطلاح ہے کہ ہم نے یہ اس لیے دیا ہے کہ تم اپنی دنیا کے اندر اس توازن کو قائم رکھو۔ جہاں خارجی دنیا میں تو از خود توازن کی یہ چیز قائم ہے، ہر شے کے اندر وحی ہے اور وہ ہر شے اس وحی کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور پیدا کی گئی ہے۔ انسان نے اسے از خود قائم کرنا ہے۔

انسان کو اپنی زندگی میں خود ہی خارجی کائنات کی طرح توازن قائم کرنا ہے نیز شرک کی بنیاد

تمہیں صاحبِ اختیار و ارادہ بنا دیا تھا کہ اپنے اختیار سے یہ نظام قائم کرو جو باہر کی دنیا میں مجبوراً قائم ہوا ہے، اسے اپنی دنیا میں قائم کرو، اسی لیے کہا کہ وَاَقِیۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ (55:9) یہاں یہ حکم کی چیز آ گئی۔ سورج اور چاند میں حکم کی یہ چیز نہیں ہے، وہ تو از خود اس کے اوپر چلنے کے لیے مامور و مجبور ہیں۔ انسانوں سے کہا گیا ہے کہ تم وزن کو، قسط کے ساتھ، نظامِ عدل کے ساتھ، قائم کرو اور وَلَا تُخۡسِرُوا الۡمِیۡزَانَ (55:9) وہ جسے محاورے میں ڈنڈی مارنا کہتے ہیں یہ ہے اس کا ترجمہ: میزان میں ڈنڈی نہ مارو، اپنے نظامِ انسانیت کے اندر یہ نہ کرو کہ ڈنڈی مار دو، کسی کو کتنا مل رہا ہے کسی کو کتنا مل رہا ہے، کسی کو کس بات سے مل رہا ہے، صاحب! کہ یہ نہ کرو۔ یاد

---

❶ ترازو کے باٹ بگڑ گئے۔

❷ یہ قرآن انسانوں کو بھی اسی غرض کے لیے دیا گیا ہے کہ ان کے معاشرے میں باہمی ربط و ضبط کے لیے جس توازن کی ضرورت ہے، وہ بگڑنے نہ پائے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔1257)۔

رکھو اور سب سے پہلا حکم اس کے اندر جو میزان قائم کرنے کا ہے وہ معاشی مسئلہ ہے' یہ انسان کو طبعی زندگی کا بنیادی مسئلہ ہے اور اسی مسئلے نے تو طوفان برپا کر رکھا ہے۔ خواہ وہ ایک کارخانے دار کے ایک مزدور کا مسئلہ ہو اور خواہ دو مملکتوں کا مسئلہ ہو' مسئلہ ہی سارا معاشی بن کر سمٹ کر رہ جاتا ہے' پہلے یہ سب کچھ اسی کے اوپر ہے پھر آگے باقی نظام چلتے ہیں اور اس کے لیے کہا کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ یہ میزان قائم رکھنے کے لیے' معاشی مسئلے میں' بنیادی اصول کیا ہوگا؟ بنیادی اصول کیا ہے؟ عزیزانِ من! معیشت کی ساری چیز' جتنی بھی ہے' زمین سے اگتی ہے' پیداوار کھانے پینے کے لیے زمین سے اگتی ہے اور یہ دنیا میں جتنی انڈسٹری (صنعت) لگی ہوئی ہے' اس کے لیے ہر چیز زمین سے' معدنیات کی شکل کے اندر نکلتی ہے۔ زمین ہی اولیں اور آخری ذریعہ پیدائش (Production) ہے اور اسی سے سارے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ انسان خدا کی اس پیدا کردہ مثلاً اس دس ہزار ایکڑ زمین کا مالک بن کر بیٹھا ہوا ہے' قرآن حمید اسے شرک قرار دیتا ہے۔

معاشی مسئلہ کا بنیادی حل زمین پر ذاتی ملکیت کے شرک کو ختم کرنے میں ہے

جہاں زمین کے متعلق کہا ہے کہ لوگ اسے ملکیت میں لے لیتے ہیں' کہا ہے کہ یہ شرک ہے' یہ خدا کے مقابل میں کسی کو خدا بنا دینا ہے کیونکہ زمین کی ملکیت صرف خدا کی ہے جو بھی اس میں اپنا حق ملکیت جتاتا ہے وہ خدا کا شریک بنتا ہے۔ کہا کہ یہ ذریعہ نشوونما ہے' یہ وہی رحمت کی بات ہے' مفت ملی ہوئی ہے' بغیر پیسے کے ملی ہوئی ہے' نہایت لطافت سے ملی ہے' وہ احسان بھی نہیں جتاتا' وہ شکریہ کا بھی متمنی نہیں ہے۔ وہ تو کہتا ہے کہ یہاں سے تمہارا وزن کا مسئلہ پیدا ہوگا جہاں سے تم نے ڈنڈی مارنی ہے۔ اس میں ڈنڈی نہ مارو۔ پھر کہا کہ وَالۡاَرۡضَ وَضَعَهَا لِلۡاَنَامِ (55:10) زمین کو ہم نے تمام مخلوق کے فائدے کے لیے پیدا کیا ہوا ہے۔ کسی فرد کو حق حاصل نہیں ہے کہ اس کے اوپر قبضہ کرے۔ یہ وَضَعَهَا لِلۡاَنَامِ [1] (55:10) ہے' معاشی مسئلے زمین کے مسئلے کے لیے ہے۔ اب ملکیت زمین کے اوپر کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ یہ سب کچھ اسی لیے ہے جب اس قرآن حکیم کو چھوڑ کر ادھر ادھر جائیں گے تو یہ سارا کچھ لکھنا پڑے گا' یہ سارا کچھ شرک ثابت کرنے کے لیے ہے۔ آج ملکیت زمین کو عین اسلامی ثابت کرنے کے لیے کتابیں لکھی گئیں اور ہزار برس سے لکھی جا رہی ہیں۔

صدیوں سے ہمارے ہاں ملوکیت کے دور کا اسلام رائج ہے

عزیزانِ من! ملوکیت کے زمانے کا اسلام یہی ہوگا۔ یہاں کہا ہے کہ وَضَعَهَا لِلۡاَنَامِ (55:10) قرآن کریم کی ایک آیت نے فیصلہ کر دیا۔ کہا ہے کہ وَضَعَهَا (55:10) ہم نے اس کو بنایا ہے' زمین کو ایسا رکھا ہے کہ یہ لِلۡاَنَامِ (55:10) ہے' ملکیت کے لیے

---

[1] اسے تمام مخلوق کے فائدے کے لیے مشترکہ طور پر دیا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص۔ 1257)۔

نہیں ہے' منفعت کے لیئے' فائدے کے لیے ہے۔ انام میں ساری مخلوق آجاتی ہے: انسانی اور باقی بھی' جن کا دارومدار زمین کی پیداوار کے اوپر ہے' ہر جاندار کا مدار اسی پہ ہے' یہ انام ہے۔ قرآن حمید نے یہ چیز کہی ہے۔ کہا کہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (41:10) اسے ضرورت مند کے لیے یکساں کھلا رہنا چاہیئے' یہ صرف ضرورت پوری کرنے کے لیے ہے' ذخائر کرنے کے لیے نہیں ہے' اس کی پیداوار کو بیچ بیچ کے اتنے بڑے دولت مند بن کر انڈسٹریاں (صنعتیں) لگانے' مال بنانے اور یہ کچھ کرنے کے لیے نہیں ہے' یہ تو صرف ذریعہ نشوونما ہے' خدائے رحیم نے' خدائے رحمٰن نے' یہ ذرائع دیئے ہیں' یہ للانام ہیں' اس میں ''لام'' نافع ہے۔

عزیزانِ من! آگے کہا ہے کہ ہم نے تمام مخلوق کے لیے زمین کو پیدا کیا فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ o وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ (55:11-12) زمین کے متعلق بتایا ہے کہ اس میں سے مختلف قسم کی چیزیں پیدا ہونگی۔ آپ کے ہاں پھل ہیں' کھجوریں ہیں۔ عربوں کو یہی کہنا تھا۔ اگر قرآن کریم ہماری طرف آتا تو آم کہتا۔ کہا ہے کہ وہاں کھجوریں ہیں' ایسا اناج ہے جو خوشوں کے اندر ہوتا ہے اور اس کے ساتھ حسنِ ذوق ملاحظہ فرماؤ' پھولوں کی خوشبو بھی تو اس میں شامل ہے۔ کیا خدا ہے یہ! ایسا حیوان کے لیے نہیں ہوتا۔ حیوان یہی جانتا ہے کہ اس کو کھا لیتے ہیں۔ پھول ہوں یا پتے ہوں' اس سے پیٹ بھر جاتا ہے۔ یہ انسان کی خصوصیت ہے جو اس کی خوشبو سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے اور یہ بھی تو طب میں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بھی اثر انسان کی صحت پر کتنا جا کے پڑتا ہے! بہر حال جذبات پہ تو پڑتا ہے ہے اور آگے ہے فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (55:13) وہ جو اس ساری سورۃ میں چلا آئے گا لیکن بات ایسی نہیں ہے کہ جسے میں آخری منٹ میں بیان کر سکوں' اسے ہم آئندہ درس پہ چھوڑ دیتے ہیں کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (55:13) بار بار دہرایا جا رہا ہے' دو دو آیتوں کے بعد دہرایا جا رہا ہے' سورۃ الرحمٰن عجیب سورۃ ہے۔

عزیزانِ من! ہم آیت 12 تک آئے۔ یہی تیرھویں آیت فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ہے' اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀❀............❀❀............❀❀

دوسرا باب: سورة الرحمٰن (آیات 13 تا 18)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جنوری 1983ء کی 14 تاریخ ہے اور قرآن کریم کا آغاز سورۃ الرحمٰن کی آیت 13 سے ہو رہا ہے: (55:13)۔ میں پہلے ہی معذرت پیش کر دوں کہ مجھ پر فلو کا حملہ ہو رہا ہے' آج اس قابل بھی نہیں تھا کہ درس دے سکوں لیکن میں حاضر ہو گیا ہوں۔ گلے پہ اس کا خاصا اثر ہے' وہ ریاض خیر آبادی نے تو کہہ دیا تھا کہ

گلا بیٹھا ہوا' خدمت اذاں کی اور کعبے میں
بھلے کو ہم اٹھا لائے تھے ناخوں سے برہمن کو

میں ناخوں سے برہمن کو اٹھا کر نہیں لا سکتا تو آپ کو اسی گلے کے ساتھ نباہ کرنا ہوگا۔

قرآن کریم کے خلاف ایک گہری سازش: وحی کی دو قسموں والا معاملہ

سورۃ الرحمٰن کی پہلی 12 آیات اور تمہیدی تفصیلات تو پچھلے درس میں سامنے آ گئی تھیں مگر ایک نکتہ باقی رہ گیا تھا۔ ہمارے ہاں جہاں دین میں تاریخیں (Histories) مرتب ہوئیں' ان میں ایک سب سے بڑی بنیادی تاریخ یہ بھی تھی کہ یہ کہا گیا کہ وحی کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وحی تو قرآن حمید کے اندر محفوظ ہے اور دوسری وحی قرآن کریم کے باہر ہے۔ وہ جو قرآن کریم کے اندر والی تھی وہ تو تعویذ لکھنے کے کام آئی اور آپ کے ہاں کا سارا شریعت کا دارومدار' اس وحی پہ ہے جو ان کے بقول قرآن حکیم سے باہر تھی۔ اس کے متعلق میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں کہ یہ بڑی سازش ہے۔ حقیقت میں یہ جو اَلرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (55:1-2) کہا گیا ہے' یہ نکتہ یہاں آیا ہے' جو

میں پچھلے درس میں پیش نہیں کر سکا تھا۔ وہ نکتہ قرآن حکیم نے یہ کہا ہے کہ قرآن حکیم ہی کو رحمٰن نے تعلیم کیا ہے۔ یہ کہیں اور نہیں آیا کہ قرآن حکیم کے علاوہ کچھ اور بھی تھا جو علم کیا ہو۔ یہ تو ایک دو لفظوں میں بات صاف ہو جاتی ہے اگر اس کے علاوہ بھی کچھ تعلیم کیا ہے تو اس کی سند قرآن حکیم سے لائیے۔ تو **عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ** (55:2) کہا ہے۔ یہ صرف قرآن کریم ہی ہے جو خدا نے تعلیم کیا ہے۔ اور قرآن کریم ہی ہے جو وحی ہے' اس کے علاوہ وحی اور نہیں ہے۔ یہی وحی ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ **وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا** (6:115) اور **لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ** (6:34) اسی میں مکمل ہو گیا' یہی غیر مبدل ہے' یہی محفوظ کر دیا گیا ہے اور وحی اس سے خارج اور کہیں نہیں ہے۔

یہ پہلی بات تھی جو میں نے عرض کی۔ تمہیدی آیات بھی اس میں آئیں کہ خدا نے انسان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے وحی کی تعلیم دی' جسمانی نشوونما کے لیے بھی جو چیزیں پیش کی تھیں' ان کا بھی ذکر کیا تھا اور انداز میں' جو قرآن حکیم کا ہے' کہ وہ کوئی بھی بات کرے' جو اصل مقصود اور اصل بنیاد ہے' اسے وہ دو لفظوں میں سامنے لے آتا ہے۔ کہا یہ کہ جسمانی نشوونما انسانوں کی ہی نہیں بلکہ ہر جاندار کی ان چیزوں پہ ہے جو زمین سے پیدا ہوتی ہیں اور زمین کے لیے کہا کہ **وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ** (55:10) یہ ہم نے تمام مخلوق کے لیے پیدا کی ہے' کوئی اس کو اپنی ذاتی ملکیت میں نہیں لے سکتا۔ دو دو لفظوں میں وہ اپنے نظام کو حل کر جاتا ہے۔ اس سے سارا معاشی نظام حل ہو جاتا ہے۔ صاحب! پھر کہا کہ **فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ○ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ** (55:11-12)۔ یہ زمین ہے جس سے پھل اگتے ہیں' اس میں ان کے ہاں پھول ہوتے ہیں' اناج ہوتا ہے۔ یہ ساری چیزیں ضروریات زندگی کے لیے ہیں۔

اس سورۃ میں ہر جگہ لفظ ''الآء'' کا ترجمہ نعمت کرنا صحیح نہیں ہے

عزیزانِ من! اس کے بعد یہ آیا تھا کہ **فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ** (55:13)۔ آپ کوئی قرآن حکیم اٹھا کر دیکھیں' اس کا عام ترجمہ یہی لکھا ہوگا کہ ''تم خدا کی کون کون سی نعمتوں کی تکذیب کرو گے' یعنی ''الآء'' کا ترجمہ ''نعمت'' ہی کیا جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض مقامات تو ایسے ہیں جن میں یہ ترجمہ کر دیا جائے تو وہ اس کے مطابق ہوتا ہے لیکن ایسے مقام بھی تو آتے ہیں جن میں اگر یہ ترجمہ کیا جائے تو بات بنتی نہیں ہے۔ اسی سورۃ کی آیت **هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ** (55:43) ہے۔ یہ مکافات عمل کے سلسلے میں کہا ہے۔ یہ بات تو وہاں آئے گی جہاں یہ آیت آئے گی لیکن اس وقت ہمارے سامنے جو نکتہ ہے' میں اس سلسلہ میں بیان کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ مجرموں سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ جہنم جس کی تم تکذیب کرتے تھے۔ اس میں ایک طرف آگ کا عذاب اور دوسری طرف **يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ** (55:44) کھولتے ہوئے پانی کا عذاب ہوگا۔ اور اس کے بعد یہ ہے کہ **فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ** (55:45) پہلے ترجمہ کیا جائے کہ تم خدا کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے تو یہ جہنم اور اس میں یہ آگ کا ایسا عذاب اور یہ کھولتا ہوا

پانی، کون سی نعمتیں ہیں جس کے متعلق یاددہانی کرائی جارہی ہے۔

''الآء'' کا ترجمہ ''قدرت'' کے علاوہ ''کرشمہ'' کے بھی ہوتے ہیں

یہ ''الآء'' بڑا جامع لفظ ہے اس کے معنیٰ ''قدرت'' کے ہوتے ہیں اور قدرت کے یہ معنیٰ ہی تو ہیں جو ہر چیز پرفٹ ہو جاتے ہیں بلکہ ایک صاحب ❶ لغت نے تو کہا ہے کہ اس سے بھی آگے چلیے، یہ جسے آپ کرشمہ کہتے ہیں، یہ بھی اس کے معنی ہیں۔ اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ایسی نادر چیزیں جو پیدا کی جائیں لیکن میں نے اپنے ''مفہوم القرآن'' میں اس کا ترجمہ ''قدرت'' کیا ہے۔ اس سورۃ میں متعدد بار یہ آیت آتی ہے۔ اس میں اگر یہ ترجمہ ''قدرت'' کیا جائے تو وہ ہر جگہ موزوں نظر آتا ہے، نعمت کیا جائے تو ایسے مقامات آتے ہیں جہاں یہ فٹ ان نہیں ہوتا اس لیے اگر قرآن حکیم کے تراجم آپ کے سامنے آئیں تو اس میں یہ مشکلات سامنے آئیں گی، آپ کے پاس ان کا حل نہیں ہوگا، ایک اعتراض پیدا ہوگا اور غیر مسلم تو فوراً ان نکات کو پکڑیں گے۔ اب ان کے سامنے قرآن حکیم کی اصل آیت تو ہو گی نہیں یا الفاظ نہیں ہونگے، ترجموں سے ہی وہ لیں گے۔ انگریزی کے ترجمے میں یا اردو کے ترجمے میں، تراجم تو اسی قسم کے ہیں۔ بہرحال ''الآء'' کے معنی عربی زبان کی لغت میں یہ ہیں۔ یہ میرے تراشیدہ نہیں ہیں۔

لغت کے بغیر قرآن کا مفہوم خود تراشنا شرک ہے

عزیزانِ من! (معاذ اللہ) قرآن حمید میں اپنے ذہن سے کوئی چیز تراش کر پیش کرنا تو شرک ہے۔ خدا تعالیٰ مجھے معاف رکھے، پناہ میں رکھے کہ مجھ سے یہ چیز ہو جائے۔ میری ''لغات القرآن'' کے اندر اس کی سند موجود ہے، ان کے معنی کی سند، ان کے لغت میں سے، انہی کی تفاسیر میں سے، میں نے دی ہوئی ہے۔ اپنی طرف سے تو میں سند دے ہی نہیں سکتا۔ لغت کی سند اپنی طرف سے کیسے دے سکتا ہوں!! وہاں آپکو یہ ملے گا کہ اس کے معنیٰ ''قدرت، اقتدار'' کیا جائے تو زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔ یہاں پھر یہ آیا ہے کہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:13) تکذبٰن میں یہ تثنیہ کا صیغہ ہے۔ ذرا آگے چل کر بتاؤں گا کہ دو کیوں کہا گیا ہے۔ باقی زبانوں میں تو واحد اور جمع ہی ہوتا ہے لیکن عربی زبان میں تین صیغے ہوتے ہیں: واحد بھی ہوتا ہے ایک کے لیے، تثنیہ ہوتا ہے دو کے لیے اور پھر جمع ہوتا ہے دو سے آگے تین سے آگے۔ یہ آگے چل کر میں عرض کروں گا کہ اس سورۃ میں یہ آیات جتنی دفعہ آئی ہیں، اس میں یہ صیغہ جو ہے تثنیہ کا ہے۔ یہ بات آگے چل کر خود واضح ہو جاتی ہے۔ بہرحال اس سے آگے چلتے ہیں۔ آپ دیکھیے ''نعمت'' کی بجائے میں نے اس کا ترجمہ ''قدرت'' کیا تو وہ ہر جگہ کیسے فٹ ہوتا ہے ''سو تم خدا کی کس کس قدرت کو جھٹلا سکتے ہو!''

---

❶ یہ صاحب لغت ہیں ''علامہ حمید الدین فراہیؒ'' اور ان کی تالیف ہے ''مفردات القرآن'' ص۔۱۱''۔

آدم کی پیدائش کا مروجہ قصہ

آگے آیا ہے کہ خدا کی قدرتوں کا اندازہ کرنا ہوتو خود انسان کی تخلیق پر غور کرو کہ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (55:14) انسان کو پیدا کیا۔ ان الفاظ کا عام ترجمہ لیا جائے تو یہ ہے کہ اسے ایک ایسی مٹی سے پیدا کیا جو سوکھ کر ٹھیکری کی طرح بجتی ہے۔ اب یہ مسئلہ کہ پہلا انسان کیسے پیدا ہو گیا' پہلے ہی دن سے جب انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے' آج تک یہ انسانوں کے لیے معمہ بنا رہا تھا۔ بات تو سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی' اب تو یہ مسئلہ بڑا آسان ہے کہ بچہ کیسے پیدا ہوتا ہے؟ اس طرح کہ عورت اور مرد کا جنسی اختلاط ہوتا ہے' اس سے استقرار حمل ہوتا ہے' اس کے نتیجے میں بچہ پیدا ہوتا ہے' پھر وہ لڑکا پیدا ہوتا ہے' دوسری جگہ لڑکی پیدا ہوتی ہے' پھر یہ سلسلہ نسل انسانی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہاں مشکل ہی کوئی نہیں ہے۔ یہ مشکل تو وہاں آ کر پیش ہوئی جہاں پہلے مرد اور عورت نہیں تھے' جن کے اختلاط سے آگے سلسلہ چلنا تھا۔ وہ کیسے پیدا ہو گئے؟ یہ تھا مسئلہ۔

باقی توہمات کو چھوڑ دیئے' خود آپ کے ہاں اس مسئلے کا جو حل کیا' وہ یہ ہے کہ جی اللہ تعالیٰ نے کسی طرح سے ادھر ادھر سے مٹی جمع کی اور پھر اس مٹی جمع کرنے کی بھی تفاصیل آپ جانتے ہیں' ہمارے ہاں زیب داستاں کے لیے پھر کیا کیا نہیں بڑھایا جاتا: وہ مٹی کس طرح سے جمع کی' کہاں کہاں سے فرشتوں کو حکم دیا کہ کس کس قسم کی وہ مٹی لائے' مٹی بہر حال جمع کی۔ جس طرح سے کمہار مٹی کا ایک تودہ سا بناتا ہے تو اس طرح سے مٹی کا تودہ بنایا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کا ایک انسان بنا دیا۔ آپ نے روح پھونک دی تو وہ مرد بن گیا۔ پہلا مرد تو وجود میں آ گیا' اب پھر آگے اس کے ساتھ کوئی عورت ہونی چاہیے تا کہ آگے یہی سلسلہ چلے۔ مرد تو انہوں نے بنا دیا' معاف رکھیے گا' شاید مٹی ختم ہو گئی' ورنہ ایک عورت بنا دینے میں کیا دقت آتی تھی لیکن اس مٹی کی عورت بنا دینے سے تو ان کی ساری تعلیم خاک میں مل جاتی' عورت اور مرد برابر ہو جاتے' خدا نے تو صرف مرد ہی بنایا تھا' پھر کیا ہو؟ کہا کہ وہ مرد اداس رہنے لگا' اکیلا تھا' تنہا تھا' اس کی اداسی مٹانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے پہلو کو چیرا اور اس کے اندر عورت بیٹھی ہوئی تھی' عورت نے چھپ کر بیٹھنا تھا اور وہاں اس مرد کے پہلو کو چیر کر وہاں سے نکال لی اور ان کا نکاح کر دیا۔ آپ حیران ہونگے تفسیروں میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا مہر کتنا تھا' نکاح کس نے پڑھا تھا۔

ایک الجھن اور بُری داستان

آپ حیران ہونگے کہ یہ ساری تفسیریں ریڈیو پاکستان کے درسِ قرآن میں آئی تھیں۔ ریڈیو پر درس قرآن کے اعلانات ہوا کرتے تھے۔ بڑے بڑے علامہ آ کر یہ بتایا کرتے تھے کہ ان کا پھر نکاح کیسے ہوا۔ اصل تو یہ ہے کہ جب حقیقت نگاہ سے اوجھل ہو جائے تو پھر افسانے باقی رہ جاتے ہیں۔ بہر حال یہ جو پہلی شکل تھی کہ پہلا جوڑا کیسے بنائیں کیونکہ اس سے آگے تو یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے'

پھر چل سوچل، چنانچہ اس طرح جو پہلی شکل تھی، وہ تو انہوں نے حل کر دی۔ اور پھر اطمینان کی نیند سو گئے کہ یہ مسئلہ تو حل ہو گیا۔ مرد بھی بن گیا، عورت بھی بن گئی۔ آگے ایک اور الجھن آئی تھی کہ اب اسی جوڑے کے ہاں لڑکے نے پیدا ہونا ہے، لڑکی نے پیدا ہونا ہے، وہ ہوئے بہن بھائی، شریعت کی رو سے بہن بھائی کی شادی ناجائز ہے، اب وہاں شریعت آ گئی، پھر کیا کریں؟ حل ان کے ہاں یوں ہوتے ہیں کہ پہلے ایک الجھن پیدا کرتے ہیں، پھر اس کا حل تلاش کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ وہ پھر یوں ہوا تھا کہ ایک حمل کا جو لڑکا تھا، اس کی شادی دوسرے حمل کی لڑکی سے کرتے تھے اور اگر اس حمل سے جوڑا پیدا ہوتا تھا یعنی لڑکا اور لڑکی تو اس حمل کی لڑکی کی شادی دوسرے حمل کے لڑکے سے کرتے تھے گویا اگر حمل بدل جائے پہلا اور دوسرا، تو پھر وہ بہن بھائی نہیں رہتے۔

اپنی کم مائیگی اور لاعلمی کو نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کر دیا گیا

عزیزانِ من! کیا کیا میں آپ سے عرض کروں! یہ اسے اپنے تک ہی محدود رکھتے تو پھر بھی یہ ٹھیک ہوتا کہ اس زمانے میں یہ بات انسانوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی، انہوں نے یہیں تک سمجھا تو معاملہ ختم ہو جاتا۔ مصیبت انہوں نے یہ پیدا کر دی کہ یہ جو کچھ انہوں نے کہا، اس کو نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کر دیا کہ وہ جو علم انسانی کی بلندیوں پر فائز تھے، انہوں نے یہ کچھ بتایا ہے۔ یہ آ گئیں آپ کے ہاں کی روایات، احادیث اور اس کے بعد پھر عقیدہ یہ پیش کیا کہ کم از کم یہ صحاح ستہ یا اس میں جو بخاری اور مسلم کی حدیثیں ہیں، ان کی کسی ایک حدیث کا انکار کرنا، مسلمان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ اس کا آپ انکار بھی نہیں کر سکتے۔ عزیزانِ من! چودہ سو سال کا عرصہ ہوا جب قرآن کریم ایک ایسے خطہ زمین میں نازل ہوا۔ جو یوں کہیے کہ علم کے اعتبار سے تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ جیسا میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ حجاز کے خطے میں مکہ بڑا ہی بنیادی شہر تھا۔ یہ اس زمانے کا بین الملی شہر تھا۔ مکے میں سترہ آدمی ایسے تھے جو نوشت خواند یعنی صرف لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اعلیٰ علم تو آگے جا کر رہا۔ یہ اس قسم کا ماحول تھا اور اس کے علاوہ یہ اس قسم کا ملک تھا جہاں ایک شخص حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے جو اس ملک میں بھی اَن پڑھ تھے۔ یاد رکھیے! نبوت سے پیشتر اَن پڑھ تھے۔ نبوت کے بعد یہ بات نہیں تھی۔ حضورؐ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا لیکن بہرحال وہ نبوت ملنے سے پیشتر اَن پڑھ تھے۔ یہ ایک ایسا خطہ زمین ہے جس کے اندر ایک ایسا شخص پیدا ہوا ہے جو اَن پڑھ ہے، وہ تخلیق انسانی کے متعلق یہ باتیں کر رہا ہے جو ہمارے پاس محفوظ چلی آ رہی ہیں۔ یہاں یہ الجھنیں موجود تھیں۔ عرب میں بھی تو یہی الجھنیں موجود تھیں، اس شخص کے سامنے بھی تو یہی الجھنیں موجود تھیں۔ وہ تخلیق انسانی بلکہ زندگی کی تخلیق کے متعلق وہ کچھ بیان کرتا ہے کہ آج کی بیسویں صدی میں آ کر سائنس کے انتہائی انکشافات ایک ایک کر کے اس کی تصدیق کر رہے ہیں، اس کی سند لا رہے ہیں۔ یہی وہ مقامات ہیں جہاں وہ پیرس کا محقق ڈاکٹر (مورس) بکائے (1911-1989ء)، جس کا میں

نے کئی دفعہ ذکر کیا ہے' ان مقامات پر آ کر جب وہ قرآن کریم کی آیات اس طرح لاتا ہے جیسے حیرت میں ڈوبے ہوئے یہ الفاظ ہوں کہ اے دنیا بھر کے سائنسدانو! خدا کے لیے بتاؤ کہ کیا چودہ سو سال پیشتر ایک شخص اپنی طرف سے یہ بات کہہ سکتا تھا؟ وہ چیلنج دیتا ہے کہ بتاؤ! کیا اس زمانے میں فکر انسانی میں یہ چیز آ سکتی تھی۔ یہ نہیں تو پھر اس کا دعویٰ کہ یہ میری فکر کی تخلیق نہیں ہے' مجھے خدا کی طرف سے علم ہوا ہے' کس طرح تم اس دعوے کو جھٹلاؤ گے۔ وہ بار بار اپنی ❶ کتاب میں یہ کہتا ہے' تخلیق انسانی کے متعلق سائنس کا انکشاف جو اس وقت تک ہوا ہے اس کی تصدیق کرتا ہے۔ وہ سائنسدان انکشاف کے اندر لگے ہوئے ہیں۔ وہ قومیں بیکاروں کی طرح ان نظری مسائل میں پھنسی ہوئی نہیں رہتی ہیں' کہ کوّا حلال ہے یا حرام ہے۔

زندگی کے سلسلہ میں کرّہ ارض پر پیدا ہونے والا پہلا سوال

عزیزانِ من! جب وہ اس بنیاد کی ریسرچ کر رہے ہیں کہ اس زمین پر زندگی کیسے پیدا ہوئی' پھر بات آگے چلے گی کہ انسان کیسے پیدا ہوا۔ پہلی تو لائف کی بات ہے۔ وہ جو زمین کی ابتدا سے جہاں یہ کہیں گے کہ یہ کرّوں کی ابتدا ہے' ان پر پہلی بات زندگی (Life) کی ہے کہ یہ کیسے پیدا ہوئی۔ وہاں تو Inorganic Matter (غیر جاندار مادہ) تھا جو بھی ہوتا ہے' مٹی ہو گی' معدنیات ہوں گی' وہ کچھ بھی ہو' اس میں تو زندگی نہیں تھی۔ اس قسم کا یہ کرّہ زمین ہی لے لیجیے۔ سوال یہ ہے کہ جو پہلی زندگی تھی وہ کہاں سے آئی؟ انہوں نے پہلی تحقیق یہ کی اور تحقیق یہ تھی کہ سمندر کے کنارے جو پانی تھا' وہ مٹی کے ساتھ ملا۔ مٹی کے اندر اس قسم کے سالٹس (نمکیات) اور معدنیات تھے کہ پانی کے ساتھ مل کر سورج کی حرارت جب ان پہ پہنچی ہے تو ذرا سا اس کا خمیر اٹھا اور اس سے' ان کیمیکلز سے' اس طرح پانی اور حرارت کے ملنے سے' اس کے اندر پہلا لائف سیل پیدا ہوا۔ یوں زندگی کی ابتدا ہوئی۔ میں نے Inorganic Matter (غیر جاندار مادہ) مٹی کہا ہے' وہ ملتی ہے' پانی کے ساتھ۔ وہ پھر چکنی مٹی بنتی ہے۔ اس پہ سورج کی حرارت پڑتی ہے' اس سے وہ جسے وہ چپچپی مٹی کہتے ہیں' اس مٹی میں سے کوئی چیز نکلی جیسے مٹی سورج میں رکھی ہوئی ہو۔ یہی مٹی ''تھوبا'' رکھا ہوا ہو' آپ دیکھتے ہیں کہ وہ کیا بن جاتا ہے؟ یہ کہ اس کے اندر سے یہ کیمیکل پانی کے ساتھ ملتے ہیں تو اس سے پہلا لائف سیل بن جاتا ہے۔ اب اگلی بات یہ ہے کہ وہ تو اتنا چھوٹا سا ایک سیل ہے وہ Naked Eye (خالی آنکھ) سے نظر بھی نہیں آتا۔

---

❶ اس کی کتاب کا نام ہے: The Bible, The Qur`an and Science، پاکستان میں یہ کتاب ''اسلامک بک سروس' لاہور'' سے مل سکتی ہے۔ یہ اس کا 1998ء کا دوسرا ایڈیشن ہے۔

نظریہ ارتقا

یہاں سے آگے پھر وہ Evolution (ارتقا) کی تھیوری آتی ہے۔ یہ ہے نظریہ ارتقا کہ پھر (زندگی) لائف جب مختلف مراحل میں سے گزری تو اس سے مختلف قسم کی Species یا انواع کیسے بنیں اور کیسے بنتی ہوئی آگے چلی گئیں تا آنکہ وہ پیکر انسانی میں نمودار ہو گئیں۔ میں اس وقت یہ پورے سلسلہ ارتقا کے متعلق گفتگو نہیں کروں گا' وہ میں نے کئی مقامات پہ بھی دیا ہے۔ میں نے اپنی کتاب ''ابلیس وآدم'' میں بھی اس پہ Discuss کیا ہے۔ یہاں میں نے پوری تھیوری (نظریہ) لائف سیل کی نمود سے لے کر انسانی پیکر تک دی ہے اور مطالب الفرقان کی دوسری جلد میں بھی میں نے یہ چیز Discuss کی ہے اور تمام بڑے بڑے Scientists (سائنسدان) جنہوں نے یہ Discoveries (انکشافات) کیے ہیں' ان کے حوالے بھی وہاں موجود ہیں۔ میں اس وقت وہ نہیں پیش کر رہا۔ اس وقت یہی آیت میرے سامنے ہے کہ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (55:14)۔

قرآن فہمی کے لیے تصریفِ آیات کے طریق کو اپنانا لازم ہے

قرآن کریم کے دیگر مقامات میں وہ تمام آیتیں موجود ہیں جن کے ملانے سے' یہ سارا ارتقا کا سلسلہ' جتنا بھی اس وقت تک نمودار ہوا ہے' ان کڑیوں کے ملانے سے وہ سارا ایک ایک کر کے سامنے آجاتا ہے۔ قرآن حکیم کا انداز یہ ہے کہ وہ دیگر مقامات میں ان میں سے کسی ایک بات کا ذکر کر دیتا ہے' تو اس نے خود کہا ہے کہ تصریف آیات سے میرا مفہوم سمجھ میں آئے گا: جو میں نے مختلف مقامات میں اس موضوع کے متعلق کہا ہے' ان سب کو اکٹھا کر لو تو بات سمجھ میں آئے گی۔ یہ تو سب موجود ہیں' یہاں صرف یہ ایک آیت دی ہے یعنی وہ Phase دیا ہے' جس میں سے یہ مٹی پانی سے مل کر سورج کی حرارت سے خشک ہو کر' ایسے ہو جاتی ہے جیسے Bake (پکائی) کی ہوئی کھنکتی ہوئی ہو۔ چکنی مٹی ہو۔ یہاں سے ہوئی بات۔ اب چند ایک آیات میں پیش کر رہا ہوں۔

پیدائشِ آدم کے سلسلہ میں ریڈرز ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا ایک مضمون

ان کے ساتھ آج اتفاق یہ ہے کہ اسی مہینے' جنوری 1983ء کا ریڈرز ڈائجسٹ[1] (Reader`s Digest) آیا ہے۔ اس میں ایک بڑا پر از معلومات مضمون ہے۔ یہ مضمون ہے تو مختصر لیکن بڑا جامع سا ہے۔ اس کا عنوان ہے How Life on Earth Began یعنی ''زمین پر زندگی کی نمود کیسے ہوئی؟'' اس کی ابتدا کیسے شروع ہوئی؟ اب آپ قرآن حکیم کے الفاظ کا اعجاز دیکھیے کہ بات کیسے سمجھا تا

---

[1] یہ مضمون جارج الیگزینڈر کا ہے جو پہلی مرتبہ نومبر 1982ء کی اشاعت میں منظر عام پر آیا تھا اور اتنا مقبول ہوا کہ ایک مہینے کے بعد جنوری 1983 میں پھر طبع ہوا۔ چزلی بونسٹل (Chesley Bonestell) نے اس مضمون کے تصویری خاکوں میں تشریح وتوضیح کی ہے۔

ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ ہوا کہ وہ چیچپی (چکنی) مٹی لی اور اس سے اس طرح سے پتلا بنا دیا تو گویا یہ آدمی کی تخلیق ہو گئی۔

تخلیقِ انسانی اور قرآن کریم

قرآن کریم کہتا ہے کہ بَـدَ اَخَـلْـقَ الْاِنْسَـانِ مِـنْ طِيْـنٍ (32:7) تخلیق انسانی کے پروگرام کی ابتدا اس بے جان مادہ (Inorganic Matter) سے ہوئی جو تمہارے سامنے مٹی کی صورت میں بے حس و حرکت پڑا ہے۔ یہاں پر ایک لفظ ہے۔ ارباب دانش خلق الانسان کے سلسلے میں اس لفظ کی داد دیں گے۔ اگر صرف ''خلق الانسان'' ہی ہوتا تو وہ ٹھیک تھا کہ یہ پتلا ہی بنا دیا۔ اس میں تو ایک پوری کی پوری اسکیم دینی ہے زندگی دینی ہے اس کے لیے ایک سلسلہ دینا ہے اس نے یہ نہیں کہا کہ بَـدَ اَخَـلْقَ الْاِنْسَانِ ۔ اس نے کہا ہے کہ بَـدَ اَخَـلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ (32:7)۔ یہ دوسرے مقامات میں بھی ہے لیکن بہر حال یہ ایک ریفرنس ہی کافی ہے۔ کہا ہے کہ بَـدَ اَخَـلْـقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ (32:7) انسان کے سلسلہ تخلیق کی ابتدا طین سے ہوئی۔ طین کا ہمارے ہاں تو ایک ہی لفظ ہے ہم اس کا ترجمہ مٹی کرتے ہیں۔ اس لفظ کا انگریزی زبان میں ترجمہ Clay کیا گیا ہے۔ یہ (Tenacious) چپکنے والی ایک بھربھری سی ریتلی سی مٹی ہوتی ہے وہ بھی ایسی جو ایک دوسرے کے ساتھ چپک جائے۔ یہ ضروری تھا کہ وہ چپکنے والی مٹی پانی کے ساتھ ملتی تو بات آگے پہنچتی۔ چپکنے والی مٹی کو Clay کہا جاتا ہے۔ یہ ان کے ہاں لغوی معنی (Dictionery Meaning) ہیں۔ دوسری جگہ قرآن کریم کہتا ہے کہ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ (37:11) ہم نے پیدائش کی ابتدا اس مٹی سے کی جو چپک جاتی ہے۔ اس مضمون نگار[1] نے بڑے بڑے Scientists (سائنسدانوں) کے حوالے دے کر مضمون لکھا ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ جو ان Elements کی زندگی ہے اس کی نمود غیر جاندار مادہ سے ہوئی ہے۔ یہ پہلے کہیں کوئی زندگی چلی نہیں آ رہی تھی جو اس سے اس کی نمود ہوئی ہے۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ بَـدَ اَخَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ (32:7)۔ زندگی کی ابتدا یہاں سے کی ہے اور اس کے ساتھ یہ ہے کہ وَ جَـعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُـلَّ شَـيْءٍ حَـيٍّ (21:30) ہر زندہ شے کی نمود پانی سے ہوئی ہے۔ پانی اور یہ چیزیں یعنی طین ملتی ہے تو طین لازب بن جاتی ہے۔ یہ سائنسدان یہ کچھ لکھتا ہے۔ یہ J.B.S.Haldane حیاتیاتی اشیاء کے حوالے سے بہت بڑا سائنٹسٹ محقق ہے۔ (اس نے 1920ء کی دہائیوں میں الیگزنڈر اوپیرن روسی سائنسدان کی ہمنوائی میں) لکھا ہے کہ

(Alexander& Haldane) independently proposed the first detailed sequences whereby life could have emerged from non-living chemicals[2] (P.117)

---

1. اس مضمون نگار کا نام جارج الیگزینڈر (George Alexander) ہے۔
2. (الیگزنڈر اور ہالڈین) نے آزادانہ طور پر پہلا مفصل سلسلہ ہائے کار پیش کیا' جہاں زندگی کی نمود غیر زندہ کیمیائی اشیاء سے ہو سکتی ہے۔

پہلی چیز یہ ہے کہ Non- living chemicals (غیر جاندار کیمیائی اشیاء) سے لائف (زندگی) کی نمو ہوئی۔ یہ Non- living chemicals یہ طین ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کہتا ہے کہ لائف (زندگی) کی نمو داس طین سے ہے' آگے طین لازب چپکتی مٹی آ گئی۔ ایک دوسرا سائنٹسٹ ❶ ہے' اس کے حوالے سے وہ کہتا ہے کہ

Bernal was the first modern experimenter to point back to mankind`s ancient intuition about clay. Clay is indeed a remarkable material ❷(P.118)

اور آگے لکھتا ہے کہ اس میں کیا کیا چیزیں ہوتی ہیں' جس سے زندگی کی نمود ہوسکتی ہے۔ اب تو یہاں اس کا لفظ طین لازب آ گیا۔ اب وہ جو یہ چپکنے والی مٹی یا طین لازب ہے' اس نے لکھا ہے کہ پھر سورج کی حرارت اس پہ پڑتی رہی' اور اس زمانے میں سورج بہت زیادہ گرم ہوا کرتا تھا' شعلے نکلتے تھے' اس حرارت میں یہ طین لازب پکی (Bake) ہوئی' سمندروں کے کنارے آئی۔ اب دیکھیے عزیزانِ من! قرآن حکیم کے الفاظ میں یہ فخار ہے یعنی ایسی مٹی جیسی گویا بیکری میں سے نکلی ہو' جس کو Baked کہتے ہیں۔ فخار کے معنی یہ ہیں۔ یہ ہے طین لازب: طین کہا' پانی کہا' اس نے طین لازب بنایا' حرارت پہنچائی اور اس کے بعد فخار کہہ دیا کہ Baked Clay (پکی ہوئی مٹی) تھی' وہ ہوئی۔ یہ لکھتا ہے کہ

But the most dramatic event of all was the primordial advance from non- life to clays of life, which apparently took place in the sun- baked clays of ocean beaches ❸(P.120)

عربی زبان کے کسی لغت سے دیکھ لیجیے' فخار کا ترجمہ Baked clay کیا جاتا ہے۔ یہ ہے اس وقت تک کی تحقیق جو آپ کے ہاں چلی آ رہی ہے۔ قرآن حکیم میں طین کہا' پانی کہا' اس سے طین لازب بنایا' اسے فخار کہا' Baked Clay بنایا' یہ سارا کچھ ہوا' پھر یہ نہیں کہا کہ وہ مٹی کا پتلا بنایا ہے۔

طین لازب سے خلاصے کا حصول

عزیزانِ من! جہاں مٹی بھی کہی' وہاں یہ کہا کہ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (23:12) ہم نے انسان کی تخلیق کی ابتدا مٹی کے خلاصہ (بے جان مادہ) سے کی۔ مٹی سے نہیں' مٹی کے اندر جو چیزیں ایسی تھیں جن سے نشو ونما ہوسکتی یا نمود ہوسکتی' اس میں سے اس مٹی کا خلاصہ لے لیا جیسا کہ مٹی میں ایک بیج دبایا جاتا ہے تو وہ مٹی میں سے Salts (نمکیات) اور کیمیکل کھینچ لیتا ہے'

---

❶ اس کا نام برنل (Bernal) ہے۔

❷ برنل عہدِ جدید کا پہلا تجربہ کرنے والا سائنسدان تھا' جس نے طین کے متعلق نوعِ انسان کے قدیم ادراک اور وجدان کی طرف توجہ مبذول کروائی (کہ) طین درحقیقت ایک غیر معمولی قابلِ توجہ مادی شے ہے۔

❸ لیکن ان سب سے بڑھ کر ڈرامائی روداد یہ غیرِ زندگی سے زندگی کی جانب آنے کی اوّلین پیش رفت تھی جو کہ ظاہراً سمندری ساحلوں کی شمسی حرارت سے پکی ہوئی طین میں وقوع پذیر ہوئی۔

انہیں اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اور پھر وہ اوپر کو ابھرتا ہے۔ وہ مٹی نہیں ہوتی' وہ اس مٹی کو چھوڑ کر مٹی کا خلاصہ لیتا ہے یعنی اس میں سے جتنی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ بیج انہیں کھینچ کر اپنے ساتھ لے کر اوپر آ جاتا ہے۔ آپ کہیں گے تو یہی کہ یہ مٹی سے پیدا ہوا لیکن اس کے ساتھ مٹی نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟ کہا کہ مٹی کا خلاصہ ہوتا ہے۔ یہ ہے سُلٰلَةٍ مِّنْ طِينٍ (23:12)۔ کہاں تک میں' اور کڑیاں بھی تو ہیں' انہیں آپ کے سامنے پیش کروں!

آپ حیران ہونگے کہ یہ قرآن کریم ہر نوع کے متعلق جس انداز سے اس نے ارتقا کی منازل کو طے کرایا ہے' کیا کچھ کہہ جاتا ہے۔ یہاں سے' وہ کہتا ہے کہ پہلا لائف سیل پیدا ہو۔ اسے لائف سیل ایسا ہوتا ہے کہ اس میں Male & Female (مذکر و مؤنث) کا Distinction (امتیاز) نہیں ہوتا' وہ لائف سیل کہتے ہیں' وہ ایک ہی ہوتا ہے' اسے قرآن کریم نے نفس واحدہ کہا۔ جب وہ ایک لائف سیل آگے چلتا ہے تو آگے کہا ہے کہ اس کو ہم نے پھر دو ٹکڑوں میں کر دیا۔ یہی سائنس کہہ رہی ہے کہ وہ خود لائف سیل جوشِ نمو سے پھٹ جاتا ہے۔ وہ اس کو Sister Cell کہتے ہیں۔ اس میں سے ایک Male (مذکر) ہو جاتا ہے' ایک Female (مؤنث) ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے کہا کہ نفس واحدہ کو ہم نے یہ کیا مگر مذہبی پیشوا کہتے ہیں کہ پسلی میں سے (بی بی) حوا نکال لی مگر سائنسدان یہ کہتے ہیں کہ وہ یہ ہے جو الگ الگ ہوئے' پھر سلسلہ ارتقا آگے چلا۔ ارتقا (Evolution) کے سلسلے میں یہ کہتے ہیں کہ ایک نوع' ایک شکل میں' ایک منزل میں ٹھہرتی ہے۔ وہ تو پتہ نہیں کہ ایک ایک منزل جو ہے' لاکھوں سال' کروڑوں سال کا مرحلہ ہے۔ تو وہ وہاں ٹھہرتی ہے' پھر وہ اس منزل میں سے ایسی ایسی خوبیاں لے کر جو اسے آگے بڑھنے کے قابل بنا دیتی ہیں' وہ اگلی منزل میں داخل ہو جاتی ہے۔

عزیزانِ من! سلسلہ ارتقا کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم نے دو الفاظ (مستقر اور مستودع) استعمال کیے ہیں۔ کہا کہ وَ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (6:98) تمہاری پہلی ابتدا نفس واحدہ سے ہوئی۔ اب وہ طین لازب سے آگے چل پڑا ہے' اب وہ نفس واحد پہ لائف سیل آ گیا ہے۔ لائف سیل کے بعد یہ سلسلہ ارتقا کس طرح سے چلا اس کے لیے کہا کہ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ (6:98) اس کے لیے ایسا انتظام کیا کہ ایک نوع کچھ وقت کے لیے کہیں ٹھہر جائے۔ یہ اس کا مستقر ہے۔ مستقر کہتے ہیں کہ کوئی حرکت کرنے والی چیز تھوڑے وقت کے لیے کہیں ٹھہر جائے' یہ اس کے لیے شرط ہوتی ہے۔ یہ عربی زبان ہے' عزیزانِ من! یہ شرط ٹھہر جانے کے لیے نہیں ہے حرکت کرنے والی چیز کسی وقت کے لیے ٹھہر جائے۔ اس نے تو پھر اور آگے حرکت کرنا ہوتی ہے۔

ایک منزل سے سامانِ نشوونما حاصل کرنے کے بعد دوسری منزل کے لیے رواں دواں

کہا ہے کہ ہم نے ہر نوع کے لیے مستقر بنایا کہ وہ وہاں اس منزل میں ٹھہر جاتی ہے اس میں اپنی نشوونما کی چیزیں اور آگے بڑھنے کے جتنے سامان ہوتے ہیں' وہ اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ یہ مستقر ہے پھر جب وہ ایسی ہو جاتی ہے کہ آگے بڑھ سکے' کیا بات ہے! مستقر کے بعد مستودع کہا' پھر وہ یہ چیز اماناً اگلی منزل کے سپرد کر دیتی ہے کہ اب اسے تم لے لو۔ عزیزانِ من! اللہ توفیق دے تو

کہیں ان کے ہاں کی جو Evolution تحقیق ہے اسے پڑھیے اور ان آیات کو سامنے رکھیے' آپ کو لفظی ترجمہ نظر آئے گا۔ چودہ سو سال پہلے کے عرب میں ایک امی' اَن پڑھ' وہ یہ باتیں کہہ رہا ہے' سچا ہے' وہ پہلے! اور زیادہ تفصیل میں جانے کے لیے ایسی آیتیں سامنے آتی ہیں کہ چھوڑنے کو جی نہیں کرتا لیکن وقت ایسے لیے جاتا ہے۔ کہا ہے کہ لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ (84:19) تم زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے بلندیوں کی طرف اٹھتے جاؤ گے کہ جب اس کی ایک منزل کے ساتھ مطابقت حاصل کرلو گے تو اس سے اگلی منزل میں پہنچنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ یوں تم منزل بہ منزل آگے بڑھتے اور اوپر اٹھتے چلے جاؤ گے۔ ارتقا کا لفظ بتا رہا ہے کہ بلندیوں کی طرف جانا ہے' اوپر لے جانا ہے' بلند ہوتے چلے جانا ہے' ارتقا میں ہوتا ہی یہ ہے کہ ہر نوع اپنی پچھلی نوع سے کچھ بلند ہوتی ہے اور خصوصیات کے اندر' صفات کے اندر Characteristics کے اندر' وہ بلندیوں کی طرف چلی جاتی ہے لیکن یہ بلندیاں طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ (84:19) ہوتی ہیں۔ قرآن حکیم کے اندر لَتَرۡکَبُنَّ (84:19) آیا ہے' بلندیوں کی طرف چلی جاتی ہے' طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ (84:19) جاتی ہے۔ یہ یکلخت نہیں ہوتا' یہ نوع (Species) بتدریج Stage by Stage Evolve کرتی ہوئی' اوپر چلی جاتی ہے تا آنکہ پھر وہ اس پیکر انسانیت میں آتی ہے۔

اختیار وارادے کی نعمت

عزیزانِ من! یہاں یہ بات دوسری طرف چلی جائے گی کہ وہاں پھر اس سلسلے میں ایک تغیر (Change) ہوتا ہے اور وہ پہلی کڑیوں سے مختلف ایک تحقیق ہے جس میں ہم نے اپنی توانائی کا ایک شمہ دیا اور اسے صاحب اختیار وارادہ بنا دیا۔ اس سے پہلے کی کوئی نوع' صاحبِ اختیار وارادہ نہیں ہے۔ اسے کہا ہے کہ یہ ''خلقِ جدید'' ہے' یہ ایک ''طور''[1] ہی اور ہے۔ اس تخلیق کے لیے نیا طور اختیار کیا ہے لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ میں اس کی تفصیل نہیں بیان کر رہا کہ سلسلہ ارتقا کی مختلف کڑیوں کے متعلق قرآن کریم نے کیا کہا ہے' میں صرف اسی آیت کے سلسلے میں یہاں تک آیا ہوں جو اس نے کہا کہ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ کَالۡفَخَّارِ (55:14) انسان کی جو ابتدا تھی' زندگی کی تخلیق کی ابتدا اس قسم کی Clay سے ہوئی جسے آج کے اس بڑے سائنٹسٹ[2] نے Sun Baked کہا ہے۔ پوچھ رہے ہیں کہ کیا تم اس سے انکار کرو گے' خدا کی اس قدرت کو جھٹلاؤ گے کہ زندگی کی ابتدا اور انسان کی تخلیق کی ابتدا اس طرح سے ہوئی؟ دیکھ رہے ہیں کہ کیا

---

[1] اس کی جمع اطوار ہے یعنی مختلف حدود یا اقسام' مختلف مدارج واحوال یا اندازے (تاج العروس)۔ قرآن کریم میں ہے کہ خَلَقَكُمۡ اَطۡوَارًا (71:14) خدا نے تمہیں ارتقائی منازل میں سے گزار کر انسانی منزل تک پہنچایا۔ تمہاری تخلیق مختلف احوال و مدارج سے گزر کر ہوئی ہے یا تمہیں مختلف احوال میں پیدا کیا (پرویزؒ: لغات القرآن جلد سوم (1961)' ص۔ 1095۔

[2] George Alexander

کیا چیزیں وہ سامنے لاکر پوچھ رہا ہے۔

عزیزانِ من! اس سے پیشتر تو وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (55:15) یہ مخلوق ہوئی جس میں حرارت برداشت کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ تھی کیونکہ زمین کی جو حالت اس زمانے میں تھی' اس میں اسی قسم کی مخلوق اب ناپید ہے۔ یہ سائنسدان بتارہے ہیں 'اس مخلوق سے جس کو ہم انسان کہتے ہیں' پہلے بہت سے انواع (Species) ایسی تھیں جواب ناپید ہوچکی ہوئی ہیں۔ ارتقا کا یہ سلسلہ بڑا دلچسپ موضوع ہے' عزیزانِ من! اگر آپ Study کریں تو ہر اسٹیج پہ جسے قرآن کریم نے مستقر کہا ہے کچھ تو ایسی ہوتی ہیں جو اتنی نشوونما اور قوت حاصل کر لیتی ہیں کہ اگلی منزل میں پہنچ جائیں' کچھ ایسی ہوتی ہیں جو ویسی کی ویسی جامد ہوجاتی ہیں' وہ ویسی ہی رہ جاتی ہیں' کچھ ایسی ہوتی ہیں جو ناپید ہوجاتی ہیں۔ یہ جو بڑے بڑے Skeleton (ڈھانچے) آپ نے کبھی دیکھے ہونگے' وہ ڈھانچے نکلتے ہیں' پھر سائنٹسٹ یوں پتہ لگاتے ہیں کہ یہ بہتر لاکھ سال پہلے کی بات ہے کہ یہ کروڑ برس پہلے کی بات ہے' یہ اس قسم کا تھا اب یہ منہدم اور ناپید ہوگئے' کچھ وہ ہیں جو اسی شکل کے اندر آج موجود ہیں یہ گوریلا (Gorilla) فلپائنز (Chimpanzees) وغیرہ جو آج موجود ہیں یہ آگے نہیں بڑھ سکے' کچھ وہ ہیں جو آگے بڑھ گئے انسان بن گئے' ہم نہیں بلکہ انسان بن گئے۔ آپ کہیں گے کہ یہ میں نے کیا کہہ دیا۔ اقبالؒ (1877-1938ء) نے یہ کہا تھا کہ خدا کی تلاش کر رہا ہے' بآدمے نرسیدی' خدا چہ می جوئی ❶۔ پہلے انسان تو بن' پھر خدا کی تلاش کر۔ ٹھیک ہے سلسلہ ارتقا میں تو ہمیں انسان کہا جائے گا مگر انسانیت کے معیار کے مطابق تو ہمیں یہ نہیں کہا جائے گا۔ یہ بات اور طرف چلی گئی کہ پیچھے جو کڑیاں رہ جاتی ہیں' جو انواع (Specis) رہ جاتی ہیں' ان میں سے کچھ وہ ہوتی ہیں جن کا آج پتہ بھی نہیں۔ سائنٹسٹ یہ کہتے ہیں کہ

> Four billion Years ago, the young planet Earth was a hellish place. Volcanoes were everywhere, chuffing gases, water vapor and blobs of Lava. The gloomy skies, only here and there pierced by shafts of strong sunlight, were frequently illuminated by lightning strikes and the glare of volcanic eruptions. There was no sea, no land, no life ❷(P.16)

اس سے پہلے' ابتدائے سطح ارض میں' جب یہ زمین' کرّہ ارض وجود میں آئی ہے تو اس میں بڑی حرارت تھی' Valcanoes تھے ویسے سورج کی تپش بھی بہت زیادہ تھی۔ ان کا خیال ہے کہ یہ تپش آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی تو اس قسم کی Species (انواع) جن میں

---

❶ بآدمے نرسیدی' خدا چہ می جوئی۔ زخود گریختہ آشنا چہ می جوئی! (اقبالؒ: جاویدنامہ) (تُو تو آدمی تک نہیں پہنچا' خدا کیوں ڈھونڈ رہا ہے تو تو خود سے بھاگا ہوا ہے' تو آشنا کیا تلاش کرتا ہے)۔

❷ Alexander, George: How life on Earth began, Reader`s Digest, November 1982,pp,116-120 and Reader`s Diget, January 1983.

حرارت برداشت کرنے کی صلاحیت انسانوں سے اور بعد کی مخلوق سے کہیں زیادہ تھی' وہ اب ناپید ہو چکی ہوئی ہیں۔ یہ ہے ان کی تحقیق۔

قرآن حکیم کے نزدیک لفظ ''جن'' کا مفہوم اور ہمارا پیدا کردہ تصور

ہمارے ہاں وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (55:15) کا ترجمہ ''جن'' ہوا کہ خدا نے آگ سے ''جنوں'' کو پیدا کیا' انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ جن کے معنی ''جن'' ہوا اور پھر جنوں کے اوپر تو پوچھو ہی نہیں' آج تو ان کا کام ہی یہ نظر آتا ہے۔ جو ہسٹیریا والی بیچاری معصوم بچی ہوتی ہے' وہ ''جن'' اس پہ سوار ہو جاتا ہے اور یہ جا کر مار مار کر اس کا یہ ''جن'' نکال لیتے ہیں۔ وہ نکلتا ہے یا نہیں نکلتا' ان کی جیب سے پیسے ضرور نکل جاتے ہیں۔ کیا یہ ''جن'' عجیب مخلوق موجود ہے؟ عربی زبان میں یہ جو اس لفظ کا مادہ ''ج ن ن'' ہے' اس کے معنی یہ ہیں: ''وہ شے جو نگاہوں سے پوشیدہ ہو' نظر نہ آئے'' عرب ہر اس شے کے اوپر اس لفظ کا استعمال کرتے ہیں جو نظر نہ آئے۔ عرب میں بھی تو ہم پرستی تھی' وہ برے جاہل جیسے تھے اور لوگوں میں ''جن'' تھے' اس میں بھی جن تھے۔ قرآن حکیم تو یہ بات نہیں مانتا کہ آج اس قسم کی یا رسول اللهؐ کے زمانے میں ایسی مخلوق تھی کہ جو پھر انسان بن کر آتی ہے' انسانوں میں رہتی ہے' انہی میں کھیلتی کودتی ہے' پھر چلی جاتی ہے۔ قرآن حکیم اس کو کہیں نہیں مانتا' ان چیزوں کو نہیں مانتا جو اس طرح سے ان بچیوں کے سر پہ سوار ہو جاتے ہیں اور چڑھ جاتے ہیں۔ ہم ''جن'' کے یہ افسانے روز سنتے ہیں۔ قرآن حکیم وہ نہیں مانتا۔ اس ''جن'' کے معنی تو یہ ہیں جو نگاہوں سے پوشیدہ ہو۔ میں آگے جا کر بتاؤں گا جہاں جہاں قرآن حکیم نے انس اور جن کا لفظ استعمال کیا ہے، ان ہیں وہ شہری آبادیاں جو آپس میں موانست سے اکٹھی رہتی ہیں اور ''جن'' تھے یہ جو ان کے ہاں کے صحرانورد' خانہ بدوش جنگلوں میں رہتے تھے' آج بھی عربوں کے ہاں جائیے تو وہ اس سے یہی معنی لیتے ہیں۔

جن و انس دو قبیلے تھے

اس حجاز[1] میں تو دو تین ہی شہر ہیں' باقی ساری آبادی دور جنگلوں میں رہتی ہے' نگاہوں سے پوشیدہ' وہ عرب ان کو ''جن'' کہتے تھے۔ ان شہر والوں کو انس کہتے ہیں۔ ان کے ہاں جن و انس انسانوں کے یہ دو قبیلے تھے لیکن یہ ''جن'' دوسری بات ہے۔ یہ جآن جو قرآن حکیم نے کہا کہ ایک تو یہ بات دیکھیے۔ اس جآن کے معنی ہیں ایسی مخلوق جو ناپید ہو چکی ہو' اب نظر نہ آ سکتی ہو' اور اس کے متعلق یہ جو چیز ہے کہ ہمارے زمانے میں موجود وہ اس قسم کی چیز تو خود قرآن حکیم کی (15:27) آیت کے خلاف ہے۔ یہ لفظ جآن ہے جو یہاں آیا ہے۔ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (15:27) انسانی پیدائش سے پہلے کے دور کے اندر کوئی مخلوق تھی جو اب ناپید ہے' اسے ایسا پیدا کیا تھا' جو بہت زیادہ حرارت برداشت کر لیتی تھی۔ یہاں اس آیت میں ''من قبل'' لکھا ہے اور کہا ہے کہ وہ ناپید ہے' کوئی ایسی مخلوق اس زمانے میں اس سے پہلے شاید اس کی ضرورت نہ ہو اس کی ضرورت ہوئی جو سائنٹفک تحقیق نے ہمیں بتایا کہ انسان سے پیشتر کتنی آبادیاں تھیں جو اب ناپید ہو چکی ہوئی ہیں' کچھ جامد ہو چکی ہوئی ہیں۔

---

[1] ملک عرب جس میں مکہ' مدینہ' طائف اور وہ زمین جو نجد اور غور کے درمیان ہے' شامل ہے۔

انسانوں سے پہلے والی مخلوق جواب ناپید ہو چکی ہے

یہ بتایا ہے کہ اس Earth (زمین) پر اس کا درجہ حرارت بہت زیادہ بلند تھا' اس درجہ حرارت میں جینے والی کوئی ایسی مخلوق [1] تھی' جس کو خدا نے ''من قبل'' پیدا کیا تھا۔ یہ انسان سے پہلے کی بات ہے جو قرآن حکیم کر رہا ہے اور اب جآن کے معنی'' جو ناپید ہو چکی ہیں'' نگاہوں سے پنہاں ہیں اور کہیں نظر نہیں آتیں۔ وہ اس سے پہلے کی بات ہے۔ اب انسان کی بات ہے۔ کہا کہ اس قسم کے کرۂ ارض کے حالات میں' جہاں اتنی درجہ حرارت تھی' جہنم کی آگ کے شعلے بھڑکتے تھے' اس کے اندر سے مٹی جیسی Inanimative (غیر جاندار) شئے' جامد شئے' جس میں زندگی نہیں ہوتی تھی' وہاں سے زندگی کی نمود کی اور اسکے بعد طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (84:19) درجہ بدرجہ' رفتہ رفتہ' مختلف منازل میں سے گزرتے ہوئے' انسان کا پیکر' انسانیت کے اندر' زندگی آ گئی اور یہاں یہ صاحبِ اختیار و ارادہ' صاحبِ عقل و شعور انسان' پیکر کے اندر' اس منزل کے اندر تمہارے سامنے آ رہا ہے۔ یہاں سے یہاں تک کہو کہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:16) غور کرو کہ تم خدا کی کس کس قدرت کو جھٹلاؤ گے۔

آج کے سائنٹسٹ سے ایک کھلا چیلنج

عزیزانِ من! ہم سے تو اس نے کیا کہنا ہے کہ کیوں جھٹلاتے ہو؟ آج کے سائنٹسٹ سے وہ پوچھتا ہے کہ تم تو اپنے انکشافات سے' اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ یہ سلسلہ کس طرح سے چلا' جو ہم بتا رہے ہیں۔ کہو کہ تم اس چیز کو جھٹلا سکتے ہو کہ یہ چیز کسی انسان کے بس کی بات نہ تھی' وہ یہ کہے کہ یہاں کوئی اور ایسی قوت تھی جو یہ کچھ کرے جو اس قسم کی قوت والی ہستی ہے۔ کیا تم جھٹلا سکتے ہو کہ وہ یہ نہیں ہے اور یہ Automatically خود بخود کسی نہ کسی طرح سے ہو گیا؟ کہو کہ کیا تم اس سب کچھ کو جھٹلا سکتے ہو؟ وہ سائنٹسٹ خواہ خدا کا نام بھی لیں' وہ ایسے مقام پہ وجد میں آ کر کہتے ہیں کہ بے شک یہ کسی ایسی قوت کا نام ہے جو ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتی فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:16) اے دنیا کے سائنسدانو! بتاؤ تم خدا کی کونسی قدرت ہے جس سے اسے جھٹلا سکتے ہو۔

سورج کے نکلنے اور غروب ہونے کے دو گوشے

آگے یہ آتا ہے کہ انسانوں کے لیے کیا کیا کچھ اس نے بنایا ہے! عزیزانِ من! وقت تھوڑا سا ہے لیکن ایک آدھ آیت تو آ ہی جائے گی۔ کہا ہے کہ زمین بنائے' انسان بنائے اس لیے یہ تمام چیزیں کھانے پینے کے لیے بنائیں۔ ان چیزوں کے لیے موسموں کا تغیر نہایت ضروری ہے۔ زمین سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے' وہ موسموں کے تغیرات کا مرہون منت ہوتا ہے۔ وہ بھی چیز ہے رَبُّ الْمَشْرِقَیْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَیْنِ (55:17) سورج اور زمین کی جو باہمی حرکت یا گردش ہے اس تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ سارا جتنا بھی حصہ ہے' ویسے

---

[1] یہ الیگزنڈر جارج کے اسی مضمون کے ابتدائیہ سے اُخذ کیا گیا ہے۔

مشرق ہی ہے' East ہی ہے' یہ سورج کے نکلنے کا مقام ہے لیکن سردیوں میں ایک نقطے سے نکلتا ہے' گرمیوں میں وہ دوسرے نقطے سے نکلتا ہے۔ یہی چیز موسموں کا تغیر ہے کہ سردیوں میں سورج ڈوبتا نظر آئے گا تمہیں کسی اور مقام پہ' گرمیوں میں کسی اور مقام پہ ڈوبتا نظر آئے گا۔ یہ چیزیں تو وہ ہیں جو ہم اپنی آنکھوں سے' یونہی مظاہر کے طور پہ' دیکھتے ہیں کہ یہ یہاں سے ڈوبا' سردیاں آ گئی ہیں تو یہاں سے آ گیا' یہاں سے طلوع ہوا لیکن درحقیقت اس کا تعلق زمین اور سورج کی باہمی گردش سے ہے اور گردش سے ہی موسموں کا تغیر ہے جس پہ ان تمام چیزوں کا دارومدار ہے جو انسان کی زندگی کے لیے' نشوونما کے لیے ضروری ہیں۔ یہ جو تغیرات آتے ہیں' یہ بڑے ضروری ہیں۔ کہا کہ یہ کچھ کیا تو ایسے ہی نہیں کیا کہ اس کو جامد طور پر بنا دیا ہے کہ ایسے ہے اور بالکل ایک ہی طرح سے رہے' کوئی حرکت نہیں' اس میں کسی قسم کی گردش نہیں' اس میں کہا کہ رَبُّ الۡمَشۡرِقَيۡنِ وَرَبُّ الۡمَغۡرِبَيۡنِ (55:17) کس قدر قوت والا ہے وہ قانون جس نے ایسے ایسے عظیم کروّں کو اس طرح پابند کیے رکھا ہے' سو تم خدا کی کس کس قدرت کو جھٹلا سکتے ہو۔

موسموں کے تغیرات کا دارومدار زمین اور سورج کی باہمی گردش پر ہے

یہ مشرقین اور مغربین ہیں یعنی دو مشرقین ہیں اور دو مغربین ہیں۔ اندازہ لگایئے کہ یہ دو مشرقین اور مغربین کہہ کر کس طرح سے موسموں کے جو تغیرات ہیں قرآن حکیم ان کی طرف لے گیا اور پھر جو رب کا لفظ ہے وہ تو ربوبیت ہے' یہ سارا کچھ نشوونما کے لیے ہوتا ہے۔ چلیے! تحقیق کیجیے کہ یہ جو سورج کے طلوع وغروب کے اندر سال کے چھ مہینے میں ایک طرف' سال کے دوسرے مہینے میں دوسری طرف تغیر ہے تو بتایئے تو سہی کہ اس کا ربوبیت کے ساتھ کتنا بڑا تعلق ہے۔ یہ ہمارے لیے ہے کہ ہم اس کا انکشاف کریں۔ ہم کیا انکشاف کریں گے' وہ انکشافات کررہے ہیں وہ آب وہوا پر' موسموں پر' تغیرات پر' ان کے ہاں تو بڑی ریسرچز ہورہی ہیں۔ صاحب! وہ جانتے ہیں کہ یہ مشرقین اور مغربین کے اندر جو تفاوت ہے' دونوں کے اندر جو فاصلے ہیں' جو گردش ہے' وہ کیا کیا نتائج پیدا کرتی ہے اور آج تو شاید ہم یہ بھی معنی لے لیں کہ یہاں جو ہمارے ہاں مغرب ہوتی ہے' سورج غروب ہوتا ہے' امریکہ میں طلوع ہوتا ہے' ہماری مغرب ان کی مشرق ہے' انکی مغرب ہماری مشرق ہے' تو اس کرہ ارض کے اوپر۔ جی چاہے تو یوں بھی کہہ لیجیے کہ یہ دو مشرقین بھی ہیں اور دو مغربین بھی ہیں لیکن بہرحال ان میں سے جو معنی بھی لینے چاہیں' میں تو سمجھتا ہوں کہ یہی جو گردش ہے اور اس میں جو موسم کے تغیرات ہوتے ہیں' وہ ہیں جو یہاں کہے گئے ہیں کیونکہ یہ ساری بات ربوبیت کی ہے۔ سورج ہماری زمین سے 13 لاکھ گنا بڑا کرّہ ہے۔ ان سب کو قوانین کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ دیا ہے کہ وہ یوں طلوع ہوتا ہے' یوں غروب ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (55:18) تم خدا کی کس کس قدرت کو جھٹلا سکتے ہو!

سورۃ الرحمٰن کی آیت 18 تک ہم آج آ گئے' برادران عزیز! 19 سے ہم آگے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ (2:127)

تیسرا باب: سورۃ الرحمٰن (آیات 19 تا 30)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جنوری 1983ء کی 21 تاریخ ہے اور درس قرآن حکیم کا آغاز سورۃ الرحمٰن کی آیت 19 سے ہو رہا ہے: (55:19)۔ سابقہ درس میں، میں نے معذرت چاہی تھی کہ نزلے کے اثر سے میرے گلے پر کچھ تکلیف ہے۔ وہ سانپ تو نکل گیا ہے لیکن اس کی لکیریں دور تک جایا کرتی ہیں، اب بھی اس کا اثر ہے اس لیے میں پہلے ہی معذرت چاہتا ہوں۔

سابقہ درس کے مطابق لفظ رحمانیت کی مزید وضاحت

سورۃ الرحمٰن میں آپ یہ دیکھیں گے کہ شروع سے آخر تک خدا کی صفتِ رحمانیت کے مظاہر کا بیان چلا آ رہا ہے اور میں نے یہ عرض کیا تھا کہ جو فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ میں اٰلَآءِ ہے، اس کے معنی نعمت ہی نہیں ہیں، اس کے معنی ''قدرت'' کے بھی ہیں اور مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم (1887-1949ء) کے الفاظ میں، وہ کہتے تھے کہ اس کے متعلق ''کرشمہ'' بھی کہا جا سکتا ہے۔ اصل میں اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کے اندر وہ چیزیں آتی ہیں جو بتدریج نمود میں نہ آ رہی ہوں بلکہ واقعی فجائی، ہنگامی (Emergent) طور پر سامنے آئیں اور ان میں نشوونما کا پہلو ہو کیونکہ چیز یہ ہے کہ اس کا مادہ (Root) ''ر ح م'' ہے اور اسی سے رحم ہے اور اس ''ر ح م'' کے معنی ہیں ''نشوونما نہایت لطافت کے ساتھ، نرمی کے ساتھ جیسی رحم مادہ میں بچے کی نشوونما ہوتی ہے''۔ یہ اس کے مادہ (Root) کے لحاظ سے معنی ہیں اور رحمانیت میں، میں نے عرض کیا تھا کہ جو چیز یک بارگی، ہنگامی طور پر (Emergently) نمود میں آئے، اس کے لیے یہ لفظ استعمال ہوگا۔ اس مادے سے تو فطرت کی ان مختلف کارفرمائیوں کا بیان چلا آ رہا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت نے پیدا کیا اور جو انسانوں

کی نشو ونما کے لیے ضروری ہیں: جسمانی نشو ونما بھی اور اس کے بعد انسانی صلاحیتوں کی نشو ونما بھی اور اگر انہی دونوں چیزوں کو خدا کی حدود کے اندر رکھا جائے تو پھر انسانی زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بھی بڑھتی ہے جسے ہم اخروی زندگی اور اس کی جنت کہتے ہیں۔

اب یہاں سے آج کا ہمارا یہ درس شروع ہوتا ہے۔کہا ہے کہ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ o بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ o فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:19-21) اب تم فضا کی پہنائیوں سے نیچے اتر کر سطح زمین کی طرف آؤ اور ذرا اس پر بہنے والے دریاؤں کو دیکھو۔بعض مقامات پر دو مختلف پانیوں کے دریا' اکٹھے بہتے چلے جاتے ہیں اور کہیں سمندر کے اندر ایک الگ روئندی کی طرح رواں دواں چلی جاتی ہے اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ انکے پانی آپس میں مل جائیں۔ان کے درمیان ایک غیر مرئی آڑ ہوتی ہے جو انہیں الگ الگ رکھتی ہے۔دیکھیے (25:53;35:12) لیکن مفاد پرست انسان اپنی اپنی راہ چلنے کے بجائے دوسروں کے حقوق میں دست اندازی کرتے رہتے ہیں۔اسی کو روکنے کے لیے قرآنی ضوابط دیئے گئے ہیں' سو غور کرو کہ تم خدا کی کس کس قدرت کو جھٹلاؤ گے۔

اب آپ کو معلوم ہے کہ پانی سے زندگی کی نمود ہوئی۔کہا ہے کہ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (21:30) اور پھر پانی پہ زندگی کا دارومدار بھی ہے۔ہم تو اس کی قدر زیادہ نہیں جانتے' وہ صحرانشینوں سے پوچھیے' ریگستان والوں سے پوچھیے کہ پانی کی قیمت کیا ہوتی ہے' ان کی ساری زندگی ان صحراؤں میں' بادیہ نشینی کی' خانہ بدوشی کی' گزر جاتی ہے' پانی کی تلاش میں جہاں کہیں تھوڑا سا پانی کے گرد سبزہ ہوا' دو چار درخت ہوئے انہوں نے ڈیرہ لگا لیا' پانی ختم ہوا' وہاں سے اٹھ کر کسی دوسری جگہ چلے گئے۔اس لیے قرآنِ کریم میں جنت کے متعلق خاص طور پر کہا ہے کہ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (65:11) پانی کا خاص طور پر وہاں ذکر آتا ہے اور وہ نہ بھی ہو' ہمارے آپ کے لیے بھی تو یہ صورت ہے کہ اگر کہیں پانی نہ ملے تو پھر دیکھیے انسان کا حشر کیا ہوتا ہے۔

میٹھے پانی اور نمکین پانی کی دو الگ الگ روئیں

بحر کا یہ لفظ ہمارے ہاں سمندر کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن عربوں کے ہاں جہاں پانی کی اتنی قلت تھی وہ تو جہاں بھی تھوڑا سا بھی پانی جمع ہوتا تھا اس کو بحر ہی کہہ دیتے تھے' نہر کی شکل میں بھی ہو' تو بھی۔اور انہار چھوٹی چھوٹی نالیوں کو کہہ دیتے تھے اور جہاں کہیں تھوڑا سا بھی پانی کھڑا ہو' اس کو بھی بحر کہتے تھے' پھر سمندر تک کے لیے بحر ہی کا لفظ تھا۔یہ جو ہے کہ دو الگ الگ دریا ہیں' یہ پانی کی روئیں (Streams) ہیں' جن کو وہ یہ کہتے ہیں۔ان کا ذکر یوں آیا ہے کہ یہ روئیں بھی اس کی کرشمہ سازی ہے کہ ایک نمکین پانی کی رو چلی جا رہی ہے' ایک میٹھے پانی کی چلی جا رہی ہے۔سمندر میں اکثر کہتے ہیں کہ یہ ہوتا ہے کہ جب یہ دریا اپنے جوش سے جا کر ملتا ہے تو کتنے ہی لمبے

وقفے تک یہ اپنی روانی کو جاری رکھتا ہے۔ میٹھا پانی ہوتا ہے' سمندر کا پانی تو بڑا کھاری رہتا ہے اور یہ آپس میں ملتے نہیں ہیں جو بھی شکلیں ہوں۔ یہ مضمون جغرافیے کا ہے اس کے لیے وہ بتا سکتے ہیں لیکن قرآن حکیم نے دوسرے مقام پر ان دونوں کے متعلق یہ کہا ہے کہ وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا (25:53)۔ یہ شیریں اور کڑوے پانی کی دو روئیں چلی جاتی ہیں جسے Streams of Water کہتے ہیں' وہ چلی جاتی ہیں۔ ایک گرم پانی کی اور دوسری ٹھنڈے پانی کی' یہ الگ الگ دو دو نہریں انگلینڈ کے قریب موجود ہیں۔ لوگ جاتے ہیں' ان کو معلوم ہی ہوگا وہ سمندر میں ٹھنڈے پانی کی جو رو ہے وہ اپنے راستے پہ چلی جا رہی ہے اور پانی ٹھنڈا ہی رہتا ہے۔ (25:53) میں کہا ہے کہ اس شیریں اور کڑوے پانی کی لہروں (نہروں) کا اس طرح کا انداز ہے کہ یہ دو چیزیں چلی جاتی ہیں' ان کے درمیان تم لوگوں نے کوئی بند نہیں باندھا ہوا کہ ایک دوسرے سے نہیں ملو۔ ہمارے قانونِ فطرت نے ایسا انتظام کیا ہے کہ وہ آپس میں ملتے نہیں ہیں' اسی طرح اپنی اپنی روش کے مطابق چلے جا رہے ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان ایک حد ہے اور وہ حد ایسی ہے کہ وہ تجاوز نہیں کرتی کہ اِدھر سے اُدھر مل [1] جائے اس لیے تم ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ زندگی تو میٹھے پانی سے نہایت شیریں ہوتی ہے تو کہیں گے کہ کیا تم خدا کی اس کرشمہ سازی سے انکار کرو گے' اس کو جھٹلاؤ گے؟ اور پھر یہ پانی پینے کے لیے ہے' زندگی کے لیے ہے' زراعت کے لیے ہے' درختوں کے لیے ہے اور پھلوں کے لیے ہے۔ یہ تو ہر چیز کے لیے بھی ضروری ہے' یہ تو پانی کی سطح ہے۔

پانی کی تہہ میں موتیوں کا ذکر

عزیزانِ من! ان آیات کے بعد کہا ہے کہ یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ○ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:22-23) ان دریاؤں یا سمندر کے نیچے موتی ہوتے ہیں' مونگا (مرجان) ہوتا ہے' یہ بڑی قیمتی چیز ہے۔ موتی تو ویسے ہی زیب و زینت کی چیزوں میں بھی کام آتا ہے اور یہ انسانی زندگی کے لیے بھی بڑی قیمتی چیز ہے۔ یہ دیسی ادویات جو ہوتی ہیں' ان میں یہ کیمیکل آپ دیکھیں' سائنس والے بتائیں گے کہ یہ جو بہترین کیلشیم ہے' یہ اپنی Concentrated Form (ارتکاز شدہ صورت) کے اندر موتی

---

[1] یہ دو ''دریا'' جنوبی افریقہ کے سمندر (بحر اوقیانوس) میں ہیں جو کہ کیپ ٹاؤن کے قریب واقع ہے' ان دو دریاؤں کی دریافت بیسویں صدی کے آغاز میں ہوئی۔ ان دونوں دریاؤں کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ دونوں ایک ہی سمندر میں بہتے ہیں جبکہ دونوں کا پانی ایک ساتھ بہنے کے باوجود آپس میں Mix نہیں ہوتا۔ ایک کا ذائقہ انتہائی کڑوا ہے اور دوسرے کا انتہائی شیریں (حوالہ: Http:groups.yahoo.com/group/sadzoum) یہاں ان دونوں دریاؤں کی تصویر بھی چھپی ہے۔

میں ہوتا ہے۔ یہ ضمناً بات آ گئی۔ میں نے عرض کیا ہے اور بار بار میں عرض کرتا ہوں کہ یہ عرب یعنی اس زمانے میں بھی دنیا میں یوں تو افریقہ کو Dark Continent کہتے تھے، عرب بھی علم کے اعتبار سے بڑا ہی تاریک براعظم یا تاریک ملک تھا، اس میں تعلیم تھی ہی نہیں، باہر کی دنیا کے ساتھ کچھ ایسا تعلق ہی نہیں رکھتا تھا، نہ تہذیب، نہ ثقافت، نہ تمدن، نہ دوسری دنیا کا علم اور اپنے ہاں جیسا میں نے عرض کیا ہے مکے جیسے شہر میں، جو بین الاقوامی شہرت رکھتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے زمانے میں کوئی سترہ آدمی تھے جو صرف نوشت وخواند (لکھنا پڑھنا) جانتے تھے، علم تو بہت بڑی چیز ہے لیکن میں نے عرض کیا تھا کہ ان کی زبان میں جو Concepts (تصورات) ہیں، معلوم نہیں کہ اس قوم نے یہ تصورات کہاں سے لیے تھے اور زبان کیسے بنی تھی! ابھی وہ چونکہ اللُّؤْلُؤُ (55:22) کا لفظ آ گیا، سامنے موتی کا لفظ ذہن میں آیا، دیکھیے یہ لوگ پہنچتے تھے!

لفظ ربوبیت اور رب کا استعمال

مشہور یہ ہے کہ بہار کے موسم میں بادل سے جو پانی ٹپکتا ہے یعنی جو بارش ہوتی ہے تو سمندر کی سپی، جسے صدف کہتے ہیں، اپنا منہ کھول دیتی ہے، اس میں پانی کا قطرہ ٹپک پڑتا ہے تو وہ اپنے آپ کو بند کر دیتی ہے اور پھر وہ نیچے سمندر میں چلی جاتی ہے۔ یہ عام طور پر مشہور ہے کہ یہ ایسے ہوتا ہے اور پھر وہ جو پانی کا قطرہ ہے، اسے سمندر کی تلاطم خیزیوں کے اندر جو مسلسل گردش ملتی ہے تو آہستہ آہستہ بتدریج وہ پانی موتی بن جاتا ہے اور یہ جو Process (عمل) ہوتا ہے، اس طرح سے پانی کا نشوونما پا کر موتی بن جانا، اس کو وہ ربوبیت کہتے ہیں اور ایسا کرنے والے کو رب کہتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ کیا قوم تھی یعنی ربوبیت کو سمجھانے کے لیے میں سمجھتا ہوں، اس سے بہتر کوئی اور مثال، تشبیہ ہو ہی نہیں سکتی۔ یعنی گردشوں کے ذریعے سے پانی کے قطرے کا موتی بن جانا۔ اس کے لیے یہ لفظ استعمال کرنا دراصل ربوبیت ہے ہی یہی۔ ہر شے کی ربوبیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ بڑے خام درجے میں چیز ہوتی ہے اور اس کی اس طرح سے نشوونما کے لیے چلے جانا کہ وہ انتہائی شکل میں پانی سے موتی بن جائے تو قرآن کریم نے یہاں موتی بھی کہا ہے اور مرجان بھی کہا ہے۔ اور آگے کہا ہے کہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:23) غور کرو کہ تم خدا کی کس کس قدرت کو جھٹلاؤ گے۔

سینہ بحر پہ تیرتی ہوئی کشتیوں کا نظارہ

عزیزانِ من! آگے کہا ہے کہ وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِی الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ (55:24) اور پھر انہی سمندروں میں تم کشتیوں کو دیکھو کہ وہ اس طرح سے سینہ بحر پہ بطخ کی طرح تیرتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ ان کی اونچائی دیکھیے تو وہ یعنی اس زمانے میں بھی تشبیہ پہاڑ سے ہی دی گئی ہے، کہ وہ پہاڑ کے سینے کی طرح سمندر کے اندر ابھری ہوئی چلی جاتی ہے۔ اس زمانے میں تو یہ کشتیاں، یہی یہ بادبانی کشتیاں ہوتی تھیں، وہ بادبان بھی اونچائی میں ایسے ہوتے تھے لیکن اس کی تشبیہ کو آج دیکھیے تو یہ جہاز جو آپ کے ہاں آج بنا ہوا

ہے' یہ واقعی پہاڑ ہوتا ہے جو سمندر میں تیر رہا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں یہ تشبیہہ دی گئی ہے کہ آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ یہ پانیوں میں پہاڑ کس تیزی سے تیرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں اور اگر ذرا گہرائی میں آپ جائیے تو یہیں سے نظر آتا ہے کہ یہ جو "الآء" یا اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت یا کرشمہ سازی کہا ہے' وہ کیا ہے۔ ایک سوئی ہے اس کا وزن کتنا ہوتا ہے' اس کو پانی میں چھوڑ دیئے تو وہ پانی کی تہہ تک ڈوبتی چلی جاتی ہے' اتنا وزن بھی پانی برداشت نہیں کرتا' وہ نیچے تک چلی جاتی ہے۔ غور کیجیے ہزاروں ٹن لوہے کا جہاز ہے اور اس میں شاید ہزاروں ٹن کا لدا ہوا بوجھ ہے' یہ پورے کا پورا اللہ تعالیٰ کے ایک قانون کے مطابق اگر اس جہاز کو تیار کیا ہے اور اس حصے تک' اس سطح تک' پانی کے اندر موجود ہے جہاں اس کے لیے اس کی تقدیر مقرر کی ہے' جو پیمانہ مقرر کر دیا ہے کہ یہاں تک تو ہزار ہا ٹن کا وزن ہو تو وہ واقعی ایک بطخ کی طرح تیرتا ہوا اس پانی میں چلا جا رہا ہوتا ہے جس پانی میں اگر آپ ایک سوئی چھوڑ دیں تو وہ نیچے تک ڈوبتی چلی جاتی ہے۔ اتنا وزنی لوہے کا جہاز اور اتنا وزن اس کے اندر لدا ہوا' وہ کس طرح سے تیرتا چلا جاتا ہے۔ جونہی کہیں اس کے قانون کی خلاف ورزی ہوئی اور وہ ڈوبا۔ اس کے قانون کی پابندی سے یہ چیزیں ہمارے سامنے تو کہیے کہ یہ رحمانیت نہیں تو اور کیا ہے اور پھر یہ انسان کے فائدے کے لیے سارا کچھ ہے۔

وہ بار بار یہی کہتا ہے کہ کہو کہ اس کی صفت رحمانیت کے کس کس مظاہر کو تم جھٹلاؤ گے اور یہ وہ چیزیں ہیں کہ اس زمانے کا عرب بھی اس کو پہچانتا تھا' آج کا بہت بڑا جو سائنٹسٹ ہے وہ بھی اس کی داد دیتا ہے۔ جونہی یہ چیزیں' ان کے رموز' ان کے اسرار اور غوامض' منکشف ہوتے چلے جاتے ہیں' دنیا کے سائنسدان اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کسی زمانے میں' اس دور میں یہ چیزیں جو قرآن حکیم کہہ گیا ہے' یہ سب کچھ کہنے کے بعد' عجیب چیز آتی ہے۔ یہ جو چار آیتیں آگے آ رہی ہیں سنو! کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ کہا ہے کہ **كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿﴾ يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴿﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ** [1] (55:26-30)۔

---

[1] یہ تمام نظم و نسق کسی ایسی کائنات سے متعلق نہیں جو ایک دفعہ بنا دی گئی ہو اور پھر اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی ہو۔ کائنات کی ہر شے میں ہر آن تغیر واقع ہوتا رہتا ہے لیکن ان تغیرات کا خدا کے قانون پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ یہ قوانین اس خدا کے ہیں جو تغیرات سے ماوراء ہے اور ہر قسم کی عظمت و تکریم کا مالک ہے۔ اسی سے یہ بھی واضح ہے کہ ذہن انسانی کا وضع کردہ ہر نظام اور اس کی طرف جانے والا راستہ تغیر پذیر ہے لیکن وحی کا تعین کردہ راستہ جو خدا کی ربوبیت اعلیٰ کی طرف لے جاتا ہے' تغیر پذیر نہیں ہوتا۔ اس خدا کی کس کس قدرت کو جھٹلاؤ گے؟

اس پر بھی غور کرو کہ کائنات کی ہر شے (انسانوں سمیت) اپنی نشوونما کے لیے خدا کی ربوبیت کی محتاج ہے۔ اور ان کی ربوبیت کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں۔ ہر دور میں ہی نہیں بلکہ مختلف حالات اور مختلف مراحل میں' ہر شے کی نشوونما کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ خدا کا نظام ربوبیت یہ ہے کہ ہر شے کو' اس کی حالت کے مطابق' سامان نشوونما ملتا رہتا ہے (35:15' 14:34)۔

سوتم سوچو کہ تم قانون خداوندی کی کس کس شق کو جھٹلاؤ گے اور اپنی زندگی غیر خداوندی قوانین کے تابع رکھ کر کس طرح نشوونما حاصل کر سکو گے؟ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص۔ 1259 تا 1260)۔

ہمارے ہاں کے تراجم میں ان آیات کا مفہوم

عزیزانِ من! یہ بڑی غور طلب آیات ہیں۔ ہمارے ہاں عام ترجموں میں آپ دیکھیں گے کہ یہی لکھا ملے گا کہ کُلُّ مَنۡ عَلَيۡهَا فَانٍ (55:26) جو کچھ بھی زمین کے اوپر ہے وہ سارے کا سارا ایک دن فنا ہو جانے والا ہے۔ وَّيَبۡقٰى وَجۡهُ رَبِّكَ ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡاِكۡرَامِ (55:27) اور خدائے ذوالجلال والاکرام اس کی ذات ہے جو باقی رہ جائے گی۔ فَبِاَىِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (55:25) اب دیکھیے تو سہی! کیا کوئی اس سے ذرا بھر بات بھی بنتی ہے کہ کون سی چیز ہے جس سے تم انکار کرو گے؟ یہ سب فنا ہو جائیں گے خدا باقی رہ جائے گا اور آگے ہے کہ يَسۡـَٔلُهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (55:29) ارض و سما میں جو بھی شے ہے وہ اس کی محتاج ہے کیونکہ كُلَّ يَوۡمٍ هُوَ فِىۡ شَاۡنٍ (55:29)۔ پھر ہمارے ہاں اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ خدا ہر آن میں ایک نئی شان میں ہے بتاؤ تم کون سی نعمتوں کی تکذیب کرو گے؟ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ تین چار آیتیں گویا گہرائی میں جا کر سوچنے کی ہیں کہ کیا کہہ گیا ہے قرآن حمید کس زمانے میں کہہ گیا ہے! یہ ٹھیک ہے یہ ارض و سما کا سلسلہ خدا نے پیدا کیا اور اس نے یہ خود کہا ہے کہ یہ جسے ایک اجلِ مسمّٰی کہا جاتا ہے یہ ابدی نہیں ہے۔ ابدیت کا تو معنی ہوتا ہے جو کبھی فنا ہو ہی نہ کبھی ختم ہی نہ ہو ازلی کہتے ہیں کہ جس کی کوئی ابتدا نہیں اور ابدی کہتے ہیں جس کی کوئی انتہا نہ ہو۔

ذاتِ خداوندی اور انسانی ذہن کی محدودیّت

یہ ازل اور ابد کی چیز تو صرف خدا کے لیے ہے انسان کے لیے تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارا جتنا شعور ہے یہ اتنا سا ہے جتنا کہ ہمارا ناریل ہے۔ اس شعور میں تو یہ چیز سما نہیں سکتی۔ جسے ہم ابتدا کہیں کہ مثلاً خدا کب سے ہے ذہن انسانی نہیں بتا سکتا اور یہ کب تک رہے گا انسانی ذہن یہ بھی نہیں بتا سکتا۔ انسانی ذہن محدود ہے یہ صرف محدود کا احساس کر سکتا ہے لامحدود کا احساس کوئی محدود شے کر نہیں سکتی۔ وہ جو خدا کی صفت لامحدودیّت ہے کہ هُوَ الۡاَوَّلُ (57:3) محدود ذہن یہ سمجھ ہی نہیں سکتا اس کا شعور نہیں رکھ سکتا اس کا احساس نہیں رکھ سکتا۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ خدا فلاں وقت سے ہے۔ وہ کب سے ہے اور کب تک رہے گا سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ انسان کا یہ محدود ذہن ہر شے کو کہیں جا کر ختم کر دیتا ہے۔ وہ کسی ایسی شے کا تصور بھی نہیں کر سکتا جس کی ابتدا کو ذہن میں نہ رکھے جس کی انتہا کو ذہن کے اندر نہ لا سکے۔ ''یہاں سے وہ شروع ہوا تھا اور یہاں پر وہ ختم ہو جائے گا'' یہ تو وہ ذہن میں لا سکتا ہے مگر یہ ہمارے ذہن میں ہی نہیں آ سکتا۔ آپ کبھی کسی وقت فرصت میں سوچیے گا اس بات کو پیچھے لیے چلے جائیے گا اور پیچھے جائیے گا خدا کے ساتھ آپ کہاں تک چلے جائیں گے آپ تھک جائیں گے آپ کا ذہن تھک جائے گا خدا اس وقت بھی موجود ہے۔ کب سے ہے؟ یہ ذہن نہیں کہہ سکتا کب تک

رہے گا یہ بھی ذہن انسانی نہیں کہہ سکتا۔ جو چیز اس نے پیدا کی ہے اس کے متعلق تو ہے کہ اس پیدا کرنے کی ابتدا یہاں سے ہوئی ہے۔ بَدَا خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ (32:7)۔ میں نے جیسا ابھی عرض کیا تھا کہ جب ابتدا ہوئی ہے تو وہ تو ہم محسوس کر سکتے ہیں، سائنس کے ذریعے سہی، کسی طریق سے سہی کہ کب ابتدا ہوئی ہے اور اس کے بعد یہ کہ یہ جو پیدا کیا گیا ہے، وہ ایک وقتِ مقررہ کے لیے، قدرت کے قوانین کے تابع چل رہا ہے اور ایک وقت کے بعد یہ ختم ہو جائے گا۔ یہ تو حقیقت ہوئی، ٹھیک ہے لیکن یہاں جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ ہر شے جو زمین پر ہے، وہ فنا ہو جائے گی، خدا کی ذات باقی رہ جائے گی، تم کونسی خدا کی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ عزیزانِ من! بات یوں نہیں ہے۔

قرآنی الفاظ ''فان اور فنا'' کا مفہوم

وہ جو لفظ ''فان'' ہے جس کے معنی ہم اپنے ہاں ''فنا ہو جائے گی'' کرتے ہیں، عربی قاعدے کے مطابق بھی ''فان'' اسم فاعل ہے اور اس کا قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک اس کو مخصوص طور پر مستقبل کے ساتھ منسوب نہ کیا جائے اس کے معنی زمانہ حال میں کچھ کرنے یا ہونے کے ہوتے ہیں۔ ''فان'' کے معنی ہوتا ہے ''ہو رہا ہے'' جا کر ہو گا والی بات نہیں ہے کہ یہاں یہ نہیں ہو رہا، اس میں یہ بات نہیں ہے۔ جب خدا نے کہا تھا کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (2:30) تو اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ ''بناؤں گا کبھی جا کے'' اس کے معنی ہوتے ہیں کہ ''بنا رہا ہوں''۔ یہ جو عربی زبان کا وزن ہے، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ کبھی آنے والے وقت میں ہو گا۔ اسے اسم فاعل کہیے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ''حال میں وہ چیز ہو رہی ہو''۔ عالم کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آنے والے زمانے میں وہ علم حاصل کرے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ''اس وقت ہے یہ اس وقت بھی کر رہا ہے'' یہ اس کا خاصہ ہے۔ یہ ''فان'' اس میں قائم ہے یعنی ہو رہا ہے اور ''فنا'' کے معنی عربی زبان کے لغت کے اندر عزیزانِ من! کسی چیز کا ختم ہو جانا نہیں ہے۔ اس کے معنی ''تغیر پذیر ہونا ہے''۔ کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے، اسمیں تغیر (Change) ہے اور اس تغیر (Change) کی اہمیت آج سائنسدانوں سے پوچھیے۔ یہ جتنی نشوونما (Devlopment) ہوتی ہے وہ ہمیشہ تغیر (Change) کی رو سے ہوتی ہے، خود انسانی جسم کے اندر بڑے چھوٹے چھوٹے خلیات (Cells) ہیں جن سے یہ سارا مرتب ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ ہر آن، ہر ثانیے میں، ہر سانس میں، کروڑوں کی تعداد میں جو پہلے سے جراثیم ہوتے ہیں، وہ ختم ہوتے جاتے ہیں، ان کی جگہ نئے جراثیم بنتے چلے جاتے ہیں۔

کائنات کی ہر شے میں ہر آن تغیر رونما ہو رہا ہے

یہ جو تغیر کا سلسلہ ہے جس کو Catabolism (انہدادی تحول)، Metabolism (استحصالی) اور Anabolism (مثبت

استحالت) کہتے ہیں' یہ کیا، ہی ایک ٹیکنیکل سی چیز آ گئی۔ یہ سلسلۂ تغیر ہر آن جاری ہے' یہ انسان کا جسم جو سات برس پہلے تھا' پہلے وہ سات برس کہتے تھے اب تو تین ہی برس کہنے لگ گئے ہیں' جو یہ پہلے تھا اس کا ایک جرثومہ بھی آج باقی نہیں رہتا' سارے کا سارا بدلا ہوا ہوتا ہے' ہر آن اس کے اندر یہ تغیر ہو رہا ہوتا ہے اور اس تغیر سے اس کی نشوونما ہوتی ہے' مردے میں یہ تغیر نہیں ہوتا' اس کی نشوونما ختم ہوگئی ہوئی ہوتی ہے۔ اب دیکھیے کہ آپ کے ہاں کا پودا کیسے اُگتا ہے۔ وہ جو آپ دانہ ڈالتے ہیں' زمین کے اندر بیج ڈالتے ہیں' اس دانے میں تغیر واقع ہوتا ہے' تو پھر اس میں سے کونپل پھوٹتی ہے' اگر وہ ویسے کا ویسا ہی دانہ' وہاں پڑا رہے' کونپل ہی نہیں پھوٹ سکتی' پھر جو کونپل ہے اس کے اندر تغیر واقع ہوتا ہے' تو وہ اوپر بڑھتی ہے اور چڑھتی ہے' تغیرات کے ذریعے سے پتے پیدا ہوتے ہیں' پھول پیدا ہوتا ہے' پھر اس میں پھل لگتا ہے' اناج لگتا ہے' دانے لگتے ہیں' یہ سارا کچھ تغیرات کی رو سے ہوتا چلا جاتا ہے۔ جب تغیرات کا یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے' تو وہ پودا مرجھا کر ختم ہو جاتا ہے' انسان مر جاتا ہے۔ یہ سلسلہ تغیرات ہے۔

یہ میں نے پچھلی دفعہ موسموں کے تغیرات کا عرض کیا تھا' جو قرآن حکیم نے مشرقین اور مغربین کہہ کر بتایا تھا کہ دیکھو! سال میں موسموں کے تغیرات کس طرح سے آتے ہیں۔ ایک سورج کو دیکھو کہ سردیوں کی انتہا میں وہ کہاں سے طلوع ہوتا ہے' اس کے دو کونے دو کنارے ہوتے ہیں' خاصا فاصلہ ہوتا ہے اگر کوئی آدمی اس کو دیکھے اور اسی طرح سے غروب ہونے کے فاصلے ہوتے ہیں۔ یہ وہ مشرقین اور مغربین کہا ہے۔ یہ تغیرات کیا ہیں؟ رات اور دن کے تغیرات کو' اختلاف کو اور تغیر کو خدا نے آیات اللہ میں شمار کیا ہے۔ اس دور کا یہ عرب یا اس دور کا دوسرا انسان بھی یہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ جو تغیرات ہیں' یہ کس طرح سے خدا کی آیات میں سے ہو سکتے ہیں۔ آج کے دور کے سائنٹسٹ سے پوچھیے' وہ ہر آن محسوس کر رہا ہوتا ہے کہ تغیر کیا رونما ہو رہا ہے اور ان تغیرات سے بھی نئی چیزیں' جتنی بھی بنتی ہیں' وہ ان تغیرات کی رو سے بنتی ہیں۔ کسی شے میں اگر تغیر نہ ہو' کسی وقت کسی شے کے اندر جمود ہو جائے تو کوئی نئی چیز پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ بھی کسی وقت ختم ہو جاتی ہے۔

انسانی جسم کے اندر انسانی ذات کے وجود کی کیفیت اور حقیقت

میں نے یہ عرض کیا ہے کہ انسان کے جسم کے متعلق یہ تحقیق کی گئی ہے کہ اس کے اندر ہر آن تغیرات واقع ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن اس کے اندر ایک ایسی بھی شے ہے جسے اس کی ذات' Personality' خودی' نفس کہا جاتا ہے' وہ ان تغیرات سے متاثر نہیں ہوتا' وہ ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے۔ برگسان (1859-1941ء) کے الفاظ میں یہ It does not cease to exist ہے یعنی ہم میں تغیر آتا ہے معدوم ہوئے بغیر۔ اب میں دوسری طرف نکل جاؤں گا۔ Human Personality (انسانی شخصیت) کے متعلق باردیو کا وہ فقرہ

بڑا برجستہ ہے کہ Personality is Change - lessness in Change تغیرات کی دنیا کے اندر جو غیر متغیر شے ہے' وہ انسانی ذات ہے۔ آپ کا جسم بدلتا چلا جائے' سات سال یا تین سال کے بعد نیا بن جائے لیکن آپ کی جو ''میں'' (I-am-ness) ہے' وہ وہی رہتی ہے۔ بیس سال پہلے بھی آپ کی تحریر ہے تو آپ یہ کہیں گے کہ ہاں صاحب! یہ میں نے ہی لکھی تھی حالانکہ نہ آپ کا وہ ہاتھ باقی ہوتا ہے' نہ آپ کا وہ دماغ باقی ہوتا ہے۔ میں نے کہا تھا' میں اس کا ذمہ دار ہوں' ساری ذمہ داری اس ''میں'' پہ عائد ہوتی ہے کہ وہ جو کرنے والا ہے وہ کرنے والی انسان کی ذات ہوتی ہے جو کسی شے کا ارادہ کرتی ہے' وہ نہ بدلی ہوئی ہو۔ اگر وہی باقی نہ ہو تو آپ وہاں جا کر کہہ دیں گے کہ صاحب! وہ تو چار سال پہلے کی بات ہے' وہ ''میں'' تو ہے ہی نہیں' میں تو ہوں ہی اور کچھ' جس سے میاں بیوی کا نکاح ہی باقی نہ رہے' کوئی ذمہ داری باقی نہ رہے' کوئی عقد باقی نہ رہے' کوئی معاہدہ باقی نہ رہے' کسی قسم کی کوئی شے جو آپ نے کبھی چار سال پہلے کی ہوئی ہے' آج وہ باقی نہ رہے اگر آپ کے جسم کی طرح آپ کا ''میں'' بھی بدلا ہوا ہو۔ یہ ''میں'' ہی ہے آپ کا غیر متغیر اور اسی لیے اس ''میں'' کے متعلق نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (15:29) کہا ہے کہ یہ خدا کی توانائی کا ایک شمہ ہے جو ہم نے آدمی کے اندر ڈال دیا ہے' وہ غیر متغیر رہتا ہے' یہ بھی غیر متغیر رہتی ہے صاحب! اسی سے تو انسان انسان ہے ورنہ جیسا میں نے عرض کیا کہ اگر یہ ''میں'' (I -am -ness) بدلتی جائے' تو آپ ذرا سوچیے تو سہی کہ واقعی اگر یہ چیز ہر تین سال کے بعد یا ہر سات سال کے بعد بدل جائے تو انسانی معاشرے کا حشر کیا ہو مثلاً اگر تم نے کسی قسم کی ذمہ داری کی کوئی بات کی' اس پر گرفتگی کی صورت کیسے ہو۔ تم نے وہ قرضہ لیا تھا۔ وہ کہنے لگے کہ وہ تم نے جو قرضہ لیا تھا' وہ ''میں'' (I am ness) تین سال ہوئے ختم ہو چکا ہوا ہے' اب میں تو ہوں ہی کوئی اور' اب میں قرض کی ادائیگی کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ بہر حال بڑی اہم بات ہو رہی تھی' ہر آن یہاں تغیر واقع ہوتا ہے۔

تغیرات کی دنیا اقبالؒ کی نظر میں

اگر اس تغیر کا مآل فنا ہے' زوال ہے' تو وہ واقعی ایک افسوسناک چیز ہے۔ عزیزانِ برادرن! اب ذہن میں یونہی ایک چیز اتر آئی' اجازت دیں تو عرض کروں' درمیان میں کچھ تھوڑی سی لطافت' تھوڑی سی رنگینی پیدا ہو جائے گی۔ یہ اقبالؒ (1877-1938ء) کی ابتدائی دور کی نظم ہے' یہ بڑی حسین چیز ہے' کہا ہے کہ

خدا سے حسن نے ایک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تُو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا

شب درازِ عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جس کی

(حقیقت حسن: بانگ درا)

'اس دور میں' میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ تغیر کی حقیقت آخر میں جا کر لازوال ہے۔ میں عرض کروں گا۔ ابتدائی دور کے بعد' اقبالؒ کا 1905ء سے 1908ء تک کا زمانہ ہے۔ ارتقا آگے ہوا تھا تو اقبالؒ (1877-1938ء) نے خود اس تغیر کو خدا کی آیات کہا ہے جبکہ یہاں کہا ہے کہ ''وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی''۔ اب آگے دیکھیے کہ فطرت نے اس شخص کو کتنی صلاحیتیں دی تھیں' ایسے ایسے حقائق ہیں' یہاں تک کہ یوں نظر آ رہا ہے کہ کوئی سائنس کا یا فلسفے کا مسئلہ بیان ہو رہا ہے' اب یہاں اس کی شاعری شروع ہوتی ہے:

ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی
کہیں قریب تھا' یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی' اخترِ سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خوں ہو گیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا' سوگوار گیا

(حقیقت حسن: بانگِ درا)

لیکن یہ تغیر تو انسان کا جسمانی تغیر ہے۔

انسانی ذات جو تغیر نا آشنا ہے، حسین سے حسین تر ہوتی چلی جاتی ہے

عزیز برادران! وہ شے جو انسان کے اندر تغیر نا آشنا ہے، اگر قوانین خداوندی کے تابع اس کی نشوونما ہوتی جائے تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا، وہ اور حسین سے حسین تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ کہا ہے کہ کُلُّ مَنۡ عَلَیۡهَا فَانٍ (55:26) اس آیت کے معنی میں یہ بات نہیں ہے کہ ایک دن جو شے بھی زمین پر ہے وہ فنا ہو جائے گی، وہ ٹھیک ہے کہ وہ ہو جائے گی، یہاں فان کے یہ معنی ہیں کہ ہر شے تغیر پذیر ہے، ہر آن ہر شے میں تغیر واقع ہوتا چلا جا رہا ہے، ہر شے میں تغیر واقع ہو رہا ہے۔ یہاں تو تغیر ہے، دوسری جگہ هَالِكٌ (28:88) بھی ہے۔ میں وہ مقام بھی سامنے لے آؤں۔ یہ ہے کہ كُلُّ شَیۡءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجۡهَهٗ[1] (28:88)۔ یہاں ''هَالِكٌ'' ہے۔ اس کے معنی یہ کیے جاتے ہیں کہ تمام کائنات فانی ہے، فنا ہو جائے گی اور صرف خدا کی ذات باقی رہ جائے گی اور پھر وہ اس (55:26) میں ''فان'' آیا ہے جو ہمارے ہاں فانی کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ یہ قرآن حکیم ہے، عزیزانِ من! اس کی تو زبان عجیب ہے، یہ تو اس زبان کے اندر اعجاز ہے کہ ھلک کے معنی ہوتا ہے ''زوال پذیر ہونا، کسی چیز کی قوت کا کم ہوتے چلے جانا'' اس کا آخری درجہ ہلاکت ہوتا ہے جس کو موت کہتے ہیں ورنہ عربی زبان کے اندر اس کے معنی ہوتے ہیں ''کسی توانائی کا کم ہوتے جانا، قوت کا کم ہوتے چلے جانا''۔ یہی تغیر ہے۔ یہاں (55:26) میں لفظ ''فان'' ہے، یہاں (28:88) میں ''ھالک'' ہے، وہاں بھی یہ ہے اور وہ ''وجھہ'' نہیں، اس میں استثنیٰ ہے، یہاں بھی اِلَّا وَجۡهَهٗ (28:88) ہے یعنی ذات خداوندی کو درمیان سے نکال کے یہ چیز بتائی اور جو میں نے عرض کیا ہے وہ روحِ خداوندی توانائی ہے، خود روح کے معنی توانائی ہوتا ہے، وہ خدائی توانائی جو انسان کو اس نے عطا کی ہے، جسے اس کی ذات کہتے ہیں، اس میں یہ چیز ہے کہ وہ تغیر نا آشنا ہے، وہ ہلاکت میں بھی نہیں آتی، فنا میں بھی نہیں آتی تو کہا کہ كُلُّ مَنۡ عَلَیۡهَا فَانٍ (55:26) یہاں ہر شے تغیر پذیر ہے اور تغیرات کے باوجود وہ باقی رہتی ہے۔ اسی طرح نشوونما کی وہ اتنی عجیب چیز بتا رہا ہے۔ نشوونما کا دارومدار تغیر[2] پہ ہے۔

---

[1] یاد رکھو! کائنات کی ہر دوسری اشیاء کی طرح ذہن انسانی کے وضع کردہ نظریات وتصورات بھی ہر آن تغیر پذیر ہوتے ہیں (55:26)۔ تغیر سے ماوراء صرف وحی کا راستہ ہے جو خدا کی متعین کردہ منزل کی طرف لے جاتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص: 908)۔

[2] ھالک اور فان کے معنی یہ نہیں کہ یہ کائنات ایک دن فنا ہو جائے گی۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ یہ چیز (فنا اور ہلاکت) اب ہو رہی ہے۔ کائنات کی ہر شے حالت فنا و ہلاکت سے گزر رہی ہے۔ فنا کے معنی معدوم ہو جانا نہیں۔ اس کے معنی تغیر پذیر ہو جانا۔ ایک حال پر نہ رہنا۔ اور ہلاکت کے معنی بھی قوت کے کم ہو جانے کے ہیں۔ لہٰذا ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے مستقل طور پر ایک حالت میں نہیں رہتی۔ ہر شے میں ہر آن تغیرات نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس کی قوت میں کمزوری آتی رہتی ہے لیکن خدا کا وہ قانون (یا وہ راستہ) جو عالمگیر نشوونما کی طرف لے جاتا ہے تغیر نا آشنا ہے۔ وہ تغیرات کے اثر سے مامون رہتا ہے (پرویزؒ: 1961)۔ لغات القرآن جلد چہارم، ص۔ 1765۔

عزیزانِ من! تغیر پر یورپ والے بہت ریسرچ کررہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ شے جو متغیر ہوتی ہے' اصل میں وہ کہتے ہیں کہ پہلی شے باقی نہیں رہتی' اس میں سے ایک نئی شے پیدا ہوتی ہے۔ اس کو ہم تغیر (Change) کہتے ہیں اگر وہ کمہار جو آبخورہ بناتا ہے اس کی جگہ اس نے بدنی بنائی ہو تو جو آبخورہ ہے وہ پھر مٹی بنتا ہے تو اس کے اندر سے بدنی بنتی ہے تو یہ جو فطرت کا سلسلہ ہے کہ ایک شے جو پہلی شے ہے' وہ باقی نہیں رہتی' اسی کے اندر سے ایک نئی شے کی نمود ہوتی ہے' جسے وہ تغیر کہتے ہیں We change without ceasing یعنی ''ہم میں تغیر تو واقع ہوتا ہے لیکن ہم معدوم نہیں ہوتے'' یہ ہے فرانسیسی مفکر برگسان (1859-1941ء) کا قول کہ اب یہ انسانی ذات میں Change (تغیر) ہے لیکن وہ انسانی ذات فنا نہیں ہوتی بلکہ اس کے اندر وہ ایک تغیر ہوتا ہے جس میں اس کی نمود ہوتی ہے' یہ آگے بڑھتی ہے' پروان چڑھتی ہے۔

انسانی ذات کی نشو ونما انسانی جسم کی نشو ونما سے بالکل مختلف ہے

یہ چیز جو انسانی ذات کی نشو ونما ہے' وہ انسانی جسم کی نشو ونما سے بالکل مختلف ہے' اس میں ہر آن Change (تغیر) ہوتا چلا جاتا ہے تو کہا یہ ہے کہ یہ دیکھیے کہ اس کائنات کی ہر شے میں ہر آن ایک تغیر واقع ہوتا ہے مگر خدا کی ذات اس تغیر سے ماوراء ہے اس لیے کہا ہے کہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:28) سوچو کہ تم خدا کے قانونِ ربوبیت کی کس کس قدرت کو جھٹلاؤ گے؟ عزیز برادران! آپ نے یہ بھی غور فرمایا کہ یہ جتنی دفعہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ (55:28) آتا ہے' اس میں رب کا ہی ذکر آتا ہے' رَبِّکُمَا (55:28) ہی آتا ہے دیگر صفات خداوندی بھی تو تھیں' وہ کیوں نہیں آئیں' وہ بدل بدل کے کیوں نہیں آئیں؟ اس لیے کہ یہ ساری بات ہی ربوبیت کی ہو رہی ہے' سارا موضوع ہی نشو ونما کا ہے' رحمانیت کی صفت ہی نشو ونما کی ہے۔

خدا کے متعلق ہمارے ہاں کا تصور

اب اس کے بعد ہے کہ یَسْئَلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ (55:29)۔ اب اس کا ترجمہ بھی ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ ارض و سما میں جو کوئی بھی ہیں' وہ اس کو مانتے ہیں اور خدا ہر آن میں ایک نئی شان میں ہوتا ہے۔ سوچیے' عزیزانِ من! خدا بھی ہر آن میں ایک نئی شان میں ہوتا ہے۔ شان کے تو معنی ''حالت'' ہوتا ہے۔ خدا کے متعلق یہ تصور کہ وہ ہر آن میں ایک نئی حالت میں ہوتا ہے (معاذ اللہ) کس قدر غلط تصور ہے! یہ اس کے قوانین خداوندی کے مظاہر ہیں' یہ اس کی تخلیق کے مظاہر ہیں' خدا تو اس تغیر پذیری سے ماوراء ہے' ہر قسم کے تغیرات سے ماوراء ہے' اس کے ہر آن ایک نئی حالت کے اندر ہونے کا یہ تصور ہی نہیں ہے' خدا کے متعلق یہ کہا نہیں جا سکتا کیونکہ اس میں کوئی تبدیلی آ ہی نہیں سکتی۔

اسمآءالحسنٰی یا صفاتِ خداوندی کی اہمیت

میں نے پہلے بھی کئی دفعہ عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم سے خدا کا جو صحیح تصور ہے' وہ ذہن میں قائم کرلیا جائے' سامنے رکھ لیا جائے تو اسلام سمجھ میں آ سکتا ہے۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ اس نے خود ہی اپنا یہ تصور دے دیا ہے۔ ذہنِ انسانی کا دیا ہوا تصور تو خدا کا تصور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ جتنے اسمآ الحسنٰی ہیں یا جنہیں صفاتِ خداوندی کہا جاتا ہے اگر ان کو گہرائی میں جا کر اور اس کے سیاق و سباق میں جا کر متعین کیا جائے کہ قرآن کریم کیا کہتا ہے' تو اس ایک تصور خداوندی سے دین انسان کی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ یہاں یہ بھی کہا کہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ (55:29) ہر شے کو' اس کی حالت کے مطابق سامانِ نشو ونما خدا کے نظام ربوبیت سے ملتا رہتا ہے۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ خدا ہر آن نئی شان میں ہوتا ہے۔ یہاں تو یہ ہے کہ اشیا کی ربوبیت کے تقاضے' مختلف حالات اور مختلف مراحل میں مختلف ہوتے ہیں' اسی لیے اس سے پہلے کہا ہے کہ يَسْئَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (55:29) ذرا اس پر بھی غور کرو کائنات کی ہر شئے' جس میں انسان بھی شامل ہیں' اپنی نشو ونما کے لیے خدا کی ربوبیت کی محتاج ہے۔ عزیزانِ من! اس آیت میں بڑی عجیب چیز کہی گئی ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنی نشو ونما کے لیے خدا کی' رحمٰن کی' رب کی' محتاج ہے۔ اگر کسی شے کی کیفیت یہ ہو کہ ویسے کی ویسی ہی ہو تو اس کی نشو ونما کے لیے مشکل نہیں ہوتی۔

کائنات کی نشو ونما کے تقاضے ہر آن تبدیلی کے متقاضی ہوتے ہیں

جو بھی چیز ہے اس کے مطابق اس کی غذا وغیرہ ہے' وہ ایک دفعہ اس کو دے دی تو بس وہ ٹھیک ہے لیکن یہاں تو کیفیت یہ ہے کہ بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی نشو ونما کے لیے اور ذرائع اسباب اور ضرورتیں ہوتی ہیں' جوں جوں وہ ذرا بڑھتا چلا جاتا ہے اس کی ضرورتیں بدلتی چلی جاتی ہیں' ساری انسانی زندگی کے اندر آپ دیکھیے' انسان کی ضرورتوں کے تقاضے بدلتے چلے جاتے ہیں۔ اگر تقاضے نہ بدلیں تو اس کی پرورش یا نشو ونما بڑی آسانی سے ہوتی ہے۔ تھوڑے سے معنی یہ دیکھ لیجیے کہ آپ کے ہاں کی بکری ہے' اس کے تقاضے نہیں بدلتے' پتہ ہے کہ اس قسم کا گھاس اس کو دینا چاہیے' بس ایک دفعہ معلوم ہو گیا تو اُس قسم کا گھاس اسے دے دیا۔ اس سے اس کی نشو ونما ہوتی چلی جائے گی مگر یہاں صورت حال یہ ہے کہ ہر دور میں ہر شے کی نشو ونما کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں جب ہر شے کا تقاضا ہر آن بدلنا ہو' اس کی نشو نما اور اس کے تقاضے کے مطابق سامان نشو ونما دینا ہو تو اسکے لیے کیا نظام ربوبیت ہو' نشو ونما تو یہ ہے اصل میں۔

یہ جسے نشو ونما کہتے ہیں سنیے! اس کے لیے کیا کہا ہے کہ کائنات کی ہر شے اس کی نشو ونما کی محتاج ہے اور ہر شے کی کیفیت یہ ہے کہ ہر آن اس کا تقاضا بدل جاتا ہے اور هُوَ فِيْ شَأْنٍ (55:29) کے معنی کائنات کی ہر شے يَسْئَلُهُ (55:29) یہاں کہا کہ کائنات کی

ہر شے نشوونما کے لیے خدا کی محتاج ہے اور ہر شے کی نشوونما کی کیفیت یہ ہے کہ ہر آن اس کی نشونما کا تقاضا بدل جاتا ہے تو کہا کہ سوچو! وہ اس قسم کا نشوونما دینے والا ہے اور یہ ہر شے جب یہ کہا ہے تو یہ کائنات تو لامحدود ہے' ہمارے سامنے تو یہی کوئی ایک شہر یا زیادہ سے زیادہ ایک ملک ہوتا ہے یا کرہ ارض ہی کہہ لیجیے' وہ کرہ ارض تو اس کائنات کے اندر ریت کے ذرے کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہاں تو مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (55:29) کہا ہے کہ تم ہی نہیں ان فضائی کرّوں کے اندر' کائنات کی وسعتوں کے اندر' جو کچھ بھی ہے' وہ سب اپنی پرورش نشوونما' بقائے ہستی کے لیے خدا کا محتاج ہے' رب کا محتاج ہے اور ادھر ہر شے کی کیفیت یہ ہے کہ ہر آن اس کا تقاضا بدلتا جاتا ہے اور وہ اس کے تقاضے کے مطابق سامانِ نشوونما دیئے چلا جا رہا ہے۔

رزق کا قرآنی مفہوم

ان عربوں کی عجیب بات ہے' پھر ایک بات آ گئی' جس کو ہم رزق کہتے ہیں کہ رزق ملتا ہے' تو رزق کی شرط یہ ہے کہ وہ وقت پر ملے اور تقاضے کے مطابق ملے جب جا کر وہ رزق کہلاتا ہے اور وہ رازق ہے' جو کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَ فِیۡ شَاۡنٍ (55:29) ہے۔ ہر آن اشیائے کائنات' انسانوں سمیت کا تقاضا مختلف ہوتا ہے' عزیزانِ من! اسے دہرایا تو میں نے پہلے بھی کئی دفعہ ہے لیکن یہاں وہ تقاضے کے بدلنے کی بات آ گئی' ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے' اب ذرا مشکل سے ہی کہنا پڑتا ہے' اب تو مشاہدہ تھا کہیے' اب تو دودھ ڈبوں کا ہوتا ہے' ماں کا تو دودھ بچے کو ملتا ہی نہیں ہے' بچہ پیدا ہوتا ہے' ہضم کی قوت بہت کم ہوتی ہے' ماں کے اس دودھ میں شاید نوے فیصد پانی ہوتا ہے' کوئی دس فیصد ہی ایسے اجزاء ہوتے ہیں جو ہضم کرنے کے لیے ہوتے ہیں' اس کے معدے کے انہضام یا ہضم کی جو صلاحیت یا قوت ہے' اس کے مطابق ماں کا دودھ ملتا ہے' بچے کی پیدائش سے ایک دن پہلے تک وہاں کوئی دودھ کے چشمے کا سراغ بھی نہیں ہوا' ادھر بچہ پیدا ہوتا ہے' ادھر اس کے رزق کی روانیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ کون کرتا ہے یہ اندر بیٹھا ہوا؟ یہ آپ کو معلوم ہے کہ گوالے سے جب آپ پوچھیے کہ ''یار ! وہ کل تک دودھ تیرا چنگا جیا ہوندا ہیگا سی' تے اج جیہڑا پانی جیا ہویگا۔ نئیں جی! (ج) سوئی ہوئی نیئی ہے نا ایس واسطے اے آ و پاویں نکلے دا پانی ای ہووے''❶ لیکن یہ بات ہے۔ جنہوں نے مویشی پالے ہیں' ان کو پتہ ہے کہ ''اس دی وجہ جیہڑی ہے❷'' یعنی اس کے دودھ میں وہ غذائیت اتنی کم ہوتی ہے جو مآیت ہے جو پانی ہے وہ اتنا زیادہ ہوتا ہے' وہ فطرت کا قاعدہ مقرر کیا ہوا ہے کہ بچے کا ہاضمہ' اس کا معدہ اس سے زیادہ ہضم نہیں کر سکتا' اندر سے بنا بنایا ہوا اس قسم کا جو دودھ ہے' وہ ملتا ہے اس بچے کو۔ یہ جو آپ کا ڈبوں کا دودھ ملتا ہے ڈبے کے اوپر

---

❶ ارے دوست! کل تک تو تمہارا دودھ ٹھیک ٹھاک ہوا کرتا تھا اور آج تو یہ پانی سا ہی ہے (کہا کہ) نہیں جی! بھینس نے نیا نیا بچہ دیا ہے اس لیے یہ بات ہے اا ور ادھر بیشک نلکے کا پانی ہی ڈالا گیا ہو۔

❷ اس کی جو وجہ ہے

لکھتا ہوا ہوتا ہے یہ جو اتنے Weeks (ہفتوں) کا بچہ ہے اس میں اتنا چھچہ دودھ کا' اتنا چھچہ پانی کا ملایئے۔ بچہ جوں جوں بڑھتا چلا جاتا ہے تو دیکھیے گا وہ جو اس کے باہر لکھی ہوئی ٹیبل ہوتی ہے اس میں یہ ہوتا ہے کہ دودھ کا اتنا چھچہ زیادہ بڑھا دو' پانی اتنا کم کر دو' یہ سارا پیمانہ انہوں نے ماں کے دود سے لیا ہوا ہے۔

یہ سب کچھ اس تغیر نا آشنا ذات کی کرشمہ سازی ہے جسے رب کہتے ہیں

عزیز برادران! وہاں کوئی اندر ہے جو نشوونما کے یہ پیمانے مقرر کر رہا ہے۔ جوں جوں بچہ بڑھتا چلا جاتا ہے' ماں کا اپنا دودھ گاڑھا ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ کون ہے جو یہ کرتا ہے؟ یہ کس اندازے سے کرتا ہے؟ یہ وہ کرتا ہے جو تغیر نا آشنا ہے۔ اب اگر وہ بھی ساتھ بدلتا چلا جائے تو وہ سلسلہ ہی سارا ختم ہو جائے۔ وہ ایک تغیر نا آشنا ناظم ہے' وہاں جو ان چیزوں کے اوپر قادر ہے' معلوم نہیں اس کا انظام کیا ہے' ابھی تو یہ بات ہی سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ دودھ کا آخر چلتے چلتے' دو سال کے بعد' ماں کا دودھ' مویشی کا دودھ' اتنا گاڑھا ہو جاتا ہے کہ مشکل ہو جاتی ہے۔ جب اس مقام پہ پہنچتا ہے تو بچہ کھانے پینے لگ جاتا ہے' اب اس کی پرورش دودھ کی بجائے دوسری غذا پہ ہوتی ہے' دانت بھی نکل آتے ہیں اور دودھ بھی اتنا گاڑھا ہو گیا ہوتا ہے کہ وہ ہضم بھی کر سکتا ہے۔

کائنات کی ہر شے اپنی نشوونما کے لیے اس کی محتاج ہے

برادرانِ عزیز! کہا ہے کہ **مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ کُلَّ یَوۡمٍ ہُوَ فِیۡ شَاۡنٍ** (55:29) کائنات کی ہر شے اپنی نشوونما کے لیے اس کی محتاج ہے اور اشیائے کائنات کی کیفیت یہ ہے کہ ہر آن اس کی نشوونما کا تقاضا مختلف ہوتا ہے اور وہ اس تقاضے کے مطابق سامانِ نشوونما دیئے چلا جاتا ہے۔ آگے کہا ہے کہ **فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ** (55:30) سوتم سوچو کہ تم قانون خداوندی کی کس کس شق کو جھٹلاؤ گے اور اپنی زندگی میں غیر خداوندی قوانین کے تابع کس طرح نشوونما حاصل کر سکو گے؟ برادرانِ عزیز! اسی تے زیادہ بس زبانی قرآن پاک پڑھن والے ہیگے آں' گا کے قرآن پاک پڑھ لیا کے ثواب ہو گیا''[1]۔ ان سے پوچھیے کہ یہاں پہنچنے کے بعد جو ان لوگوں نے کہا ہے کہ **مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ کُلَّ یَوۡمٍ ہُوَ فِیۡ شَاۡنٍ** (55:29) اور اس کے بعد **فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ** (55:30)۔ برادرانِ عزیز! ان لوگوں سے پوچھیے جو ریسرچ کر رہے ہیں کہ کس مقام پہ خدا نے اس بات کو یہاں کہہ دیا جو **رَبِّکُمَا** (55:30) کہا ہے۔ رب یہاں جو کہا ہے آپ سوچیے کہ کیا جچتا ہے اسکی شان کو یہ رب ہونا! رب ہو ہی وہی سکتا ہے کہ تمہارے تقاضے

---

[1] ہم تو بس زیادہ سے زیادہ زبانی قرآن پاک پڑھنے والے ہیں' گا کر پڑھ لیا تو ثواب ہو گیا اور بس!

بدلتے جائیں تو وہ ہر تقاضے کے مطابق رزق دیتا ہوا چلا جائے اور خود نہ بدلے' تم بدلتے چلے جاؤ' تمہارے تقاضے بدلتے چلے جائیں اور اس کے مطابق وہ سامان نشوونما دیئے چلا جائے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں کہا ہے کہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:30) سو تم اس نشوونما دینے والے کی کس کس قدرت کو جھٹلاؤ گے؟

وقت ہو گیا عزیزانِ من! سورۃ الرحمٰن کی آیت 30 تک ہی ہم آئے۔ یہاں ایک اہم مقام آیا تھا اس لیے میں نے سمجھا کہ یہیں اسے واضح کر دیا جائے۔ اب آگے بات انسانوں کی آ رہی ہے جو قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور سلب ونہب سے اپنی ضروریات سے زیادہ سمیٹتے ہیں' دوسروں کی کمائی بھی لوٹتے ہیں۔ یہ بات ذرا لمبی ہے' اسے ہم اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀❀............❀❀............❀❀

چوتھا باب: سورۃ الرحمٰن (آیات 31 تا 49)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جنوری 1983ء کی 28 تاریخ ہے اور درس قرآن کا آغاز سورۃ الرحمٰن سے ہو رہا ہے۔ یہ 27ویں پارے کی 55ویں سورۃ ہے: (55:31)۔ موسم کا اثر آج بھی مجھ پہ کافی خراب ہے۔ جب میں اس موسم کی گرفت میں آتا ہوں تو یہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتا، بہرحال آج کے درس کے لیے حاضر ہوا ہوں۔

نشو ونما کے تقاضے، نظامِ ربوبیت اور انسانوں کا استحصالی نظام

سابقہ آیات میں خدا کی ربوبیت کے مظاہر کا ذکر ہو رہا تھا اور جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ سورۃ الرحمٰن میں تو خدا کی رحمانیت کی صفت ہے یعنی نشو ونما کے سامان کا ہنگامی طور پر مل جانا، جسے Emergent Evolution (فجائی ارتقا) کہتے ہیں۔ رحمٰن کے لفظ کا باب ہی اس کی دلالت کرتا ہے اور یہی انداز چلا آ رہا تھا۔ آخری آیت میں جو بات کہی گئی تھی، وہ آپ کو یاد ہوگی کہ ربوبیت یہ ہے کہ ہر شے کو سامان نشو ونما ملتا ہے اور ان کی کیفیت یہ نہیں ہے کہ وہ جامد ہیں، ایک ہی دفعہ جس حالت میں ہیں، مستقل طور پر اسی حالت میں رہے ہیں، اس لیے ایک دفعہ جو کچھ ان کو دیا، بس وہی دیئے چلے جا رہے ہیں تو نشو ونما ہوتی ہے۔ یہاں تو کائنات کی ہر شے میں، ہر آن ایک تغیر واقع

ہوتا ہے اور تغیر کی بنا پر اس کی نشوونما کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں' اس کے سامان اور ذرائع بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور خدا کی ربوبیت عالمگیری کی یہ حالت ہے کہ ہر شے کو اس کی حالت کے مطابق سامانِ نشوونما دیتا ہے۔ جب تک بچے کے دانت نہیں ہوتے' دودھ کے چشمے از خود ابل کر چلے آ رہے ہیں' دانت ہو جاتے ہیں تو پھر اناج کھانا شروع کر دیتا ہے' تو یہ ہے کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ (55:29) ہر شے ہر آن ایک نئے انداز میں ہوتی ہے اور ہم اس کے اس نئے انداز کے مطابق سامانِ نشوونما مہیا کرتے ہیں۔

عزیزانِ من! یہاں تک تو یہ صورت تھی۔ اب اگلی بات آتی ہے جو لوگ قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کرتے ہیں' جو اس سامان ربوبیت کو' جسے پہلے اس نے کہا کہ وَضَعَهَا لِلۡاَنَامِ (55:10) تمام جانداروں کے لیے ہم نے یکساں طور پر پیدا کیا ہے کہ ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق ملتا چلا جائے۔ یہاں تک یہ ذکر کیا اور آگے آیا کہ اب انسانوں کی دنیا کی طرف آیئے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ لوگ سلب و نہب اور استحصال Exploitation لوٹ کھسوٹ کرتے ہیں' اپنی ضرورت کے مطابق نہیں لیتے' ضرورت تو تھوڑے سے ہی پوری ہو جاتی ہے۔ یہ دوسروں کی محنت کی کمائی کو بھی لوٹتے ہیں' کھسوٹتے ہیں' سمیٹتے چلے آتے ہیں۔ اس کو جرم کہتے ہیں۔ عربی زبان میں دوسروں کے درخت کا پھل کاٹ کر اپنے گھر لے جانا یا جیسا میں نے کہا تھا بھیڑ کی اون مونڈ لینا کہ وہ تو سردی میں ٹھٹھرتی رہے اور ان کے کتوں کے لیے کمبل بنتے رہیں' یہ جرم (Crime) کہا۔ اب انسانوں کی طرف آیئے' سنیے کہ لَكُمۡ اَیُّهَ الثَّقَلٰنِ (55:31) اے دو گروہو! اب ہم تمہاری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ بڑا دلچسپ انداز ہے کہ یہ جو سارا کچھ تھا یہ تو اشیائے کائنات کے متعلق تھا۔ اب ہم تمہاری طرف متوجہ ہوتے ہیں' تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں یا تمہارے متعلق بھی کچھ بتانا چاہتے ہیں۔ یہ جو ثقلٰن یعنی دو گروہ ہیں اس میں ذرا وزن بھی پایا جاتا ہے۔ ''ثقل'' کے معنی ''وزن'' ہوتا ہے۔

تذکرہ کچھ جن و انس کا

کائنات میں اہم گروہ انسان ہے۔ کائنات میں انسان کو جو خصوصیت حاصل ہے وہ کائنات کی دوسری شے کو حاصل نہیں ہے۔ یہ صاحب اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے۔ جب دو گروہ کہے ہیں تو اگلی آیت میں بتا دیا ہے کہ یہ کون سے گروہ ہیں۔ کہا کہ وہ گروہ ہیں: یٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ اِنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ اَنۡ تَنۡفُذُوۡا مِنۡ اَقۡطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ فَانۡفُذُوۡا لَا تَنۡفُذُوۡنَ اِلَّا بِسُلۡطٰنٍ (55:33)۔ یہ جو آیت ہے' اس کا مفہوم تو میں آگے بیان کروں گا' پہلی چیز یہی یٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ (55:33) ہے جو دو گروہ بتائے گئے ہیں' ان کا خود ہی بتا دیا کہ وہ جن اور انس کے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے بھی' میرا خیال ہے کہ ایک دو درس کی بات ہے' جب یہ ''جن'' کا لفظ آیا تھا' تو عرض کیا تھا' اسے پھر سمجھ لیجیے کہ قرآن کریم میں ایک تو ''مـن قبـل'' انسانوں سے پہلے کسی ایسی نوع Species کا ذکر آیا ہے جو اس

زمین پر کہیں تھی اوراب وہ ناپید ہو چکی ہے۔اس زمانے میں' اس عہد میں' اس دور میں' جوارض کی Species (نوع) تھی' اس میں اتنی زیادہ حرارت تھی کہ وہ نوع اس قسم کی تھی جو ویسی حرارت برداشت کرلیا کرتی تھی لیکن اب وہ ناپید ہے۔''جن'' کے معنی وہ کوئی شے ہوتا ہے جو نگاہوں کے سامنے نہ ہو۔قرآن حکیم نے مِـنْ قَبْـلُ [1] (15:27) کہہ کر یہ بات واضح کی کہ وہ ایسی نوع تھی جو انسانوں سے پہلے اس کرّہ ارض پر تھی۔جنہوں نے Evolution (ارتقا) کی تھیوری کو کچھ ابتدائی طور پر بھی پڑھا ہے ان کو معلوم ہے کہ اتنی Species (انواع) گزری ہیں' اس سے پہلے' انسانوں سے پہلے۔بہت سی تو ان میں ایسی تھیں کہ وہ منجمد ہو کر رہ گئیں' اب کھدائی میں ان کے بڑے بڑے ڈھانچے ملتے ہیں اور بہت سی بالکل معدوم ہو گئیں' بہت سی اسی شق کے اندر جامد ہو کر رہ گئیں' آگے نہیں بڑھ سکیں' وہ زندہ حیوانات کی شکل میں نظر آتی ہیں اور کچھ وہ تھیں جو آگے بڑھتی ہوئی چلی آئیں' اور پیکرِ انسانیت تک پہنچ گئیں۔یہ جو ناپید ہوئی انواع ہیں' ان کے متعلق یہ آیا ہے کہ انسانوں سے پہلے جَآنّ (15:27) کا لفظ آیا ہے' وہ ان کے متعلق ہے۔یاد رکھیے! اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب اس کے بعد قرآن حکیم میں یہ لفظ آتا ہے' جن اور انس کے الفاظ اکٹھے آتے ہیں۔اب ہمارے ہاں تو جنات کا ایک توہم پرستانہ عقیدہ ہے کہ وہ ''جن'' ہوتے ہیں اور پھر ویسے تو ان کا کچھ پتہ نہیں چلتا' لیکن یہ غریب غریب بچیاں جو ہسٹیریا کی مریضہ ہوتی ہیں' جب ان پہ وہ دورہ پڑتا ہے تو وہ چمٹے سے داغنے والے' گدگدی کرنے والے آجاتے ہیں' روز خبریں نکلتی ہیں کہ ان بیچاریوں کو مار مار کر ادھ موا کر دیتے ہیں' بعض دفعہ تو جان سے مار دیتے ہیں' ہلاک کر دیتے ہیں' وہ ''جن'' بیچارہ تو کبھی جان سے نہیں مارتا لیکن یہ ''جن'' نکالنے والے' اس کی جان نکال دیتے ہیں۔یہ توہم پرستیاں ہیں۔

عزیزانِ من! اس وقت کرّہ ارض کے اوپر کوئی ایسی مخلوق نہیں ہے جس کا انداز یہ ہے کہ وہ اس طرح سے آکر انسانوں کو چمٹ جائے اور محیر العقول کرشمے دکھاتی پھرے' جیسے یہ کہا کرتے ہیں۔عربوں کے ہاں ان کی کوئی ایسی مخلوق نہیں ہے۔میں نے جیسے کئی دفعہ یہ سمجھایا ہے یا پھر یہ لفظ یہاں آیا ہے تو میں یہ عرض کروں کہ عربوں کے ہاں اس زمانے میں آبادیاں بلکہ اب بھی جا کر دیکھ لیجیے وہاں شہر تو سارے دو تین ہیں' اب تو خیر پھر بھی آبادی بڑھ گئی ہے۔ان کے اندر جو موجودہ تہذیب وتمدن کی چیزیں ہیں' وہ بھی آگئی ہیں۔اس زمانے میں یہ شہر بھی آپ کے ہاں کے کچھ قصبوں یا گاؤں جیسے تھے' باقی ساری آبادی گاؤں میں پھیلی ہوئی تھی۔وہ دور دور نکل جاتے تھے۔چند نفوس پر مشتمل ایک قبیلہ تھا۔یہاں سے اٹھے اور اپنا گھر کندھے پر رکھا اور پھر پانی کی تلاش میں نکل گئے۔وہ صحرا ہے۔بڑا ہے

---

[1] وَ الْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (15:27) واضح رہے انسانی تخلیق سے پہلے کرّہ ارض میں بے پناہ حرارت تھی اس لیے ابتداً یہاں ایسی مخلوق کی ابتدا ہوئی جس میں حرارت برداشت کرنے کی بڑی صلاحیت تھی۔وہ مخلوق باقی نہیں رہی۔انسان اسی کا جانشین ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص584)۔

کہ میل ہا میل تک چلے جایئے تو کہیں کوئی متنفس نظر نہیں آ تا۔انسان تو ایک طرف رہا کوئی جاندار نظر نہیں آ تا۔ وہاں پانی نہیں تھا۔ یہ جو شہریوں کی زندگی سے الگ رہنے والے' دور نگاہوں سے پوشیدہ خانہ بدوش قبائل تھے یہ ہمارے ہاں کے خانہ بدوش بھی اب تو شہر میں آ بسے ہیں' یہ ان کی جھونپڑیاں کچھ شہروں میں موجود ہیں۔ یہ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں' ہمارے ہاں چند سال پہلے تک بھی یہ لوگ دور جنگلوں میں رہا کرتے تھے اور شہروں میں آیا کرتے تھے۔ یہ بندر نچانے' کوئی ریچھ کا تماشا دکھانے' کوئی لکھو وٹیکن والیاں جیہڑ یاں ہونڈیاں سن' (مٹی کے کھلونے وغیرہ بیچنے والی جوتھیں) یہ بھی وہی تھیں۔ یہ وہی قبائل ہیں جو ساری دنیا میں پھیلے ہوتے ہیں۔

''جن'' کی کوئی الگ مخلوق نہیں ہے

عرب میں یہ خانہ بدوش قبائل بہت خاصی تعداد میں تھے۔ان کی تہذیب الگ تھی' تمدن الگ تھا' معاشرت الگ تھی' معیشت الگ تھی۔شہری زندگی کے انسانوں کے مقابلے میں یہ بالکل مختلف قسم کے انسان نظر آتے تھے۔عربوں کے ہاں ان قبائل کو جو نگاہوں سے اوجھل' دور آبادیوں میں' دور جنگلوں صحراؤں میں' رہتے تھے' ان کو وہ ''جن'' کہتے تھے اور جو موانست سے' ایک دوسرے کے ساتھ انس سے' اکٹھے مل کر رہتے تھے' ان کو وہ ''انس'' کہتے تھے۔ جہاں قرآن حکیم میں جن اور انس آئے گا' اس کے معنی ہونگے وہ خانہ بدوشوں کی آبادیاں اور شہری آبادیاں۔ہم بھی اس سے پیشتر دیہاتی آبادی اور اور شہری آبادی' الگ الگ کہا کرتے تھے اور اس زمانے کی دیہاتی آبادی میں اور شہری آبادی میں بڑا فرق ہوتا تھا۔ یہ جن وانس انسانوں ہی کی دو نوع ہیں' کچھ وہ جو شہری متمدن زندگی سے دور صحراؤں میں' جنگلوں میں' نگاہوں سے اوجھل رہا کرتے تھے اور دوسرے وہ تھے جو شہری زندگی بسر کرتے تھے' متمدن زندگی بسر کرتے تھے۔جن اور انس یہ ہیں۔ان میں ''جن'' کوئی الگ مخلوق نہیں ہے۔

قرآن کریم نے کعبہ کے متعلق کہا ہے کہ اَوَّلَ بَيۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىۡ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًاوَّ هُدًى (3:96) جہاں بھی آپ دیکھیں گے' یہ ہمیشہ الناس کے متعلق آئے گا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آیا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَكُمُ الرَّسُوۡلُ بِالۡحَقِّ (4:170) الناس کی طرف رسول قانون ربوبیت حق وصداق کے ساتھ لے کر آیا۔تم میں سے ایک رسول ہم نے بھیجا ہے۔ سارے قرآن حکیم میں کسی رسول کا ذکر نہیں ہے جو ''جنوں'' میں سے کہا جائے کہ یہ آیا۔انسانوں میں سے ہی رسول آتے تھے' انسانوں کی ہی طرف آتے تھے اور انسانوں میں وہ دونوں گروہ شامل ہیں' اس لیے جہاں بھی یہ خطاب یا یہ جن اور انس الفاظ آئیں گے' تو اس کے معنی اس زمانے کی شہری آبادیاں اور وہ قبائلی آبادیاں جو صحراؤں میں نگاہوں سے دور رہا کرتی تھیں' مراد ہیں۔ یہ انہی دو آبادیوں کا ذکر ہے۔

یہ ''جن'' دراصل پہاڑی علاقے کے ہی لوگ تھے

حضرت سلیمانؑ ❶ کے قصے میں تو جنات کے متعلق بڑی لمبی چوڑی تفصیل ہے کہ ان کو پکڑ کر لاتے تھے اور پھر ان سے وہ اپنے قلعے بنوایا کرتے تھے' بڑے بڑے حصار بنواتے تھے' عمارتیں بنواتے تھے' وہ غوطہ خور ہوتے تھے' سمندروں میں غوطے لگاتے تھے (21:82) ان کے لیے وہ موتی نکال کر لایا کرتے تھے' بڑی بڑی عظیم چیزیں بناتے تھے Sculptures (تماثیل) بناتے تھے اور پھر یہ کہ انہیں راتوں کو ہتھکڑیوں میں باندھ کر رکھا جاتا تھا کہ کہیں بھاگ نہ جائیں۔ یہ وہ جنات نہیں تھے جو بچیوں کے اعصاب پر سوار ہو جاتے ہیں۔ عزیزانِ من! اب اس کی تو تفتیش ہوگئی ہے' تحقیق ہوگئی ہے کہ وہ پہاڑی علاقے کے لوگ تھے' وحشی قسم کے' بڑے سرکش قسم کے لوگ تھے' وہ ان کو پکڑ کر لاتے تھے اور لا کر ان سے کام لیا کرتے تھے۔ ان کو جنات کہا جاتا ہے۔ وہاں بھی یہ لفظ جن وانس آتا ہے بلکہ قرآن کریم میں ایک مقام پہ تو یہ بھی آیا ہے جو میں نے کہا ہے کہ انہیں قبائلی خانہ بدوش کہتے ہیں' یہ آیا کرتے تھے' یہ چھوٹی موٹی چیزیں بنا کر' وہ چھاج چھلنیاں' وہ اس قسم کی چیزیں بنا کر' لایا کرتے تھے اور شہروں میں آ کر بیچا کرتے تھے۔ یہ چھوٹے موٹے چاقوں وغیرہ یا اس قسم کی چیزیں بنا کر لایا کرتے تھے تو آپس میں شہریوں کے اور ان دیہاتیوں کے یا ان قبائلیوں کے تعلقات بھی تھے اور یہ جنہیں قرآن کریم نے انس کہا ہے' قرآن حکیم میں ایک مقام پہ ان کی یہ چیز بھی کہی ہے اور میں نے خاص طور پہ اس کا یہ ریفرنس (حوالہ) دیا ہے کہ وَ قَالَ اَوۡلِیٰٓؤُهُمۡ مِّنَ الۡاِنۡسِ رَبَّنَا اسۡتَمۡتَعَ بَعۡضُنَا بِبَعۡضٍ (6:128) واقعی ہماری کیفیت یہ تھی کہ یہ ادھر شہروں کے اندر آیا کرتے تھے' چھوٹی موٹی چیزیں بنا کر لایا کرتے تھے' ہم وہ خریدا کرتے تھے اور یہ ہم سے' شہروں سے' اپنی ضروریات کی چیزیں خرید کر لے جایا کرتے تھے۔ یہ تو وہ انسان ہی تھے جو آتے تھے اور انسانوں سے ہی سب کچھ ہوتا تھا۔ یہ جنات جو ہمارے ذہنوں میں ہیں یہ وہ جنات تو نہیں ہوتے۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے بلکہ اسی سے اگلی آیت میں ہے یٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ وَ الۡاِنۡسِ اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ (6:130) اے جن وانس کے گروہو! کیا تم میں سے تمہاری طرف رسول نہیں آئے۔

بچوں کے ذہنوں پر T.V پروگرام الف لیلیٰ کی کہانیوں کا اثر

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ رسول تو سارے انسان ہی تھے' کسی ''جن'' رسول کا تو ذکر ہی نہیں آیا اس لیے یہ کوئی الگ نوع یا الگ پیدائش یا الگ مخلوق نہیں تھی۔ جہاں یہ جن اور انس کہا گیا ہے' اس کے معنی یہی دو گروہ ہیں۔ اگلی نسل کے ذہنوں سے یہ چیزیں محو ہوتی جا رہی تھیں لیکن یہ جو ہمارے ہاں اب نئے نئے ذرائع ابلاغ آ گئے ہیں' انہوں نے صورتِ حال بدل دی۔ مثلاً پچھلے دنوں آپ

---

❶ تاریخ کا قیاس اس طرف ہے کہ آپ علیہ السلام کا زمانہ 950 ق م کا ہے۔

دیکھیں، میرا خیال ہے کہ سال بھر سے بھی زائد عرصے تک وہ الف لیلیٰ کا ایک قصہ چلا آ رہا تھا۔ سب سے پہلے ہمارے بچے تو ان تو ہم پرستیوں سے نکلتے چلے آ رہے تھے، Scientific (سائنسی) طریق پر ان کی تعلیم ہوتی تھی مگر وہ جو الف لیلیٰ کے قصے آئے تو اسکے اندر انہوں نے پھر وہی جنات اور دیو دکھانے شروع کر دیئے۔ اب وہ پھر پوچھتے ہیں کہ صاحب! وہ جنات کہاں ملتے ہیں، وہ پریاں کہاں ہوتی ہیں یعنی نئے سرے سے نئی نسل کے لیے بھی ایک مصیبت پیدا کر دی۔ وہ جن اور پریاں ان کے ذہن میں آ گئیں تو بہرحال یہ ''جن'' اور ''انس''، وہی دو قبائل، دو قسم کی آبادیاں ہیں، جو عربوں میں ہوتی تھیں، اب بھی مختلف علاقوں میں خاص طور پہ افریقہ کے علاقے میں تو بیشتر آبادی ہے، جو انہی کی ہے جو باہر جنگلوں میں رہتے ہیں۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ جن و انس آئے گا، اس کے معنی یہ ہونگے۔ یہ الگ کوئی جنات کی مخلوق نہیں ہوگی۔

کہا ہے کہ **یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ** (6:130)۔ یہ اگلی آیت ہے جس سے عجیب ہی مفہوم لیا جاتا ہے۔ اس آیت کا مفہوم ہے کہ اے دونوں گروہو! اے بدوؤ اور شہریوں! اے دہی اور شہری باشندو! بتاؤ کہ کیا تمہاری طرف ہمارے پیغمبر نہیں آئے تھے، جو تمہارے اپنے ہی بھائی بنے تھے کوئی غیر نہیں تھے۔

انسان کی پرواز اور کائنات کی لامحدود وسعتیں

برادران عزیز! اب آیئے اس آیت (55:33) کی طرف۔ اس آیت کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اے جن وانس کے گروہو! اگر تمہیں طاقت ہے کہ زمین اور آسمان کے کناروں سے باہر نکل جاؤ تو جاؤ! تم نکل جاؤ۔ تم نہیں نکل سکتے مگر غلبہ کے ساتھ۔ یہ اس کا عام طور پہ ترجمہ کیا جاتا ہے اور یہ آیت مشکل آیات میں سے بتائی جاتی ہے۔ انسانوں سے یہ کہا جائے کہ تم Boundries of this Universe (کائنات کی حدود) بلکہ **اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** (55:33) اب تو ارض وسما اتنے آ گئے، فضائی کرّے بھی، ارض بھی، تو اس کے معنی پوری خارجی کائنات ہوتی ہے۔ اس کی اقطار، اس کی Boundries سے نکل سکتے ہو تو ذرا باہر نکل جاؤ، تم نہیں نکل سکتے۔ اس نکلنے کے لیے کسی خاص قوت کی ضرورت تھی جسے پروانہ راہداری کہتے ہیں، اس کی ضرورت تھی اور وہ تمہیں حاصل نہیں ہے۔ بات تو یہ ہے کہ یہ انسان اس مادی کائنات کے اعتراف یا ان کی Boundries سے آگے نہیں جا سکتا۔ یہ جواب جا بھی رہے ہیں زمین سے اڑ کر آسمانوں کی طرف، تو وہ بھی سماوات کے اندر اندر ہی رہ سکتے ہیں، اقطار سماوات سے آگے کوئی نہیں جا سکتا۔ آگے جانے کا تو آج کی تحقیق کی رو سے، تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اول تو اس Universe (کائنات) کا کوئی آخری کنارہ ہی ابھی تک محدود نہیں ہوا، پیدا نہیں ہوا۔ ہر چند یہ محدود، وہ جو اس کی آخری حد ہے، وہ تو ابھی تک کوئی دریافت ہی نہیں کر سکا، اور پھر اسے تو Expanding Universe (پھیلتی

ہوئی کائنات) کہا جاتا ہے۔ یہ تو غالباً جیمز جینز (1946-1877ء) کی کتاب ہے: The Expanding Universe[1] یہ کائنات پھیلتی جا رہی ہے لیکن یہ پھیلے' موجود ہی رہے' جو کچھ ہے تو اس کا بھی جو آخری کنارہ کہا جا رہا ہے' وہ تو ابھی تک ذہنِ انسانی میں بھی نہیں آیا چہ جائیکہ اس کے متعلق کوئی انکشاف ہو گیا ہو کہ یہ Universe (کائنات) کی حدِّ آخر ہے۔ ہر کرّے کے متعلق تو کہا جائے گا اور کرّہ بھی جو گول ہوتا ہے' اس کی کوئی حد آخری نہیں ہوتی۔ اگر آپ کے اس ارض کا یعنی ساری دنیا کا' یہ چکر لگاتے ہیں تو ان سے پوچھیے کہ تم نے کوئی آخری کنارہ دیکھا ہے' زمین کا آخری کنارہ ہوتا ہی نہیں۔ بہر حال جو پوری کائنات ہے' یہ مادی کائنات' اس کی اقطار' اس کی Boundries' اس کی حدود' اس سے آگے جانا' تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا اور ہمارے ہاں تصوف والے تو بڑے دلچسپ لوگ ہیں۔ ان کو تو پوچھو نہیں' وہ تو اپنے ہاں حجرے میں بیٹھے بیٹھے آسمانوں سے بھی آگے چلے جاتے ہیں۔

میں نے عرض کیا تھا اور کبھی کبھی یہ بات دہرانے کی آ جاتی ہے کہ صاحب! وہ حضرت صاحب سے ملنے کے لیے آتے ہیں' انہوں نے کہا کہ نہیں مل سکتے' وہ تو اندر ایک ریاضت میں' ایک چلّے میں بیٹھے ہوئے ہیں قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ (30:42) کا ایک خاص چلّہ ہے۔ کہنے لگے: کس قسم کا ہے؟ کہا کہ یہ قرآن کریم میں ہے' قرآن کریم کہتا ہے کہ جاؤ نکلو دیکھو مختلف آبادیوں کو' مختلف اقوام کو' مختلف ممالک کو اور پھر دیکھو کہ ان آبادیوں کا حشر کیا ہوا۔ لہٰذا حکم تو یہ تھا کہ جاؤ چلو پھرو اور آبادیوں میں دیکھو۔ یہ بہت بڑی چیز تھی۔ ان سے کہا کہ حضرت صاحب! آج کل چالیس دن کا چلّہ کر رہے ہیں' چالیس دن حجرے سے باہر نہیں نکلیں گے۔ کیا بات ہے حضرت صاحب کی! ''تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر''۔ یہ تو ہر وقت یہاں بیٹھے ہوئے عرشِ معلیٰ پر اللہ میاں کے پاس ملاقات کا شرف حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔ چھوڑیئے ان تصورات کی دنیا کو' اپنے تصور کی دنیا کے اندر تو آپ بھی یہاں بیٹھے بیٹھے لندن جا سکتے ہیں' امریکہ جا سکتے ہیں' یہ انہی کی بات نہیں ہے۔

کائنات کی وسعتوں کو محدود کر سکنے کا مفہوم

قرآن حکیم نے کہا ہے کہ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ (55:33) اے بدوی اور حضری' شہری اور صحرائی' مہذب اور غیر مہذب گروہو! اس کائنات کی حدود سے آگے نہیں نکل سکتے۔ یہ کاہے کے لیے کہا گیا؟ یہ تو اگلی آیت میں بات صاف کر دی۔ کہا کہ تم جو

---

[1] یہ سر آرتھر ایس۔ ایڈنگٹن (1944-1882ء) کی تصنیف ہے۔ اس کا نام The Expanding Universe ہے' اس کا 1946ء کا ایڈیشن کیمبرج یونیورسٹی پریس میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا تھا۔ اس کتاب کے کل 130 صفحات ہیں۔ سر جیمز جینز (1946-1877ء) کی تصنیف کا نام The Mysterious Universe ہے۔ یہ میکملن کمپنی نیویارک سے 1930ء میں طبع ہوئی' اس کے کل 154 صفحات ہیں۔

قوانین خداوندی کے خلاف یہ زندگی بسر کرتے ہو' اس کے نظام ربوبیت کو تم نے غصب کر رکھا ہے' اس کا استحصال کر رکھا ہے' اس کو سلب کر رکھا ہے' یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی اتنی ہی سخت سزا تمہیں ملے گی' تم یہ کچھ کرتے ہو اور ایک دوسرا نظام تم نے اپنے ہاں قائم کر رکھا ہے' قوت فراہم کر رکھی ہے' جس کی بنا پہ تم یہ سمجھتے ہو کہ ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے' ہماری گرفت نہیں ہو سکتی' وہ جس طرح سے ایک مفرور مجرم ہوتا ہے' اشتہاری ہو جاتا ہے' وہ گرفت میں نہیں آتا' پولیس سے نکل جاتا ہے' بھاگ جاتا ہے۔ کہا کہ تم یہ کیوں سمجھتے ہو کہ تم ہمارے قانون مکافاتِ عمل کی گرفت سے نکل کر اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (55:33) سے کہیں اور آگے چلے جاؤ گے' پکڑے نہیں جاؤ گے۔ سنو! تم نہیں جا سکتے' اس کے لیے ہماری طرف سے عطا کردہ' کسی قوت یا پروانہ راہداری کی ضرورت تھی' وہ تمہیں حاصل نہیں ہے' تم جا نہیں سکتے' یہ ہو نہیں سکتا کہ تم جرم کرو تو اپنے ہاں کا جو نظام عدل یا نظام تفتیش ہے' اس کی حدوں سے تو ہو سکتا ہے کہ تم باہر چلے جاؤ' وہ جو کہا کرتے ہیں کہ جی! وہ سرحد پار چلے گئے یعنی کسی ایک مملکت کی جو گرفت کی حد ہے' اس سے آگے چلے گئے تو وہ محفوظ ہو گئے اور اب ان کو کوئی نہیں پکڑ سکتا' وہاں اس کا قانون نہیں چل سکتا' کہا کہ تم کیا سمجھتے ہو کہ اسی طرح سے تم بھی اس قسم کے جرائم کے مرتکب ہو کر ہماری گرفت سے باہر چلے جاؤ گے' کسی اور مملکت میں چلے جاؤ گے' کسی اور ملک میں سرحد پار کر جاؤ گے' تم کائنات کی سرحد پار نہیں کر سکتے یعنی خدا کے قانون مکافات کی گرفت یا اس کی جو حدود فراموشیاں ہیں' یہ اس کی طرف اشارہ ہے' بڑے حسین انداز میں' بڑے بلیغ انداز میں یہ کہا ہوا ہے کہ یہ بات تو الگ رہی کہ تم ایک شہر سے دوسرے شہر میں چلے جاؤ' بچ جاؤ' ایک مملکت سے دوسری مملکت میں چلے جاؤ' بچ جاؤ' اسی کرّہ ارض کے اوپر کہا کہ یہ تو یہ بات رہی' تم تو اس کائنات کی جو Boundries (سرحدیں) ہیں' اگر تم چاہو کہ ان سے بھی باہر نکل کر کہیں ہماری گرفت سے دور ہو جاؤ' تو تم تو یہ بھی نہیں کر سکتے۔ جاؤ تو کہاں جاتے ہو' تم ہماری گرفت سے باہر نہیں جا سکتے۔

جرم کرنے سے کیونکر بچا جا سکتا ہے

جرم وہی کرتا ہے جس کے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ میں پکڑا نہیں جاؤں گا۔ یہ غلط سوچ ہے۔ یہ اسکی خوش فہمی ہو' کچھ بھی ہو' تصور یہی ہوتا ہے کہ میں پکڑا نہیں جاؤں گا اور اگر ذہن کے اندر یہ ہو کہ جونہی میں نے جرم کیا اور وہاں پولیس والا کھڑا ہے' وہ فوراً پکڑ لے گا تو پھر پولیس والا بھی ایسا نہ ہو کہ کچھ دے دلا کر وہاں سے چھوٹ جائیں۔ اگر یہ چیز یقینی ہو کہ جونہی جرم کیا اور اسی وقت گرفت ہو جائے گی' اس کی سزا ملے گی' پھر جرائم نہیں ہوتے۔ کہا کہ اگر تم یہ یقین رکھ لو کہ جو جرائم تم ایسے کر رہے ہو' جن سے اپنی دنیاوی نظام عدل کی رو سے تم سزا سے چھوٹ سکتے ہو' چھوٹ جاتے ہو' اس کا کوئی طریق بھی یوں نہ اختیار کرو' گرفت میں ہی نہیں آتے' گرفت میں آتے ہو تو پھر وہ عدالت کا نظام جس قدر سقیم سا ہے' اس میں سے بھی یہ ضروری نہیں کہ تمہیں سزا ملے' تو جرم کے ارتکاب پر تمہاری جرأتیں بے باک ہو جاتی

ہیں لیکن ہمارا قانون مکافات تو ایسا نہیں ہے کہ تم اس کی گرفت میں نہ آؤ اور اس کے بعد تمہیں سزا نہ ملے۔ اگلی ہی آیت میں پھر وہی ہے فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:34) اس کے بعد سوچو کہ تم خدا کی کس کس قدرت کو جھٹلاؤ گے؟

پھر اگلی ہی آیت میں کہا کہ یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ (55:35) چاروں طرف سے اس تباہی کے شعلے تمہیں لپٹ جائیں گے اور کوئی ایسا نہیں ہوگا جو تمہیں وہاں سے بچا سکے۔ اپنے جرائم کی سزا سے بچنے کے لیے ایسا ذہن میں تھا کہ ہم نکل جائیں گے، یہاں سے دور چلے جائیں گے، گرفت میں نہیں آئیں گے۔ اس نے کہا کہ اس سے بچنے کا سوال ہی نہیں ہے کہ وہ ہماری گرفت میں نہیں آئیں گے جو ہمارے ہاں یہ چیز آ گئی ہے کہ یہ سارا کچھ وہاں قیامت میں جا کر ہوتا ہے، یہاں تو کچھ بھی نہیں ہوتا، یہی چیز (9:49) میں ہے۔ دو تین آیتیں میں پیش کروں گا، اس میں تو بے شمار اس قسم کی وہ آیتیں ہیں کہ تم جو کہہ رہے ہو کہ وہاں قیامت میں جائیں گے، پھر حساب کتاب ہوگا اور وہاں پہ یہ کچھ ہوگا اور اس کے اندر پھر شفاعت کا عقیدہ آ گیا کہ ٹھیک ہے، وہاں پکڑے بھی گئے، عدالت میں بھی گئے، جہنم میں بھی گئے، پھر وہ چھڑا لیں گے۔

جنت اور جہنم اسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے

عزیزانِ من! یہ جو چیز ہمارے ہاں مانی جاتی ہے کہ صاحب! وہ دن آئے گا جس دن یہ دیکھا جائے گا، حساب کتاب ہوگا، پھر جنت یا جہنم ملے گی۔ قرآن مجید کے تصور کی رو سے یہ چیز برحق ہے، آخرت پر ہمارا ایمان ہے، آخرت کا جہنم، آخرت کی جنت جو بھی قرآن مجید نے کہا ہے، اس پر ہمارا ایمان ہے لیکن یہ بات نہیں ہے کہ وہ وہیں ہے، جو کچھ ہوتا ہے، وہ یہاں نہیں ہے۔ سنیے! یہیں سے جہنم شروع ہو جاتا ہے، یہیں جنت مل جاتی ہے۔ یہ کچھ یہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے یہ نہیں کہا آپ دیکھیے کہ کس کس انداز میں قرآن مجید کہتا ہے کہ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِیْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِیْنَ (9:49) انہیں نظر نہیں آتا، جہنم تو انہیں چاروں طرف سے اب بھی گھیرے ہوئے ہے، یہ انہیں اس وقت محیط ہے اور ظاہر ہے کہ جو جہنم اس وقت انہیں گھیرے ہوئے ہے، یہ اس گھیرے سے نکل کر کائنات کی سرحدوں سے پار کہاں جا سکیں گے، وہ تو اس وقت بھی انہیں گھیرے ہوئے ہے۔ دوسری جگہ (82:16) میں کہا ہے۔

مکافات عمل کی حقیقت اور کیفیت

یہ (82:16) بڑی عجیب آیت ہے۔ کہا ہے کہ انہیں جہنم تو نہیں نظر آ رہا (82:16) جہنم کی نگاہ میں یہ اس وقت بھی اوجھل نہیں ہیں، جہنم تو ان پر محیط ہے یہ اس کی نگاہوں سے اس وقت بھی اوجھل نہیں ہیں، جہنم انہیں اس وقت بھی دیکھ رہا ہے۔ اور یہ اپنی آنکھیں بند کر لیں، اس پہ پردے ڈال لیں تو اور بات ہے، اس سے یہ غائبین نہیں ہیں، یہ اس وقت بھی اس کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔

سرحد کے پار چلے جانے کے معنی تو یہ تھے، وہ خدا کی گرفت سے دور ہو جائیں گے اور پھر اس عذاب کے متعلق تو یہ کہا ہے کہ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنْهَا وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ (5:37) اس جہنم کے عذاب سے یہ کسی طرح سے نکلنا چاہیں گے، اس سے نکل نہیں سکیں گے، یہ عذاب مقیم ہے، وہ اس سے تو انکار کر رہے ہیں۔ یہ وہ عذاب ہے جو اس وقت ان پہ آہنی محیط ہے، جس میں وہ داخل ہیں، جس سے یہ نکل نہیں سکتے۔ اس کے متعلق یہ تصور کرنا کہ صاحب! ہم اگر اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (55:33) سے باہر نکل جائیں گے تو پھر خدا کی گرفت سے دور ہو جائیں گے، یہ تقدس کس قدر حماقت پر مبنی ہے۔ وہ اس سے نکل ہی نہیں سکیں گے اور ایک مقام پہ تو ایسا، عزیزانِ من! تصور آتا ہے تو کلیجہ لرز جاتا ہے کہ یہاں کے جہنم کا جو عذاب ہے، اس کے متعلق جو قرآن کریم میں اتنا سخت عذاب کہا ہے کہ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِیْدُوْا فِیْهَا (22:22) کوشش کریں گے کہ کسی طرح سے جم کر، جیسے کہتے ہیں جیل کی دیوار کاٹ کر یا سلاخیں کاٹ کر، کسی طرح سے وہاں سے نکل جانے کی کوشش کریں گے، دھکے دے کر ان کو پھر اس عذاب میں ڈال دیا جائے گا۔ اس عذاب سے نکلنے کی یہاں بھی کوئی صورت ہی نہیں، کہیں جانے کے لیے جگہ نہیں، پھر دھکے دے کر اس عذاب کے اندر ڈال دیا جائے گا اس لیے یہ جو بات ہے کہ یہ انسان کے امکان میں بھی نہیں ہے کہ خدا کے قانون مکافاتِ عمل کی گرفت سے بچ جائے یا اس کے عواقب سے بچ جائے۔ تم سمجھتے ہو کہ کائنات کی حدود سے آگے چلے جائیں گے، تم کہیں نہیں جا سکتے۔

ایک اور آیت میں کہا ہے کہ وَ رَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَ لَمْ یَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا (18:53) وہ جہنم کے عذاب کو دیکھیں گے اور چاہیں گے کہ اس میں داخل نہ ہوں لیکن یہ ان کے بس کی بات نہیں ہوگی، یہ ان کے اختیار میں ہی نہیں ہوگا کہ اس طرح سے اس کو بدل لیں۔ یہ مکافات عمل کی بات تو ایک موضوع ہی الگ ہے کہ اس کی رو سے قرآن کریم نے جہنم کس کو کہا ہے۔ وہ تو جہنم ہے جو نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ o الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ (104:6-7) خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں کو لپیٹ لے گی۔ کچھ یہاں سے بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ہماری زندگی کس جہنم میں گزر رہی ہے جس کی آگ دلوں کو لپیٹ لیتی ہے۔ کوئی ہے ایسا دل جسے آج سکوں میسر ہو! جنہیں ہم بظاہر بڑا خوشحال، مرفع الحال، نہایت کامیابی کی زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، ان کے بھی دلوں کے اندر جھانک کر دیکھیے، آپ سے بھی زیادہ شعلے بھڑکتے ہوئے نظر آئیں گے۔ جس عذاب کی کیفیت یہ ہو کہ اس کے شعلے دلوں کو گھیر لیں، اس سے بچ کر نکل جانے کی صورت کیا ہو سکتی ہے۔ یہ ہیں اس کے معنی میری بصیرت کے مطابق۔

کہا ہے کہ ان سے یہ کہہ دو کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (55:33) سے باہر نکل جائیں گے تو خدا کے قانون کی گرفت سے بچ جائیں گے۔ تم نہیں نکل سکتے، تمہارے پاس یہ قوت ہے ہی نہیں جو تمہیں اس سے باہر لے کر جا سکے، اس لیے تم اس کی گرفت میں آ وَ گے عَلَیْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّ نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ (55:35) اگر تم نے خدا کی نظام ربوبیت کی مخالفت کی تو

تم پر تباہیوں کی آگ کے شعلے اور دھوئیں کا غبار اس طرح چھا جائے گا کہ تم اس مصیبت سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکو گے۔ عزیزانِ من! قرآن حکیم نے جہنم کے عذاب کو محسوس پیرائے میں جو بیان کیا ہے تو آگ سے ہی تشبیہہ دے کر اس کو بیان کیا ہے۔

ہمارے ہاں کے غلط تراجم سے پیدا ہونے والی مشکلات

اب وہ بات یہاں آئی جو میں نے پہلے ہی کہی تھی کہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:36) کا ترجمہ جو ہمارے ہاں کیا جاتا ہے کہ تم خدا کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے تو پہلی آیات میں تو وہ واقعی نعمتیں تھیں' جن کے متعلق کہا ہے اور یہاں تو یہ کہا گیا ہے کہ چاروں طرف تمہیں آگ کے شعلے لپیٹ رہے ہونگے اور تم اس کے اندر جھلس رہے ہوگے۔ اس کے بعد کہا کہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:36) خدا کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جو اٰلآء ہے' اس کے معنی نعمت ہی نہیں ہیں' اس کے معنی قوت کے ہیں' اقتدار کے ہیں' وہ اس کا قوت اقتدار جو سامان نشو ونما بھی دیتا ہے اور وہی اس کا اقتدار ہے جو مجرمین کو اس طرح سے اپنی گرفت میں بھی لاتا ہے۔ اس سے آپ دیکھیے اس آیت کے معنی واضح ہوگئے۔ جہاں بھی یہ آئیں گے' وہاں آپ دیکھ لیجیے اس کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ یہ ہے فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:36) ورنہ بڑی مشکل پڑ جاتی تھی جہاں یہ معنی کرتے تھے کہ اس کے بعد' خدا کی کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے' تو پھر اب یہ جہنم کے عذاب میں جھلس رہا ہے' چیخ رہا ہے' پکار رہا ہے اور اس کے بعد یہ ہے کہ تم خدا کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ آپ کا کیا خیال ہے اگر آپ کو اس نعمت سے سرفراز کر دیا جائے تو آپ خوش ہو جائیں گے کہ بہت بڑی نعمت مل گئی' دوسروں کو ملتی ہے تو آپ کہتے ہیں کہ خدا کی نعمت ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اگر ایک لفظ کے معنی غلط ہوتے ہیں تو پھر اس ترجمے کی اس قسم کی تاویل کی جاتی ہے۔ اس کے سوا اور کیا تاویل کی جائے کہ ہاں صاحب! یہ نعمت ہی ہوتی ہے اور قرآن مجید جو کہتا ہے کہ چیخیں گے' چلائیں گے تو سوال یہ ہے کہ کیا چیخنا چلانا نعمت ہے؟ دراصل یہ خدا کی قدرت کی بات کی ہے' اس کے اقتدار کی بات کی ہے۔ خدا تعالیٰ کے پاس قدرت اور اقتدار دونوں ہیں۔ وہ نشو ونما دیتا ہے۔ اقتدار ہے کہ سامان نشو ونما چھیننے والوں کو اپنی گرفت میں لاتا ہے' ان کی کلائی مروڑتا ہے۔ یہ بھی خدا کی قدرت ہے۔ یہاں لفظ الآء آیا ہے کہ تم بتاؤ کون کون سی خدا کی قدرت کا انکار کرو گے۔

قرآن کریم میں لغوی اور مجازی معنی

عزیزانِ من! اب اگلی آیات میں یہ کہا گیا ہے کہ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَکَانَتْ وَرْدَةً کَالدِّهَانِ (55:37)۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کریم کے آخری دو پاروں میں' 29 ویں میں عمومی طور پہ' اور تیسویں پارے میں خصوصی طور پہ' یہ جسے ہم عذاب یا تباہی یا جہنم یا یہ کچھ کہتے ہیں' وہاں بڑی ہی تفصیل سے' چھوٹی چھوٹی آیتوں میں یہ آیا ہے' وہاں جا کر یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ ان الفاظ

کے معنی کیا ہیں اور وہی' جو میں عرض کرتا ہوں کہ ایک تو الفاظ کے وہ معنی ہیں جو لغوی ہیں۔'' عام طور پر لغات کی رو سے ہوتے ہیں مثلاً ایک تو آتش کے معنی آگ ہیں' جو جلتی ہے لیکن ایک آتش حسد بھی تو ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اسی لفظ آتش کے یہاں کیا معنی ہو جاتے ہیں۔ یہ مجازی معنی کہلاتے ہیں۔ عربی زبان میں اس کا عام استعمال تھا تو قرآن کریم میں آخرت کے متعلق جو Descriptions (تفصیلات) دی ہیں' وہ تو اس نے کہا ہے کہ کوئی آنکھ یہاں محسوس نہیں کر سکتی کہ اس کی ٹھنڈک کے لیے وہاں ہم نے کیا رکھا ہے' اس لیے وہ عالم محسوس نہیں ہے' Physical World نہیں ہے' ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہاں کیفیات کیا ہونگی لیکن بہر حال جو کچھ محسوس چیزیں یہاں ہیں' اگر یہاں نخیل کہا گیا ہے' کھجور کہا گیا ہے یا انگور کہا گیا ہے تو ضروری نہیں ہے کہ وہاں اسی قسم کی یہ کھجوریں اور یہ انار اور یہ غنام اور یہ انگور ہوں معلوم نہیں کہ مجازی طور پر وہاں کیا معنی ہونگے' اس لیے وہاں پہلے ہی یہ کہا گیا ہے کہ (13:35) جنت کی مثال یوں سمجھیے جیسے کہ............ وہ تو ساری چیزیں مثال کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔ ان پاروں میں جہاں یہ آئے گا' تو میں نے وہاں' اپنے ہاں' یہ کیا ہے کہ ان تمام الفاظ کے مجازی معنی جو عرب لیا کرتے تھے' ان کی رو سے میں نے مفہوم متعین کیا ہے' اور میرے ''مفہوم القرآن'' میں بھی وہ بات آ گئی ہے۔ پہلے دور درس میں' جب ہم قرآنِ کریم کی آخری دو سورتوں' آخری دو پاروں' پہ آئے تھے تو ہمارا خاصا وقت لگا تھا اور میں نے وہاں ان الفاظ کے مجازی معنوں میں یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اخروی نعما اور وہاں کے عذاب کی جو قرآن کریم نے تفاصیل دی ہیں' مجازی طور پہ اس کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے تو میں یہ چیزیں دوبارہ اس مقام پہ ہی لاؤں گا یہاں درمیان میں لانے سے ربط ٹوٹ جاتا ہے۔

عزیزانِ من! جسے آسمان کہتے ہیں اس کے متعلق کہا ہے کہ پھٹ جائے گا' سرخ ہو جائے گا' اس تباہی کی آتش فشانیوں کا یہ عالم ہوگا کہ فضاؤں' بلندیوں سے پھٹنے والی چیزیں یوں کریں گی جیسے سرخ پگھلا ہوا تانبا یا تیل کی تلچھٹ جو چمٹ کر چھوٹ ہی نہ سکے اور یوں ہر شے کو جلا اور پگھلا کر تباہ کر دے تو فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:38) بتاؤ کہ خدا کی کس کس قوت سے انکار کرو گے؟ یہ گرفت اس قسم کی ہے۔ آگے کہا ہے کہ فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ (55:39)۔ اگرچہ قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ ہر ایک کے ذرہ ذرہ عمل کا موازنہ ہوگا' تب وزن ہوگا اس کا ایک صلہ ہوگا' یہ بھی وہاں کہا ہے کہ یہ چیزیں تمہارے سمجھانے کی ہیں۔ وہاں کسی قسم کی تفتیش اور کسی قسم کے سوال کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی' یہ تفتیش کا پہلا حصہ جو پولیس کا ہوتا ہے وہ تو مجرم سے سوال کیا جاتا ہے' پھر اس کے ذریعے سے کچھ بات معلوم کی جاتی ہے۔ یہاں قرآن کریم کہتا ہے کہ ''قانون مکافات کی رو سے وہاں تو اس کی ضرورت ہی نہیں پیش آئے گی کہ ان سے وہ شہری ہوں یا صحرائی' سوال کر کے ہم اقرار کرائیں کہ ہم نے یہ کچھ کیا تھا''۔ اس پر کہا کہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:40) سو بتاؤ کہ تم خدا کی کس کس قوت سے انکار کرو گے۔

آج کے مخلوط معاشرے کے برعکس قرآنی معاشرے کی امتیازی خصوصیات

عزیزانِ من! دیکھیے کہ وہاں یہ صورت ہوگی کہ (55:41) مجرم تو اپنی پیشانیوں سے پہچانا جائے گا۔ وہاں مجرم شریف انسانوں سے الگ ہو جائیں گے۔ قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ ایک ایسا معاشرہ اس دنیا کے اندر قائم ہوگا جسے صحیح اسلامی نظام کہتے ہیں۔ اس کی یہ خصوصیت ہے۔ آج کے مخلوط معاشرے میں تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ جو ہمارے ساتھ چلنے والے ہیں، ہمارے دشمن ہیں یا دوست ہیں۔ یہ بڑے ہمدرد اور بڑے ناصح بن کر انسانوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اور آخر میں پتہ چلتا ہے کہ یہ ساری عمر دھوکا ہی دیتے رہے' پہچان میں ہی نہیں آ سکتے' امتیاز ہی نہیں کیا جا سکتا' شریف انسان میں اور اس قسم کے بدقماش میں۔ وہ معاشرہ یہ ہوگا کہ اس میں مجرم' شریف انسانوں سے الگ نظر آئیں گے' اس لیے ان سے دھوکا نہیں کھا سکے گا۔ یہاں کہا ہے کہ مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے۔ اس اتنی سی بات میں آپ دیکھیے کہ یہ معاشرہ کس قدر اطمینان بخش ہوگا۔ جہاں دور سے آتے ہوئے پہچانا جا سکے کہ یہ بدقماش ہے یہ شریف ہے' یہ چور ہے' یہ فریب کار ہے۔ کس قدر اطمینان میں رہے گا انسان! اس دنیا کے جنگل کے اندر' یہ ہرن اور بکریاں ان کے ساتھ ہی بھیڑیئے اور شیر ہیں۔ یہ بکریاں یہ ہرن کس طرح سے زندہ رہتے ہیں؟ یہ اس لیے کہ انہیں دور سے ہی پتہ ہوتا ہے کہ بھیڑیا ہے۔ اگر وہاں ساری بکریاں ہی ہوں اور بکریاں بھی ایسی ہوں کہ یہ بھیڑیئے کی طرح دوسروں کی طرح کھا جائیں تو کوئی بکری باقی ہی نہ بچے۔ وہاں فطرت نے خود ان کے اندر یہ امتیاز رکھا ہے۔ ساری بات ہی یہ ہے کہ انسانوں کی دنیا میں بات تو وہی کرتا ہے جو وہاں سے' یہاں انسانوں کو خود یہ کچھ کرنا پڑتا ہے یعنی اس نظام کو یہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ کہا ہے کہ وہاں نظام وہ ہوگا جس میں مجرم دور سے پہچانا جائے کہ یہ بھیڑیا آ رہا ہے' یہ بکری یا ہرن نہیں ہے۔

(55:41) میں کہا ہے کہ مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانا جائے گا۔ جب یوں پہچانا جائے گا تو پھر اس کی گرفتاری میں تو کسی قسم کی دقت ہی نہیں ہوگی' وہ پکڑا جائے گا، اس کا بند بند گرفت میں ہوگا۔ دیکھیے پھر وہی بات آ گئی فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:42) سو بتاؤ کہ خدا کی کس کس قوت سے انکار کرو گے؟ ان مجرمین سے کہا جائے گا کہ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ (55:43) یہ ہے وہ جہنم جس کے متعلق تم کہتے تھے کہ ہمیں کون پکڑنے والا ہے' کون ہے جو ہمارے اس جرم کی سزا دے سکے گا۔ دیکھیے! کس مزے میں گزر رہی ہے ہماری' ہمیں تو کوئی نہیں پکڑ رہا۔ اس دنیا میں بھی جب وہ صحیح نظام ہوگا تو اس میں یہ کیفیت نہیں ہوگی کہ کوئی یہ کہہ سکے کہ صاحب! دیکھیں ہمیں کون پکڑ سکتا ہے' اور کون سزا دے سکتا ہے۔ کہا ہے کہ: هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ (55:43) یہ ہے جہنم جسے تم جھٹلایا کرتے تھے اور آج یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَبَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ (55:44)۔ ایک طرف آگ کا ایسا عذاب' دوسری طرف کھولتا ہوا پانی۔ ان دونوں کے درمیان' ان کی کشتِ عمل جھلس رہی ہوگی۔ یہ اس کے اندر ہوں گے۔ قرآن کریم نے جہنم کے پانی کی

جومثال دی ہے' وہ بڑی عجیب مثال ہے' آپ کو معلوم ہے کہ کھیتوں کے لیے پانی لازمی چیز ہے' اس پانی کے بغیر کھیتی کی زندگی نہیں ہوتی' وہ پنپ نہیں سکتی' بڑھ پھول پھل نہیں سکتی' نشوونما نہیں پا سکتی لیکن اگر پانی کھولتا ہوا ڈال دیا جائے' تو وہی پانی اس کے لیے ہلاکت کا موجب ہو جاتا ہے اور اگر شدت کی سردی ہو' برف کی قسم کا پانی ہو' وہ بھی اس کو جلا دیتا ہے' یہ عجیب بات ہے۔ قرآن کریم جب کہیں پہ ان چیزوں کی مثال دیتا ہے تو جہنم کو کہا ہے کہ یہ کھولتا ہوا پانی ہے جو کھیتوں کو جھلسا کر رکھ دیتا ہے۔ کہیں کہا ہے کہ یخ بستہ پانی ہے' وہ بھی کھیتوں کو جلا کر رکھ دیتا ہے۔ جب وہاں یہ چیزیں آئیں گی تو میں عرض کروں گا کہ کہاں اس نے کھولتا ہوا پانی کہا ہے' کہاں اس نے اسے یخ بستہ کہا ہے' ان دو پاروں میں بڑی دلچسپ تفصیلات آتی ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ وہ جہنم کی آگ کھولتا ہوا پانی ہے۔ یہ ساری چیزیں تشبیہات کے طور پر' مثالوں کے طور پر' بیان کی گئی ہیں۔ ان سے مقصد یہی ہے کہ نشوونما رک جاتی ہے' بیج وہ کچھ نہیں بن سکتا جو کچھ بننے کی صلاحیت اس کے اندر ہوتی ہے۔

جسم انسانی کے اندر انسانیت کے بیج کی قدر ومنزلت

عزیزانِ من! وہ ساری چیز تھی' جتنی بھی جنت اور جہنم کی ہے' اس کو اقبالؒ (1938-1977ء) نے دو لفظوں میں' ایک مصرع میں' کہہ دیا ہے کہ قرآن مجید کرتا کیا ہے:

آنچہ حق می خواہد آن سازد ترا

جو کچھ خدا چاہتا ہے کہ تُو بن جائے' قرآن مجید تجھے وہ بنا دیتا ہے۔ یہ بڑی خوبصورت چیز ہے۔ کسان کیا چاہتا ہے؟ اپنا بیج جب مٹی میں ملا کر آتا ہے تو یہی چاہتا ہے کہ یہ اتنا اتنا بڑا ہو گا' گیہوں ہو گا' اتنی بوریاں بھریں گی' یہ گھر میں آئیں گی۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ وہ کچھ ہو جائے۔ انسان کے اندر بھی اس قسم کی انسانیت کا ایک بیج رکھ دیا گیا ہے جسے اس کی ذات کہتے ہیں۔ اس کی نشوونما کی ضرورت ہوتی ہے تو قرآن مجید تمہیں وہ بنا دیتا ہے جو کچھ خدا چاہتا ہے کہ تم بن جاؤ۔

یہ تو جہنم کا ذکر آیا اور اس پر کہا ہے کہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:45) تم ان حقائق پر غور کرو اور بتاؤ کہ تم خدا کے قانونِ مکافات کی کون کون سی قوت کو جھٹلاؤ گے؟ اس کے بعد دوسرا مقام ہے' جہاں بڑی تفصیل ہے' کہا ہے کہ وَلِمَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (55:46) وہ مقام یہ ہے کہ جو قوانین خداوندی کے ماتحت رہتا ہے' ان کی خلاف ورزی سے ڈرتا ہے کہ تباہی آ جائے گی' کھیتیاں جھلس جائیں گی' اس کے ہر عمل کے متعلق باز پرس ہو گی' اسے احساس ہے کہ انسان کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہیں رہے گا' وہ خطرناک گھاٹیوں سے بچتے ہوئے زندگی بسر کرے گا۔ اس کے لیے دو جنتیں ہونگی: ایک جنت اس دنیا میں اور دوسری جنت آخرت میں۔ اس کی یہ کیفیت ہے۔ پھر یہاں مقام یہ ہے کہ "رَبِّهٖ" آیا ہے۔ اس آیت میں آپ دیکھیں گے کہ قرآن مجید ربوبیت پر زور دیئے چلا جا رہا ہے۔ خدا کے مقام کا تو ترجمہ ہی نہیں ہو سکتا۔

عزیزانِ من! میں نے اپنے ہاں ''مفہوم القرآن'' میں بھی بہت غور کیا تھا کہ جو مقام ہے' اس کا کوئی اور ترجمہ مل جائے کہ اس کا ''مقام'' کیا ہے۔ جو خدا کے ''مقام'' سے محتاط ہے' اس کے لیے اب یہاں سے یہ بات شروع ہوئی' جو میں کہہ رہا تھا۔ آپ کو یاد ہے' میں شروع سے کہہ رہا ہوں کہ سارے قرآن مجید میں یہ چیز ہے کہ اگر اس کے مطابق معاشرہ قائم کیا جائے تو جنت یہیں سے شروع ہو جاتی ہے جیسے یہیں سے جہنم شروع ہو جاتی ہے تو میں نے کہا کہ گو ہم اپنے آپ کو یہ نہ سمجھیں کہ ہم جہنم میں ہیں۔ جہنم کے اندر تو ہم ہر وقت ہوتے ہیں' وہ جنت یہاں ہم نے دیکھا ہی نہیں ہے اس لیے اسے وہیں یعنی آخرت کے متعلق سمجھتے ہیں۔

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں دو جنّتوں کا ذکر کیا ہے

عزیزانِ من! غور فرمائیے' یہاں بھی جو خدا کے اس ''مقام'' سے محتاط رہتا ہے' اس کے لیے دو جنتیں ہیں۔ کہیے یہ دو جنتیں کیا ہیں؟ یہ کہ ایک جنت ارضی ہے' اسی دنیا کے اندر' اس کے قانون کے مطابق صحیح معاشرہ قائم ہو جائے۔ اس معاشرے کے اندر جو زندگی بسر کی جاتی ہے' وہ جنّتی زندگی ہے اور پھر مرنے کے بعد یہی جنّتی زندگی ساتھ چلی جاتی ہے' وہ وہاں کی جنت ہے۔ قرآن کریم نے جنتٰن کہا ہے اور پھر کہا ہے کہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:47) یہ آسائشیں اور نعمتیں بھی اس کی قدرت کے کرشمے ہیں' سو بتاؤ کہ تم ان سے کس کس کو جھٹلاؤ گے۔ یہاں پھر اسی طرح سے وہی فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:47) کی بات آ گئی پھر آ گے وہی جنتٰن کے متعلق کہا ہے کہ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ (55:48) ان کا یہ جنّتی معاشرہ ہے۔ یہ یہاں اور وہاں مختلف علوم وفنون کا مرکز ہوگا۔

عزیزانِ من! آج میں شاید یہاں تک ہی رہ سکوں گا۔ یہ عجیب چیز ہے' یہی چیز نہیں ہے کہ وہ ایک جامد سی چیز ہے' کہ روزانہ کھجوریں کھانے کو ہونگی' وہی پانچ سات چیزیں جو گنائی گئی ہیں کہ انگور کھانے کے لیے' دودھ پینے کے لیے' شہد کی نہریں ہیں۔ ارے پانچ چار دن کسی کو ایسا کچھ دیا جائے تو آدمی کی طبیعت اکتا جاتی ہے' آدمی روز مرغی نہیں کھا سکتا' بور ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی ایک جامد جنت جو بتایا گیا ہے' تو یہی چیزیں ہیں' اس نے ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔ صبح اٹھے' تے گوشت گوبھی' رات نو ہووے تو گوبھی گوشت' کہا کہ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ (55:48) فن تو آپ نے سنا ہوگا اور فنون بھی۔ آپ نے علوم وفنون تو سنے ہونگے' اسی فنان کی جمع ہے۔ یہ جامد قسم کی نہیں ہے' بچے بھی ایک کہانی سناؤ' امی جان انہیں رات کو ایک ہی کہانی سنائیں تو وہ بھی بور ہو جاتے ہیں۔ انسان Change (تغیر) چاہتا ہے' تھوڑا سا بور کرنے والا ٹی وی پہ کوئی پروگرام آتا ہے تو میں بچوں کو دیکھتا ہوں کہ اٹھ کر چلے جاتے ہیں کہ نہیں' کچھ نہیں ہے' ربوبیت کی یہ کیفیت ہے مگر یہاں کہا ہے کہ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ (55:48) وہ ہر قسم کے فنون کی ایک دنیا ہوگی' بس اس کے لیے میں کیا الفاظ دوں! اصل میں ان کے ہاں فن کہتے ہیں کہ یہ جو خزاں کے بعد شاخیں نکلتی ہیں تو اگر ہر نئی شاخ میں نئے قسم کے پھول آئیں تو ان کو وہ فنون کہتے ہیں۔ یہاں

کہا ہے کہ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ (55:48) جو بور کردے گی' یہ ایک ہی چیز نہیں ہے جو صبح شام ملے' ساری زندگی وہی ملے' وہ تو ہر آن میں ایک نئی شان رہتی ہے۔ کہا ہے کہ اس قسم کی جنت ہوگی' اس کے اندر فنون ہونگے۔

عزیزانِ من! یہاں اگلے دن یہ بات چلی ہوئی تھی کہ صاحب! کرکٹ کے اوپر پابندی لگایئے' یہ بھی حرام ہے۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ یہ کئی دن چلتی ہے تو شاید بور کردینے والی ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ ذَوَاتَـآ اَفْنَانٍ (55:48) یہ جامد قسم کی' بور کردینے والی قسم کی' جو چیز ہے یہ وہ جنت نہیں ہے۔ زندگی تو ہر آن ایک تغیر چاہتی ہے' ایک تغیر کے بعد باہر کی دنیا کے اندر بشرطیکہ خداوندی حدود کے اندر وہ چیزیں رہیں' ہر قسم کے فنون' ہر قسم کے علوم' ہر قسم کی Changings (تغیرات) یہ جنت ہے۔ ذَوَاتَـــــآ اَفْنَانٍ (55:48) کہا ہے کہ آپ جنتیں پر غور کیجیے کس طرح سے اس نے یہاں کی جنت اور وہاں کی جنت دونوں بتا دیں اور پھر ذَوَاتَآ اَفْـنَـانٍ کہا کہ وہاں فنون' اس قدر تغیرات میں' وہاں ہر لمحہ کی کیفیت ہے کہ ایک تماشا نگاہوں کے سامنے ہے تو کہا ہے کہ فَبِـاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّـکُـمَـا تُکَذِّبٰنِ (55:49) یہ اس کی قدرت کے کرشمے ہیں' سو بتاؤ کہ تم کس کس کو جھٹلاؤ گے۔ اب آئی بات جنت کی جس کی تفصیل آگے چلی آرہی ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ الرحمٰن کی آیت 49 تک ہم آ گئے ہیں' 50 ویں آیت سے اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀❀............❀❀............❀❀

پانچواں باب: **سورۃ الرحمٰن** (آیات 50 تا 59)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جنوری 1983ء کی 4 تاریخ ہے اور درس قرآن کا آغاز سورۃ الرحمٰن کی آیت 50 سے ہو رہا ہے: (55:50)۔

خدائے حکیم کی طرف سے عطا کردہ دو جنتوں کا تفصیلی ذکر

آپ کو یاد ہو گا کہ سابقہ آیات میں رزق کی آسائشوں اور نعمتوں کا ذکر چلا آ رہا ہے اور یہ بھی آپ کو یاد ہو گا کہ اس میں دو جنّتوں کا ذکر ہے۔ کہا ہے کہ مَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (55:46) اس درس میں تو آپ کو شروع سے معلوم ہو گا کہ میں کہتا چلا آ رہا ہوں کہ جنت اور جہنم کی زندگی یہیں سے شروع ہو جاتی ہے اور اس کے بعد پھر اخروی زندگی پر تو ہمارا ایمان ہے اور وہاں کی جنت اور جہنم ایک حقیقت ہے اور اس پر ہمارا ایمان ہے۔ یہ نہیں ہے کہ یہ وہیں کی بات ہے، یہاں کی بات نہیں ہے۔ میں اسی لیے جہاں جنت کا ذکر آتا ہے یا جہنم کا آتا ہے، تو اسے جنت کہنے کی بجائے جنّتی زندگی کہا کرتا ہوں، جہنّمی زندگی کہا کرتا ہوں۔ آپ غور کریں گے تو اس میں فرق نظر آئے گا۔ آپ جنت اور جہنم کہیں گے تو ایک مقام ہمارے ذہن میں آئے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم محسوسات کے خوگر، محدود ذہن رکھنے والے انسان ہیں۔ جب تک محسوس طور پر کوئی چیز سامنے نہ آئے، انسان اس کا تصور نہیں کر سکتا لیکن جب ہم جنت اور جہنم کہیں گے اور اس

کو ایک مخصوص مقام سے تعبیر کیا جائے' تو اس کا مقصد کچھ اور ہو جاتا ہے اور ویسے ہی قرآن حکیم نے تو جنت کے متعلق کہا ہے کہ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ (13:35) یہ سارے بیانات تمثیلی ہیں۔ اس کی جگہ اگر آپ جنّتی زندگی کہیں تو یہاں تو خیر بات ہماری سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی' جنّتی زندگی کبھی ہمارے نصیب میں ہی نہیں' جہنمی زندگی کہنے سے تو بات سمجھ میں آ سکتی ہے۔ وہ جو اس نے کہا ہے کہ جہنم وہ ہے جس کی آگ کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں' کوئی ہی سعادت مند فرد ایسا ہوگا جس کے دل کو ان شعلوں نے نہ لپیٹا ہو؟ جہنمی زندگی کہنے سے بات بن جاتی ہے۔ اگر کہیں سعادت مندی ہوئی اور وہ جنّتی زندگی کی بھی جھلک آ گئی' بات سمجھ میں آ جائے گی۔ بہر حال زندگی کی اس کیفیت کو جنّتی زندگی کہنے سے مفہوم سمجھ میں آ جاتا ہے تو کہا یہ ہے کہ جنّتی زندگی یہاں کی ہے اور اس کے بعد آخرت کی ہے۔ قرآن حکیم میں جنت کے متعلق جن چیزوں کا ذکر آئے گا وہ اس دنیا کی جنت کی زندگی سے متعلق بھی ہوگا اور پھر آخرت کی جنت کے متعلق بھی۔ اس فرق کو سامنے رکھنے سے بہت سی چیزیں واضح اور صاف ہو جاتی ہیں۔

اب جنت کی زندگی میں' میں نے عرض کیا ہے کہ جب خدا نے خود دو جنّتین کہا ہے تو پہلے اسی دنیا کی جنت کو لے لیتے ہیں اور پھر اس کے بعد اگلی زندگی کو جس کے متعلق اس نے کہا ہے کہ ہم نے تمثیلاً بیان کیا ہے۔ اس سے مطابقت رکھتے ہوئے اس کا بھی کوئی تصور ذہن میں کیا جا سکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس زندگی کے اندر کیا چیز پہلے بتائی ہے۔ کہا ہے کہ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ (55:50) قرآن حکیم کے اندر جہاں جہاں ان دونوں جنّتوں کا ذکر آتا ہے' تو وہاں ضمائر بھی دونوں کی آئیں گی' فعل بھی دونوں کے آئیں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ باقی زبانوں میں تو واحد اور جمع یعنی Singular & Plural دو ہی ہوتے ہیں مگر عربی زبان میں تین ہوتے ہیں: واحد ہوتا ہے ایک کے لیے ہے' تثنیہ ہوتا ہے دو کے لیے' پھر جمع ہوتا ہے اس دو سے زیادہ کے لیے۔ یہ جو دو جنتیں بتائی ہیں تو یہاں یہ جنّتین بھی ہیں' ضمیریں آئیں گی' ضمائر (Pronouns) آئیں گے یا Verbs (فعل) آئیں گے تو وہ تثنیہ کے آتے ہیں کیونکہ دو جنتوں کا ذکر آ رہا ہے' دونوں کے متعلق یہ چیز آئے گی جو قرآن حکیم کہتا ہے۔ پہلے جہنم آئے گا' تو اس کا ذکر بھی ہم قریبی جہنم سے کریں گے' یہاں کی جنت کے متعلق بھی بات ہوگی' تو اس میں پانی کا ذکر عام طور پہ آئے گا آپ اسے بھی ذہن میں رکھیے۔

صحرائے عرب میں پانی کی دستیابی کی قدر و منزلت

قرآن حکیم کی سب سے پہلی مخاطب قوم عرب کی قوم تھی جو ریگستان میں زندگی بسر کرتی تھی۔ اب بھی اس کو صحرائے عرب ہی کہتے ہیں۔ وہاں سارے ملک میں تین چار ہی تو ساری بستیاں ہیں جنہیں آپ شہر کہہ لیجیے۔ وہ شہر بھی اب بن گئے ہیں جب وہاں زمین سے یہ بہنے والا سونا نکلا ہے ورنہ وہ شہر بھی ہمارے کچھ گاؤں یا قصبوں جیسے ہی شہر ہوتے تھے' باقی ساری زندگی ریگستان کی' صحرا کی' زندگی

ہوتی تھی' کہیں پانی نکلتا تھا تو وہاں دو چار درخت ہوتے تھے جسے وہ نخلستان کہتے تھے۔ اس کو وہ باغ کہتے تھے' جنت کہتے تھے۔ وہ وہاں جا کر ڈیرہ لگا لیتے تھے' جب تک پانی رہا وہاں رہے' پانی ختم ہوا' خانہ بدوش' گھر کو کندھوں پہ رکھا' پھر چلے گئے' ہر صبح سفر' ہر شام سفر' یہی ان کی زندگی کی سب سے اہم شے تھی' ویسے بھی زندگی کا مدار پانی پر ہے اور قرآن حکیم نے تو جب زندگی کی ابتدا کی ہے تو کہا کہ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (21:30) پانی سے ہی ہم نے ہر جاندار چیز کو پیدا کیا' تو زندگی کا مدار پانی پر ہے۔ اور جب ایسے مقامات ہوں جہاں پانی کہیں دور دور تک نہ ملتا ہو تو وہاں تو پانی کی قدر و قیمت کا ہم اندازہ ہی نہیں لگا سکتے کہ پانی کی قیمت کیا ہے۔ اس کا اندازہ تو وہ لگاتے تھے' اس کی ایک مثال سنیے۔ ایک بدو ایک دفعہ ایک اتنا سا مشکیزہ سر پہ اٹھائے ہوئے چلا آ رہا ہے' پتہ نہیں کتنے سو میلوں سے ہارون رشید کے دربار میں آیا۔ لوگوں سے کہا کہ مجھے وہاں تک پہنچنے دیجیے' بادشاہ نے بھی کہا کہ ہاں آنے دیجیے' دیکھتے ہیں کہ یہ اتنی دور سے آیا ہے' وہ کیا لے کر آیا ہے' وہ وہاں گیا تو اس نے مشکیزہ نکال کر اس سے کہا کہ حضور! یہ چشمے میں ایسا صاف اور شفاف پانی تھا کہ میرا جی نہیں چاہا کہ میں خود پیوں اور خلیفۃ المسلمین اس سے محروم رہ جائیں' تو میں وہ پانی اس مشکیزے میں بھر کر آپ کے لیے لایا ہوں۔ ان کی یہ چیز تھی تو کہا یہ ہے کہ ان میں ان جنّتوں کے اندر فِيهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ (55:50) ان میں پانی کے چشمے ہونگے۔ خود یہ چشمہ ہی ہوتا ہے جس میں سے پانی نکلتا ہے' جاری رہتا ہے' یہ خصوصیت اس کے ساتھ چلی ہے۔ یہ ہے تَجْرِيٰنِ (55:50)۔

پانی کے چشموں کی خصوصیت

عزیزانِ من! ایک تو یہ چشمے ہیں جو بہنے والے چشمے ہیں' ایک یہ کنواں ہوتا ہے' یہ کھودا جاتا ہے اور اس میں سے پانی نکلتا ہے۔ ان عربوں کے ہاں بعض چشمے بھی اتنے چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے کہ ان کا پانی ایک ہی جگہ رہتا ہے اور اسی کو خصوصیت سے استعمال کرتے تھے۔ یہاں فِيهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ (55:50) میں کہا گیا ہے کہ یہ چشمے جاری ہونگے' ان میں جاری رہنے والا پانی ہوگا یعنی جنکا بہنے والا پانی ہوگا ایک مقام پہ اسے مسکوب کہا ہے کہ وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ o وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ (56:30-31)۔ مسکوب وہ پانی ہے جسے جگر پاش مشقتوں سے زمین کھود کر نہ نکالنا پڑے بلکہ وہ خود بخود اوپر چلتا آئے' بہتا چلا آئے یعنی مسکوب کہہ کر خصوصیت یہاں بھی یہ بتائی ہے کہ یہ وہ پانی ہے جو خود بخود بہتا چلا جائے' جاری رہے' اسے ہمارے ہاں چشمہ جاریہ بھی کہتے ہیں یعنی جاری رہنے والا۔ یہاں جاری رہنے والے کی خاص طور پہ بات کیوں کی گئی؟ اس لیے کہ اس کے مقابلے میں یہاں ایک زندگی اس کے برعکس بھی بتائی گئی تھی۔

دعویٰ اسلام کا لیکن روٹی کے چند ٹکڑوں کی محتاجی

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سی زندگی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ (107:1)۔ یہ بڑی مشہور

سورۃ الماعون ہے کہ کیا تُو نے اس کی حالت پر بھی غور کیا ہے جو دین کا اقرار تو کرتا ہے لیکن عملاً اس کو جھٹلاتا ہے۔ اگر اس کا اقرار نہ کرے تو پھر ایسی فریب دہی نہیں ہوسکتی۔ یہ تو اس دین کو مانتا ہی نہیں ہے لیکن مردم شماری کے خانے میں تو مسلمان لکھا جائے اور عملی زندگی' اسلام کو جھٹلا رہی ہو' اسے کہتے ہیں ''تکذیب دین کرنا'' اقرار تو کرنا لیکن عملی زندگی میں اس کو جھٹلانا' دوسرے یہ کہیں کہ اچھا یہی ہے وہ اسلام' جس کا نمونہ یہ لوگ چلتے پھرتے ہیں' روٹی مانگنے کے لیے بھی' ہمارے ہاں آتے ہیں' اور دعویٰ یہ ہے کہ دنیا بھر کی مشکلات کا حل اس اسلام کے اندر ملتا ہے۔ یہ ہے تکذیب۔ کیا دین کی محسوس شکل کوئی اور بھی ہے؟ یہاں تو کہا ہے کہ اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ (107:1) کیا تم نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا ہے جو زبان سے تو اسلام کا اقرار کرتا ہے لیکن عملاً دین کی تکذیب کرتا ہے یعنی اس کا طرزِ عمل اس امر کی دلیل ہے کہ اگر دینداری یہی ہے جس کا مظاہرہ اس کے اعمال سے ہوتا ہے تو پھر دین کا ہر دعویٰ جھوٹا ہے۔ یہ بڑی عجیب سورۃ ہے اور کئی دفعہ یہ سامنے آچکی ہے' دین کی تکذیب میں کیا کیا باتیں اس میں کہی گئی ہیں؟

تکذیب دین کی عملی شکل

اس سورۃ الماعون میں کہا گیا ہے کہ فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ (3-2 :107)۔ اس میں دو چار باتیں ساتھ ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اگر کوئی معاشرے میں تنہا رہ جاتا ہے' اس کا جتھہ نہیں ہوتا' پارٹی نہیں ہوتی' اس کی گروہ بندی نہیں ہوتی تو برادری نہیں ہوتی' اس کو دھکے دیتا ہے۔ تکذیب دین کی یہ پہلی چیز ہے اور پھر جس کا کہیں چلتا ہوا کاروبار رک جاتا ہے' کسی طرح سے وہ حرکت سے ساکن ہوجاتا ہے تو اس کے رزق کا انتظام نہیں کرتا' اور کہیں یہ کہتا نہیں ہے کہ اس کی مدد کرنی چاہیے۔ تو یہ دین کی تکذیب کرتا ہے اور بات آگے بھی ہے کہ فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ o الَّذِیۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ (5-107:4) نمازیں پڑھتا ہے' نماز کے مقصد کو پس پشت ڈال رکھتا ہے اور الَّذِیۡنَ هُمۡ یُرَآءُوۡنَ (107:6) نماز اس چیز کو سمجھتا ہے جسے لوگ دیکھ لیں کہ قیام میں ہے' رکوع میں ہے' سجود میں ہے' اللہ اکبر کانوں تک ہاتھ لے جا کر کرتا ہے' آمین اونچی آواز سے کرتا ہے۔ هُمۡ یُرَآءُوۡنَ (107:6) یہ جتنی چیزیں دیکھی جاسکتی ہیں' لوگ دیکھتے ہیں کہ یہ ہے یہ نمازی' اس وقت اس کی نماز ہوتی ہے لیکن کرتا کیا ہے؟ کہا کہ وَیَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ (107:7) اس پانی کو' جو بہتی ہوئی ندی کی طرح' ہر ضرورت مند کے آگے پکارتا ہوا چلا جائے کہ جس کو ضرورت ہے' لے لے' وہ اسے بند لگا کر اپنے لیے محفوظ کر لیتا ہے۔ یہ ہے جو تکذیب دین کرتا ہے۔ جن چیزوں پہ زندگی کا مدار ہے اور جسے خالقِ کائنات نے تمام انسانوں کے لیے ہی نہیں' بلکہ پوری خلق کے لیے وَضَعَهَا لِلۡاَنَامِ (55:10) کہا ہے کہ ہر متنفس کے لیے اس کی زندگی کا جو سامان اس نے پیدا کیا ہے وہ مفت دیا ہے' بلا معاوضہ دیا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ اسے ہر ایک کی ضرورت کے لیے کھلا رکھا

جائے' یا اسے بند لگا کر اپنے لیے مخصوص کرتا ہے' دوسروں کو اس سے محروم کر دیتا ہے۔ یہ ہے تکذیب دین۔ دین میں بھی وہ یہ کرتا ہے کہ نمازیں بہت پڑھتا ہے۔

عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن حمید نے جو تَجْرِيٰنِ (55:50) ساتھ کہا ہے کہ پانی کے چشمے وہ ہیں جن کے آگے کوئی بند نہیں لگائے گا' وہ کھلے رہیں گے' بہتے چلے جائیں گے۔ وہ یہی چشمے ہیں جن کو سلسبیل کہا جاتا ہے۔ سلسبیل یعنی چلتا ہوا' آوازیں دیتا ہوا' جارہا ہے کہ جس کو ضرورت ہے' پانی لے لو۔ کیا مرکب لفظ بنایا ہے کہ خود آوازیں دیتا جاتا ہے۔

جنتی معاشرے کی پہلی خصوصیت محنت اور مشقت میں فرق

اس قسم کی چیز میں بات تو پانی کی ہو رہی ہے لیکن ہر وہ شے جس پہ زندگی کا مدار ہے' اسے بہتے ہوئے چشمے کی طرح جاری' آب رواں' رہنا چاہیے کہ ہر ضرورت مند اپنی ضرورت کے مطابق اس میں سے لیتا چلا جائے۔ یہ نہیں ہے کہ جس میں کچھ تھوڑا سا زور ہو' وہ اس پہ بند لگالے' اپنے لیے اس کو مخصوص اور محدود کر دے اور دوسروں کو اس سے محروم کر دے۔ یہ چیز نہیں ہوگی۔ یہ جو جنّتی زندگی بتائی ہے' اس زندگی میں جنتی چیزیں ایسی ہیں' جن پہ زندگی کا مدار ہے' ان پہ کوئی شخص بند لگا کر انہیں اپنے لیے مختص نہیں کر لے گا' وہ ہر ایک کے لیے کھلے بندوں جاری رہے گی' ہر ایک کی دسترس میں رہے گی' ہر شخص اس سے اپنی ضرورتیں پوری کرے گا۔ اس جنت کی پہلی چیز یہ بتادی۔ اس نے جنت کے متعلق یہ کہا ہے اور مسکوب کا لفظ استعمال کیا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ابھی بڑی عجیب چیز یہ ہے کہ اس میں بڑی مشقت کے ساتھ زمین کھود کر اسے نکالنا نہیں پڑتا اور پھر آپ جانتے ہیں کہ وہ صحرائی زمین یا اس قسم کی زمین جس میں پانی کتنا نیچے جا کر ہوتا ہے وہاں سے کھود کر پانی نکالنے میں کتنی مشقت طلب بات ہوگی۔ محنت اور چیز ہوتی ہے' مشقت اور چیز ہوتی ہے۔

سورۃ طٰہٰ میں وہی آدم کا قصہ ہے۔ اس میں یہ باتیں پہلے ہی آچکی ہیں کہ یہ ابلیس اور شیطان کیا ہے؟ وہی ابلیسیت ہے جس میں بہتے ہوئے پانی پہ بند لگا دینا ہے۔ یہ ابلیسیت ہے کہ وہ یہ کرے گا فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ (20:117) تمہیں یہ جنّتی زندگی سے محروم کر دے گا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ کہ فَتَشْقٰى (20:117) تمہیں مشقتیں اٹھانی پڑیں گی' تمہیں زندہ تو رہنا ہی ہے' ہر شخص نے کسی طرح سے روٹی تو کمانی ہے۔ یہ بڑی عجیب آیات ہیں (20:117-119) کہا کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰىۙ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى (20:118-119) جنّتی زندگی میں یہ کیفیت ہے کہ اس میں نہ بھوک ستا سکتی ہے' نہ پیاس' نہ موسم کی سردی اور گرمی۔ یہ تمام چیزیں' جنتی ہیں' ان کے لیے یہاں کوئی چیز مشقت طلب نہیں ہوتی۔ اگر اس میں' اس جنّتی زندگی سے تمہیں محروم کر دیا یا تم اپنی مفاد پرستیوں کی بنا پر محروم ہو گئے تو فتشقٰی (20:117) انہی چیزوں کے لیے تمہیں مشقتیں اٹھانا پڑیں گی۔

نزولِ قرآن کا نکتۂ ماسکہ

میرا خیال ہے کہ اس سورۃ طٰہٰ کی جو دوسری ہی آیت ہے‘ اس میں یہ ہے کہ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤی (20:2) ہم نے قرآن مجید کو اسی لیے نازل کیا ہے کہ تمہیں ان چیزوں کے لیے مشقتیں نہ اٹھانی پڑیں‘ تجھ پر زندگی بارگراں نہ بن جائے اور یہاں یہ کہا گیا ہے کہ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَ لَا یَشۡقٰی (20:123) جو ہمارے قوانین کا اتباع کرے گا اس کی نہ تو محنت رائیگاں جائے گی اور نہ اسے ان ضروریات زندگی کے لیے جگر پاش مشقتیں اٹھانا پڑیں گی اور اس کے برعکس وَ مَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیۡشَةً ضَنۡکًا (20:124) جو ان قوانین سے گریز کرے گا‘ پہلوتہی کرے گا‘ منہ موڑے گا‘ اعراض برتے گا‘ اس کی معیشت‘ اس کی روزی‘ تنگ ہو جائے گی۔ وَّ نَحۡشُرُهٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ اَعۡمٰی (20:124) اور یہاں اس کی روزی تنگ ہو جائیگی اور ظہور نتائج یعنی قیامت کے دن بھی اسے اندھا اٹھایا جانے لگا جو یہاں ذکر ہے‘ تو آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن حمید کے نزدیک اس دنیا کا اور اگلی زندگی کا آپس میں کتنا گہرا تعلق ہے کہ یہاں جو یہ کہا تھا کہ یہ دو جنتیں ہیں: ایک یہاں کی ایک وہاں کی۔ وہ یہاں کی‘ جو زندگی ہے جس میں جگر پاش مشقتیں ہیں‘ جو رزق ہے اس پہ کہا کہ مَعِیۡشَةً ضَنۡکًا (20:124) وہ جو رزق کی تنگی ہو جاتی ہے‘ اس سے مشقتیں اٹھانا پڑتی ہیں‘ تو یہ یہاں کی زندگی بھی جہنم ہو جاتی ہے اور جس کی یہاں کی زندگی جہنمی ہے‘ وہاں کی زندگی بھی جہنمی ہوگی۔ یہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرے محتاجی اور محرومی کی زندگی بسر کرے اور اسکے بعد مطمئن ہو کہ کوئی بات نہیں‘ یہاں یہ چار دن کی زندگی ہے‘ اس طرح سے جس طرح سے ہوتا ہے‘ گزارا کر لیجیے‘ بس اگلی زندگی کے لیے ہم نے آنکھیں بند کیں اور ہم جنت کے اندر چلے گئے۔ وہ کہتا ہے کہ مَنۡ کَانَ فِیۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰی فَهُوَ فِی الۡاٰخِرَةِ اَعۡمٰی (17:72) یہاں کا اندھا وہاں کا بھی اندھا ہوگا۔ یہ اس لیے ہے کہ وہ زندگی کو مسلسل قرار دیتا ہے‘ کہتا ہے کہ یہ ایک ہی زندگی ہے‘ ایک ندی چلی آ رہی ہے‘ پہلے ہمارے سامنے آتی ہے‘ پھر وہ باغ کی باڑ کے نیچے سے باغ میں داخل ہو جاتی ہے‘ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہے زندگی وہی ہوتی ہے‘ جو آب رواں کی طرح‘ ندی کی طرح‘ آگے چلتی ہے۔ زندگی ایک مسلسل ندی کا نام ہے‘ جس قسم کی یہاں زندگی بسر ہو رہی ہے اسی قسم کی زندگی وہ آگے جا کر بسر ہوگی۔

جہنمی زندگی میں اطمینانِ قلب کا حصول ایک واہمہ ہے

کسی اتفاقیہ Accident (حادثے) کی وجہ سے‘ چلتے ہوئے کسی گڑھے میں گر جانا اور بات ہے لیکن گڑھے میں گرنے کے بعد مطمئن ہو جانا کہ اصل زندگی یہی گڑھے کی ہے‘ یہ باہر کی زندگی نہیں ہے‘ یہ ہے وہ چیز جو قرآن مجید کہتا ہے کہ اس چیز کو‘ اس زندگی کو‘ جو

محتاجی اور محرومی، مسکینی اور رزق کی تنگی کی زندگی ہے، اس پہ مطمئن ہو جانا اور اس سے نکلنے کی کوشش نہ کرنا، یہ ہے جہنمی زندگی اور یہاں تو معاملہ اس کے الٹ ہے۔ یہی نہیں ہے کہ اس زندگی پہ مطمئن ہو جاتے ہیں، پہلے تو روایات میں بھی آپ دیکھیے تو یہ دنیا جیل خانہ ہے، جس میں مومن پھنسا ہوا ہے، اس دنیا میں مومن کی حالت یہ ہے جیسے پانی سے باہر مچھلی کی حالت ہوتی ہے، دنیا ایک لاش ہے اور اس کے چاہنے والے کتے ہیں، یہ سارا کچھ ہے۔

ترکِ دنیا کی آرزو کو بھی ترک کرنا اور قرآنِ کریم کی دو جنّتیں

جب تصوف میں آیئے تو پھر پوچھیے ہی نہیں! اس میں تو سارا دارومدار ہی ترک کے اوپر ہے، ترکِ دنیا، ترکِ آرزو، ترکِ ترک، ارے صاحب! یہ ہر آرزو کا ترک ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ جو آرزو ہے یہ بھی تو ایک آرزو ہے کہ میں اس چیز کو چھوڑ دوں، اسے بھی ترک کروں تو بدھ مت کا نروانا جسے کہتے ہیں بات اور چلی جائے گی یعنی دل میں یہ آروز و خواہش بھی نہ پیدا ہو کہ مجھے یہ چیز چھوڑ دینی چاہیے، ایسی زندگی ہو جبکہ یہاں قرآن کریم دونوں کو جنّتٰن کہہ رہا ہے۔ یہاں دنیا کی بھی جنت اور آخرت کی بھی جنت اور ابھی جو الفاظ آتے ہیں کہ یہ دونوں جنتیں ملی ہوئی ہیں، دور دور نہیں ہیں فِيهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ (55:50) ان دونوں میں فیض کے چشمے جاری ہونگے۔

جنّتی زندگی کی سب سے بڑی واضح اور اہم نشانی

عزیزانِ من! ان دونوں جنّتوں میں چشمے جاری ہیں۔ ان میں بہنے والا پانی ہے جو ہمیشہ نیچے سے مسکوب ابلتا چلا آئے گا اور بہتا چلا جائے گا اور کوئی کسی چشمے کے سامنے بند نہیں لگا سکے گا۔ جونہی کسی نے لکیریں کھینچ کر کہا کہ یہ میری زمین ہے، وہ جنت کی زندگی نہ رہی۔ یہ ہے عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ (55:50) جنّتی زندگی کی کیفیت ہوگی۔ یہ وہی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جنّتی زندگی کا، جس کو اسلامی نظام کہتے ہیں، فرمایا کہ جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی رات اس طرح بسر کی کہ وہ بھوکا رہا، اس بستی سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ہیں وہ تَجْرِيٰنِ (55:50) وہ چشمے جو جاری چشمے رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ نے جنّتی زندگی کی کیفیات اور لوازمات کو اچھی طرح سمجھ لیا ہوگا۔ اور آگے پھر وہی ہے کہ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (55:51) بتاؤ کہ تم خدا کے قانونِ مکافات کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کی تکذیب کروگے۔ اس جنّت کے متعلق مزید کہا ہے کہ فِيهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ (55:52) پھر وہ ہر قسم کی مختلف نعمتیں، قسم قسم کے انواع و اقسام کے لطیف اور لذیذ پھل، یہ سب چیزیں میسر ہوں تو کہا کہ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (55:53) وہ تو ہر آیت کے بعد چلا آ رہا ہے کہ بتاؤ خدا کی کن کن قدرتوں، کرشمہ سازیوں کی تم تکذیب کروگے، ان کو

جھٹلاؤ گے۔ آگے کہا کہ مُتَّكِئِينَ عَلٰى فُرُشٍ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ (55:54) وہاں کے رہنے والے اعلیٰ درجے کے ایسے فرشوں پر بیٹھے ہونگے' آگے چل کر قرآن کریم میں ایک جگہ صوفوں کا بھی ذکر آتا ہے' پردوں کا بھی ذکر آتا ہے یہاں وہ جو قالینوں کے اوپر فرشی نشستیں ہوتی ہیں ان میں ذرا اس سے پہلا جو ہمارا دور تھا' جب ابھی یہ صوفوں والی نشست نہیں تھی' تو یہ فرشی نشستیں بھی بڑی پرتکلف اور بڑی آسائش ہوتی تھیں' یہ قالین اسی دور کی یادگار چیزیں ہیں اور تکیے ہوتے تھے۔ ان تکیوں کے سہارے آسائش سے' آرام سے' نہایت پرتکلف فرشوں پہ بیٹھے ہوئے اور تکیوں کے متعلق کہا کہ ایک تو یہ ابرہ ہوتا ہے جو اوپر ہوتا ہے' ایک نیچے ہوتا ہے اس کو استر کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے نیچے وہ کیا ہوگا' اس کو تو چھوڑ دیجیے' ان کے استر بھی بڑے بڑے دبیز ریشموں کے ہونگے۔

جنّتی معاشرے میں کوئی شخص کسی شے سے محروم نہ ہوگا

عزیزانِ من! یہاں آپ کو یہ یاد ہوگا کہ آپ کی جو شریعت چلی آ رہی ہے' اس میں مردوں کے لیے سونا اور ریشم پہننا حرام قرار دیا گیا ہے یعنی جنت کی زندگی کے متعلق تو خدا یہ کہہ رہا ہے کہ ان کے جو استر تک بھی ہونگے وہ بھی ریشمی ہونگے' حریر و اطلس کے ہونگے اور انہوں نے یہاں کی زندگی میں یہ سب چیزیں حرام قرار دی ہیں اور پھر خدا کے ہاں زیورات کا' سونے کا ہونا تو ایک طرف رہا' قرآن مجید نے تو اپنے ہاں ظروف' برتن' چاندی' سونے کے کہا ہوا ہے' بلوری آبگینے کہا ہوا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ جنّتی زندگی بھکاریوں کی' گداگروں کی' زندگی نہیں ہے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے آسائش اور زیبائش کے لیے پیدا کیا ہے' ان سے متمکن ہونا ہے۔ اتنی سی ہی بات ہے کہ اس میں ان حدود کے اندر رہتے ہوئے' جو اس نے قائم کی ہیں' انہیں ان کے مطابق استعمال کرنا ہے' ان سے متمتع ہونا ہے۔ قرآن کریم کے اندر یہ چیزیں جنّتی زندگی کی شناخت بتائی گئی ہیں اور کہا ہے کہ یہ ہوں گی تو یہ جنّتی زندگی کہلائے گی۔ اس طرح جس چیز کو جنّتی زندگی کی چیزیں کہہ رہا ہے' ان کے متعلق کہنا کہ صاحب! یہ بھی حرام ہے' اور وہ بھی حرام ہے' یہ کچھ از بس قرآن کریم کے خلاف ہے۔

انتیسویں اور تیسویں پارے میں جنّتی زندگی کی پُرتکلف نعما کا ذکر

جنّتی زندگی کی یہ آسائشیں اور لوازمات بہرحال آگے چلی آ رہی ہیں۔ اب تو ہم اٹھائیسویں پارے میں آ رہے ہیں' انتیسویں پارے میں تو آپ دیکھیں گے کہ وہاں جو جنّتی زندگی کی تفاصیل آئیں گی' ان کے سامنے تو یہاں کی جسے آپ بڑی سے بڑی پرتکلف زندگی بھی کہتے ہیں' جسے آپ آرام و آسائش کی زندگی بھی کہتے ہیں' وہ بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ یہ وہ زندگی بتائی گئی ہے کہ جس میں برتنوں تک چاندی اور سونے کے آبگینے ہیں جو منگائے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ آپ اور کیا چاہتے ہیں؟ کہا ہے کہ وہاں تو اِسْتَبْـرَقٍ ط وَجَـنَـا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ (55:54) ہے۔ میں نے پہلے دو جنّتیں کہا تھا۔ کہا ہے کہ ان دونوں جنّتوں کے جو پھل ہیں' وہ ایک دوسرے کے ساتھ ملے

ہوئے ہونگے۔ یہ وہی چیز ہے جو میں نے عرض کی ہے کہ زندگی تو ایک تسلسل کا نام ہے، یہ مسلسل چلتی ہے، حال کی زندگی اور مستقبل کی زندگی، یہاں اور وہاں کی زندگی میں کوئی بُعد اور فاصل نہیں ہے۔ حسنِ عمل کے جو نتائج ہم کہتے ہیں کہ جنت میں، آخرت میں، جا کر نکلیں گے، قرآن مجید کی رو سے وہ نتائج اس دنیا کے اندر نکلیں گے۔ یہاں کی زندگی جنّتی زندگی ہوگی، ان کی خلاف ورزی سے یہاں کی زندگی جہنمی زندگی ہوگی اسی لیے کہا ہے کہ وَّ جَـنَـا الْـجَـنَّـتَیۡنِ دَانٍ (55:54) دونوں جنّتوں کے پھل آپس میں ملے ہوئے ہونگے۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے جو یہاں سے وہاں تک مسلسل جاتی ہے اس لیے اس کے حال اور مستقبل میں کچھ فرق نہیں ہوسکتا۔ نشوونما یافتہ ذات، یہاں بھی سکون واطمینان سے رہتی ہے اور وہاں بھی اس کی یہی کیفیت ہوگی۔ اس قسم کے افراد کی اجتماعی زندگی یہاں بھی آسائشوں اور فراوانیوں کی ہوگی اور وہاں بھی۔ یہاں کی جنت کے گوشے مسلسل وہاں کی جنت سے جا ملتے ہیں۔ اس لیے کہا کہ فَبِـاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّـکُـمَا تُکَذِّبٰنِ (55:55) ان حقائق کی روشنی میں تم غور کرو اور بتاؤ کہ تم خدا کے قانونِ مکافات کی کون کونسی نعمتوں اور قدرتوں کی تکذیب کرو گے!

اس سے آگے اس معاشرے کے بارے میں کہا ہے کہ فِیۡهِـنَّ قٰـصِـرٰتُ الـطَّـرۡفِ لَـمۡ یَطۡمِثۡهُنَّ اِنۡسٌ قَبۡلَهُمۡ وَلَا جَآنٌّ (55:56) قرآن کریم کی رو سے جنت کا یہ معاشرہ مردوں کے لیے ہی مخصوص نہیں ہے، مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے مخصوص ہے، مومن اور مومنات دونوں کے لیے ہے، دونوں جنت میں ہونگے، جنّتی مرد بھی اور جنّتی عورتیں بھی۔ قرآن حکیم نے ان کی خصوصیات مومن اور مومنات ہونا بتائی ہیں۔ عورت کے لیے قرآن حکیم میں مومنات آیا ہے جن کو نمایاں طور پر وہ سامنے لاتا ہے اور وہ جو صرف عورتوں ہی کے لیے نہیں ہے قرآن حکیم میں مردوں کے لیے بھی یہ حکم دیا گیا ہے، یہاں سورۃ النور 24 ویں سورۃ میں کہا گیا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ عورتیں باہر نکلیں تو وہ نگاہ اوپر نہ اٹھائیں، یہی پہلے مردوں سے کہا گیا ہے۔

آج عزت، عفت، عصمت اور پاکیزگی کے یہ تمام تقاضے صرف عورتوں سے ہی کیوں کیے جاتے ہیں؟

یہاں تو سارے احکام جتنے بھی عزت، عفت، عصمت، پاکیزگی اور پاک دامنی کے کیے جاتے ہیں وہ ہمارے ہاں ساری زندگی کے لیے صرف ساری عورتوں کے لیے کیے جاتے ہیں، مردوں کے لیے تو اس میں کوئی بات ہی نہیں ہے، کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ''اوجنوں کیندی اے نا خاوندنوں کہ میاں منڈے دا ہن کج کر۔ دیکھنا پیا ایں کس طرح ادھی ادھی رات نوں باہر رہندا اے۔ او کیندا اے: ایس عمر اچ اے تے ہوندا ای رہندا ایگا۔ اے منڈے نال اے کچھ ہوندا ای[1] اے''۔ بچی کے متعلق تو یہ ہے کہ اگر کہیں اس کے ہاتھ میں کوئی خالی

---

[1] وہ جسے یوں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے خاوند کو کہتی ہے کہ میاں! بیٹے کا اب کچھ کرو۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح یہ آدھی آدھی رات تک باہر گزارتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس عمر میں یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ لڑکے کے ساتھ یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔

کاغذ کا ورق بھی دیکھ لیا جائے تو صبح ایک دوسرے سے ہوتا ہے کہ ذرا پتہ لو یہ خط کہاں سے آنے شروع ہو گئے ہیں۔ یہ ساری چیزیں ہیں مگر قرآن حکیم یہاں حکم دیتا ہے (24:30) کہ نگاہوں کو بے باک نہ ہونے دو۔

نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دینے کا حکم پہلے مردوں کے لیے ہے

جب راستہ چلو تو پہلے مردوں سے کہتا ہے کہ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ (24:30)۔ عزیزانِ من! قرآن حکیم پہلے مردوں سے کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ جب باہر نکلیں تو نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دیں اور اپنی عصمت کی حفاظت کریں۔ یہ کچھ پہلے مردوں کے متعلق ہے اور پھر عورتوں کے متعلق وہی بات کہی ہے کہ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (24:31)۔ یہ وہی بات کی ہے اور یہ بڑی سیدھی سی بات ہے کہ اگر مرد اپنی عصمت کو محفوظ رکھیں گے تو بے حیائی پھیل ہی نہیں سکتی، عورت کیا کرلے گی! جب یہ قصہ اٹھایا گیا تھا کہ یہ جسے Red light area کہتے ہیں، یہ بازارِ حسن جس کا نام رکھا ہوا ہے یعنی حسن کا بازار، تو اس میں یہ تھا کہ اس کو قانوناً منع کر دیا جائے۔ اس کے بعد یہ عام پھیلتا اور عام ہوتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ یہ تو کچھ ناممکنات میں سے ہے۔ اس زمانے میں میرے کہنے کی کچھ میری بھی شنوائی ہوتی تھی۔ انہوں نے مجھے کہا کہ اس کا علاج کیا ہے تو میں نے کہا کہ عورتوں سے کچھ نہ کہیے، مردوں کو قانوناً حکماً بند کر دیجیے کہ اس علاقے میں نہ جائیں، معاملہ حل ہو جائے گا۔ قرآن حکیم نے مردوں سے پہلے کہا ہے اور عورتوں سے بعد میں کہا ہے۔

بیٹیو! میں دل کی گہرائیوں سے معذرت خواہ ہوں

ذلت کی زندگی میں تو عورتوں کا ذکر آئے گا لیکن بعض مقامات ایسے آجاتے ہیں کہ مجھے آپ مردوں سے نہیں، اپنی بیٹیوں سے، اپنی بہنوں سے، خاص طور پہ، اسے آپ کہیے کہ مجھے معافی مانگنی پڑے گی۔ قبول کر لیجیے، میری بیٹیو! مجھے معلوم ہے کہ کبھی سہواً بھی میری زبان سے کوئی ایسا لفظ نکل جاتا ہو گا جو مناسب نہ ہو۔ مجلس میں میری بیٹیاں اور بہنیں بھی بیٹھی ہوتی ہیں لیکن بعض ذکر ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ اس درس میں وہ چیز میرے سامنے آرہی ہے میں نے پچھلے دو جمعہ میں کتنی بار یہ سوچا کہ میں جرأت کر کے مجلس میں یہ چیز بیان کر دوں، بیان کیے بغیر آپ کی سمجھ میں بات آئے گی نہیں کہ ہمارے ساتھ ہوا کیا ہے، اسلام کو ان لوگوں نے کہاں پہنچا دیا ہوا ہے۔ آپ میں سے ہر ایک آدمی سے یہ نہیں ہو گا کہ خود اس نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہو گا۔ آپ کے لیے اس کا علم ہونا بڑا ضروری ہے، پھر سمجھ میں آئے گا کہ اس اسلام کے ساتھ کیا کیا گیا ہے لیکن اس میں اب میری بیٹیو! مجھے آج معاف رکھیے گا، سمجھ لیجیے گا کہ آپ نے شاید سنا نہیں ہے، نہ سنیے مگر مجھے کہنے دیجیے۔ یہ جنت کا ذکر ہے، جنت تو وہاں کی جنت ہے اور ہمارے ان حضرات کے یہ جتنے اربابِ شریعت علمائے کرام،

مفسرینِ عظام ہیں، جب ان کے ہاں جنت کا ذکر آتا ہے اور اس میں جب پھر عورت کا ذکر آئے گا اور پھر حوروں کا ذکر کہتے ہیں تو پھر وہ عورت کا ذکر آتا ہے تو پھر پوچھو نہیں کہ وہ کیا کچھ ارزاں فرماتے ہیں۔

خلیفۃ المسلمین کہلانے والے کے حرم میں تین تین ہزار لونڈیاں

میں سمجھتا ہوں کہ ملوکیت کے دور میں، جب اخلاق کی تمام حدیں ٹوٹتی ہیں، تو سب سے زیادہ زور آکر جنسیات (Sex) پر پڑتا ہے۔ جس دور کی کیفیت یہ ہو تو اس میں عباسی زمانے (750-1258ء) کے خلفاء، امیر المؤمنین خلیفۃ المسلمین کہلانے والوں کے ہاں، آپ کو یاد ہے کہ ایک ایک خلیفے کے حرم میں تین تین ہزار لونڈیاں (غلام) ہوتی تھیں۔ بغداد کے بازار میں ایک منڈی تھی جس میں عورتیں نیلام ہوتی تھیں، بیچی جاتی تھیں۔ پہلے مویشیوں کی وہ منڈی ہوتی تھی عربی زبان میں اس کا نام نخاس ہوتا ہے جہاں مویشی بیچے جاتے ہیں۔ مویشی تو شاید وہاں پھر کم ہو گئے ہونگے یا ان کی گنجائش نہیں رہی، اسی منڈی میں عورتیں بکا کرتی تھیں۔ ''نخاس'' اس کا نام تھا۔ اب تک ان کی زبان میں اس کا نام نخاس ہی ہے۔ میں جب حجاز کی زمینوں میں گیا ہوں تو ایک مقام پہ انہوں نے بتایا کہ اب وہاں یہ چیزیں بند ہو گئی ہوئی ہیں۔ یہ تھی وہاں حالت۔

پاکستان کی قومی اسمبلی میں کم از کم ایک لونڈی رکھنے کا مطالبہ

آپ کے ہاں کی شریعت کے اندر یہ غلام اور لونڈیوں کی یہ چیز موجود ہے۔ آپ کو یاد ہے کہ اس اسمبلی سے پہلے کی اسمبلی ❶ تھی، غالباً (ذوالفقار علی) بھٹو کے زمانے کی اسمبلی، اس میں جب یہ پابندی لگا رہے تھے کہ چار عوتیں جو دھڑ ادھڑ کرتے چلے جاتے ہیں، اس پہ کچھ پابندی لگائی جائے، تو ایک بہت بڑے مولوی ❶ صاحب نے اسمبلی میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ یہ پابندی تو لگا دیجیے لیکن کم از کم ایک لونڈی رکھنے کی اجازت ضرور دیجیے۔ آج اس دور میں آپ کے ہاں کی نیشنل پارلیمنٹ میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا تو اب سوچیے کہ وہاں دور وہ ہے جہاں تین تین ہزار لونڈیاں، ایک ایک محل کے اندر ہیں، اس لیے جب ہم سنتے تھے کہ کوئی مسلمان یورپ وغیرہ میں باہر جاتا ہے تو اس کا تعارف ہوتا ہے کہ مسلمان ہے تو وہ پوچھا کرتے تھے کہ آپ کے حرم میں کتنی عورتیں ہیں یعنی پہلی بات خصوصیت کے طور پر یہ پوچھی جاتی تھی۔

تفسیر ابن کثیر میں ابھرے ہوئے سینوں والی عورتوں کی بارش

جب ان کے ہاں جنت کا ذکر ہو گا تو پھر کیا کچھ نہیں کہا جائے گا! میں دو چار مثالیں پیش کرونگا، اس سے آپ کو اندازہ لگ

---

❶ یہ 1973ء کے فروری کے سنٹرل پارلیمنٹ اسمبلی کے سیشن میں، جمعیت العلماء کے ایک رکن مولوی نعمت اللہ نے تقریر میں کہا تھا (حوالہ مطالب القرآن، فی دروس الفرقان، سورۃ المؤمنون، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2007ء ص۔61)۔

جائے گا کہ وہ معاشرہ کس قسم کا تھا اور آپ کے ہاں کی یہ کتابیں، جن کو اتنی مقدس اور متبرک کتابیں کہا جاتا ہے ان میں لکھا ہوا کیا ہے! میری بیٹیو! سنیے! معذرت کے ساتھ سنیے، یہ تفسیر ابنِ کثیر ❶ میں ہے۔ یہ ان کے ہاں کی بڑی مستند تفسیر ہے۔ ابن کثیر (700-774ھ) کی تفسیر تو عربی میں ہے، اس کا اردو ترجمہ مولانا محمد جونا گڑھی (1890-1941ء) نے کیا ہے۔ اب تو وہ مرحوم ہو گئے ہیں، دلی میں تھے۔ یہ ترجمہ ان کا شائع کردہ ہے۔ پچیسواں پارہ ہے، تفسیر ابن کثیر کا اردو ترجمہ محمد جونا گڑھی مرحوم کا ہے، اس کا صفحہ گیارہ میرے پاس موجود ہے، یہ اس دور کی ایک ہی تفسیر ہے، اس میں سے میں پیش کروں گا۔ کہتے ہیں کہ حضرت ابوطیبہ فرماتے ہیں کہ جنتیوں کے سروں پر ابر آئے گا اور انہیں ندا آئے گی کہ بتلاؤ، کس چیز کا برسنا چاہتے ہو؟ پس جو لوگ جس چیز کا برسنا چاہیں گے وہی چیز ان پر اس بادل سے برسے گی، یہاں تک کہ وہ کہیں گے کہ ہم پر ابھرے ہوئے سینوں والی ہم عمر عورتیں برسائی جائیں چنانچہ وہ برسائیں جائیں گی۔ یہ قرآن کریم کی تفسیر ہو رہی ہے، انتہا ہے یا نہیں! اس تفسیر کے ساتھ دوسری بخاری شریف ہے۔

بخاری شریف کی ایک روایت

اتفاق سے یہ بخاری شریف بھی، میں ساتھ ہی لے آیا، الفاظ پڑھ کر سنا دوں۔ بخاری شریف کا کتاب الجہاد ہے، یہ حضرت سلیمانؑ پیغمبر ہیں، وہ تو اہل جنت کی بات ہو رہی تھی، یہ پیغمبروں تک آ رہے ہیں اور قیامت یہ ہے کہ اس میں جو وہ لکھتے ہیں وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کر کے لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ او! اپنی طرف سے کچھ لکھو کہ برداشت بھی کیا جائے، اس ذاتِ اقدس و اعظم کی طرف یہ چیزیں منسوب ہیں۔ لکھا ہے کہ ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ سلیمان بن داؤد پیغمبرؑ نے ایک روز کہا کہ آج شب کو میں سو عورتوں کے پاس یا ننانوے عورتوں کے پاس جاؤں گا''۔ سنیے! ایک شب میں خدا کا ایک پیغمبر دوسرے پیغمبر کے متعلق یہ کہہ رہا ہے کہ ''میں سو عورتوں یا ننانوے عورتوں کے پاس جاؤں گا، وہ سب عورتیں ایک شہسوار پیدا کریں گی، جو خدا کی راہ میں جہاد کرے گا، تو ان سے ان کے ایک ہمنشین نے کہا کہ انشاء اللہ کہو، مگر انہوں نے انشاء اللہ نہیں کہا، پس ان میں سے صرف ایک عورت حاملہ ہوئی تو وہ بھی آدھا بچہ جنی، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے''۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ ''اگر وہ انشاء اللہ کہہ لیتے تو سب عورتوں کے بچے پیدا ہوتے اور بے شک وہ سب شہسوار ہو کر اللہ کی راہ میں جہاد کرتے''۔ ایک رات

---

❶ تفسیر ابن کثیر کی 4 جلدیں ہیں۔ یہ تفسیر حافظ اسماعیل بن عمر بن کثیر بن ضوع بن کثیر القریشی البصروی الدمشقی، کنیت ابوالغداء اور لقب عماد الدین (700-774ھ) کی ہے۔ اس کا ترجمہ مولانا محمد جونا گڑھی (1890-1941ء) نے 4 جلدوں میں کیا ہے اور مکتبہ اسلامیہ لاہور سے اس کا 2005ء کا طبع شدہ ایڈیشن موجود ہے۔

میں سوعورتوں کے پاس اور وہ سوکی سوحاملہ ہو جاتی ہیں۔ یہ بخاری شریف کا کتاب الجہاد ہے۔ آپ کے اہلحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی گوجرانوالہ کے تھے۔ان کا فتویٰ موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلم اور بخاری کی کسی ایک حدیث کا انکار بھی انسان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ یہ اس کی حدیث ہے جو بیان کر رہا ہوں۔ کیجیے اس سے انکار! یہ کہتے ہیں کہ یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔ بقول ان کے (معاذ اللہ) نظر آتا ہے کہ یہ کس دور میں وضع ہوئیں' خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہیں بخشا گیا تھا۔جگر پہ پتھر رکھ کر یہ باتیں کرنا پڑتی ہیں۔

اس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق معاذ اللہ' معاذ اللہ

عزیزانِ من! اس بخاری شریف کے ہی باب الحسن میں یہ روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات میں اپنی گیارہ بیویوں کا دورہ کرلیا کرتے تھے۔ میں کسی دوسرے وقت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے متعلق عرض کروں گا۔ یہ جو 11 یا 9 یا اتنی کا ذکر ہے' جب وہ وقت آئے گا تو میں اس وقت ان کے متعلق عرض کروں [1] گا۔ میں اس وقت صرف وہ روایت بیان کر رہا ہوں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی گئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات میں گیارہ یا نو بیویوں کا دورہ کرلیا کرتے تھے۔اس میں یہ ہے کہ صحابہؓ نے کہا کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں اتنی قوت تھی تو کہا کہ آپ ﷺ میں (معاف رکھیو' بیٹیو!) تیس مردوں کی قوت تھی' دوسرے نے کہا کہ یہ اس دنیا کے تیس مردوں کی نہیں' جنت کے تیس مردوں کی ہے جبکہ جنت کے ایک مرد کی قوت سو مردوں کے برابر ہوتی ہے۔ یہ سیرت پیش کی جا رہی ہے اس ذات اطہر واقدس کی' جس کے پاکیزگیٔ دامن کی قسمیں جبرئیل کھائے' کہنے لگے کہ یہ اس دور کی باتیں ہیں۔ مجوسیت کی جہالت کی تو آپ کر نہیں سکتے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی تفسیر میں حوروں کا تذکرہ

آج آپ کے ہاں کیا ہو رہا ہے؟ پھر اس دور کے سب سے بڑے آپ کے ہاں کے مجتہد اور اقامت دین کے داعی سید ابوالاعلیٰ مودودی موجود ہیں [2]۔ انہوں نے بھی تو تفسیر تفہیم القرآن لکھی ہے۔ یہ حال کی ہے۔ وہ اس تفہیم القرآن کی پانچویں جلد میں حوروں کے متعلق بیان فرماتے ہیں۔ اہل جنت کی بیویاں ان کے ساتھ قصروں یعنی محلوں میں رہیں گی اور ان کی سیر گاہوں میں جگہ جگہ

---

[1] ان کے متعلق دیکھیے جون 1970ء کی 21 تاریخ کا درسِ قرآنِ کریم' سورۃ النسآء آیات 2 یا 3' عنوان ''نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس پر ازواج مطہرات کے سلسلہ میں کیے جانے والے اعتراضات'' تا اختتام' دوسرا باب' ازاں مطالب القرآن فی دروس الفرقان: النسآء' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2012' ص ص 89 تا 95۔

[2] اب مرحوم ہو چکے ہیں (1979-1903ء)

خیمے لگے ہونگے' جن میں حوریں ان کے لیے لطف ولذت کے سامان فراہم کریں گی' بیویاں تو گھروں میں' محلوں میں رہیں گی اور جب وہ آج کی طرح پکنک منانے جائیں گے تو وہاں باہر پھر وہ ٹینٹ لگا گئے ہونگے' خیمے لگا گئے ہونگے تو حوریں ان خیموں میں' سیر گاہوں میں' ان کے لیے لطف ولذت کا سامان فراہم کریں گی۔ یہ آج کی تفسیر ہو رہی ہے۔ ہاں بیچاروں کے اعصاب پہ عورت سوار ہے۔ عزیزانِ من! بیٹیوں سے پھر میں نے معذرت کی ہے۔ یہ ہے آپ کا وہ اسلام جو دنیا میں پیش کیا جا رہا ہے۔ کیا انکار کریں گے آپ' جب وہ آپ کے ہاں کی مستند ترین تفسیروں کی کتابوں سے' حدیثوں کی کتابوں سے' جن کے متعلق اصح الکتب بعد کتاب اللہ یعنی قرآن کریم کے بعد سب سے زیادہ صحیح ترین کتابیں کہا ہے' سے نکال کر یہ کچھ آپ کے سامنے لائیں گے؟ آپ کے ہاں کی یہ اسلام کی سندیں ہیں' متقدمین کو چھوڑ دیجیے آج کے دور کے آپ کے ہاں وہ اس قسم کے مفسرین ہیں جسے عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ کچھ لبرل قسم کے ہیں۔ ان کی ذرا وہ تفہیم القرآن اٹھا کر دیکھیے۔ میں نے تو اس میں سے ایک بات کی ہے۔ کتنی ہی اور باتیں اس میں سے میں کہوں! وہ بھی ان کے متعلق یہ کہہ رہے ہیں۔

ہماری ان پیش کی جانے والی تفسیروں پر اٹھنے والے اعتراضات کا جواب بن نہیں پڑتا

عزیزانِ من! یہ جنت کا وہ نقشہ ہے' جو ان تفاسیر میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر دنیا کے یہ جتنے بھی غیر مسلم ہیں وہ History (تاریخ) میں جائیں تو آپ کے ہاں کا وہ دور آئے گا جس میں ایک ایک خلیفہ کے حرم میں تین تین ہزار لونڈیاں ہوتی تھیں' وہ بکتی تھیں' نیلام ہوتی تھیں' آپ کی یہ تفسیریں بھی یہ کچھ بتا رہی ہیں' احادیث کی کتابیں بھی یہی بتا رہی ہیں' یہی ان میں لکھا ہے۔ آپ کے یہ موجودہ دور کے مفسر ہیں' یہ بھی یہی اسلام پیش کر رہے ہیں اور آپ بھی یہی اسلام ان غیر مسلموں کے ہاں پیش کریں گے' انہی کے اوپر وہ اعتراضات ہوتے ہیں جن کا کوئی جواب نہیں بنتا۔ اب آپ کیا کریں گے؟

لفظ حور کا قرآنی مفہوم

میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ لفظ حور جمع ہے۔ اس کا واحد ''احور'' بھی ہے اور ''حوراء'' بھی۔ عربوں کے ہاں ''الحور'' کے معنی ہوتے ہیں ''آنکھ کی سفیدی کا بہت سفید اور سیاہی کا بہت سیاہ ہونا اور جلد (Skin) کا رنگ صاف ہونا یا آنکھ کی سیاہی کا اتنا زیادہ ہونا کہ آنکھ اس سے بھری ہوئی معلوم ہو۔ ویسے تو ایسی آنکھ والے میں' میں ابھی عرض کروں گا کہ صرف عورت ہی نہیں' ہوتی گو کہ یہ بڑی خوبصورت آنکھ ہوتی ہے' یہ وہ بھی ہے جسے غزال کی آنکھ کہتے ہیں یعنی سیاہی ہو تو پوری سیاہی ہو' سفیدی ہو تو بڑی شفاف ہو' اور وہ نہایت متناسب قسم کی آنکھ کو بھی ''حور'' کہتے تھے۔ عربوں کے ہاں یہ لفظ حور عورت کے لیے' مؤنث ہی نہیں ہے' یہ مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے'

بولا جاتا ہے، مرد بھی حور ہوتا ہے جس کی یہ صورت ہو اور عورت بھی۔ یعنی ایسے مرد اور عورتیں جن میں یہ خصوصیات پائی جائیں وہ ''حور'' کہلائیں گے۔ یہ بظاہر آنکھ کی بات ہے مگر وہ اپنے ہاں اسے پاکیزہ عقل (Pure or Clean Intellect) کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس لفظ کو وہ ایسی عقل کے لیے استعمال کرتے ہیں جو مکار نہ ہو، پاکیزہ ہو، جو نیک سیرت کی عقل ہو، جو انسان کو اس راستے پہ لے جائے جہاں کوئی بات داغ کی نہ ہو، کوئی بات ناپاکیزگی کی نہ ہو، عقل عیار نہ ہو، وہ عقل جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

یا عطا فرما خرد بہ فطرت روح الامیں

عقل بہ فطرت روح الامیں کو عرب حور کہتے تھے جس میں کوئی عیاری مکاری روسیاہی دھوکا دہی نہ ہو، جس کو ادب خوردہ دل کہا ہے یہ وہ عقل ہوگی یعنی پاکیزہ اور صاف عقل، نہ کہ حیلہ جو اور فریب کار۔ قرآن کریم نے وحی کی روشنی میں چلنے والی پاکیزہ عقل کو حور کہا ہے۔ عرب مرد اور عورت دونوں ہی کے لیے یہ لفظ حور استعمال کرتے تھے۔ اب ان کے بس میں یہ حوریں پڑ گئیں تو پھر وہ ان کے لیے خیموں کے اندر لذت کا سامان فراہم کرنے والی ہوئیں، وہ بھی اس طرح کہ بیویاں رہیں گی محلوں میں اور یہ جائیں گی باہر سیر گاہوں میں۔ کس حیثیت سے یہ عورتیں ہونگی، بیویاں تو محلوں میں ہونگی۔ اف میرے اللہ! یہ پھر کہاں پر لے آئے!

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف

آج سینے میں مرے درد سوا ہوتا ہے

دنیا کے سامنے قرآن کریم کی یہ تفسیریں پیش کی جارہی ہیں۔ اس بات کے بعد قرآن کریم نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ جنت کے اندر مومن مرد بھی ہونگے اور مومن عورتیں بھی ہونگی لیکن یہ نہیں کہا کہ بیباک نگاہوں سے ادھر ادھر وہ چالبازیاں کرنے والی عورتیں ہونگی۔ کہا یہ تھا کہ فِيهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ (55:56) یہ وہ باحیا، پاکیزہ فطرت، عصمت و عفت کا مجسمہ عورتیں ہیں جن کی نگاہیں جھکی ہوئی اور جو پوری طرح سے اٹھی ہوئی بھی نہ ہوں، اتنی شرم و حیا ان کے اندر ہو۔ اس جنّتی زندگی کے اندر عورتوں کی بھی یہ کیفیت ہوگی، اس قسم کی عورتیں کہ نکاح سے پہلے، اپنوں یا بیگانوں میں سے کسی نے انہیں Touch (مس) تک نہیں کیا ہوگا، ایسی مومن کی زندگی ہوگی کہ جس میں ہر نکاح کرنے والے لڑکے کو اس کا یقین ہو کہ میری یہ جو منکوحہ بیوی آ رہی ہے، اس سے پیشتر کسی نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، کسی نے Touch (چھوا) تک نہیں کیا، اس کی یہ زندگی بڑی اطمینان کی زندگی ہے!

اور یہ کیا کہہ گیا ہے قرآن مجید کہ فَبِأَيِّ آلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (55:57) کہ کیا کہتے ہو تم ان کی پاکیزہ فطرت کے متعلق

بتاؤ کہ تم ان پاکیزہ صفات سے کس کس کو جھٹلاؤ گے۔غور کرو کہ تم اپنے رب کی کون کون سی قدرتوں اور نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ وہ عورتیں کیا ہوں گی؟ کہا کہ **کَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ**(55:58) یہ تو گہر ہیں۔سپیدہ سحر کی طرح صاف' دامنِ مریم کی طرح پاکیزہ' گہر مرجان ہوتی ہیں' صدف کے اندر پلے ہوئے موتی ہیں' کسی نے بد آنکھ سے ان کو دیکھا تک نہیں' اپنی عفت کی آب و تاب اور پاکیزگی سیرت و کردار کے اعتبار سے یوں سمجھو جیسے یاقوت و مرجان ہوں: صاف' شفاف' محفوظ' گوہرِ آبدار۔ یہ ہونگی جنّتی زندگی کے اندر عورتیں۔غور کرو کہ **فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ** (55:59) تم اپنے نشو ونما دینے والے کی کون کون سی نعمت اور قدرت کو جھٹلاؤ گے؟

عزیزانِ من! سورۃ الرحمٰن کی آیت 59 تک ہم آئے ہیں۔آگے بات ہے اور بڑی اہم بات ہے۔کہا ہے کہ **هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ** (55:60) لیکن اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀❀............❀❀............❀❀

چھٹا باب: **سورۃ الرحمٰن** (آیات 60 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جنوری 1983ء کی 11 تاریخ ہے اور درس قرآن کا آغاز سورۃ الرحمٰن کی آیت 60 سے ہو رہا ہے: (55:60)۔

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات میں جنّتی زندگی کی مختلف آسائشوں، نعماء اور نوادرات کا ذکر ہوتا چلا آ رہا تھا۔ یہ اس دنیا میں، اس معاشرے کا ذکر تھا جسے ہم جنت کی زندگی کہہ کر پکاریں گے اور پھر اگلی دنیا میں جا کر تو وہ اس کے متعلق تسلسل ہوگا ہم تو کچھ سمجھ نہیں سکتے، وہ مثالاً بیان ہوگا اور یہاں اگر جنّتی معاشرہ قائم ہوگا، تو اس کے متعلق قرآن حکیم کی تفصیلات ہونگی کہ یہ مردوں اور عورتوں دونوں پر مشتمل ہوگا۔

احسان کا بدلہ احسان نہیں بلکہ حسن ہوتا ہے

آج کی آیت جو ہمارے سامنے آتی ہے، اس کے عمومی غلط مفہوم نے عجیب قسم کی غلط فہمیاں اور پیچیدگیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ وہ آیت یہ ہے: هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (55:60)۔ اس آیت کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہے یعنی کوئی ضرورت مند کسی وقت آپ کے پاس آیا، آپ نے اس کی مدد کی، تو یہ اس پر احسان ہوا۔ اب وہ جب تک اس احسان کا بدلہ نہ اتار

دے اس احسان کا یہ بوجھ اس کے سر پر سوار رہا۔ اب وہ ہر معاملے میں آپ کا بے دام غلام بن گیا جیسے آپ کہیں ویسا اسے کرنا ہوگا۔ عام طور پر یہ آپ نے سنا ہوگا کہ کہتے ہیں کہ وہ دیکھیے صاحب! اس طوطا چشم احسان فراموش محسن کش شخص نے کس طرح آنکھیں پھیر لیں ابھی کل روتا ہوا آیا تھا اور آج کہہ رہا ہے کہ نہیں صاحب! ووٹ تو میں اسے دوں گا جسے میں اچھا سمجھوں گا لیجیے یہ صورت ہے ان لوگوں کی۔ میاں! زمانہ ہی ایسا آ گیا ہے یعنی ایک دفعہ کسی پر احسان کر دیا اب اس کے بعد اس کی جان جبھی چھوٹے گی جب وہ ویسا ہی یا اس سے کہیں زیادہ کچھ کرے تو اب وہ دعائیں مانگے گا کہ یا اللہ! اس پہ بھی مصیبت پڑے یہ بھی روتا ہوا آئے اور میں اس طرح اس کی مدد کروں تا کہ وہ احسان کا بدلہ احسان اتار دوں پھر ہم برابر ہو جائیں گے اور جب تک ایسا نہیں ہوگا اس وقت تک تو وہ ہر معاملے میں یہ کہے گا کہ یہ احسان فراموش محسن کش ہے اور اس کی تائید میں وہ قرآن حکیم کی یہ آیت لائے گا۔ آپ اندازہ لگایئے کہ کیا قرآن حکیم یہ کہہ سکتا ہے؟ قرآن حکیم کی تو کیفیت یہ ہے کہ جس زمانے میں ابھی اسلامی نظام قائم نہ ہو جتنی زندگی تشکیل ہو رہی ہو تو اس زمانے میں انفرادی طور پر ایک دوسرے کی مدد کرنے کے مواقع ہوتے ہیں ضرورت پڑتی ہے مدد کی جاتی ہے۔

کسی کی مدد کرنے والے کے لیے قرآنِ حکیم کی تعلیم

قرآن کریم انفرادی طور پر دوسروں کی مدد کرنے کے متعلق بار بار تاکید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتۡبِعُوۡنَ مَاۤ اَنۡفَقُوۡا مَنًّا وَّ لَاۤ اَذًی (2:262)۔ اگر وہ کسی کی مدد کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں اس کا کسی قسم کا کوئی اجر یا معاوضہ نہیں ہوتا وہ اسے اپنی زندگی کا فریضہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح سے مدد کی اور اس کے بعد اب جس کی مدد کی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ اب اسی طرح سے اس کی بھی اذیت قلبی کا موجب بن جائے یعنی اگر کسی وقت بھی آپ نے اس کو جتا دیا تو اس پہ بھی اس کے دل کو کوفت پہنچے گی یہ اس میں ذلت محسوس کرے گا تو کہا کہ اس طرح سے کسی کی مدد کریں کہ پھر اس کے بعد کیفیت یہ ہو کہ کوئی حرکت کبھی ایسی سرزد نہ ہونے پائے جس سے اس شخص کو کسی قسم کی اذیت پہنچے تکلیف پہنچے دل گرانی پہنچے یہ بالکل نہ ہو۔ اگر کرنے کے بعد یہ کیفیت ہے تو پھر یہ کہا ہے کہ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ (2:262) وہ اجر جو اس کا ہے وہ تو اس کے عمل کے اندر مضمر تھا یہ تو تمہیں ملے گا جیسے قرآن کریم کی وہ اصطلاح یہ ہے کہ وہ تو خدا کے ہاں سے تمہیں ملے گا اس کے ساتھ معاملہ کیا ہے کہ تم نے اس کی مدد کی اور اس کے بعد اب عمر بھر کے لیے اس کے پیچھے پڑ گئے تو کہنے لگے کہ اس طرح مدد کرنے والا اس کے بعد کبھی زندگی بھر کوئی ایسا اشارۃً کنایتاً بھی نہ کرے جس پہ اس کو کسی قسم کی اذیت پہنچے اس کو دل گرانی محسوس ہو اس کو ذلت محسوس ہو یہ قطعاً نہ کرے۔ اگر ایسا کہا تو یاد رکھو! یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُبۡطِلُوۡا صَدَقٰتِکُمۡ بِالۡمَنِّ وَ الۡاَذٰی (2:264) اے جماعت مومنین! اگر تم نے مدد کی اور اس کے بعد کوئی ایسی حرکت کی کہ جس سے اس کو ذرا

سی بھی قلبی تکلیف پہنچی تو تمہارے صدقات باطل ہو گئے' جو کچھ تم نے کیا تھا وہ سب کا سب مٹ گیا' ضائع ہو گیا۔ اس سے تمہارا اتفاق' تعمیری نتائج کے بجائے' تخریبی نتائج پیدا کرنے کا موجب بن گیا۔ یاد رکھیے! ایسا کبھی نہ کرنا۔

عمر بھر کی ذلت

بیشتر مقامات پر قرآن کریم نے اس کی تاکید کی ہے کہ انفرادی طور پر مدد کرنا پڑے تو اس کے بعد پھر یہ نہ ہو کہ تم اس کا احسان جتاتے رہو جیسے ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ اس کی اذیت کا باعث بنتے رہو' یہ اس کے لیے بڑی اذیت کا باعث ہے۔ اس سے تو وہ ہر بار یہ کہے گا کہ اچھا ہوتا' میں اسکے پاس مدد کے لیے ہی نہ آتا' یہ میری مدد ہی نہ کرتا تو یہ اس سے بہتر تھا۔ اب اس نے ایک دفعہ میری مدد کی ہے اور پھر عمر بھر کے لیے وہ میرے لیے وجہ ذلت ہو گیا ہے۔

عمل کا بدلہ تو ہمیشہ عمل کے اندر ہی پوشیدہ ہوتا ہے

عزیزانِ من! آگے تو یہ کہا ہے کہ ایک تو کسی کام کا بدلہ اجرت ہوتی ہے۔ مثلاً مزدور مزدوری کرنے کے لیے آپ کے ہاں آیا' آپ نے شام کو جو پانچ روپے' دس روپے روزانہ طے کیا تھا وہ دے دیئے' یہ خارج سے بدلہ ملتا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ آپ صبح سیر کے لیے جاتے ہیں' دو تین میل مسافت طے کرتے ہیں' وقت بھی طے کرتے ہیں' تو اس کے بعد کسی سے آ کر یہ نہیں کہتے کہ مجھے دس روپے دو' میں تین میل کا سفر کر کے آیا ہوں۔ یہ جو آپ نے کام کیا ہے' یہ جو سیر کی ہے' یہ جو اتنا سفر کیا ہے' یہ خود اپنا بدلہ آپ بن گیا کہ آپ کی صحت اچھی ہو گئی' آپ کو خارج سے کوئی ایسی چیز نہیں ملتی' اس عمل کا بدلہ اس عمل کے اندر ہوتا ہے اور قرآن حمید کی تعلیم ایسی ہے کہ وہ یہ کہتا ہے کہ تمہاری قلبی کیفیت یہ ہونی چاہیے کہ یہ جتنا اس قسم کا حسنِ عمل ہے' وہ خود اپنا بدلہ آپ ہوتا ہے۔

خودی کی پرورش اور ذات کی تقویت کا راز

انہی آیات میں وہ عظیم آیت ہے' جسے ہم خودی کی پرورش' انسانی ذات کی تقویت' اس میں Integration' اس کا ثبات کہتے ہیں جو اس زندگی کے اندر مقصود بالذات چیز ہے۔ اب ایک تو یہ طبعی زندگی ہے۔ اس طبعی زندگی کی ضروریات کا پورا ہونا ضروری ہے مثلاً کھانا پینا سونا اور افزائش نسل کرنا لیکن اصل شے تو انسان کی ذات کی پرورش اور نشوونما' استحکام اور فروغ ہے' اس کا آگے بڑھنا ہے۔ کہا یہ ہے کہ یہ جو تم کسی دوسرے کی مدد کرتے ہو تو اس کا مقصد انسانی ذات کی یہ نشوونما ہوتا ہے۔ یہ تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِہِمْ (2:265) آیت بڑی اہم ہے' اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنی ذات کے ثبات کے لیے تم یہ کر رہے ہو' اس کے لیے نہیں کچھ کر رہے کہ تم اس سے اس کا بدلہ چاہو۔ یہ ایک بڑی اہم چیز ہے۔ انسانی ذات ہر انسانی بچے کو غیر نشوونما یافتہ شکل کے اندر ملتی ہے' انسانی زندگی کا مقصد اپنی ذات کا استحکام' اس کی

نشوونما' اس کا آگے بڑھانا ہے اور یہ جتنے جنہیں اعمال حسنہ کہا جاتا ہے' ان کے معنی یہ ہیں کہ ان سے انسان کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہ تَثْبِیْتًا (2:265) کتنا عجب لفظ قرآن کریم نے کہا۔ یہ اس کا ثبات ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اس دور میں بھی' ہمارے ہاں سائیکولوجی جہاں تک پہنچی ہے' وہ بھی اس کے لیے Integration کی یہ Term (اصطلاح) استعمال کر رہی ہے۔ جو قرآن کریم نے دی ہے۔ یہ چیز انسانی ذات کا استحکام ہے' یہ ثبات ہے۔ انسانی ذات یا تو Disintegrate (مضمحل اور منتشر) ہو جاتی ہیں یا Integrate (مستحکم) ہوتی ہے۔ اسے تثبیت حاصل ہوتی ہے جنہیں قرآن کریم نے اعمالِ حسنہ کہا ہے۔ یہ ہے تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (2:265)۔

اپنے حسنِ عمل کا بدلہ کسی دوسرے سے طلب کرنا' کاروبار کہلائے گا

اس اعمالِ حسنہ کا مقصد اپنی ذات کا استحکام ہے' یہ ان سے حاصل ہوتا ہے اس لیے جس کسی کی آپ نے مدد کی ہے' تو اس سے اس مدد کا بدلہ کاہے کے لیے چاہنا' اس کا تو سوال ہی نہیں ہے وہ تمہارے اس اپنے عمل کے اندر ہی مضمر تھا کہ اس سے تمہاری ذات کی نشوونما ہوگی' تمہیں اس کا بدلہ مل گیا۔ قرآن مجید کی یہ بڑی عجیب چیز ہے کہ حسنِ عمل کا یا کسی کے لیے کچھ کرنے کا بدلہ' اس سے چاہنا یا کسی اور سے چاہنا یا خارج سے چاہنا' تو مزدوری ہے' کاروبار ہے۔ اصل چیز تو یہ ہے کہ یہ چیز جو تم نے کی وہ تمہاری ذات کی تقویت کا' ثبات کا' استحکام کا' موجب بن گئی۔ اب تمہیں یہ بدلہ مل گیا۔ قرآن مجید کے نزدیک مومنین کا شعار تو یہ ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! یہ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (76:9) بڑی اہم آیت ہے۔ اس میں قرآن حکیم کہتا ہے کہ وہ لوگ ہیں یہ جماعت مومنین والے کہ وہ اگر کسی کی مدد کرتے ہیں تو اسے کہتے ہیں کہ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (76:9) جو کچھ ہم نے تمہارے لیے کیا ہے اس کا کوئی بدلہ تم سے لینا تو ایک طرف رہا' ہم تو شکریہ کے بھی متمنی نہیں ہیں' نہ ستائش کی تمنا' نہ صلہ کی امید' شکریئے تک کے بھی متمنی نہیں ہیں کہ تم اس کے لیے ہمارا شکریہ ادا کرو۔ وہ یہ کہے گا کہ میں نے تمہارے لیے کچھ نہیں کیا ہے جو تم میرا شکریہ ادا کرو' میں نے اپنی ذات کے لیے یہ کیا ہے۔ قرآن کریم اس مقام تک پہنچاتا ہے جسے آپ باہمی تعاون کہتے ہیں یعنی معاشرے کے اندر ایک دوسرے کی مدد کرنا' ضروری ہوتا ہے۔ معاشرے کے اندر ایک کو دوسرے کا کام پڑتا ہے لیکن اس کام کیلیے قرآن کریم جماعت مومنین کو یا ایک عبد مومن کو اس مقام تک لے جاتا ہے مگر وہ کسی دوسرے کے لیے اس قسم کا کوئی کام کرتا ہے تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ اپنے ذہن میں یہ بات رکھے کہ مجھے اس سے اس کا بدلہ کچھ ملے گا وہ اس کے شکریئے تک کا بھی متمنی نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (55:60) پھر آیت کے معنی کیا ہوئے؟ یہ عجیب چیز ہے۔

قرآن کریم کے نزدیک خوبصورت زندگی کا معیار Balanced Personality (متوازن شخصیت) ہے

قرآن کریم نے انسانوں کو یہ جتنا پروگرام دیا ہے' اس سے مقصود ہی انسانی ذات کی یہ پرورش کرنا ہے لہٰذا یہ ہے وہ حسن' جسے آپ حسنِ عمل کہتے ہیں' جسے آپ حسنات کہتے ہیں۔ قرآن کریم کے یہ سارے الفاظ اسی سے لیے ہیں اور حسن کے معنی ہوتا ہے کسی چیز کا صحیح ترین توازن (Balance)۔ کسی کی جو Balanced Personality (متوازن شخصیت) جو ہے وہ ہے قرآن کریم کے نزدیک معیار: لَا نُرِیۡدُ مِنۡکُمۡ جَزَآءً وَّلَا شُکُوۡرًا (76:9) نہ ستائش کی تمنا' نہ صلے کی پرواہ' اس معیار پر پوری اترتی ہے وہ حسن عمل سے پروان چڑھتی ہے۔ تو اس آیت کے یا اس سے متعلقہ آیات کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم نے کہیں دیکھا کہ کسی کا توازن بگڑ رہا ہے' تو تم نے اس کے توازن کو ٹھیک کر دیا۔ اس میں تمہاری ذات کی تقویت کا راز ہے' اسی سے تمہاری ذات پروان چڑھتی ہے۔

قرآن کریم میں نیکی کے لفظ کی بجائے ''حسنات'' کا لفظ آیا ہے

تمہارے متوازن عمل سے اگر اس کا توازن ٹھیک ہو گیا تو تمہیں اس کا بدلہ مل گیا۔ احسان کے معنی ہی '' بگڑا ہوا توازن جو تمہیں اچھا نہیں لگا تھا' وہ صحیح کر کے' اس میں حسن پیدا کر دینا''۔ بگڑے ہوئے توازن کو چھوڑ دیجیے' عقل سلیم رکھنے والا کہیں سے گزرے' کہیں تصویر ٹنگی ہوئی ہو' اور وہ وہاں ٹیڑھی ہو' وہ اسے بدنما نظر آئے تو وہ چلتے ہوئے اس کو ذرا یوں کر کے صحیح کرنا چاہیے تو وہ خوش ہوتا ہے کہ سیدھی ہو گئی۔ کہا کہ اس کا توازن بگڑ گیا تھا تم نے اس کا توازن ٹھیک کر دیا' تمہیں اس کا بدلہ مل گیا۔ کس مقام پہ قرآن کریم لے جاتا ہے! عزیزانِ من! انسانوں کے بگڑے ہوئے توازن کو صحیح کر دینا احسان ہے اور اس کا بدلہ یہ ہے کہ وہ جو تم چاہتے تھے کہ یہ صحیح ہو جائے' اس کا حسن قائم ہو جائے' اس کا بیلنس صحیح ہو جائے' یہ صحیح ہو گیا۔ یہی تو چاہتے تھے تو بدلہ تو تمہیں مل گیا۔ هَلۡ جَزَآءُ الۡاِحۡسَانِ اِلَّا الۡاِحۡسَانُ (55:60) Imbalance (غیر متوازن) کا Balance (توازن) ٹھیک کر دینا بجائے خویش اس کا بدلہ ہے۔ پتہ نہیں یہ کن لوگوں کی باتیں ہیں اور وہ کہاں ہیں۔ کئی مقامات پر اس نے ان چیزوں کا کہا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کریم نے جسے ہم نیکی کہتے ہیں یہ تو لفظ عربی زبان کا نہیں' فارسی کا ہے' لفظ ہی حسنات یا حسنِ عمل استعمال کیا ہے اور بنیاد ہی اس کی حسن پہ ہے۔ یہ جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ بگڑے ہوئے توازن کو تم نے صحیح کیا' توازن صحیح ہو گیا' اس کا حسن پیدا ہو گیا' تو تمہیں اس کا بدلہ مل گیا کیونکہ تم نے اس میں جو چاہا وہ ہو گیا۔

کسی دوسرے کے توازن کو صحیح کرنے والے کا اپنا توازن صحیح ہو جاتا ہے

کیسے الفاظ ہیں قرآن حکیم کے! کہا ہے کہ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی (10:26) جس نے اس توازن کو صحیح کر دیا' اس کا اپنا توازن صحیح ہو گیا اور یہی تو تم چاہتے تھے۔ حسنات کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ جن کو ہم نیک کام کہتے ہیں' نیکیاں کہتے ہیں' وہ ہے ہی یہ چیز کہ سب سے پہلے اپنی ذات کے بگڑے ہوئے توازن کو صحیح کرنا' Balanced Personality (متوازن شخصیت) بنانا پھر جو دوسرے لوگ ہیں ان کے متعلق جہاں کہیں تم دیکھو کہ ان کا توازن بگڑا ہوا ہے' تو کوشش کرو کہ ان کا بگڑا ہوا توازن بھی صحیح ہو جائے' پھر پورے معاشرے کا بگڑا ہوا توازن صحیح ہو جائے اور جماعت مومنین کا فریضہ تو عالمگیر ہے' اور آگے وسعت دیتے چلے جاؤ' یہاں تک تم پہنچتے چلے جاؤ گے حتیٰ کہ اگر پورے کرہ ارض کا توازن صحیح ہو جائے' انسانیت کا یا نوعِ انسان کا توازن درست تو اس سے بڑی جنت کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ صاحب! یہ جتنی خرابیاں ہیں ہر روز آپس کے یہ فسادات تزاحمات اور تصادمات ہوتے ہیں یہ بگڑے ہوئے توازن کے ہوتے ہیں۔

عزیزانِ من! اسی کرسی کا ایک پایہ جو باقیوں سے ذرا ایک انچ کا دسواں حصہ بھی چھوٹا ہو' بیٹھ کر دیکھیے آدمی گر جاتا ہے۔ اگر آدمی چلتا چلتا لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے تو وہ ہوتا کیا ہے؟ یہ کہ اس کا توازن قائم نہیں رہتا۔ آپ نہایت آسانی سے' لاشعوری طور پر' چلتے جاتے ہیں۔ یہ کیا ہے؟ کہ توازن صحیح ہے۔ آپ کا ذرا سا توازن بگڑا' آپ لڑکھڑائے اور گر پڑے۔ اسی لیے یہ کہا ہے کہ کسی کا توازن صحیح کرنے والے کا اپنا توازن صحیح ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم سارا زور اس پہ دیتا ہے۔

صحت نام ہی حسنِ توازن کا ہے

عزیزانِ من! صحت نام ہی حسنِ توازن کا ہے۔ آپ کے قویٰ کے اندر جو توازن ہے' وہ اگر صحیح ہے تو اس کا نام صحت ہے' کسی عضو کے اندر اگر اس میں کہیں ذرا کمی بیشی ہوتی ہے تو اس کا نام مرض ہے۔ علاج نام ہی اسکا ہے کہ وہ جو اندر مختلف قویٰ و اعضاء میں بگڑا ہوا توازن ہے' وہ ان کو درست کر کے توازن ٹھیک کر دیتے ہیں۔ میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا کہ ہمارے حکماء دوائیوں سے' نسخوں سے' علاج کرتے تھے۔ اب بھی جو دوائیاں دی جاتی ہیں' جو اجزاء ہیں' وہ آسانی سے لکھ دیتے تھے۔ میں نے دلی کے حکماء کے ہاں ان کے مطب میں بیٹھ کر دیکھا ہے۔ یہ تشخیص بھی بڑی آسانی سے کر لیتے تھے' نسخہ بڑی آسانی سے لکھ دیتے تھے' گولی دیتے تھے' ساتھ نسخہ بھی تھا' میں چھوٹا سا نسخہ لکھنے کے بعد نسخہ ان کو دکھاتا تھا اور وہاں وہ سوچ میں پڑ جاتے تھے کہ ہاں! پانچ دانے منکے کے ٹھیک ہیں' تین ماشے اس کے' یہ ٹھیک نہیں ہے' اسے چھ ماشے کر دیجیے۔ میں نے وہی دیکھا ہے۔ یہ بڑے اچھے حکیم ہوتے تھے۔

حکمت میرا مشغلہ بھی رہا ہے: پرویزؒ

یہ حکمت تو میرا مشغلہ بھی رہا ہے۔ انہوں نے یعنی مریض نے آ کر کہا کہ جی! میں یہ نسخہ لے تو گیا تھا' کچھ آرام نہیں ہوا۔ پوچھنے لگا کہ کس طرح سے پیا تھا؟ وہ کہنے لگے کہ جی! جوش دے کر۔ آپ نے کہا تھا کہ جوش دے کر پی لینا۔ پوچھا کہ کیا بھاپ نکل گئی تھی؟ وہ کہنے لگے کہ ہاں۔ بتانے لگے کہ نہیں پہلے بھاپ نکال دینا' پھر چھنکا کر کے پی لینا' پھر کل کو آنا اور وہ آیا اور اس نے کہا کہ جی! آج تو مجھے آرام ہو گیا ہے۔ ذرا سا تو ازن بگڑا ہوا تھا۔ وہ ذرا سا زیادہ تیز گرم تھا اسی سے انہوں نے اس کو پیا تھا۔ دلی کی زبان میں کہتے تھے بھاپ نکال کر پی لینا' یعنی یہ جو چیزیں ہیں' یہ بڑی چھوٹی چھوٹی سی چیزیں ہیں' اصل مغز دور تک جاتا ہے' ان کا توازن بگڑتا ہے۔ ایک چیز کا ایک دفعہ تو اتنا کرتے تھے کہ وہ چار دانے منکے کے بجائے تین دانے کیا' اصل چیز وہ تھی اس کو وہ نسخے کے مختلف اجزاء اوزان کہتے ہیں۔ ان کے ہاں اصل حکمت یہاں آتی تھی کہ ان کے مختلف اجزاء میں توازن قائم رکھا جائے' تو یہ جو توازن قائم رکھنا ہے' یہ ہے حسن پیدا کر دینا' اسی کو حسنات کہتے ہیں' اسی کو حسنِ عمل کہتے ہیں' اسی کو الاحسان کہا گیا ہے۔ اور یہی ہے جو کہا ہے کہ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (55:60)۔

قرآنِ حکیم کے نازل کرنے کا مقصد قرآن حکیم کے اپنے الفاظ میں

اس سلسلے میں ایک اور آیت بھی ہے' خود قرآن کریم کے متعلق پوچھا گیا ہے۔ یہ بڑی عظیم آیت ہے۔ کہا ہے کہ وَ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ (16:30) یہ لوگ ان سے' جماعت مومنین سے' پوچھتے ہیں کہ خدا نے تمہاری طرف کیا نازل کیا ہے؟ سوال تو بہت بڑا ہے' اس کے جواب میں تو بڑی لمبی چوڑی تفصیل ہونی چاہیے۔ کہا کہ قَالُوْا خَيْرًا (16:30) جو کچھ اس نے نازل کیا ہے' شر کے مقابلے میں خیر آتا ہے' وہ خیر ہی خیر ہے۔ کہا کہ پھر کچھ تو بات بتاؤ کہنے لگے کہ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ (16:30) اس نے ہمیں ایک ایسا نسخہ دیا ہے کہ اگر اس کو استعمال کریں گے تو اس دنیا میں بھی ہمارا توازن برقرار رہے گا اور اگلی زندگی کے اندر بھی خیر ہو گی۔ کہا کہ یہ ہے جو خدا نے نازل کیا ہے۔ یونہی جواب دیا جاتا ہے' جواب سننے والے بھی اس دور میں سمجھتے تھے کہ بات یہ کیا کہہ گیا ہے' جواب دینے والے بھی جانتے تھے کہ خدا نے کیا نازل کیا ہے۔ کہنے لگے کہ یہ سب خیر ہی خیر نازل کیا ہے۔ یعنی نفع بخشی اور زندگی کے ہر پہلو میں بہتری۔

پھر اس خیر کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ کہا کہ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ (16:30) توازن قائم ہو جائے گا: اس دنیا میں بھی' اگلی زندگی کے اندر بھی۔ یہ ہے جو خدا نے نازل کیا ہے۔ وَ لَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ (16:30) بس ان کے لیے اس قسم

کے گھر ہوتے ہیں۔ جوقوانین خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔ یہی متقین ہیں۔ انہی کے لیے کہا ہے کہ ان کے بڑے عمدہ گھر ہوتے ہیں۔ آہا! قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے والوں کا گھر کتنا اچھا ہوتا ہے! ایک گھر کے اندر ہی اگر آپ کا توازن صحیح ہو جائے عزیزانِ من! گھر جنت بن جاتا ہے پھر یہاں تو یہ کہا ہے کہ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (55:60)۔اب بات سمجھ میں آ گئی کہ اس معاشرہ میں تعاون کی ضرورت پڑے گی' ایک دوسرے کی مدد کرنے کی ضرورت پڑے گی تو اس ضرورت کے ماتحت یہ نہیں ہے کہ اگر تم نے کسی کا کام کیا تو اس پہ احسان جتانا شروع کر دیا۔ یہ ہماری زبان میں کہا ہے کہ بالکل نہیں' ایسا بالکل نہیں ہے۔

وہ ضرورت مند کیوں ہے؟ اس لیے کہ اس کا توازن بگڑ گیا ہے۔ جتنی اس کی ضرورت ہے' اتفاق سے اتنا اس کے پاس نہیں آ رہا' اس میں کمی آ رہی ہے' اس کمی سے اس کا توازن بگڑ گیا تھا۔ وہ آیا ہے تم نے اس کا توازن ٹھیک کر دیا ہے' اس کا توازن درست ہو گیا ہے' یہی مقصد تھا تمہارا کہ توازن درست ہو جائے' توازن درست ہو گیا' اس عمل کا نتیجہ خود اس کے اندر مضمر ہے' اس کا توازن صحیح ہو گیا' تمہارا مقصد حاصل ہو گیا۔ جو حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے' جس میں حسن پیدا ہو جاتا ہے تو یہی چیز اس کی کوششوں کا صلہ بن جاتی ہے اس لیے کہا کہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:61) سو بتاؤ کہ تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ اس کے بعد کہا کہ (55:62) یہ پہلے بھی آیا ہے' وہاں بھی یہ کہا تھا کہ یہ دو جنتیں ہیں' یہ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (55:46) آیا ہے میں نے عرض کیا تھا کہ کہا یہ گیا ہے جن لوگوں کو اس کا احساس ہے کہ ہمارے ہر عمل کے متعلق باز پرس ہو گی' انسان کا کوئی ایسا عمل بلا نتیجہ نہیں رہے گا اور وہ خطرناک گھاٹیوں سے بچتے ہوئے زندگی بسر کریں گے تو قرآن مجید ہمیشہ اس دنیا کی جنتی زندگی کا بھی ذکر کرتا ہے اور پھر آخرت کی جنتی زندگی کا بھی۔

ابتدائی دور میں اسلامی نظام کو متشکل کرنے والے لوگ

اب یہاں اس کے متعلق تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ (55:62) ان کے علاوہ دو جنتیں بھی ہیں: اس زندگی میں بھی' اور آنے والی زندگی میں بھی۔ اب ایک تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس نظام کے قیام کے لیے پہل کی جبکہ حالات بڑے ہی نامساعد اور واقعات سخت حوصلہ شکن تھے۔ انہوں نے قوانین خداوندی سے ہم آہنگی اختیار کی' اس لیے اس کی برکات وسعادات ان سے ہم آہنگ ہو گئیں اور ان کے لیے ایک ایسا جنتی معاشرہ تیار ہو گیا جس کی شادابیوں میں کبھی کمی نہیں آئے گی۔ وہ اس نظام کے قیام میں ''السابقون الاولون'' کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ یہ دوسرے لوگ کون ہیں' جو اس زندگی میں جنتی معاشرہ میں رہیں گے؟ یہ وہ ہونگے جو السابقون الاولون کے بعد شامل ہونگے۔ یہ دونوں ہی سرسبز و شاداب ہیں لیکن ان دونوں کے اندر ذرا سا فرق ہے۔ عجیب

فرق ہے کہ یہ اسلامی نظام یا جنّتی زندگی کی تشکیل کا پروگرام جب شروع ہوگا اور تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب شروع کیا تو ابتدائی دور میں جو لوگ ان کا ساتھ دیتے ہیں' ان کے حصے میں مصیبتیں' تکالیف' صعوبات آتی ہیں' دنیا بھر کی مخالفت ان کے حصے میں آتی ہے اور اس وقت ریٹرن بھی کچھ نہیں ہوتا' ابھی ملتا کچھ نہیں ہے' وہ جوان پہلی اپنی ذہنی جنت تھی' وہ تو چھن چکی ہوتی ہے' حقیقی جنت جس کے لیے محنت کر رہے ہیں' وہ ابھی وجود میں آئی نہیں ہوتی۔ یہ جو پہلا دور ہوتا ہے' یہ تو محنت کا' مشکلات کا دور ہوتا ہے' خارا شگافی کا دور ہوتا ہے' اس میں جوئے شیر تو آخر میں آکر نکلتی ہے۔ یہ جو پہل کرنے والے ہوتے ہیں' جن کے حصے میں مساعد اور تکالیف ہوتی ہیں' نظام ابھی قائم نہیں ہوا ہوتا۔ یہ وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ (9:100) کہلاتے ہیں۔

میں اپنی تحریروں میں ان کو اس عمارت کی بنیاد کی اینٹیں کہا کرتا ہوں۔ بنیاد کی اینٹیں کسی کو نظر ہی نہیں آتیں' نہ ان کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم ذرا ابھر کر' نمود ہو کر' کہیں کہ صاحب! یہ ہمارے سر پہ ہے ساری عمارت کا جو بوجھ ہے۔ یہ خیال انہیں کبھی نہیں آتا۔ اگر ان کے دل میں کبھی آجائے تو عمارت گر جائے۔ انہوں نے عمارت کا بوجھ اٹھایا ہوا ہوتا ہے اور خود کسی نمود کی خواہش تک ان کے دل میں نہیں ہوتی۔ ان وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ (9:100) کا بڑا بلند مقام ہے۔ یہ جو کسی اس قسم کے نظام کی ابتدا کرنے والے لوگ ہوتے ہیں' ان کے حصے میں مصیبتیں اور مشقتیں ہی آتی ہیں۔ یہ تو کسان کا ابتدائی دور ہے کہ جو اس میں وہ ہل چلاتا ہے' پانی دیتا ہے' دھوپ میں مرتا ہے' ہو سکتا ہے کہ اس کی زندگی میں وہ فصل نہ پکے' فصل اس کے بعد والے جو ہیں' وہ لے کر چلے جائیں تو یہ جو اس پروگرام کی ابتدا کرنے والے ہیں ان کا مقام بڑا بلند ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے انہی لوگوں کو وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ (9:100) کہا ہے۔

بعد میں آنے والے لوگ

اس کے بعد جو دوسرے لوگ بعد میں آنے والے ہوتے ہیں' وہ اس پروگرام کو آگے بڑھاتے ہیں' مستحکم کرتے ہیں۔ وہ دور وہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے پھل دینے شروع کر دیتا ہے' اس میں نظام قائم ہو جاتا ہے' جتنی چیزیں اس نظام کی' اس حسن عمل کی یا قرآن حکیم کی رو سے جنّتی زندگی کی' جتنی آسائشیں' نعماء' جتنی چیزیں ہوتی ہیں' وہ حاصل ہونا شروع ہو گئی ہوتی ہیں۔ اب انہوں نے یا تو بیرونی خطرات سے اس کو محفوظ رکھنا ہوتا ہے' اس کا استحکام کرنا ہوتا ہے یا اس نے کچھ ترقی کرنا ہوتی ہے تو اس میں اب وہ مشقتیں' وہ جگر پاش مساعدات و تکالیف نہیں آتیں لیکن محنت ان کو بھی کرنا پڑتی ہے۔

السابق تو السابق ہی ہوتے ہیں

قرآن کریم ان دو گروہوں میں امتیاز کرتا ہے اور کرنا بھی چاہیے۔ یہ امتیاز بڑی چیز ہے۔ یہ گروہ ان لوگوں کا ہے جو السّٰبِقُوْنَ

اَلۡاَوَّلُوۡنَ (9:100) ہیں۔قرآن مجید نے السّٰبِقُوۡنَ السّٰبِقُوۡنَ (56:10) السابق تو السابق ہوتے ہیں' ان کے متعلق کیسا انداز قرآن کریم نے اختیار کیا ہے! اب مزید اور کیا کہنا ہے کیا بات ہے! صاحب! خدا کی بھی! کہا ہے کہ السابقون کی بات پوچھتے ہو کہ السّٰبِقُوۡنَ اَلۡاَوَّلُوۡنَ (9:100) ہوتے ہیں جو اُولٰٓئِکَ الۡمُقَرَّبُوۡنَ (56:11) سب سے پہلے ہوتے ہیں' سب سے قریب تر ہوتے ہیں' جنہیں ہم مقرب بارگاہ خداوندی کہتے ہیں۔اب تو ہمارے ذہن میں یہ کچھ اور ہی قسم کے لوگ آتے ہیں۔

عزیزانِ من! جو مقربین ہوتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس نظام کے قیام کے لیے ابتدا کی ہے' پہل کی ہے' اس پروگرام کو شروع کیا ہے' مصیبتیں جھیلی ہیں' مشقتیں اٹھائی ہیں لیکن یہ اس کے بعد آنے والی جماعت سے پہلے ہوتے ہیں اس لیے انہیں کہا ہے کہ السّٰبِقُوۡنَ السّٰبِقُوۡنَ اُولٰٓئِکَ الۡمُقَرَّبُوۡنَ فِیۡ جَنّٰتِ النَّعِیۡمِ (56-10-11-12) سیدھی سی بات ہے جو سب سے آگے ہے وہ سب سے پہلے جنت میں چلا جائے گا لیکن وہ جو پیچھے والے ہیں ان کو Neglect (فراموش) نہیں کیا گیا یعنی یہ نہیں ہے کہ ان کے متعلق کہہ دیا جائے کہ نہیں صاحب! یہ تو کچھ نہیں ہیں۔دوسری جگہ ہے' کئی مقام ہیں' قرآن حکیم کے اس نگاہ سے جب آپ مطالعہ فرمائیں گے تو دیکھیں گے کہ لَا یَسۡتَوِیۡ مِنۡکُمۡ مَّنۡ اَنۡفَقَ مِنۡ قَبۡلِ (57:10) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو پروگرام تھا' اس سے پہلے مکے کی تیرہ سالہ زندگی مشقتوں کی' صعوبتوں کی ایسی زندگی تھی کہ جس میں دو دفعہ آپ علیہ السلام کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا' پہلی جو ہجرت تھی وہ حبشہ کی طرف ہوئی' دوسری ہجرت مدینہ کی طرف ہوئی۔اس کے بعد بھی انہوں نے پیچھا نہیں چھوڑا' مسلسل سات سال تک مدنی زندگی میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی بڑی جنگیں اور چھوٹی چھوٹی جھڑپیں جولڑنی پڑیں وہ تقریباً اَسّی بیاسی کے قریب بن جاتی ہیں۔اب اس سات سال کے عرصے میں یہ جو جماعت تھی آپ سوچیے کہ اس جماعت نے کتنی قربانیاں دی ہونگی۔اس کے بعد جو فتح مکہ ہے وہ مقام ہے جس میں پھر یہ پہلا دور ختم ہوتا ہے اور دوسرا دور آتا ہے جس میں پھر یہ جنگ نہیں ہوئی کوئی ایک آدھ جنگ اور ہوئی تھی لیکن اس میں کچھ ایسے خطرات نہیں تھے کہ یہ دوسرا دور ہے۔یہ کتنے دنوں کا دور ہے؟ یہ رسول اللہؐ کی حیات طیبہ میں تین سال بھی نہیں ہوتے۔(رمضان) 8ھ میں تو مکہ فتح ہوا تھا لیکن یہ بات بعد کی زندگی میں بھی جو یہ جماعت کے ساتھ آکر ملے ہیں' ان کے ساتھ فتح مکہ کے بعد' انہوں نے بھی قربانیاں دی ہیں' انہوں نے اس کے استحکام کے لیے' اس کے فروغ کے لیے' اس کو آگے بڑھانے کے لیے قربانیاں دی ہیں لیکن قرآن کریم نے دونوں میں فرق کیا ہے اور فرق ہونا بھی چاہیے۔کہا کہ دونوں برابر نہیں ہوسکتے۔

عزیزانِ من! یہ دوسرا دور ہے۔یہ پہلے والے لوگ وہ تھے جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے اپنا سب کچھ قربان کر دیا' میدانِ جنگ میں اتر آئے' جانیں تک دیدیں۔کہا کہ اُولٰٓئِکَ اَعۡظَمُ دَرَجَۃً (57:10) ان کے درجات یقیناً بہت اونچے ہیں۔ان کے مقابلے میں مِّنَ الَّذِیۡنَ (57:10) جو ان کے بعد آئے اَنۡفَقُوۡا مِنۡۢ بَعۡدُ وَ قٰتَلُوۡا (57:10) انہوں نے بھی کچھ صرف کیا' خرچ کیا' انہوں نے بھی

جنگیں لڑیں، انہوں نے بھی جانیں دیں لیکن جنہوں نے اس نظام کے غلبہ کے لیے سلسلۂ فتوحات سے پہلے اپنی دولت کو اس مقصد کے لیے عام کر رکھا اور اپنی جانیں ہتھیلیوں پر لیے مخالفین سے مقابلے کے لیے میدان میں نکل آئے ان کے برابر وہ لوگ نہیں ہو سکتے جنہوں نے اس کے بعد ایسا کیا۔ قرآن کریم کا انداز ملاحظہ فرمائیے کہ ان دونوں کے درجات کا جو فرق ہے، قرآن کریم نے اس کو تو بیان کیا اور اس کے ساتھ کہا کہ وَ کُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی (57:10) ان کے درجات میں فرق ہے۔ اول الذکر کے درجات بہت بلند ہیں۔ ویسے خدا کا وعدہ حسنیٰ ہے، یہ سب کے ساتھ ہے۔ کہا کہ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (57:10) ہمیں معلوم ہے کہ کون کیا کرتا ہے، کس وقت کرتا ہے اور جو درجات ہیں۔ یہ دو ہیں۔ اس نے تو امتیاز پیدا کر دیا پہل کرنے والوں اور بعد میں آنے والوں میں لیکن کہا یہ ہے کہ سب کے ساتھ ہمارا وعدہ حسنیٰ موجود ہے۔

اب قرآن کریم کی رو سے دو گروہ ہو گئے: جو پہلا تھا، اس کے لیے تو وہ جنت اولیٰ ہے جس کا پہلے ذکر کیا گیا تھا اور کہا تھا کہ اس کے علاوہ بھی دو جنّتیں ہیں، یہاں کی بھی اور وہاں کی بھی، اور یہ دو گروہ ہیں ایک السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ (9:100) کا اور دوسرا جو ان کے بعد آ رہا ہے، یہ بھی اہل جنت ہیں، یہاں ان کی زندگی بھی جنت کی زندگی ہو گی پھر یہ بتانے کے بعد کہا کہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (55:63) بتاؤ کہ تم اپنے نشوونما دینے والے کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ قرآن حکیم یہ دہرائے چلا آ رہا ہے۔ اب کہا ہے کہ مُدْهَآمَّتٰنِ (55:64) یہ جنّتیں بھی سر سبز و شاداب ہیں، ان میں انہیں بھی پھل ملتا ہے جو اس میں ان کے بعد شامل ہوں گے۔ یہ معاشرے بھی بڑے سر سبز شاداب ہوں گے فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (55:65) یہ بتاؤ کہ تم اپنے نشوونما دینے والے کی کون کون سی نعمت اور قدرت کو جھٹلاؤ گے۔

قرآنِ حکیم کی ایک اہم بات

عزیزانِ من! آگے ایک بات آتی ہے۔ میں نے یہ اس دن عرض کیا تھا جہاں قرآن حکیم نے کہا تھا کہ اس میں بہنے والے جاری چشمے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ ویسے پانی کے متعلق تو قرآن حکیم نے کہا ہے اور اب سائنس بھی کہہ رہی ہے کہ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (21:30) زندگی کا مدار پانی پہ ہے اور پھر عربوں جیسی قوم میں تو جو پانی ہے، اس کی قیمت کچھ یوں سمجھیے کہ جو بہت نادر، نایاب شے ہے، وہ ان کے ہاں پانی تھا اس لیے جہاں قرآن حکیم نعماء کا ذکر کرتا ہے، وہ اپنی اس پہلی مخاطب قوم کو سامنے رکھ کر کرتا ہے کہ وہاں سایہ دار درخت ہیں، پانی سے نخلستان ہے، یہ سارا کچھ ہے، گرمی نہیں ہے، سایہ ہے اس قوم کو مخاطب کر کے جو چیزیں ان کے نزدیک آسائش کا مدار ہو سکتی تھیں، اس میں ان کا ذکر کیا ہے اور خاص طور پر یہ بھی کہ ٹھنڈی ٹھنڈی چھائیں ہیں۔

میں نے سنا ہے کہ کشمیر میں حضرت بل میں وہاں کا ملاّ وعظ کر رہا تھا۔ وعظ کرتے ہوئے جب وہ کہنے لگا کہ جہنم میں اتنی بڑی بڑی انگیٹھیاں ہوں گی' انہی میں آگ ہوگی' لوگ مرتے ہوں گے۔ وہاں بالکل ٹھنڈ نہیں لگے گا' بالکل سردی نہیں لگے گا' تو ان لوگوں نے کہا کہ ایسی جنت میں تو جانا چاہیے۔ اگر وہاں وہ کہتا ہے کہ وہاں بڑا گہرا سایہ ہوگا' ٹھنڈی چھاؤں ہوگی' ٹھنڈا یخ بستہ پانی ہوگا تو وہ کہیں گے کہ یااللہ! اس سے تو جہنم بہتر ہے۔ یہ ہے جس طرح میں کبھی کہا کرتا ہوں کہ اگر نبی یہاں مبعوث ہوتے تو جہاں قرآن کریم نے کھجور کا ذکر کیا' یہ یقیناً آم کا ذکر کرتا۔ یہ جو اولیں مخاطب قوم ہوتی ہے' سب سے پہلے تو اس کو تیار کرنا ہوتا ہے تو اس کے معیار کے مطابق یہ باتیں کی جاتی ہیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ پانی ان کے نزدیک بھی اتنا اہم ہے اور ویسے ساری دنیا کے لیے' زندگی کے لیے' پانی بڑی چیز ہے اور قرآن کریم جو مثال دیتا ہے اس میں اس کا صحیح مقصد ہوتا ہے۔ وہاں عَیۡـنٌ جَـارِیَۃٌ (88:12) کہا تھا۔ میں نے بتایا تھا کہ یہ اس لیے کہا ہے کہ ہم چشمے کا پانی دیتے ہیں' اس کو ہر ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بہتے ہوئے رہنا چاہیے۔ جونہی آپ نے اس کے اوپر بند لگایا' یہ یَـمۡـنَـعُوۡنَ (107:7) ہوگیا' یہ ممنوع ہوگیا یعنی وہ پانی جو خدا کی طرف سے منفعت عامہ کے لیے ملا ہے' ممنوع ہوگیا۔ میں نے یہ بتایا تھا۔

قرآن حکیم کے نزدیک مُصَلِّیۡن کا جرم

قرآن حکیم نے اس کی وضاحت کے سلسلہ میں کہا ہے کہ فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ o الَّذِیۡنَ ھُمۡ عَنۡ صَلَاتِہِمۡ سَاھُوۡنَ o الَّذِیۡنَ ھُـــمۡ یُـــرَآءُوۡنَ (107:4-6) تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے جو نماز کی محسوس حرکات کو ہی سمجھتے ہیں کہ صلوٰۃ کا یہ فریضہ ادا ہوگیا۔ وَیَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ (107:7) اور اس جاری پانی کے چشمے کو' جو ہر ایک کی ضرورت کے لیے بہتے رہنا چاہیے' بند لگا کر روک لیتے ہیں۔ جن چیزوں پر زندگی کا مدار ہے' انہیں نوع انسانی کے لیے کھلا رکھنے کی بجائے ان کو بند لگا کر روک لینا اور سمجھنا کہ ہم جو نماز پڑھ آتے ہیں' تو وہ فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ کہا ہے کہ فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ (107:4) تباہی ہے ان مصلین کے لیے۔ اندازہ لگایئے' عزیزانِ من! کہ جرم کیا ہے؟ یہ کہ یَـمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ (107:7) جن چیزوں پہ زندگی کا مدار ہے' ان کو بہتے پانی کی طرح رواں رہنا چاہیے۔ اس پہ بند نہیں لگنا چاہیے۔ وہاں یہ بات بتائی تھی۔

یہاں ایک اور چیز بتائی ہے' صاحب! اس پہ تو پوچھو نہیں کہ انسان کتنا عش عش کر اٹھتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ فِیۡہِـمَـا عَیۡـنٰـنِ نَـضَّاخَتٰنِ (55:66) اب میں کیا سمجھاؤں کہ قرآن حکیم کیا بات کہہ گیا ہے۔ ٹھیک ہے ندی ہے' بہتی چلی جاتی ہے' رواں رہتی ہے۔ یہی زندگی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ بات کس سے شروع کروں۔ جو مقصد (Objective) ہے اس سے شروع کروں یا یہ بات نصاب

سے شروع کروں۔ اسلام کی یہ بنیادی شے ہے۔ انسانی زندگی ایک تو مادی پیکر (Physical Life, Phsical Body) کے اندر ہے' اس کی فزیکل (طبعی' جسمانی) ضروریات ہیں' مادی ضروریات ہیں' یہ نہایت ضروری ہیں' زندگی اسی سے قائم رہتی ہے لیکن زندگی یہی نہیں ہے۔ یہ حیوانی سطح کی زندگی ہے' انسان میں ایک اور شے بھی ہے' جسے اس نے اس کی ذات' اس کا نفس' اس کی خودی کہا ہے۔ مقصود بالذات اس انسان کی اپنی ذات یا اس خودی کی نشو ونما یا اس کا پختہ کرنا ہے۔ قرآن حکیم یہ کہتا ہے کہ اس مادی پیکر سے انسانی ذات اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بھی بڑھتی ہے اور بلندیوں کی طرف بھی جاتی ہے۔ ارتقا کے معنی ہوتا ہے اونچا بھی ساتھ ہوتے چلے جانا اور ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے آگے بھی بڑھتے چلے جانا۔ ارتقا سے یہ زندگی آگے بھی بڑھتی ہے اور بلندیوں کی طرف بھی جاتی ہے' عزیزانِ من! یہ ذرا توجہ طلب بات ہو جائے گی:

زندگی جوئے روان است و رواں خواہد بود [1]

(اقبالؒ: پیام مشرق)

قرآنِ کریم کا ایک ایک لفظ کرشمہ ہے یعنی اس کو یہیں ختم نہیں ہو جانا' سانس کے ساتھ انسان کی زندگی ختم نہیں ہوتی' اس کے جسم کی زندگی ختم ہوتی ہے' زندگی نے اور آگے بھی جانا ہے' یہ ایک ندی ہے ''جوئے رواں است و رواں خواہد بود'' [1]۔

عزیزانِ من! اس زندگی نے آگے بھی بڑھنا ہے اور بلندیوں کی طرف بھی جانا ہے۔ اب ندی کی روانی میں بلندی نہیں ہوتی' ساری روانی ہوتی ہے اور قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ اس خدا کی دی ہوئی ذات ہے جو ذی المعارج ہے۔ ایک مثال کے اندر وہ یہ اتنی سی بات سمجھا گیا ہے۔ معارج سیڑھی کو کہتے ہیں یعنی سیڑھیوں والا خدا' سیڑھی سیدھی بھی ہوتی ہے اور اوپر کی طرف بھی لے جاتی ہے جسے درجات کہتے ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ درجہ بلند ہے سیڑھی کا وہ جو ایک ایک ڈنڈا ہوندا اے ناں جنوں پوڑیاں کیندے نیں' اسے درجہ کہتے ہیں [2]۔ اس قوم کی زبان کی ایک بات اور یاد آ گئی جی! یہی سیڑھی ہے جب اوپر کی طرف آپ چڑھتے ہیں تو وہ اس کے درجوں کو درجات کہتے ہیں لیکن جب آپ اترتے ہیں' تو ڈنڈے وہی ہوتے ہیں' آپ نیچے آ رہے ہوتے ہیں' ان کو وہ درکات کہتے ہیں۔ زندگی نے سیدھے بھی جانا ہے' زندگی نے بلند بھی ہونا ہے کیونکہ یہ اس خدا کی زندگی ہے جو ذی المعارج ہے' سیڑھیوں والا خدا ہے' کچھ بلندی کا تصور بھی ہونا چاہیے۔ اب جو ندی ہے اس میں بھی بلندی کا تصور نہیں ہوتا' وہ تو سیدھی جا رہی ہے۔ یہاں زندگی کی اس بات کو یہ کہہ کر واضح کیا

---

[1] زندگی جوئے روان است و رواں خواہد بود   ایں مئے کہنہ جوان است و جوان خواہد بود
(زندگی ایک بہتی ہوئی ندی ہے اور بہتی رہے گی۔ یہ پرانی شراب جوان ہے اور جوان رہے گی)۔

[2] سیڑھی کا وہ جو ایک ایک ڈنڈا ہوتا ہے جسے Steps (اقدام) کہتے ہیں انہیں درجہ کہتے ہیں۔

ہے فِیۡهِمَا عَیۡنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ (55:66) یہ چشمے ہونگے جو اپنے زوردروں سے فورے کی طرح اوپر کو ابھر رہے ہونگے۔ اب انسانی ذات کا جو ارتقا ہے' وہ اس کے اندر آ گیا۔ قرآن کریم نے حسن عمل کے متعلق یہ کہا کہ اِلَیۡهِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ (35:10) آپ قرآن کریم کی کسی بھی آیت کا کوئی لفظ لے لیجیے کہ

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست ❶

وہ کہتا ہے کہ یہیں کھڑا ہو جا' آگے نہ جا اور سن! کہ یہ جو خدا نے قوانین دیئے ہیں' یہ کلمہ طیب ہیں' ان کے اندر بھی اس کی خصوصیت موجود ہے' صلاحیت موجود ہے کہ یہ اوپر کو اٹھتے جائیں' ان میں یہ بھی ہے لیکن ان کے از خود اوپر اٹھنے کی رفتار انسانی حساب وشمار کی رو سے بڑی سست ہوگی اور جب وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُهٗ (35:10) انسانی اعمال اسے سہارا دیتے ہیں تو اس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔

اعمالِ صالحہ کے جوشِ دروں سے انسانی ذات کے لیے استقامت اور ارتقائی منازل کی نوید

عزیزانِ من! عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ ''یرفعہ'' کے معنی اوپر جانا کے ہیں' یصعد یہ ہے جو خود اپنے زورِ دروں سے اوپر جاتا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ''بلندی اور مشقت'' کے ہیں اور یرفعہ میں ''بلند کرنا'' کے معنی ہیں راغب نے کہا ہے کہ ''رفع'' بھی تو مادی چیز جو پڑی ہوئی ہو' اسے اس کی جگہ سے اٹھا کر بلند کرنے کے لیے بولا جاتا ہے' کبھی تعمیر کے وقت دیوار وغیرہ کو کھڑا کرنے اور اوپر لے جانے کے لیے' کبھی ناموری اور شہرت کا ذکر بلند کرنے کے لیے' کبھی مرتبہ بلند کرنے کے لیے آتا ہے۔ تاج العروس نے بھی ان معانی کی تائید کی ہے۔ خود خدا کے قوانین کے اندر صلاحیت ہے کہ زمانہ آگے بڑھتا چلا جائے' یہ اپنے زورِ دروں سے اوپر ہوتے چلے جائیں گے لیکن اگر ان کے ساتھ جماعت مومنین کا عمل صالح شامل ہو جائے تو بڑی تیزی سے یہ اوپر چلے جائیں گے' مقصود اس میں رفعت ہے' بلندی کی طرف جانے کا ہے' اوپر جانے کا ہے۔

عزیزانِ من! تو اب دو باتیں ہو گئیں کہ زندگی نے رواں بھی رہنا ہے لیکن اگر وہ صرف رواں ہی رہتی ہے تو اس میں بلندی نہیں ساتھ آتی اور اس کے ساتھ ہی اس نے بلند بھی ہونا ہے۔ عَیۡنٌ جَارِیَۃٌ (88:12) کہا تو اس کے معنی ہوئے کہ اس کا جو پانی ہے وہ بہتا ہوا چلا جائے گا۔ بند نہیں لگیں گے یہاں کہا کہ عَیۡنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ (55:66) وہ چشمے جو اپنے زورِ دروں سے' فوارے کی طرح' اوپر کی طرف اٹھتے ہیں' بلندیوں کی طرف جاتے ہیں۔

---

❶ زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

علامہ اقبالؒ کی قرآنی بصیرت

کیا بات ہے بار بار اقبالؒ آ جاتا ہے! اس شخص کی بھی ان چیزوں کے اوپر عجیب نگاہ تھی اور پھر اس کے اندازِ بیان کا بھی جواب نہیں۔ اس کی یہ بات بڑے غور سے سننے کی چیز ہے۔ کتنی بڑی چیز کہہ گیا!

یہ آبجو کی روانی' یہ ہمکناریٔ خاک
میری نگاہ میں ناخوب ہے یہ نظارہ

زندگی میں روانی تو ہو لیکن اگر وہ مادے کے ساحلوں کے اندر محصور ہے' محدود ہے' مقید ہے تو یہ زندگی محدود ہوگی اور میری نگاہ میں ناخوب۔ عزیزانِ من! یہ نکتہ غور طلب ہے۔ اس شخص کو بات کہنے کی کتنی قدرت تھی! یہ آبجو کی روانی لیکن یہ ''ہمکناریٔ خاک''۔ ''میری نگاہ میں ناخوب ہے یہ نظارہ''۔ آگے کہا کہ

اُدھر نہ دیکھ اِدھر دیکھ' اے جوانِ عزیز!
بلند زورِ دروں سے ہوا ہے فوارہ

اُدھر نہ دیکھ کہ انسانی زندگی کی یہ جوئے رواں مادے کے ساحلوں کے اندر مقید چلی جائے۔ کہا کہ یہ ٹھیک ہے یہ تیری زندگی تو ہوگی' یہ چلی جائے گی لیکن یہ تو Material World (مادی دنیا) ہے۔ تیری یہ زندگی اس مادی دنیا کے ساحلوں میں گھری ہوئی ہے' مقید ہے' اس سے رفعت نہیں پیدا ہو سکتی' اس سے بلندی نہیں پیدا ہو سکتی تو پھر یہ زندگی کیا ہوئی؟ کچھ بھی نہیں:

یہ آبجو کی روانی یہ ہمکناریٔ خاک
مری نگاہ میں ناخوب ہے یہ نظارہ
اُدھر نہ دیکھ اِدھر دیکھ' اے جوانِ عزیز!
بلند زورِ دروں سے ہوا ہے فوارہ

یاد رکھ! اس ندی کی روانی کو کسی نے اچھال کر اونچا نہیں کیا' یہ زورِ دروں سے ہوا ہے' یہ تمہارے اعمال ہیں' تمہاری اپنی ذات کی قوت ہے' جس سے یہ ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے چلی جائے گی: بلند زورِ دروں سے ہوا ہے فواہ''۔ قرآن حکیم نے عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ (55:66) کہا ہے کہ زندگی کے یہی وہ چشمے ہیں جو فواروں کی طرح اونچائی کی طرف چلے جاتے ہیں' یہ انسانی ذات آبِ رواں کی طرح آگے جانے والی بھی اور فوارے کی طرح اوپر اٹھنے والی بھی ہے۔ صراط مستقیم پہ بھی چلی جا رہی ہے' خدائے ذی المعارج کے پیچھے پیچھے بھی چلی جا رہی ہے' سیڑھیاں بھی چڑھتی چلی جا رہی ہے۔ صاحب! کیا مثالیں ہیں' کیا استعارے ہیں' کیا تشبیہات ہیں! یہ زندگی اور انسانی

ذات کی آب جو کی روانی ہے۔ اُدھر قرآن حکیم کی اِدھر سمجھانے والا یہ اقبالؒ بھی' پوچھو نہیں' عزیزانِ من! کہ میری کیا کیفیت تھی! کہا ہے کہ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (55:67) کہو! خدا کی کن نعما اور کن قدرتوں سے تم تکذیب کرو گے؟ زندگی ایسی بنا دی فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ (55:68) ان میں تروتازہ پھل ہیں' کھجوریں ہیں' انار ہیں۔ اب وہ زندگی کے ان باغات کی تفصیلات ہیں کہ اس کے اندر کھجوریں ہیں' انار ہیں' بڑے بڑے مختلف قسم کے پھل ہیں' کثرت سے سامانِ حیات ہے۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (55:69) سو! تم سوچو اور بتاؤ کہ تم اپنے نشوونما دینے والے کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ اور پھر کہا کہ فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ (55:70) ان میں مرد اور عورتیں سب ہونگے۔ ایسی عورتیں ہونگی جو حسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں سے مزین ہوں۔

مذہبی پیشوائیت کا زوال عورت کے ہی ہاتھوں آئے گا

پچھلی دفعہ میں نے حوروں کے معاملے میں عرض کر دیا تھا کہ ہمارے ہاں والوں نے انہیں کتنا مسخ کر کے رکھ دیا ہوا ہے! یہ وہی ہے جو میں نے کہا ہے کہ ''آہ ان بیچاروں کے اعصاف پہ عورت ہے سوار'' اب تو ایسا نظر آتا ہے کہ شاید ان کی موت عورتوں کے ہاتھوں سے آنے والی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اس دور کے جو نئے تقاضے پیدا ہوئے ہیں' عورتوں کی حکوت میں زندہ رہنے کی بجائے مردوں کو مر جانا چاہیے۔ میں نے کہا کہ اچھا ہی ہے ''خس کم جہاں پاک''۔ یہاں پھر آیا ہے کہ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ (55:70) ان کے نزدیک تو یہ جو ہر چیز ہے' وہ یہ حوریں ہی ہوتی ہیں' وہ یہی حوروں کے متعلق ہے۔ میں نے پچھلی دفعہ حوروں کا تصور عرض کیا تھا' یہاں شاید وہ ایک بات میں نے نہیں بتائی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ ان اہل جنت کی جو بیویاں ہونگی وہ تو گھروں میں ان محلوں میں رہیں گی اور پکنک منانے باہر جائیں گے تو وہاں ٹینٹ لگائے ہوئے ہونگے' ان خیموں کے اندر حوریں ہونگی' یعنی بیویاں تو الگ ہوئیں یہ تو منکوحہ بیویاں ہوئیں جو گھروں میں رہیں گی۔

حوروں کے متعلق مودودی مرحوم کی کہی ہوئی ایک اور بات

''اوجیہڑیاں باہر Outing واسطے لے جاندے نیں''[1] آپ کے ہاں یہ ''تفہیم القرآن'' حدیث ہے جی! انگریزی میں بھی اس کے ترجمے ہو رہے ہیں' دنیا دیکھے گی کہ اسلام کیا ہے۔ ان سے پوچھا گیا تھا کہ صاحب! یہ حوریں کہاں ہونگی؟ بیویاں تو یہ گھروں میں ہو گئیں (معاذ اللہ معاذ اللہ) خدا کرے کہ اس پر کسی غیر مسلم کی نظر نہ پڑے۔ انہوں نے وہاں لکھا ہے کہ یہ غیر مسلم' کفار کی' وہ چھوٹی چھوٹی بچیاں ہونگی جو مر جائیں گی' تو خدا ان کو جہنم میں بھیجے گا نہیں' یہ وہاں جوان کر کے مومنوں کے سپرد کر دی جائیں گی۔ یہ ہونگی وہ حوریں!

---

[1] وہ (حوریں) جو سیر سپاٹے کے لیے باہر لے جائیں گے اس کے لیے......

میرے اللہ! کون باپ ہے جس کی بیٹی چھوٹی عمر میں ہی فوت ہوگئی اور کون اس کو سن سکے گا کہ اس کی اس بیٹی کو جوان کر کے ان کے سپرد کر دیا جائے گا کہ یہ جا کر ان کے ساتھ پکنک منائیں۔ انسان اس دور میں کس سے کہے ''یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زبان میری''۔ یہ وہ لٹریچر ہے جسے ضبط ہونا چاہیے' اس نے دنیا میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ غیر مسلموں کی جو معصوم بچیاں' فوت ہو جائیں گی' ان کو وہاں جوان کر کے' ان جنتیوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یا للعجب!

قرآن کریم بتاتا یہ ہے کہ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ (55:72) عورت کی سب سے بڑی خصوصیت عصمت اور عفت کی حفاظت ہے۔ حضرت مریمؑ کو قرآن کریم نے کہا کہ وہ منتخب تھیں' ان کا ذکر اس طرح سے کیا ہے کہ ہم بھی جب نام لیتے ہیں تو یہ جو علیہ السلام' صرف انبیائے کرامؑ کے لیے ہے' یہ حضرت مریمؑ کی ایک خصوصیت ہے' کہ ان کے نام کے ساتھ ہمارے ہاں علیہ السلام بھی لکھتے اور کہتے ہیں۔ یہ بڑی خصوصیت ہے۔ قرآن حکیم نے ان کی خصوصیت کیا بتائی ہے؟ کہ یہ اس قسم کے غلط ماحول کے اندر' اس نے اتنی مخالفتوں کے باوجود' اپنی عصمت کو محفوظ رکھا۔ یہ اس قابل ہے کہ اس عورت پر تم درود و سلام بھیجو۔ خدا کے ہاں اس کی اتنی قدر و قیمت ہے کہ قرآن کریم نے اس کا ذکر کیا ہے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ فِیْهِنَّ خَیْرٰتٌ حِسَانٌ (55:70) ان میں مرد اور عورتیں سب ہونگے اور ایسی عورتیں ہونگی جو حسنِ صورت اور حسنِ سیرت کی ملکہ ہوں۔ اس کے بعد قرآن کریم نے پھر دہرایا فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:71) سوچو کہ تم اپنے نشو ونما دینے والے کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ اگلی آیت میں کہا کہ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ (55:72) وہ عورتیں ایسی فہم و فراست کی مالکہ ہوں گی جو انسان کو کسی فریب کی طرف نہ لے جائے' نہ ہی ان کے مزاج میں آوارگی ہوگی' وہ عفت و عصمت کا پیکر ہونگی اور کہا کہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:73) سنو! تم اپنے نشو ونما دینے والے کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ کتنا بڑا اطمینان ہوگا اس جنتی معاشرے میں' اس جوان لڑکے کو جو ایک لڑکی سے نکاح کرنے والا ہے اور اس کے متعلق اس کو یہ یقین ہو کہ لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ (55:74) اسے اپنے اور بیگانوں میں سے کسی نے Touch (چھوا) تک نہیں کیا' وہ عفت و عصمت کا پیکر ہیں اور پھر کہا کہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:75) سو بتاؤ کہ تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ اور پھر وہ آسائشیں ہیں کہ مُتَّکِئِیْنَ عَلٰی رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِیٍّ (55:76) فرش' قالین' نہایت عمدہ تکیے' سبز رنگ کے ریشم ہیں جن پر متمکن ہوں گے۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:77) بتاؤ کہ کن کن باتوں کی تم یہ تکذیب کرتے چلے جاؤ گے؟ یہ ہے اس نظام ربوبیت کے خوشگوار اور حیات بخش نتائج کی ایک ہلکی سی جھلک جو تمہارے نشو ونما دینے والے کے قوانین کے اتباع سے مشکل متشکل ہوگا۔ کہا کہ تَبٰرَکَ اسْمُ رَبِّکَ ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ (55:78)۔

لفظ برکت کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! اب یہاں (55:78) میں خدا بھی کس بات کا ذکر کر رہا ہے؟ یہ ہے برکت۔ ہم تو یونہی کہتے ہیں کہ اللہ برکت دے دے، برکت پائے'' روٹی کھان لگیاں بسم اللہ پڑھ لیا کرو کہ برکت پیندی اے [1]''۔ کبھی یہ بات تھی اور واقعی یہ تھی لیکن اس کے کیا معنی ہیں؟ یہ برکت کیا چیز ہے؟ خدا کے متعلق ہے کہ تَبٰـرَکَ اسْمُ رَبِّکَ (55:78) رب کا برکت والا مبارک نام ہے۔ برکت کے معنی کیا ہوتا ہے؟ یہ عجیب قوم تھی اور عجیب قرآن حکیم نے الفاظ چنے ہیں۔ کوئی شے جو اپنے مقام پہ مستحکم بھی ہو اور وہ بڑھتی بھی چلی جائے، پھولتی چلی جائے، نشوونما بھی پاتی چلی جائے، مستحکم بھی ہو، نشوونما بھی پا رہی ہو، یہ ہے برکت۔ دیکھا یہ دو متضاد سی چیزیں نظر آتی ہیں۔ جڑیں اس کی مستحکم ہوتی ہیں، نشوونما پاتا اوپر کو چلا جاتا ہے۔ جب نشوونما کی یہ کیفیت ہو کہ اپنے مقام کے اوپر وہ مستحکم بھی ہو اور اس کے ساتھ وہ نشوونما پاتا ہوا بڑھتا بھی چلا جائے تو اس کو برکت کہتے ہیں۔ خدا کی یہ صفت تبارک کہی ہے وہ اس لیے کہ تم بھی خدا کی اس صفت کو اپنے اندر منعکس کرو تا کہ تم اپنے مقام کے اوپر مستحکم بھی رہو اور بڑھتے بھی چلے جاؤ، پھولتے پھلتے بھی چلے جاؤ، نشوونما پاتے بھی چلے جاؤ۔ اپنے مقام کے اوپر مستحکم رہو کہ اس کا پاؤں اس کی سائیکل کے اوپر جما ہوا ہو اور پھر جو دوسرا پاؤں ہے وہ ساری دنیا میں گھومتا پھرتا رہے۔ اگر یہ پاؤں اپنے مقام سے ہل گیا، سارا دائرہ ناس ہو جائے گا۔ یہ ہے استحکام کے ساتھ نشوونما پانا۔ یہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ اس کو برکت کہتے ہیں۔ ہے خدا کی برکت: رَبِّکَ ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ (55:78)۔

عزیزانِ من! میں نے کہا تھا کہ الآء جو آیا ہے اس سورۃ میں فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:77)۔ اس کا ترجمہ نعمتیں ہی کیا جاتا تھا تو میں نے کہا تھا کہ یہ جو مکافاتِ عمل ہے یہ مجرموں کو گرفت کرنا، ان کو عقوبت لینا، ان کے لیے سزا ہونا، تباہی ہونا تو یہ کون سی نعمت ہے؟ اٰلَآءِ کے معنی نعمت اور قدرت دونوں ہوتے ہیں، جلال اور جمال دونوں اس کے اندر آتے ہیں۔ اس سورۃ کا اختتام ہو رہا ہے اور فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:77) کا دونوں سے کہا کہ الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ (55:78)۔ وہ صاحب جلال بھی ہے، صاحب کرام بھی ہے، اس کی قدرتیں ہیں اور قدرتیں بھی حاصل ہیں اور نعمتیں اور آسائشیں بھی حاصل ہیں۔ جلال کے متعلق ہی ہے کہ یہ لفظ بڑا وسیع المعنی ہے۔

انسان کے لیے اکرام یا کریم کے لفظ سے بڑھ کر اور کوئی لفظ ہی نہیں

آپ کو معلوم ہے کہ اس کے اندر جلال پایا جاتا ہے، جلوت ہوتی ہے اور اکرام کا لفظ تو عربی زبان کے اندر پوچھو نہیں کہ کن عظیم

---

[1] کھانا کھاتے وقت بسم اللہ پڑھ لیا کرو۔ اس سے برکت ہوتی ہے۔

معنی کا حامل ہے! انسان کے لیے اس سے بہتر کوئی اور صفت کا لفظ ہی نہیں تھا۔ اس لفظ کے سینکڑوں معنی ہیں لیکن جس کے متعلق انہوں نے کہہ دیا کہ کریم ہے بس سمجھ لیا کہ انہوں نے صفت کی انتہا کر دی کہ جو خدائے ذوالجلال والاکرام ہے' اس پہ سورۃ کا اختتام ہوا ہے کیونکہ شروع سے آخر تک کہتا چلا گیا تھا فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (55:77) تم خدا کی کون کون سی نعمتوں اور قدرتوں کی تکذیب کرو گے' وہ خدا جو صاحب ذوالجلال والاکرام بھی ہے اور اس لیے عبدِ مومن یا جماعت مومنین کو بھی صاحب ذوالجلال والاکرام ہونا ہوگا' جلال بھی ہو گا اور اکرام بھی ہوگا' قوت بھی ہوگی اور نوازشیں بھی ہونگی۔

عزیزانِ من! یہاں یہ سورۃ الرحمٰن ختم ہوئی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀❀............❀❀............❀❀

سورة الواقعة

پہلا باب: **سورة الواقعة** (آیات 1 تا 19)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج فروری 1983ء کی 18 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الواقعۃ سے ہو رہا ہے۔ یہ 27ویں پارے کی 56ویں سورۃ ہے۔

خارجی کائنات میں ہونے والے حوادث کا بیان اور مفسرین کا تصور مگر ان کا مقصد کیا؟ ایک سوال

بات ہی شروع ہوتی ہے: اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (56:1) جب وہ ہونے والا واقعہ واقع ہو جائے گا۔ اس 27ویں پارے میں دو ایک سورتیں ہی اور باقی ہیں، اٹھائیسواں پارے بالخصوص انتیسویں اور تیسویں پارے میں، یہ چیزیں التزاماً آپ کے سامنے آئیں گی، جن میں کہا جائے گا کہ جب یہ زمین پھٹ جائے گی، آسمان سرخ ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، گرد و غبار کیطرح اڑ جائیں گے۔ یہ چیزیں بار بار ان سورتوں میں آئیں گی اور جیسا میں نے عرض کیا ہے انتیسواں اور تیسواں پارہ تو بالخصوص اسی قسم کے واقعات سے بھرا ہوا ہے۔ ہمارے ہاں کے متقدمین اور انہی کے اتباع میں متاخرین بھی ان کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ قربِ قیامت کی نشانیاں بتائی گئی ہیں۔ جب یہ ہوگا تو پھر قیامت آئے گی، زمین پھٹ جائے گی، آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، پہاڑ اڑ جائیں

گے ریزہ ریزہ ہوجائیں گے اور پھر قیامت آجائے گی۔ قیامت یعنی اس زندگی کے بعد دوسری زندگی آجائے گی۔ اس زندگی پر تو ہمارا ایمان ہے۔ اسے یوں کہیے کہ وہ تو ہمارا جزو ایمان ہے' ایمان کی بنیاد ہے' اس میں تو کوئی شک وشبہ نہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے قرآنِ کریم صرف موت کے بعد کی زندگی کا ہی ذکر نہیں کرتا' وہ اس زندگی میں بھی' جو انقلابات آتے ہیں' ان کا بھی ذکر کرتا ہے۔ یہاں کی جہنم کی زندگی کا ذکر کرتا ہے اور اگر قرآن کریم کے مطابق صحیح نظام ہو تو یہاں جنتِ ارضی کا بھی ذکر کرتا ہے اس لیے قرآن کریم میں جہاں اس قسم کے مقامات آئیں تو وہاں یہ دیکھنے کی بات ہوتی ہے کہ وہ یہاں کی قیامت کے متعلق ذکر کررہا ہے یا مرنے کے بعد کی قیامت کے متعلق۔ یہ جو اس قسم کے واقعات کا ذکر آتا ہے کہ زمین پھٹ جائے گی' آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گا' پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجائیں گے تو ان سب واقعات کا ذکر کرنے سے مقصود کیا ہے' ہمیں اس کا فائدہ کیا پہنچتا ہے؟

عزیزانِ من! یہ بھی صحیح بات ہے کہ یہ جو خدا کی مادی تخلیق ہے' جو کچھ بھی اس نے پیدا کیا ہے' وہ ابدی نہیں ہے۔ وہ اِلَـٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (11:3) ہے۔ وہ ایک مدتِ معینہ کے لیے قانونِ فطرت کے مطابق' اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق' وجود میں لایا گیا اور اس کے بعد اس نے معدوم ہونا ہے' اس کا کچھ انجام ہونا ہے' یہ ابدی نہیں ہے لہٰذا یہ چیز بھی ہمارے ایمان میں ہے کہ ٹھیک ہے خواہ یہ ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے یا ویسے معدوم ہوجائے' ہم نہیں کہہ سکتے لیکن سوال یہ ہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے جب قرآنِ کریم نازل ہوا' اس کے بعد چودہ سو سال کی زندگی میں یہ آیات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ قیامت تک کے لیے ان آیات نے ابدی طور پر ہمارے سامنے رہنا ہے تو ان سے ہمیں کیا فائدہ ہے کہ آخر میں جا کر پتہ نہیں کہ وہ آخرت کب آنی ہے کہ یہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجائیں گے' آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں گے' زمین ٹکڑے ہوجائے گی۔ اگر یہ طبعی طور پر ایسا ہی ہونا ہے تو یہ ہوجائے گا' ہمارا آج اس سے کیا تعلق؟ یہ تو ہمارا ایمان ہے کہ یہ کچھ نہیں رہنا' نہ زمین' نہ آسمان' نہ پہاڑ' نہ طبعی کائنات۔ ٹھیک ہے لیکن یہ چیز کہ اس طرح سے قرآنِ کریم کے ان پاروں میں' اس شدومد سے اعادہ وتکرار کا' ہمیں کیا فائدہ ہے؟

عربی زبان کے مطابق قرآن حکیم الفاظ کے لغوی اور مجازی معنی پیش کرتا ہے مثلاً جبل' ارض' سما

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم سمجھنے کے لیے دو باتیں ذہن میں رکھیے۔ عربی زبان میں بھی ایک تو لفظ کے لغوی معنی ہوتے ہیں (مثلاً) پہاڑ یعنی یہی جس کو ہم Mountain کہتے ہیں جیسے ہمالیہ پہاڑ ہے' فلاں پہاڑ ہے۔ پہاڑ کے یہی معنی ہیں کہ پہاڑ ہے۔ ایک اس کے مجازی معنی بھی ہوتے ہیں۔ عام زبانوں میں بھی یہ چیز ہوتی ہے اور عربی زبان میں تو کثرت سے یہ مجازی معنی ہوتے تھے' ایک ایک لفظ کے سو سو معنی ہوتے تھے۔ ان عربوں کے ہاں یہ بڑی وسیع زبان تھی۔ یہ زبان میں وسعت تو پیدا اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ الفاظ

کے مجازی معنی بھی لیے جائیں۔ وہ عرب جبل یا پہاڑ کے معنی یہ پہاڑ ہی نہیں لیتے تھے، جس کو ہم Mountain کہتے ہیں، بلکہ اتنے بڑے بڑے سردار جن کے کھونٹے پہاڑوں کی طرح گڑے ہوئے ہوں، انہیں بھی یہ کہتے ہیں۔ ارض صرف زمین نہیں تھی، بلکہ ان کے ہاں کے مظلوم محکوم ضعیف کمزور انسان جنہوں نے انہیں غلامی کے طوق پہنا رکھے تھے، جسے کہتے ہیں کہ ان کو پاؤں تلے روندا جاتا تھا۔ وہ اس پستی کو ارض کہتے ہیں۔ ویسے بھی ارض کے معنی ہی پستی کے ہیں اور سماء کے معنی ہی بلندی کے ہیں۔ یہ جو ہمارے ہاں آسمانوں کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ہے، یہ ہے جو اپنے آپ کو آج بلند مقام کے اوپر رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں کہا ہے کہ تم دیکھو گے کہ ان کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اب اگر ان کے یہ معنی مجازی لیے جائیں تو ساری بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ بات کیا ہو رہی ہے۔

حق و باطل کی کشمکش اور صاحبِ قوت کا نشہ شروع سے آج تک جاری و ساری ہے

قرآن کریم شروع سے آخر تک بیان کرتا ہے کہ یہاں حق اور باطل کا تصادم ہے، کشمکش ہے، ٹکراؤ ہے۔ وہ باطل کے نظام، ملوکیت، سرمایہ داری، مذہبی پیشوائیت کی بات کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان کے کھونٹے پہاڑوں کی طرح گڑے ہوئے تھے، ان کو کون ہلا سکتا تھا اور باقی انسانوں کی بات کہتا ہے کہ انہوں نے انہیں اپنے پاؤں تلے روندا ہوا تھا جیسے کہتے ہیں کہ انہیں راستوں کا غبار کر دیا ہوا تھا۔ ان میں ہمت نہیں تھی کہ وہ سر بھی اُٹھا سکیں۔ تمام انبیائے کرامؑ کی یہ ساری کد و کاوش اس کے خلاف تھی اور پھر نبی اکرم ﷺ کی یہ جو داستان ہے، وہ قرآن کریم کے اندر مسلسل التزاماً بیان ہوئی ہے۔ وہ داستان ہی یہ ہے کہ مقابلے میں قریش ہی نہیں تھے بلکہ اور قبائل بھی تھے۔ انہوں نے بھی اس قسم کا ہی نظام قائم کر رکھا تھا کہ جس میں یہ جو چند بڑے بڑے تھے، جن کو قرآن کہتا ہے کہ ان کی کوٹھیوں میں دانے بھرے ہوئے ہیں، ان کا طرہ امتیاز آسمان تک جاتا ہے، وہ پہاڑوں کی طرح اپنے آپ کو مستحکم سمجھتے ہیں کہ ہمیں اپنے مقام سے کوئی ہلا نہیں سکتا۔ یہ وہ قریش تھے، یہ وہ سردارانِ قوم تھے جو اس نظام کی مخالفت کرتے تھے اور یہ وہ نظام تھا کہ جنہیں تم نے پامال کر رکھا ہے، یہ ان بلندیوں پر آئیں گے۔ یاد رکھو! کہا یہ گیا تھا کہ انسانیت کے اندر مساوات پیدا ہوگی کہ پاؤں تلے کچلے جانے والے انسان نہیں ہوں گے، بلکہ یہ جو اپنے غرور اور تکبر اور فخر کے اندر، اپنے طروں کو اتنا اونچا اونچا بنا کر کہہ رہے ہیں کہ ہمیں کوئی ہلا نہیں سکتا، تم دیکھو گے کہ تم کس طرح سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہو، پاش پاش ہو جاتے ہو، گرد و غبار ہو جاتے ہو، راستوں کی راکھ ہو جاتے ہو، اور یہی جنہیں تم پاؤں کے نیچے آج اس طرح سے کچل رہے ہو، کل تم دیکھو گے کہ وہ کس طرح تمہارا مقام لے لیتے ہیں۔ یہ تھی ساری کشمکش۔ یہ ہیں وہ سارے حالات۔ جب آپ قرآنِ کریم کے اٹھائیس پارے تک آئیں گے تو کسی آنے والے انقلاب کی تمہید آپ کو نظر آئے گی۔ بار بار آپ دیکھیں گے اور اب آپ نے دیکھ لیا ہے کہ یہ چیز آتی ہے کہ ان سے کہہ دو کہ اس نظام کا انجام تمہاری تباہی ہوگا۔ اب بھی وقت ہے کہ تم اس میں تبدیلی

کرلو' صحیح نظام قائم کرلو تو اس تباہی سے بچ جاؤ گے۔ اگر ایسا نہ کیا تو پھر تمہیں کوئی شخص نہیں بچا سکے گا' تمہارا کوئی حامی وناصر اور مددگار نہیں ہو سکے گا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ مسلسل یہ تعلیم آ رہی ہے اور وہ مقابلے میں بار بار یہ کہتے تھے کہ ہماری ساری زندگی یہی کچھ تمہاری زبان سے سنتے ہوئے گزر گئی' تو لاؤ وہ انقلاب' کہاں ہے' وہ انقلاب جسے ہماری تباہی کا موجب بننا ہے' ہمیں تو کہیں نظر نہیں آتا۔ وہ اس چیز کو جھٹلاتے تھے کہ ہمیں ہمارے مقام سے کون ہلا سکتا ہے۔ ہم تو پہاڑوں کی طرح گڑے ہوئے ہیں' آسمان کی طرح بلند ہیں۔ یہ ساری داستان ہی یہ چلی آ رہی ہے اور قرآن کریم اس کے جواب میں کہتا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ ہم نے یہ مہلت کا وقفہ دے رکھا ہے کہ شاید یہ بات تمہاری سمجھ میں آ جائے تو تم اس تباہی سے بچ جاؤ لیکن اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہی یونہی جھوٹی بات ہے جو تمہیں کہی جا رہی ہے' کوئی اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا اور جو ہر صاحبِ قوت ہے' وہ اسی نشے میں مست ہوتا ہے کہ مجھے کوئی نہیں ہلا سکتا تو تم زعمِ باطل میں ہو۔

زوالِ ظلم اور پروازِ حق ہر آن اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتے ہیں: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثال

عزیزانِ من! قرآنِ پاک نے کہا کہ یہ غلط ہے' یہ زعمِ باطل ہے جو تمہارے ذہن کے اندر ہے' باطل کا نظام کبھی حق کے سامنے ٹھہر ہی نہیں سکتا' یہ تو سورج کے نکلنے کی دیر ہے' کوئی ستارہ تمہیں نظر ہی نہیں آئے گا۔ یہ ساری داستان یوں چلی آ رہی ہے اور جیسا کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں بتایا گیا ہے' اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ جاؤ فرعون کی طرف' وہاں بھی یہ تھا کہ دیکھو! اس کے اقتدار کے کھونٹے کتنے گہرے گڑے ہوئے ہیں جو سمجھ رہا ہے کہ ہمیں کوئی بھی ہلا نہیں سکتا۔ کہا تھا کہ وہاں جاؤ۔ آپ نے کہا کہ یہ کیا چیز ہے؟ کہا کہ یہ آنے والا انقلاب ہے' جو اس وقت تک آہستہ آہستہ' غیر محسوس طور پر' اندر ہی اندر' نیچے ہی نیچے' آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا' اب وقت آ گیا ہے کہ وہ نمودار ہو کر سامنے آ جائے تو جاؤ فرعون کی طرف۔ اس انقلاب کے متعلق بھی قرآن پاک نے بتا دیا کہ یہ انقلاب بہت پہلے سے ہی شروع ہوا ہوتا ہے۔ یہ جو کمزور ضعیف نادار مظلوم طبقہ ہے' جن پہ اس قدر ظلم ہوتا ہے' سلب ونہب ہوتا ہے' وہ اس کو محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے اوپر زیادتی ہو رہی ہے' ظلم ہو رہا ہے' ہماری محنت کے ماحصل کو کوئی کسی طرح سے نچوڑ کر لیے چلا جا رہا ہے' سمجھ میں بات نہیں آتی کہ کیا کریں لیکن اندر ہی اندر یہ وہاں چیز آ رہی ہوتی ہے۔ سورۃ التوبۃ میں تو قرآن کریم نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہا ہے کہ یہ انقلاب آہستہ آہستہ' زیرِ زمین' تو چلا آ رہا ہے۔ اب ہم چاہت ہیں کہ وہ ابھر کر سامنے بھی آ جائے۔ اس کے لیے کسی ایک صاحبِ کلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہوتا تو وہ بھی مظلوم طبقہ' کمزور طبقہ' محکوم طبقہ ہے' جن کو دبایا ہوا' کچلا ہوا ہوتا ہے' ہوتے تو یہ ان کے ہی زیرِ غلامی ہیں لیکن کسی ایک فرد کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کو مجتمع کر کے' ان کی امامت کر کے' سامنے کھڑا ہو جائے تو پھر یہ انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ اس داستان کو دہراتے ہوئے کہتا ہے کہ

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ ؑ طلسمِ سامری

تباہ حال قوم میں پیدا ہونے والا ایک فردِ مومن ان کے لیے جہانِ نو پیدا کرنے کا موجب بن جاتا ہے

عزیزانِ من! بات تو خونِ اسرائیل کے جوش میں آنے کی ہوتی ہے۔اس سے پہلے یہ وہاں پک رہا ہوتا ہے‘ وہ انتظار کر رہا ہوتا ہے کہ کوئی موسیٰ علیہ السلام آئے جو طلسم سامری کو توڑ دے۔ ہر جگہ یہی ہوتا ہے۔حضور ﷺ کے زمانے میں بھی یہی صورت تھی کہ ان کی تعداد‘ جو پہاڑوں کی طرح محکم ہوتے ہیں اور جن کا طرہ امتیاز آسمانوں تک جاتا ہے‘ ہوتی کتنی ہے۔ مدینے اور مکے کی زندگی میں میں غلاموں کی آبادی قریباً 75% تھی۔ وہ اوپر والا طبقہ گنتی کا ہوتا ہے لیکن ان کے پاس قوت ہی اتنی ہوتی ہے کہ یہ بیچارے تعداد کی کثرت کے اعتبار سے اُٹھ ہی نہیں سکتے۔ کسی ایک کی ضرورت ہوتی ہے جو ان غریبوں کا مددگار بن کر سامنے آئے‘ ساری مصیبتیں جھیلے‘ خود ان دشمنوں کے تیروں کو‘ ان مظلوموں کی حفاظت کے لیے اپنی چھاتی پر لے۔قوت اُن کی ہوتی ہے جن کے خلاف دلوں کے اندر جذبات کے لاوے پک رہے ہوتے ہیں۔ان جذبات کے پھوٹنے کا وقت آ گیا ہوتا ہے۔ یہ جہانِ نو پیدا کرنے کا موجب بن جاتا ہے۔

قرآن حکیم کے پہلے 27 پارے ایک انقلابِ عظیم کا نصاب پیش کرتے نظر آتے ہیں اور اگلوں میں وہ انقلابِ عظیم آ گیا ہے

عزیزانِ من! قرآنِ حکیم شروع سے 27 ویں پارے تک یہ تمہید بیان کرتا چلا آتا ہے اور ان پاروں کے بعد 28 ویں پارے میں آ کر ایک انقلاب نظر آتا ہے۔ یاد رکھیے! جس طریق سے یہ انقلاب آنا ہوتا ہے‘ قرآن کی یہ تصویب بھی بڑی ہی تدریجی واقع ہوئی ہے۔قرآن حکیم ایک نصاب کی کتاب ہے۔ وہ شروع سے بات اس طرح آہستہ آہستہ آگے لاتا ہے کہ یہ جو انقلاب کے سارے منازل ہیں‘ وہ سامنے آ جاتے ہیں۔اس اعتبار سے اگر آپ قرآن کا مطالعہ کریں تو آپ کو عجیب چیز نظر آئے گی۔ وہ ان منازل کو بتاتا جاتا ہے‘ تدریجاً آگے لاتا چلا جاتا ہے‘ آہستہ آہستہ بڑھاتا چلا جاتا ہے۔آخری پاروں میں آ کر پھر وہ کھلے بندوں یہ بات کہنی شروع کر دیتا ہے کہ اب یہ پہاڑ‘ پہاڑ نہیں رہیں گے‘ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے‘ یہ تمہارے آسمان پہ جو طرہ امتیاز والی پگڑیاں ہیں‘ وہ اس فضا کے اندر بکھری ہوئی نظر آئیں گی‘ یہ جو اس طرح کچلے ہوئے لوگ ہیں‘ یہ ابھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ وہ پھر ان الفاظ میں آخری پاروں میں لے آتا ہے اور اس کے بعد پھر یہ انقلاب آیا۔

جنگِ بدر میں ابوجہل کے تکبر اور تفاخر کی ذہنیت کا عالَم

عزیزانِ من! پوچھو نہیں کہ یہ اس زمانے کے جو طرہ باز تھے' ان کا تکبر اور تفاخر کتنا تھا! وہ کیا تھے! ان کی ذہنیت کی کیا تھی! اس کی ایک مثال دیکھیے۔ بدر کے میدان میں جب ابوجہل کا سر کاٹنے لگا' وہ ایک مسلمان مجاہد نوجوان ہی تھا تو اس نے کہا کہ میری گردن ذرا نیچے سے کاٹنا۔ اس مجاہد مسلمان نے کہا: او! وہاں تو بڑی تکلیف ہوگی' وہاں تو ہڈیاں ہوتی ہیں۔ یہ تم کا ہے کے لیے کہہ رہے ہو کہ ذرا نیچے سے کاٹنا۔ اس نے کہا کہ یہ کیوں کہتے ہو؟ ان کے ہاں رواج تھا کہ جنگ کے بعد یہ جو مقتولین ہوتے تھے' ان کے سر کاٹے جاتے تھے اور پھر نیزوں پہ سر کو ٹانگ کر ان کا جلوس نکالا کرتا تھا' ابوجہل کہنے لگا کہ میں چاہتا ہوں کہ جب اس کے بعد یہ جلوس نکلے تو ابوجہل کا سر باقیوں سے چار انچ اونچا نظر آئے یعنی ان کے تفاخر کی' ذہنیت کی' یہ کتنی کیفیت تھی کہ یہاں سینے سے گردن کاٹنے میں بھی تکلیف کیوں نہ ہو' یہ میں برداشت کر لوں گا لیکن چاہتا یہ ہوں کہ اس جلوس میں ابوجہل کا سر باقیوں سے اونچا نظر آئے۔ یہ ہوتا ہے تکبر اور تفاخر کی ذہنیت کا عالَم۔

کسی بات کو موثر انداز میں پیش کرنے کے لیے مجازی معنی زیادہ مفید ثابت ہوتے ہیں

عزیزانِ من! یہ تھی وہ قوم جن کے ساتھ واسطہ پڑا تھا اور مقابلے میں' میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ساری آبادی' قریباً جتنی بھی تھی' ان کے پاؤں تلے کچلی ہوئی تھی' یہ اس زمانے کے گرد و غبار تھے۔ اب اس کو سامنے رکھیے اور پھر آیئے ان پاروں میں۔ یہ جو کچھ کہا گیا ہے' عربوں کی زبان کے اعتبار سے ہی' ان کے مجازی معنی لیجیے۔ یاد رکھیے! یہ بات نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے کہیں مجازی معنی لے لے' جس کا جی چاہے کہیں لغوی معنی لے لے۔ ان کی زبان میں ہی مجازی معنی موجود تھے۔ اب سوال اتنا ہی باقی رہ جاتا ہے کہ ٹھیک ہے' آپ اس کے لغوی معنی لیتے ہیں' تو یہی کہیں گے کہ ٹھیک ہے' ہمالیہ پہاڑ کے جو پتھر ہیں' وہ اڑ جائیں گے اور اوپر چلے جائیں گے۔ ان کے ہاں بھی جبل کے مجازی معنی سردارانِ قوم لیے جاتے تھے۔ بہرحال یہ جو لینے والا ہے' وہ یہ کہے گا کہ ان سردارانِ قوم کی نخوت کے طرّے اس فضا میں اڑتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ آج بھی اس انداز میں باتیں کی جاتی ہیں' لکھا جاتا ہے' میرے ہاں میری تحریروں کے اندر آپ دیکھیں گے اور یہ بڑا مؤثر طریق ہوتا ہے۔ قرآن حمید نے یہی انداز اختیار کیا ہے۔

قرآنی الفاظ کے مجازی مفہوم کی بلاغت اور وضاحت اور ہمارے مفسرین کا ماجرا

عزیزانِ من! اس کے لیے دلیل کیا ہے کہ ان مقامات میں یہ چیز مجازی معنوں میں لی جاتی ہے؟ یہاں بھی دیکھیں گے جو سورۃ ہمارے سامنے آ رہی ہے اور دیگر مقامات میں بھی آپ دیکھیں گے کہ پہاڑوں کا' آسمانوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّىْ نَسْفًا (20:105)۔ یہ پوچھتے ہیں تم سے جبال کے متعلق۔ اب لغوی معنی لینے والا تو کہے گا کہ پہاڑوں کے متعلق

پوچھتے ہیں۔ انہی کے ہاں جو مجازی معنی ہیں، وہ یہ کہیں گے کہ یہ جو اتنے بڑے بڑے سردارانِ قوم ہیں، جن کا زعمِ باطل یہ ہے کہ ہمیں کوئی ہمارے مقام سے ہٹا نہیں سکتا، ہم جمے ہوئے ہیں، ہم مستحکم ہیں، ان کے متعلق پوچھا جاتا ہے کہ ان کا انجام کیا ہوگا؟ **فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا o لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّ لَآ اَمْتًا** (20:106-107)۔ ان سے کہو کہ ان کا انجام یہ ہوگا کہ غبار کی طرح اڑ جائیں گے۔ ان میں نہ کوئی کمی باقی رہے گی، نہ کوئی ناہمواری باقی رہے گی، روڈ رولر پھیر دیا جائے گا۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ہمالیہ پہاڑ یا اس سے کچھ چھوٹا کے ٹو والا بھی اس طرح سے ہموار کر دیا جائے تو اس کا اثر ہم پہ کیا پڑتا ہے۔ وہ تو ان کے متعلق کہا جا رہا تھا کہ ان سے کہو کہ یہ ہوگا حشر۔ اب اس کے بعد یہ کہ یہ معنی کیسے لیے گئے؟ پہاڑوں کے ٹوٹ جانے سے، ان کے پتھروں کے پھٹ جانے سے، انسانی دنیا کو تو کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کے بعد اب دیکھیے کہ کیا ہے؟ کہا کہ **يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ** (20:110) جس دن یہ واقعہ ہوگا، پھر کسی کی سفارش کسی کام نہیں آئے گی۔

عزیزانِ من! اگر یہ پتھروں والا پہاڑ ٹوٹتا ہے تو اس کے ساتھ یہ معنی کہ کسی کی سفارش کام نہیں آئے گی بالکل ان جوڑ سی بات ہے۔ آگے کہا ہے کہ **وَ عَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ** (20:111) خدائے حیی وقیوم کے سامنے گردنیں جھکی ہوئی ہوں گی۔ قرآن کریم تو معنی آپ بتا رہا ہے۔ بات شروع کی ہے کہ وہ ان پہاڑوں کے متعلق پوچھتے ہیں تو وہ ان پہاڑوں کے متعلق، جو وہاں فاران کی چوٹیاں کے ان پتھروں کے متعلق نہیں کہا جا رہا، جو کہا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ساری ناہمواریاں دور ہو جائیں۔ ان سردارانِ قوم سے زمین صاف کر دی جائے گی، ان کی گردنیں پھر خدا کے سامنے جھکی ہوئی ہوں گی۔ کہا کہ **وَ قَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا** (20:111) جو اس قدر ظلم کر رہے ہیں وہ اس وقت تباہ اور برباد ہو جائیں گے۔ آگے کہا ہے کہ **وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّ لَا هَضْمًا** (20:112) پھر اس وقت کسی کو اس کا ڈر نہیں رہے گا کہ مجھ پہ کوئی ہوگا یا میری محنت کو کوئی کھسوٹ کر لے جائے گا۔ اس وقت کسی کو اس کا ڈر نہیں ہوگا۔ تو صاف ظاہر ہے کہ اس وقت جو پہاڑ کی بات ہو رہی ہے، یہ پہاڑ اگر ہموار بھی ہو جائیں تو یہ کیا ہوگا کہ جن محنت کشوں کی محنت کو، خون پسینے کی کمائی کو، یہ لوٹ کر لے جا رہے ہیں، ان پہ کیا اثر پڑے گا۔ وہ تو اور محنت کش وہاں بھیج دیں گے کہ جاؤ! پتھر بھی اٹھاؤ۔ یہ کیا چیز ہے کہ ان کا یہ استحکام اور ان کی یہ پہاڑیت کہہ دیجیے گا، ختم ہو جائے گی، ہموار ہو جائیں گے، روڈ رولر پھیر دیا جائے گا اور پھر اس وقت کسی کو اس کا ڈر نہیں ہوگا کہ کوئی میری محنت کو لوٹ کھسوٹ کر لے جائے گا۔ ملا دیجیے ان دونوں معنوں کو، بات صاف ہو جائے کہ لغوی معنی لینے سے ان کے یہ بات بنتی نہیں ہے۔

عزیزانِ من! قرآن کریم نے تو اگلے الفاظ میں خود کہہ دیا کہ یہاں مراد کیا تھی جنہیں پہاڑ کہا گیا ہے؟ یہ انہی کی زبان میں ہے کہ بڑے بڑے مستحکم کِلّے گاڑنے والے لوگوں کا انجام یہ ہو جائے گا۔ اسی لیے کہا کہ **لَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّ لَا هَضْمًا** (20:112) کیا بات

کہہ جاتا ہے' قرآن حکیم صاحب! کہ کسی کو پھر اس کا خطرہ اور اندیشہ نہیں ہوگا کہ میری محنت کی کمائی کو کوئی اور لوٹ کر لے جائے گا۔ ان پہاڑوں پہ روڈ رولر پھیرنے سے یہ نتیجہ ہوگا۔ یہ انداز ہے' عزیزانِ من! قرآن حمید کے سمجھنے کا۔ یہ تھی (20:105-112) تک مجازی معانی لینے کی مثال۔

اب ایک آدھ اور مثال لے لیجیے۔ کہا ہے کہ **وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ** (77:10)۔ قرآن کریم' وہاں بھی وہی لفظ لایا ہے۔ اس سے پہلے والا لفظ ہے کہ **وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ** (77:9) یہ جو بڑے بڑے طُرّے بنے پھرتے ہیں' یہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے' جو پہاڑ ہیں یہ بالکل ہموار ہو جائیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کب ہوگا؟ کہا کہ **لِیَوْمِ الْفَصْلِ** (77:13) جس دن تمہارے فیصلے ہوں گے اور صحیح بات ہے کہ اگر یہ جو Physical Mountains یا طبعی پہاڑ ہیں' وہ اگر ٹوٹ جائیں گے' ان کے پتھر بکھر جائیں گے' تو اس دن تمہارے فیصلے کس طرح سے ہو جائیں گے؟ کیا ربط ہے ان دونوں کے اندر؟ ہمارے ہاں کے یہ حضرات' عزیزانِ من! بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ قرآن حمید بڑی بے ربط کتاب ہے۔ معاذ اللہ۔ یہاں کے کسی مصنف کے متعلق کہا جائے کہ تمہاری کتاب میں تو ربط ہی نہیں ہے' کتاب کو اٹھا کر پھینک دیگا۔ یہ مجمل ہے' کہا کرتے ہیں یعنی جتنی خرابیاں کسی تصنیف میں ہونی چاہئیں وہ خدا کی کتاب میں کہہ دی جاتی ہیں۔ معاذ اللہ۔ یہ ایک ایک کر کے بیان کرتے ہیں۔ کیوں بیان کرتے ہیں؟ کہ جی! ہماری تفسیروں میں انہوں نے ان ادھورے قوانین کو پورا کیا ہے۔

یہ مفسرین آئے' محدثین آئے' انہوں نے آ کر یہ جو خدا کے کلام کے اندر۔ معاذ اللہ۔ اس قسم کے نقائص رہ گئے تھے۔ انہیں اس میں ربط پیدا کیا ہے' اس کے جمال میں انہوں نے تفصیل دی' اس کے ابہام کو انہوں نے واضح کیا۔ خدا نے تو ایسی کتاب بھیجی تھی۔ اب کتاب ایسی بھیج دی' انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا۔ اب اس کتاب کے اس قسم کے اسقام کو دور کر دیا جائے گا یعنی یہ اللہ کے بندے پیدا ہو گئے' شکر کرو' بچ گیا اللہ میاں۔ معاذ اللہ معاذ اللہ۔ کہتے ہیں کہ یہ خدا کی کتاب ہے' اس میں ربط ہی نہیں ہے انہیں کیا معلوم کہ:

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یہاں ورنہ جو حجاب ہے' پردہ ہے ساز کا

خدائے علیم وخبیر نے تو اپنی کتاب کے اجمال کی وضاحت خود ہی کر دی ہے

عزیزانِ من! دیکھنے والی آنکھیں ہوں تو کہیں دور جانا ہی نہیں پڑتا۔ اگلی ہی تو دوسری تیسری آیتوں میں بات خود ہی صاف کر دیتا ہے کہا کہ **وَمَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الْفَصْلِ** (77:14) یہ یوم الفصل کیا ہے جس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ پہاڑ اڑ جائیں گے؟ جواب میں

کہا کہ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (77:15) یہ جھٹلا رہے ہیں کہ اس دن ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔ ان کی تباہی ان کے سامنے آ جائے گی۔ آ گے دیکھیے! کہا ہے کہ اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ o ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ (77:16-17) پوچھو کہ سابقہ اقوام کے ساتھ یہی کچھ نہیں ہوا تھا؟ وہ تو تم سے بھی زیادہ محکم پہاڑوں کی طرح' مضبوط پہاڑوں کی طرح' جمے ہوئے تھے۔ کیا ان کے ساتھ یہ نہیں ہوا تھا؟ تو یہی کچھ اگر تم کرو گے یا تو اس کے بعد آنے والے کریں گے تو کیا یہی کچھ ان کے ساتھ نہیں ہوگا؟ اگلی ہی آیت میں کہا کہ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ (77:18) ہم تو ہر مجرمین کے ساتھ یہی کچھ کیا کرتے ہیں صاحب! وہ پہاڑ' جو پتھروں والے ہیں' ان کے ٹوٹنے سے یہ نتیجہ تو نہیں نکلتا کہ ہم مجرمین کے ساتھ یہی کیا کرتے ہیں۔

ان پہاڑوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے سے مراد بڑے بڑے طرے باز مکذبین کا انجام ہے

عزیزانِ من! یہاں نظر آتا ہے کہ مجرمین کا ہی ذکر آ رہا ہے' وہ مجرمین جو اپنے زعم باطل میں سمجھے ہوئے تھے کہ ہمیں کوئی ہلا نہیں سکتا۔ انہیں قرآنِ کریم نے بار بار مکذبین کہا ہے۔ ان سے یہ کہا جاتا تھا' جو وہ کہتے تھے کہ کیا تم کہہ رہے ہو! ہمارے مقام سے ہمیں کون ہلا سکتا ہے! تو بات ان مجرمین کی ہو رہی ہے' ان کے انجام کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس تمہید کو ذہن میں رکھیے تو اب یہ جو باتیں قرآن حمید کہے گا وہ باتیں سمجھ میں آ جائیں گی۔ یہ کیا کہہ رہا ہے؟ کہہ یہ رہا ہے کہ اب وہ آخری وقت بھی آ رہا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کی جو اس کشمکش حق و باطل کی تاریخ ہے' اس میں بھی یہ پہلے جتنے بھی مہلت کے وقفے تھے' وہ گزرتے چلے جا رہے تھے' مدینے میں ہجرت بھی ہو کر آ گئی تھی' انہوں نے اس پہ بھی پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ یہاں سے اب یہ ٹکراؤ' جنگ کے میدان میں جا کر شروع ہوا اور اس کے بعد پھر اس جنگ کے میدانوں کی تاریخ دیکھیے کہ کس طرح ان کے' جیسے میں نے کہا ہے' ان کے اونچے اونچے طرّے فضا کی پہنائیوں میں اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پہاڑوں جیسے جو محکم تھے' ان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور جنہیں انہوں نے پامال کر رکھا تھا' ان کے اندر ایسی حرکت پیدا ہو گئی کہ وہ اُبھر کر اوپر آ گئے تھے۔ یہ ہے جو قرآن حکیم کہتا ہے۔

قرآن حکیم کے احکام کا عملی نتیجہ: دو الفاظ میں وضاحت

کہا ہے کہ اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ o لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ (56:1-2) اب وہ جو آنے والا انقلاب آئے گا' جسے ہم واقعہ کہتے ہیں' عام طور پہ اسے Event کہتے ہیں' کچھ بھی کہیے' وہ آپ کا جو آنے والا ہے' وہ جو انقلاب آنے والا ہے' جب وہ آئے گا اور یہی کہہ دیا کہ اب اس کے واقع ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے۔ یاد رکھو! یہ چھوٹی بات نہیں ہے جو کہی جا رہی ہے۔ آئے گا ہو گا وہ واقعہ۔ اس واقعہ میں کیا ہوگا؟

عزیزانِ من! قرآن حمید کے دوالفاظ ہیں کہ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ (56:3) یہ جو پستیوں میں گرے ہوئے ہیں' وہ بلند اور قوی ہو جائیں گے اور جو آج اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتے ہیں' وہ پست ہو جائیں گے۔ یہ دو الفاظ ہیں اور یہ ہوا: خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ (56:3) قرآن حمید کا تو اندازِ عجیب ہے' عزیزانِ من! یہ دو الفاظ ہیں' یہ ہوگا۔ کہنے لگے کہ وہ پست اوپر آ جائیں گے: خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ (56:3) میں ان لفظوں کے بنیادی معنوں میں جاؤں تو اس کے لیے بڑا لمباوقت چاہیے۔

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے قرآنی لغت کی اہمیت اور مثال سے وضاحت

عزیزانِ من! معلوم نہیں کہ زندگی مہلت دے یا نہیں' جب بھی آپ کے ہاں کسی کے ذہن میں قرآن کریم کو سننے کی یہ بات ہو تو دو باتیں ہوتی ہیں۔ ایک کام یہ ہے جو کیا ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے توفیق دی جو میں نے قرآنِ کریم کا لغات لکھا ہے۔ اس میں ان الفاظ کے مادے کے اعتبار سے بنیادی معنی دیئے ہیں اور پھر بتایا ہے کہ زمانہ نزولِ قرآن میں کن معنوں میں اس لفظ کو استعمال کرتے تھے اور پھر ساتھ میں نے قرآن کریم کی آیتیں دی ہیں' وہاں اگر آپ دیکھیں گے تو پھر نظر آ جائے گا کہ یہ کیا مفہوم دیتے ہیں۔ یہ ہیں دو باتیں۔ اس کی مثال یہ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ (56:3) ہے۔ اس بات کا مفہوم بیان کرنے کے لیے تو یہی جن کو پستیوں میں دھکیل دیا گیا ہے' یہ رفعتوں میں اور بلندیوں میں چلے جائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ حضورﷺ کے بعد جو آپ کے ہاں اتنی بڑی وسیع مملکت بنی ہے تو ان کے ہاں اس مملکت کے کوئی عام کارندے یا سپاہی یا عمال ہی نہیں بلکہ جو اس مملکت کے گورنر بھی تھے' وہ وہی تھے' جو کل تک ان قریشیوں کے غلام تھے۔ یہ تھے جو خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ (56:3) ہوئے ہیں' جن کو بڑے بڑے مقامات حاصل ہوئے ہیں۔ وہ غلام تھے' یہ لوگ بھی ان لوگوں کے سامنے تھے' ان کی زندگی میں یہ کچھ ہو گیا تھا اور کہا ہے کہ یہ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ (56:2) یہ آنے والا انقلاب جھوٹی بات نہیں ہے' یہ ہو جانا ہے۔ یہ حضورﷺ کے سامنے ہی ہو گیا۔ اس کے بعد بھی ہوا کیا ہوگا۔ اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا (56:4) اس وقت انقلاب کے لیے بات یہ ہوگی۔ یہ قرآن کریم نے ایک عجیب Symptom بتائی ہے کہ یہ جن کو پامال کیا جا رہا ہے' ان میں حرکت پیدا ہو جائے گی۔ یہ چیز ہوتی ہے۔

جابر قوتوں کا نظام کبھی دوسرے کے اندر حرکت پیدا ہی نہیں ہونے دیتا مگر قرآن کریم کچھ اور کہتا ہے

جابر قوتوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان میں حرکت پیدا نہ ہو جائے' یہ حالتِ جمود میں رہیں ان کے ہاں ہلنے نہ پائیں۔ جہاں انہوں نے دیکھا کہ کسی نے یوں سر اُٹھایا ہے' وہیں انہیں کڑچ (کاٹ) کر کے رکھ دیا۔ جیسے قرآن کریم نے کہا ہے کہ ہر فرعون یہ کرتا ہے کہ جس میں ذرا بھی صلاحیت دیکھتا ہے' اسے ذبح کر کے رکھ دیتا ہے۔ کہا ہے کہ اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا (56:4) یہ جو پستیوں میں گئے ہوئے ہیں (جنہیں مستبد قوتوں نے اپنے پاؤں تلے روندر کھا ہے) وہ حرکت میں آ کر اُٹھ کھڑے ہوں گے' وہ آگے آئیں گے۔

انقلاب کی نوید کے لیے قدمِ اول کی وضاحت اور پہلے انقلاب لانے والوں کے مدارج کا ذکر

عزیزانِ من! آج میں نے اس لیے تمہیداً بیان کرنا ضروری سمجھا کہ اس کے بعد جو آیات یا سورتیں آئیں گی' ان میں اسی طرح سے یہ اصطلاحات آئیں گی۔ سوال یہ ہے کہ پھر ہوگا کیا؟ یہ انقلاب کیسے آئے گا؟ پہلی چیز یہ ہے کہ جنہیں پامال کیا جا رہا ہے' دبایا ہوا ہے' جن میں حرکت نہیں ہے' جن میں جمود طاری ہے' جن کو اُٹھنے نہیں دیا جاتا' جن کو ملنے نہیں دیا جاتا ہے' ان میں حرکت پیدا ہو جائے گی۔ انقلاب کی پہلی چیز یہ ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ کہا کہ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا (56:5) یہ جو تمہیں بڑے بڑے پہاڑ نظر آ رہے ہیں' وہ تیز آندھی میں گرد و غبار کی طرح اُڑ جائیں گے۔ کہا کہ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا (56:6) ٹکڑے ٹکڑے ہی نہیں ہو جائیں گے بلکہ غبارِ راہ نظر آئیں گے' اڑتا ہوا غبار نظر آئیں گے۔ یہاں تک کہنے کے بعد پھر وہی چیز ہے جو سورۃ التوبۃ میں پیچھے گزر چکی ہے کہ وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ (9:100) اس کے بعد پھر وہ آنے والے یہی لوگ تھے' وہ انقلاب کے داعیان' پہل کرنے والے تھے۔ وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً (56:7) اور تین جماعتیں کہا ہے' پہلے بھی کہا تھا کہ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ (56:8) ایک گروہ خوش بخت انسانوں کا ہے۔ یہ یمن و سعادت کا مالک ہے۔ اس گروہ کی زندگی کیسی بابرکت ہوگی! ایک تو یہ ہوگیا۔ اب سوچیے اور دیکھیے' بات صاف ہوگی۔ اگر شروع میں اس ارض کے معنی زمین ہو جاتی' حرکت کے معنی زلزلے ہوتے' اور پہاڑوں کے ٹوٹنے کے معنی پتھروں والے پہاڑوں کا اس طرح سے غبار بننا ہوتا' تو اس کے ساتھ ہی یہ جو آیتیں آئیں کہ کیفیت یہ ہوگی کہ یہ تمہاری انقلاب لانے والی جماعت' مدارج کے اعتبار سے اس کے تین قسم کے لوگ ہوں گے' تو اس کے ساتھ ربط ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ربط تو ہوتا ہی اس لیے ہے کہ وہ ''ارض'' اُٹھے اور یہ جو بڑے بڑے ''پہاڑ'' ہیں' یہ ریزہ ریزہ ہو جائیں تو پھر تم دیکھو گے کہ یہ انقلاب لانے والی' مقربین کی جماعت ہے۔ اب ان کا ذکر چلا آ رہا ہے۔

جن کے رتبے میں سوا ان کی سوا مشکل ہے: تین گروہوں کا ذکر

میں نے پچھلی دفعہ بھی کہا تھا کہ قرآنِ کریم نے انہیں وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ (9:100) کہا ہے۔ یہ یہاں بھی آگے آئیں گے۔ یہ الفاظ انقلاب لانے والوں کے لیے سب سے پہلے ہوتے ہیں' پہل کر کے اس کے اندر آئے ہوتے ہیں' ان کے رتبے بڑے ہی بلند ہوتے ہیں' دنیا بھر کی مصیبتیں انہوں نے جھیلی ہوتی ہیں۔ وہ جو معاشرے کے ساتھ رہنے کی جنت ہوتی ہے وہ تو چھن جاتی ہے اور جس جنت کی تعمیل کے لیے یہ اپنا خونِ جگر دیتے ہیں' وہ ابھی کہیں نظر آئی ہوتی[1]' پیدا ہی نہیں ہوئی ہوتی۔ اس دور کے اندر یہ گزرتے ہیں۔ یہ

---

[1] سلکرک انہیں Disinherited Children (محروم الارث یتیم) کہتا ہے:

On each torpip turn of the World
There are some disinherited children
Whom no longer what`s been
Nor yet what`s coming belong.

ہیں جو وَ السّٰبِقُوْنَ ہوتے ہیں۔ان کے حصے میں تو مصیبتیں' صعوبتیں' مشکلات اور دشواریاں ہی ہوتی ہیں اور جیسا میں تشبیہ میں کہا کرتا ہوں۔یہ ''پتھر'' انقلاب کی بنیاد کی اینٹیں ہوتے ہیں۔ان بنیاد کی اینٹوں کو کوئی دیکھ ہی نہیں سکتا۔ان کے جی میں کبھی یہ چیز نہیں آتی کہ ہم ذرا سا سر اونچا کر کے ان کو بتائیں کہ صاحب! ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔وہ مطمئن ہوتے ہیں' وہ بنیاد کی ایسی اینٹیں ہوتے ہیں۔ کہا کہ ان کے سر پر اتنا بوجھ ہوتا ہے کہ یہ وہ ہیں جنہیں کوئی دیکھ بھی نہ سکے۔یہ سابقون ہوتے ہیں' بڑے دل گردے کے لوگ ہوتے ہیں۔ایک یہ ہیں۔آگے کہا ہے کہ وَ اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَةِ مَاۤ اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَةِ (56:9) اور ان کے مقابلے میں یہ سوختہ بخت ہوں گے' جن کے حصے میں بدبختیاں آئیں گی۔پہلا گروہ کن ہے؟ قرآنِ کریم نے کہا کہ وَ السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ o اُولٰٓئِکَ الۡمُقَرَّبُوۡنَ o فِیۡ جَنّٰتِ النَّعِیۡمِ (56:10-11-12) یہ تیسرا گروہ ان کا ہے جو مصافِ زندگی میں سب سے آگے آگے تھے۔وہ سب سے زیادہ صفاتِ خداوندی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں گے۔ان کی زندگی' قوانینِ خداوندی سے بہت زیادہ ہم آہنگ تھی۔اس لیے ان کے مدارج بھی' سب سے بلند ہوں گے۔یہ لوگ آسائشوں اور سرفرازیوں کی جنت کے مالک ہوں گے۔یہ ہے وَ السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ (56:10)۔یہ متعدد مقامات میں آیا ہے۔کون تھے یہ سابقون؟ ان کے لیے کہا ہے کہ وَ السّٰبِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ مِنَ الۡمُهٰجِرِيۡنَ وَ الۡاَنۡصَارِ (9:100) سیدھی بات بتا دی کہ یہ جس انقلاب کا ذکر ہو رہا ہے' یہ ان ''پتھروں'' کا اور راستوں کے غبار کا ذکر نہیں ہو رہا' یہ تو کسی انقلاب کا ذکر ہو رہا ہے' یہ وَ السّٰبِقُوْنَ کا ذکر ہے کہ یہ وَ السّٰبِقُوۡنَ الۡاَوَّلُوۡنَ مِنَ الۡمُهٰجِرِيۡنَ وَ الۡاَنۡصَارِ (9:100) یہ مہاجرین اور انصار میں سے وہ لوگ تھے جن کے لیے کہا کہ وَ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُمۡ بِاِحۡسَانٍ (9:100) انہوں نے حسن کارانہ انداز سے پہل کی۔پھر جو ان کے بعد بھی آئے ہیں' وہ بھی اپنے حسنات کا' اپنے جتنے یہ جو نیک اعمال کیے ہیں' ان کا درجہ بھی ہے۔ان کے لیے کہا کہ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡهُ ❶ (9:100) وہ جو عام ترجمہ ہے: اللہ ان سے راضی ہوا' وہ اپنے اللہ سے راضی ہوئے۔جب یہ آیت آئے گی تو میں عرض کروں گا کہ اس کے معنی کیا ہوتے ہیں۔آگے کہا کہ وَ اَعَدَّ لَهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ تَحۡتَهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا (9:100) ان کے لیے پہلے سے ہی' اسی زندگی میں کہا' کہ ہم نے تو ان کے آنے سے پہلے ہی ان کے لیے جنت تیار کر رکھی ہے۔کیا بات ہے۔یہ صحابہ کبارؓ ہیں۔

---

❶ انہوں نے قوانین خداوندی سے ہم آہنگی اختیار کی' اس لیے اس کی برکات و سعادات ان سے ہم آہنگ ہو گئیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص-446)۔

قرآن حکیم کے فرمان کے برعکس بخاری شریف کی ایک روایت کا انکار دائرۂ اسلام سے خارج

عزیزانِ من! اس کے اندر انصار اور مہاجرین دونوں کا ذکر آیا ہوا ہے' کسی ایک کی بھی استثنیٰ نہیں کی گئی۔ میں تو کبھی اپنے درس میں فرقہ وارانہ بات نہیں کرتا۔ فرقے کی بات یہ نہیں ہے کہ اس کے متعلق اہلِ تشیعہ کیا کہتے ہیں۔ ان کا تو ایمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد صرف پانچ مرد رہ گئے تھے۔ انہیں چھوڑ دیجیے' پھر ان سنیوں سے پوچھیے' بخاری (شریف) کی اس حدیث سے پوچھیے کہ کیا کہتے ہو قرآن کریم کے اس سرٹیفکیٹ کے بعد کہ حضور ﷺ قیامت کے میدان میں ہوں گے اور ایک گروہ کا گروہ فرشتے جہنم کی طرف لیے چلے جا رہے ہوں گے' تو آپ ﷺ کہیں گے کہ ان کو کہاں لے جا رہے ہو؟ آپ ﷺ کہیں گے: او یہ تو میرے صحابیؓ ہیں' یہ تو میرے صحابیؓ ہیں۔ یہ آپ کے ہاں کی بخاری شریف ہے۔ اس میں یہ ہے۔ انہیں آپ کیا کہتے ہیں؟ جواب ملے گا کہ جی ٹھیک ہے' صحابیؓ تھے۔ جب تک آپ ﷺ ان میں تھے' یہ آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپ ﷺ کے جانے کے بعد انہوں نے یہ کچھ کیا۔ قرآن کریم ان کے لیے کہتا ہے کہ **اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا** (8:4) یہ پکے اور سچے مومن ہیں۔ یہ ان کی زندگی میں کہا کہ یہ خدا سے راضی ہو گئے' خدا ان سے راضی ہو گیا۔ کہا کہ **اَعَدَّ لَهُمۡ** (9:100) ان سب کے لیے ہم نے پہلے سے جنت تیار کر رکھا ہے۔ قرآن پاک یہ کہہ رہا ہے اور آپ کے ہاں بخاری شریف کی ایک روایت میں یہ چیز مل رہی تو جب اپنے ہاں یہ عقیدہ کیا تو سوال آیا کہ یہ تو ہمارے پیچھے پڑ جائیں گے۔ کریں کیا؟ کرنا بڑا آسان ہے مگر یہ تو بخاری شریف کی ایک روایت ہو گئی۔ بات یہ ہو گئی کہ صاحب! ہمیں آپ کیا الزام دیتے ہیں؟ بخاری شریف کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ یہ اصح الکُتب بعد کتاب اللہ ہے۔ صحیح ترین عقیدہ یہ ہے کہ بخاری اور مسلم کی ایک حدیث کا انکار بھی دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ اس حدیث سے آپ بھی انکار نہیں کر سکتے۔

ہمارے ہاں کفر کے فتوؤں کی نوعیت اور کامرانی کا راستہ

عزیزانِ من! بخاری اور مسلم کی ایک حدیث کا انکار دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے' پھر کافر ہو جاتے ہیں۔ اب کافر ہونے کے بعد ہوتا کیا ہے' کیا آپ کو کچھ پتہ ہے؟ کچھ پتہ نہیں۔ بیٹھے ہؤ او! دھیان نال سنیا کروایناں گلاں نوں (دھیان سے ان باتوں کو سنا کرو)۔ کل ہی تو انہوں نے فتویٰ دیا ہے۔ یہ کل کے ہی جنگ میں ہے۔ جی! کہا یہ ہے کہ او ہٹے کٹے مردو! سمجھا لو یہ جو تمہاری اپنے ہاں کی عورتیں ہیں۔ انہیں سمجھا لو اور سنبھال لو' ان کو گھروں میں بند رکھو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو ہم ان کے خلاف کفر کا فتویٰ لگا دیں گے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ تمہارے نکاح ٹوٹ جائیں گے۔ جی! کل کے ہی اخبار کے اندر یہ فتویٰ آیا ہوا ہے کہ میاں! ایناں نوں سمجھا لو۔ او پنڈ والا جیہڑا کیندا ہوندا اے پئی اے اپنا بیل بن کے رکھیا کر۔ ساڈی پیلی ساری جیہڑی ہیگی' اے کھا گیا ای (میاں صاحب! انہیں سمجھا لو وہ جو گاؤں والا کہا کرتا ہے کہ اپنا بیل باندھ کر رکھا کرو۔ یہ جو ہماری ساری فصل ہے وہ یہ کھا جاتا ہے) پھر' عزیزانِ من! کیا کہا جائے۔ کہہ میں یہ رہا تھا کہ

عقیدہ یہ ہے کہ بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث کا انکار بھی کافر بنا دیتا ہے اور یہ حدیث بھی بخاری کے اندر ہے اور آپ یہ بھی مانتے ہیں کہ وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ (9:100) مہاجرین اور انصار میں سے جن لوگوں نے اس نظام کے قیام کے لیے پہل کی جب کہ حالات بڑے ہی ناسماعد اور واقعات سخت حوصلہ شکن تھے اور جن لوگوں نے حسن کارانہ انداز سے اس کا اتباع کیا' خواہ وہ شہری ہوں یا دیہاتی' ان کے بعد بھی یہ ہے کہ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (9:100) چونکہ انہوں نے قوانین خداوندی سے ہم آہنگی اختیار کی اس لیے اس کی برکات وسعادات ان سے ہم آہنگ ہوگئیں اور ان کے لیے ایسا جنتی معاشرہ تیار کر دیا گیا جس کی شادابیوں میں کبھی کمی نہیں آئے گی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اس زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی اور یہ انسان کی بہت بڑی کامیابی اور کامرانی ہے۔

یہاں ان پہاڑوں کا ٹوٹنا یا زمین کا پھٹ جانا مجازی معنی لیے ہوئے ہے

عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا کہ یہ جو پہاڑوں کا ٹوٹنا ہے' اور زمین کی حرکت ہے' تو یہ ان ''پتھروں'' کا ٹوٹنا اور اس ''کرہ ارض'' کا پھٹنا نہیں ہے ورنہ اس کے بعد جو مضمون چلا آ رہا ہے' اس میں ربط ہی کوئی نہیں رہتا۔ تو وہ جو اس وقت پھنے خان بنے بیٹھے ہیں اور اپنے آپ کو اتنا محکم و مستحکم سمجھتے ہیں کہ ہمیں کوئی ہلا نہیں سکتا' ان سے یہ کہنا کہ وہ گرد و غبار ہو جائیں گے تو اس میں کوئی ربط نہیں رہتا۔ پہلے کہا کہ ان کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ پھر ان سے کہا کہ غبارِ راہ ہو جائیں گے۔ یہ کس وقت ہوگا؟ کہا کہ جب وہ' جنہیں انہوں نے پاؤں تلے روند رکھا ہے' ان میں حرکت پیدا ہوگی' پھر یہ ریزہ ریزہ ہوں گے اور اس میں بھی ربط نہیں ہے کہ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (56:10-12). اللہ اکبر۔ یہ ان کا حق ہے صاحب! جو Pioneers (اولین' ہراول) ہوتے ہیں.

نبی اکرمؐ کے دل سے بے ساختہ نکلنے والی دعا کی کیفیت' خدا کا جواب اور مصاف زندگی کے تیسرے گروہ کے بعد بقیہ قلیل سے اُٹھیں گے

عزیزانِ من! یہ ہراول دستے تو وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ (9:100) ہوتے ہیں' یہ انقلاب لانے والے ہوتے ہیں' ان کا یہ حق ہوتا ہے۔ ان کے حصے میں تو مصیبتیں ہی آتی ہیں صاحب! ان انقلاب لانے والوں میں عام تو ایک طرف رہا' خود نبی اکرم ﷺ کے ذہن میں شاید زندگی کے آخری دور میں' یہ معصوم سی آرزو اُبھری کہ یا اللہ! میری زندگی ان مصیبتوں اور مشکلات میں ہی گزر جائے گی یا جس انقلاب کے لیے میں یہ جو کچھ کر رہا ہوں' کیا میں اپنی آنکھوں سے اس کی جھلک بھی دیکھ پاؤں گا یا نہیں؟ اسی وقت خدا کے ہاں سے

جواب مل رہا ہے۔ میں عرض کروں اپنی کمزوری کو' میرے ذہن میں یہ تھا کہ بھئی! جواب میں تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ نہیں' کوئی بات نہیں' ابھی ہو جائے گا لیکن قانون تو وہ ہے کہ جو کسی کی جذباتی رعایت نہیں کرتا۔ کہا کہ یہ سمجھنا تمہارا کام نہیں ہے کہ یہ کب واقعہ ہوگا۔ کہا کہ **فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ**(13:40)۔ تیرا کام یہ ہے کہ اس پیغام کو پہنچائے چلے جاؤ' یہ ہمارا قانون بتائے گا کہ اس کی رو سے یہ انقلاب واقع کب ہوگا۔ **وَ السّٰبِقُوْنَ**(56:10) میں تو یہ ہستیاں بھی شامل ہیں۔ خدا ان کے لیے بھی یہ یقین قطعاً نہیں دیتا کہ نہیں' یہ تمہارے سامنے ہی ہو جائے گا' اگرچہ یہ ہو تو گیا۔ کہا ہے کہ **وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ o اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ o فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ o ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ o وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ** (56:10-14) تیسرا گروہ ان کا ہوگا جو مصافِ زندگی میں سب سے آگے آگے تھے۔ وہ سب سے زیادہ صفاتِ خداوندی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں گے۔ یہ لوگ آسائشوں اور سرفرازیوں کی جنت کے مالک ہوں گے۔ اس تیسرے گروہ میں بیشتر وہ لوگ ہوں گے جو شروع میں ہی' ہجرت سے پہلے' اس نظام میں شامل ہو گئے تھے اور بقایا تھوڑے سے لوگ وہ ہیں جو ہجرت کے بعد اس میں داخل ہوئے تھے۔ یعنی پہلوں کی بڑی جماعت میں سے بعد میں آنے والے تھوڑے سے ہوں گے۔ کیفیت یہ ہوگی کہ یہ جو غبارِ راہ ہیں' وہ اٹھیں گے' پھر اب جنت کی زندگی آ گئی۔ کہا کہ **عَلٰی سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ**(56:15)۔

قرآن حکیم جن نعمتوں کو یہاں حلال قرار دیتا ہے یہ حضرات ان کو حرام کہتے ہیں: جنت کی کیفیات

عزیزانِ من! میں نے کہا تھا کہ قرآن حکیم نے کہا یہ ہے کہ وہاں کی جنت کے متعلق تو ہم نے مثالی طور پہ بات سمجھائی ہے لیکن یہاں بھی جو جنت ہے اس میں تو یہ چیزیں اسی طرح سے بھی اگر واقع ہو جائیں تو یہ ہوئی' پھر تو اس میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو قابلِ اعتراض ہو کہ جی! قرآن حکیم نے پھر یہاں کہا کہ ان کو اس قسم کے باغات ہونگے اور نہریں ہونگی اور پھل ہونگے اور پرندوں کا گوشت ہوگا اور اطلس اور حریر کے پردے ہونگے اور زرنگار برتن ہونگے۔ ٹھیک ہے خدا کی دی ہوئی یہ نعمتیں ہیں۔ قرآن حکیم میں خدا کہتا ہے کہ ان سے پوچھو: کون ہے جو اس زینت کی چیزوں کو حرام قرار دے جو ہم نے اپنے بندوں کے لیے بنائی تھیں؟ کون ہے جو انہیں حرام قرار دیتا ہے۔ ہمارے ہاں کے قانون ساز کہتے ہیں کہ یہ ہم ہیں جو کہتے ہیں کہ یہ بھی حرام' یہ بھی حرام' یہ بھی حرام۔ کہا ہے کہ **سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ** (56:15)۔ اس زمانے میں تو تخت ہی ہوتے تھے۔ اب آج صوفے کہہ لیجیے: **مَّوْضُوْنَةٍ** (56:15) اگر وہ بنے ہوئے ہوں جیسے وہ شاید زرنگار مرصع تکیے ہوتے ہیں۔ وہ تو بڑی سخت قسم کی بنائی ہو' ڈھیلے ڈھیلے نہ بنے ہوئے ہوں۔ ان کے ہاں اس زمانے میں یہ ہوتے ہونگے' اصل میں ایران میں جو یہ لوگ دیکھ کر آتے تھے۔ عرب کے ہاں تو انہیں دیکھ کر منہ میں پانی بھرتا تھا کہ زندگی تو یہ لوگ بسر کرتے ہیں' تو یہ اس قسم کی چیزوں کا ذکر قرآن حکیم میں آیا ہے جو انہوں نے دیکھی ہوئی تھیں۔ اس قسم کے صوفے اور تخت یا تو زرنگار مرصع تکیے

اس کے معنی ہو سکتے ہیں یا اگر بنے ہوئے ہوں تو کس کر بنے ہوئے جسے کہیں گے۔ کہا ہے کہ مُتَّكِـئِيْنَ عَلَيْهَا (56:16)۔ وہ ان پہ بیٹھے ہوئے ہونگے۔ ٹھیک ہے یہ تو سب کو نصیب ہوگا۔

قرآن حکیم کے نزدیک جنت کی خصوصیات

عزیزانِ من! قرآن حکیم کی یا اس نظام میں بات تو ایک جو انفرادیت ہے، جو ملے گا وہ اگلی بات ہے، کہا ہے کہ مُتَـــقٰبِــلِيْــنَ (56:16)۔ یہ جو ہماری نشست ہے، اس میں تو اگلی صف ہے، پھر پچھلی صف ہے، تو جو پچھلے ہیں، وہ پہلوں سے پیچھے ہیں، اور اگر یہ صفیں اس طرح سے ہوں، دوسری صف یوں ہو، ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ہوں، تو مساوات قائم ہو جاتی ہے، آگے پیچھے بیٹھنے سے یہ چیز ذہن میں آ جاتی ہے۔ یہ پچھلی صف کے اندر ہے یہ اگلی صف کے اندر ہے۔ وہاں تو پہلی چیز یہ ہے کہ قرآن حکیم میں جنت کی جن نعمتوں کا ذکر آیا ہے، یہ نہیں ہے کہ کوئی ایک گروہ ایک طبقہ ایک ہے، جس کے نصیب میں وہ کچھ ہوگا اور باقی بیچارے وہاں بھی ان کے بدلے ہی مانگتے رہیں گے۔ ساری جنت میں جو ہیں، ہر ایک کے حصے میں وہ بہت کچھ آئے گا، تو یہ ساری زینت کی چیزیں اس وقت حلال ہوتی ہیں جب یہ سب کے حصے میں آئیں۔ جب یہ جنت بنتی ہے تو کہا یہ ہے کہ وہ صوفے جو رکھے ہوئے ہونگے یا تخت رکھے ہوئے ہونگے، وہ اس طرح ہونگے کہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے وہ بیٹھے ہوئے ہونگے۔ ایک دوسرے کے پیچھے نہیں ہونگے۔ وہاں مساوات کی کیفیت یہ ہوگی اور يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ (56:17)۔ یہ جس طرح، یہ اس زمانے کے رومن ایمپائر تھے، ان میں بھی تھا اور ایرانیوں کے ہاں بھی تھا کہ یہ جو خدمت گار (Waiters) وغیرہ کام کرتے ہیں، جنہیں ویٹرز یا بیرے کہتے ہیں، ہوٹلوں کے اندر چیزوں کو لیے پھرتے ہیں تو یہ اس انداز کی چیزیں یوں ہے لیکن یہ وِلْـدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ (56:17) ہے۔ لڑکے تو کہا ہے۔ قرآن حکیم میں بہت سے مقامات میں ہے کہ اہلِ جنت کی بیویاں اور ان کے بچے، وہ بھی اگر ان جیسے ہی اعمال والے ہونگے، تو وہ وہاں ان کے ساتھ ہونگے تو یہ ان کے وہ بچے ہیں جن کے متعلق ذکر کیا ہے اور مُـخَلَّـدُوْنَ (56:17) کہہ کر یہ کہا ہے کہ ان کی جوانیاں یونہی نہیں ڈھل جائیں گی۔ بڑی دیر پا رہنے والی ہیں۔

جنتی معاشرے کے مخلدون وہ ہوں گے جن کی جوانیاں دیر پا ہوں گی

عزیزانِ من! جوانی کے زمانے میں اگر اپنے اخلاق اور عصمت کو برقرار رکھا جائے تو جوانی کی عمر بڑی لمبی ہوتی ہے۔ کیا بات کہی ہے صاحب! وِلْدَانٌ کی! یہ بھی وہاں ہونگے۔ آگے کہا کہ بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ (56:18) یہ شیشے کے آبخورے، صراحیاں اور اس کے بعد پھر وہی خصوصیات ہیں تو جونہی یہ بات کرتا ہے ساتھ اپنی خصوصیت لے آتا ہے۔ كَاْسٍ (56:18) پیالے۔

مِّنْ مَّعِيْنٍ (56:18) وہی جاری رہنے والے پانی کے۔ یاد ہے آپ کو سورۃ الرحمٰن میں یہ بات آئی تھی کہ خصوصیت جاری رہنے والے ہے جس کے سامنے کسی نے بند نہ لگایا ہو اور جو کیا جائے گا کہ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ (56:19)۔ وہ نشہ آور نہیں ہوگی۔ اس جنت کی قوت سے بدمستی نہیں آئے گی، کسی قسم کا وہ نشہ نہیں ہوگا، متوالے نہیں ہو جائیں گے، بہک نہیں جائیں گے، ان کے پینے کے ساتھ وہ بدمست نہیں ہو جائیں گے۔ یہ ہے جنت کا معاشرہ۔ اب درس کا وقت ختم ہو گیا ہے آگے بھی یہی اسی جنت کی تفصیلات ہیں۔

حضرت عمرؓ کے دور میں ایران کی فتح پر عربوں کی زندگی کا ذکر

عزیزانِ من! یاد رکھیے! جب یہاں حضور نبی اکرمؐ اور بعد میں صحابہؓ کے زمانے میں یہ نظام قائم ہوا تھا، بالخصوص حضرتِ عمرؓ کے زمانے میں، جب یہ ایران وغیرہ فتح ہوا ہے، تو یہ ساری چیزیں عربوں کو میسر آ گئی تھیں۔ فاتح ایران نے جب حضرت عمرؓ کو چٹھی لکھی ہے تو جو کچھ وہاں کا مال تھا، اس کو ساتھ بھیجا، تفصیل جو بھیجی ہے، اس میں یہ چیز ہے کہ ایک ایک چیز لکھی اور اس میں یہ قرآن کریم کی ان آیتوں کے حوالے دیئے کہ یہ دیکھیے قرآن حمید نے جو کہا تھا وہ یہ ہیں پیالے، وہ یہ ہیں صراحیاں، وہ یہ ہیں پردے، ان کو تو اسی زندگی کے اندر یہ سب کچھ مل گیا تھا تو یہ ساری چیزیں اگر وہ صحیح قرآنی نظام ہو، تو اس میں ملیں گی، ہر ایک کو ملیں گے، طبقاتی تقسیم نہیں ہوگی۔

ہم سورۃ الواقعۃ کی آیت 19 تک آ گئے ہیں، 20 ویں سے پھر لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀......❀......❀

دوسرا باب: **سورة الواقعة** (آیات 20 تا 40)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج فروری 1983ء کی 25 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الواقعۃ کی آیت 20 سے ہو رہا ہے: (56 :20)۔

امروز، جنتِ ارضی اور فردا، آخرت کی جنّت میں فرق

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات میں جنّتی زندگی کی نعماء کا ذکر چلا آ رہا تھا۔ تجدیدِ یادداشت کے لیے پھر عرض کر دوں کہ میں نے پہلے یہ بیان کیا تھا کہ میں جنت کی بجائے جنّتی زندگی کیوں کہتا ہوں۔ یہاں وہ جنت کہنے سے صرف مرنے کے بعد کی جو جنت ہے، وہی ذہن میں آتی ہے اور قرآن کریم کی رو سے تو یہ اس دنیا میں بھی خدا کے قوانین کے مطابق کوئی نظام، جو قائم ہو، تو اس معاشرے کو جنّتی معاشرہ ہی کہا جائے گا۔ جو چیزیں قرآن کریم نے آخرت کی جنت کے متعلق کہی ہیں، ان کے متعلق تو کہا کہ وہ صرف مثالی ہیں، انہیں حقیقی معنوں میں نہیں لینا چاہیے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ آج یہاں کوئی آنکھ سمجھ نہیں سکتی کہ اس کی ٹھنڈک کے لیے وہاں کیا سامان تیار کر رکھا ہے تو گویا وہ مخصوص کنکریٹ فزیکل چیزیں نہیں ہیں جو قرآن کریم میں اس زندگی کے متعلق کہی ہیں لیکن وہ معاشرہ جب یہاں قائم ہوگا تو اسے بھی جنّتی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تو یہ جنّتی چیزیں قرآن کریم نے جنت کے متعلق کہی ہیں، جب وہ دنیا کی جنّتی زندگی یا جنّتی معاشرہ کے اندر ہونگی تو وہ تو کیونکہ محسوس معاشرہ ہوگا اسی قسم کے یہی انسان ہونگے، انہی کی ضروریات، انہی کی آرائشیں زیبائشیں، ضروریاتِ زندگی، کا ذکر ہوگا تو اس زندگی کے متعلق تو یہ انہی معنوں میں لیا جائے گا لیکن مرنے کے بعد کی جنت کی زندگی میں سمجھا جائے گا کہ یہ تمثیلاً سمجھایا گیا ہے، مثال کے طور پر یہ بتایا گیا ہے، اس کے حقیقی معنی یہ نہیں لینے چاہئیں تو جنّتی زندگی کے متعلق، یعنی یہاں جو جنّتی معاشرہ قائم ہوگا، اس کے متعلق اگر ہم سمجھیں کہ جو تفصیلات چلی آ رہی ہیں تو ان میں جو پہلے کہا گیا ہے اس کے بعد یہ کہا کہ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ o وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ (56:20-21) قسم قسم کے پھل جو پسندیدہ ہوں، پرندوں کا گوشت جس کی انہیں خواہش ہو۔ یہ ہے ان کے کھانے کے متعلق۔

حور کا لفظ مذکر اور مونث، دونوں کے لیے ہے، جس کے معنی پاکیزہ عقل کے ہوتے ہیں یہی عقل انسان اور حیوان میں امتیاز کرتی ہے

آگے کہا کہ وَحُوْرٌ عِيْنٌ (56:22)۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں اس سے پہلے دو تین درسوں میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ حور بھی اور عین بھی صرف مؤنث کے صیغے نہیں ہیں، یہ الفاظ عورتوں کے لیے ہی نہیں بولے جاتے، عربی زبان میں مرد اور عورت دونوں کے متعلق یہ الفاظ آتے ہیں اور ان کے معنی ہوتے ہیں وہ لوگ جو پاکیزہ عقل کے مالک ہوں، ایسی عقل جو فریب کار اور طیار یا عیار نہ ہو بلکہ وہ ہو جسے قرآن حمید ادب خوردہ دل کہتا ہے، جسے اقبالؒ کہتا ہے:

یا عطا فرما خرد با فطرت روح الامیں

ایسی خرد جو روح الامین کی فطرت کی حامل ہو۔ جو اس قدر شفاف پاکیزہ عقل ہے، اسے بھی کہتے ہیں۔ جو لوگ اسکے حامل ہوں، مرد ہوں یا عورتیں، ان دونوں کو عربی زبان کی رو سے حور بھی کہا جائے گا، عین بھی کہا جائے گا، لہٰذا جنّتی معاشرہ کے اندر یہی نہیں کہ یہ صفات صرف عورتوں کی کہی گئی ہیں بلکہ عورتیں اور مرد دونوں ہونگے جو ایسی عقل کے مالک ہونگے، جو فریب کار نہیں ہوگی، تو عقل بہت بڑی نعمت ہے۔

حیوان اور انسان کے اندر مابہ الامتیاز چیز تو یہی عقل اور فکر اور علم اور شعور اور تدبر ہیں لیکن عقل تو ایک صلاحیت کا نام ہے' جیسے قوت انسان کی ایک صلاحیت ہے۔ اب اس کے بعد اس صلاحیت کا استعمال ہے جو اسکو قابلِ ستائش بھی بنا دیتا ہے' ملعون بھی بنا دیتا ہے۔ اسی قوت کو آپ کسی مظلوم کا گلا گھونٹنے کے لیے استعمال کریں تو یہ مردود ہو جائے گی' کسی ظالم کی کلائی مروڑنے کے لیے استعمال کریں تو یہ قابلِ ستائش ہو جائے گی۔ اسی طرح سے عقل بھی ایک صلاحیت کا نام ہے۔ اسے اگر آپ فریب کاری کے لیے استعمال کریں گے' دوسروں کو دھوکا دینے کے لیے استعمال کریں گے تو یہ ملعون ہو جائے گی اور اگر اسی عقل سے آپ اس قسم کا معاشرہ قائم کریں گے' جس میں قرآن کریم یہ جنّتی چیزیں دے رہا ہے' یہ عقل و فکر کی رو سے یہ سب چیزیں ہونگی تو یہی عقل جو ہے' یہ وہ عقل ہوگی جسے قرآن کریم نے کہا ہے کہ وہ فریب کار نہیں ہوگی' صاف اور شفاف ہوگی۔ اس لیے کہا کہ كَاَمۡثَالِ اللُّؤۡلُؤِ الۡمَكۡنُوۡنِ (56:23) یوں سمجھو کہ جیسے سیپ کے اندر موتی ہوتا ہے' ایسے بے داغ گوہر میں آب گوہر کے سوا کچھ اور نہیں۔ قرآنِ کریم کی تشبیہات عجیب عجیب ہیں اور یہ سب کچھ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ (56:24) ہیں۔ نہ تو مفت میں ملے گا' نہ بخشش کے طور پر ملے گا بلکہ یہ تمہارے اپنے کاموں کا بدلا ہوگا۔

ہزار برس سے مذہب کے پیدا کردہ تصورات کی نوعیت

جب ہم اعمال کہتے ہیں تو یہ اصل میں ہمارے ذہنوں کے اندر یہ تصورات ہیں جو ہزار برس سے مذہب نے پیدا کر دیئے ہیں۔ جب ہم نیک عمل' حسنِ عمل' اعمالِ صالحہ کہتے ہیں' تو وہ صرف مذہبی عبادات یا رسومات یا اس قسم کی چیزیں تک ہمارا ذہن رہتا ہے۔ اس کا ترجمہ اگر آپ ''کام'' کریں گے تو پھر آپ دیکھیں گے' اس دنیا میں آ جائیں گے' آپ اچھے کام کہیں گے' تو ذہن میں یہاں کی دنیا کے کام آ جائیں گے جن کو اچھا کہا جا رہا ہے۔ اگر آپ اعمالِ صالحہ کہیں گے تو وہی جتنے آپ کے ہاں کے مذہب والے اعمال ہیں' بات وہیں تک محدود ہو جائے گی۔ اس کا تعلق آپ کی اس زندگی سے نہیں رہے گا۔ کیریکٹر سے نہیں رہے گا' اخلاقیات پہ نہیں رہے گا۔ وہی جوان کی عبادات اور اس کی رسومات وغیرہ ہیں' وہیں تک یہ بات محدود ہو جائے گی۔

دین اور دنیا کے ان دو الفاظ کو اگر عملاً یکجا کر دیا جائے تو دین کی شکل و صورت نکھر کر سامنے آ جائے گی

یہی وجہ ہے کہ یہ جو قرآن کریم کی اصطلاحات ہیں' ان کا یا تو مفہوم بیان کیا جائے اور اگر اپنے روزمرہ کے استعمال میں جو الفاظ آتے ہیں' ان کا ترجمہ ان میں کیا جائے تو پھر بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ (مثلاً) اچھے کام کہنے سے بات اور ہو جاتی ہے' نیک عمل یا اعمالِ صالحہ کہنے سے آپ دیکھیے ذہن دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ انہوں نے دین اور دنیا میں' مذہب اور دنیا میں' ایسی ثنویت (Duality) ہے' آپس میں اتنا فرق ڈالا ہوا ہے کہ وہ ایک بات یکسر مذہب کی ہو جاتی ہے اور وہی الفاظ یکسر دنیا کے ہو جاتے ہیں ورنہ قرآن کریم کی رو سے ان دونوں میں کوئی فرق ہی نہیں ہے: ازکلید دیں درِ دنیا کشاد

اقبالؒ نے ایک مصرع میں اسلام کے متعلق یا قرآن کریم کے متعلق جو کہہ دیا ہے اس سے بہتر مثال نہیں دی جا سکتی کہ قرآن کریم کرتا کیا

ہے: ''از کلید دیں درِ دنیا کشاد'' دین کی چابی سے دنیا کے ہر دروازے کو کھولتا ہے۔ یہ بڑی خوبصورت تشبیہ ہے۔ تو ان الفاظ میں بھی یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ الفاظ اس دنیا کے متعلق ہونگے تو جب یہ کہا کہ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ(56:24) یہ سب آسائشیں اور سرفرازیاں' ان لوگوں کے اپنے اعمال کے نتائج ہوں گے' ہاں یہ تو ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوگا' تو کہو کہ ان کے اچھے کاموں کا یہ نتیجہ ہوگا۔ اب قرآن کریم میں مختلف مقامات پر یہ جو اعمال یا اچھے کام میں نے کہا ہے ان کی تفصیل خود دی ہے لیکن جب ہم یہ کام' اچھے کام کہیں گے تو پھر جہاں تفصیل دی ہے' وہاں بھی ذہن میں آ جائے گا کہ اچھے کام کے کیا مطالب ہیں اور پھر ویسے بھی ہم آپ جانتے ہی ہیں کہ اچھے کام اور برے کام کیا ہوتے ہیں تو یہ ان کے اپنے اچھے کاموں کا بدلہ ہوگا ۔

لغو کا قرآنی مفہوم: تعمیری طور پر نتیجہ خیز نہ ہونے والی زندگی لغو میں آتی ہے

کہا ہے کہ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا (56:25) اس معاشرے میں' اس جنّتی زندگی کے اندر' کوئی لغو بات نہیں ہوگی اور نہ ہی ایسا کام جس سے انسانی صلاحیتیں مضمحل ہو جائیں۔ لغو مہمل بات' بے معنی بات ہوتی ہے' جس کا کوئی تعمیری نتیجہ نہ ہو۔ اس قسم کی باتیں ہی نہیں' اس قسم کے کام بھی اس میں آ سکتے ہیں کہ جن کا کوئی تعمیری نتیجہ نہ نکلے' یونہی وقت بھی ضائع ہو' توانائی بھی ضائع ہو' اور کوئی تعمیری نتیجہ برآمد نہ ہو۔ وہ چیز لغو ہوتی ہے۔ لغو ولعب بھی اس کے لیے کہا جاتا ہے۔ وہ تو ایسی کشتی ہے جو دریا کی یا سمندر کی لہروں میں یوں پھنسی ہوئی ہو کہ اس میں حرکت تو ہو رہی ہو مگر ساحل کی جانب نہ جا رہی ہو۔ اس کے لیے وہ یہ لفظ لغو ولعب بولا کرتے تھے اور لغو تو ہے ہی ایسی چیز کہ جو بالکل مہمل اور بے معنی ہو' وقت ضائع کرنے والی جتنی چیزیں بھی ہیں' جن کا کوئی عملی تعمیری نتیجہ مرتب نہ ہو رہا ہو' اس کو وہ لغو کہیں گے۔

قرآن حکیم کے لفظ اثم کا لغوی مفہوم: تکان' اضمحلال' کمزوری

عزیزانِ من! اب یہاں دوسرا لفظ تَاْثِيْمًا(56:25) ہے۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ہمارے ہاں قرآن کریم کے جو الفاظ جرم کے لیے آتے ہیں' مثلاً عدوان' اثم' ان سب کا ترجمہ گناہ ہی کیا جاتا ہے۔ وہ گناہ ایک ایسی چیز ہے کہ اس سے کوئی کنکریٹ شکل میں ہمارے ذہن میں کچھ آتا نہیں کہ کیا ہوا حالانکہ قرآن کریم کے یہ الفاظ ایسے نہیں ہیں کہ اس نے یہ شعر برائے بیت کہے ہوں۔ قرآنِ کریم نے یہ مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں' ان میں سے ہر لفظ کا الگ الگ معنی ہے مثلاً یہ تاثیم اثم کے الفاظ ہیں۔ عرب یہ اس اونٹنی کو کہتے تھے جو چلتے چلتے

تھک جائے اور باقی قطار کے ساتھ چلنے کے قابل نہ رہے' تکان کی وجہ سے پیچھے رہ جائے' وہ مضمحل ہوجائے ❶ ' تو ایسے کام جو تکان پیدا

---

❶ عرب اس اونٹنی کو ناقة آثمة کہتے تھے۔

کریں' اضمحلال ہو جائے' اس کو آپ ایسے تاثیم کہیں گے جسے قرآنِ کریم نے لغواً کے ساتھ اثم کہا۔ اس معاشرے کے اندر نہ تو کوئی ایسی باتیں ہوں گی کہ وقت ضائع ہو' توانائیاں ضائع ہوں اور نتائج کوئی نہ نکلیں اور نہ کوئی ایسی چیز ہو کہ ان کی وجہ سے اضمحلال پیدا ہو جائے' کمزوری پیدا ہو جائے۔ یہ چیز بھی اس کے اندر نہیں ہوگی۔ اب سوال یہ ہے کہ وہاں ہوگا کیا؟

قرآنی معاشرے کی تعمیر السلام علیکم کی محکم بنیاد پر استوار ہوتی ہے

آگے کہا کہ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (56:26) . دو لفظوں میں بات کہہ دی۔ وہاں جو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات ہونگے وہ ایسے ہونگے کہ ہر فرد دوسرے کی سلامتی کا آرزومند ہوگا۔ کیا معاشرہ ہے صاحب! یہ جو ہمارے ہاں اب رسمیں اذاں رہ گئی اور روحِ بلالؓ نہیں رہی تو ان میں ایک بات السلام علیکم ہے۔ ہمارے ہاں تو ایک یہ بات ہے کہ ہر مسلمان ایک دوسرے کو السلام علیکم کہتا ہے' ہم بھی جب ملتے ہیں تو یہی کہتے ہیں۔ کیا کبھی آپ نے غور کیا کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ وہ السلام علیکم کہتے ہیں اور وہ وعلیکم السلام کہہ دیتا ہے اور اب تو میں نے عرض کیا ہے کہ یہ بالکل ہی ایسی رسم ہوگئی ہے' جو بس ایک لفظ ہے زبان سے نکل گیا ہے' اس کے بعد کوئی سمجھتا ہی کچھ نہیں ہے۔ یہ وہی سَلٰمًا سَلٰمًا (56:26) ہے یعنی اس معاشرے کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر فرد دوسرے فرد سے جب ملتا ہے تو اسے کہتا ہے کہ میں تمہاری سلامتی کا آرزومند ہوں' اور وہ جواب میں کہتا ہے وعلیکم السلام' میں بھی تمہاری سلامتی کا آرزومند ہوں' تو جس معاشرے میں ہر فرد دوسرے کی سلامتی کا آرزومند رہے' آپ سوچیے کہ اس کے جنّتی ہونے میں کیا شبہ رہ جائے گا۔ سلام کے معنی کا میں نے صرف سلامتی ترجمہ کیا ہے۔ یہ سلامتی تو خطرے سے محفوظ رہنے کو کہتے ہیں لیکن یہ ''سلام'' کا لفظ ہے' یہ خطرے سے بچنا پھر بھی ایک Negative منفی سا عمل ہے۔ خطرے سے محفوظ رہنے کے اندر' کوئی ایسی چیز نہیں آتی کہ اس میں کوئی فروغ ہو' کوئی ترقی ہو' کسی قسم کا کوئی ارتقاء ہو' کوئی آگے بڑھنا ہو۔

سلام اور اسلامی معاشرے کا قرآنی مفہوم اور مشکلات

عزیزانِ من! یہ جسے آپ in peace کہتے ہیں' اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن قرآن کریم تو یہ نہیں کہتا کہ زندگی ایسی پُرخطر نہ ہو' جس میں انسان کو خطرہ نہ ہو۔ اگر وہ ویسے کا ویسا ہی رہے' اسے کوئی خطرہ نہیں رہا تو وہ کہتا ہے کہ یہ زندگی نہیں ہے۔ یہ جو ''س ل م'' ہے جہاں سے سلام کا لفظ نکلا ہے' جو السلام علیکم ہے' یہ سلامتی ہے لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ اس کے معنی ہوتے ہیں:

''کسی چیز کا مکمل ہو جانا' اس کی تکمیل ہو جانا' اس کی نشو و نما ہو جانا' جو کچھ اسے بننا چاہیے وہ بن جانا۔'' یہیں سے اسلام ہے۔ اسلام اس نظامِ زندگی کا نام ہے جس میں ہر قسم کے خوف اور حزن سے انسان محفوظ رہے' اور جو کچھ انسان نے بننا ہے وہ کچھ بن جائے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں قرآن کریم کیا کرتا ہے؟ وہ کرتا ہے کہ

آں چہ حق می خواہد آں سازد ترا

خدا جو چاہتا ہے کہ تُو اس قسم کا بن جا' قرآن کریم تمہیں اس قسم کا انسان بنا دیتا ہے۔ یہ ہے سلام اور یہ ہے السلام علیکم۔

یہ جو قرآن حمید نے سَلٰمًا سَلٰمًا (56:26) کہا ہے وہ یہ ہے اور وہ یہ تھا جس کے لیے کہا گیا کہ ملو تو ایک دوسرے سے کہو: السلام علیکم تمہاری سلامتی کا بھی خواہش مند ہوں اور تمہاری نشو و نما کے لیے بھی جو مجھ سے ہو سکے گا' وہ میں تمہاری تعمیر کی خاطر' تمہاری تکمیلِ ذات کی خاطر' کرونگا کیونکہ انسانی زندگی کے اندر تو باہمی تعاون کی ایک بات ہے' سب کچھ ہوتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کا تعاون ہے۔ جس کو کسی چیز کی یا مدد کی ضرورت ہے' دوسرا اس کی مدد کرتا ہے' اس کو اس کی ضرورت ہے' یہ اس کے لیے تکمیل کا باعث بنتا ہے تو یہ جو سارا پروسیس ہے' طریق ہے' اسے سلام کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عربوں کے ہاں بھی یہی کرتے تھے' قرآن کریم نے اسی کو سلام کہا ہے' یہیں سے اسلام ہے' یہیں سے مسلم ہے۔ وہ جو ہم اب مسلمان کہتے ہیں تو وہ مسلم یہیں سے ہے اور یہی وہ چیز ہے جو السلام علیکم کے اندر ہے۔ کہا کہ وہ زندگی ایسی نہیں ہوگی جس میں کسی قسم کی لغو بات ہو یا ایسی چیزیں ہوں کہ جو اضمحلال کا باعث بن جائیں یعنی جیسا ہے اس سے بھی کمزور تر ہو جائے۔ یہ نہیں ہے۔ اس میں ہر فرد' دوسرے فرد کی سلامتی اور اس کی تکمیلِ ذات کی آرزو' اپنے دل میں رکھے گا اور اس کے لیے جس قدر ممکن ہوگا وہ کوشش کرے گا اور ہر فرد جو ملے گا وہ ایک دوسرے سے کہے گا کہ میں تمہاری سلامتی اور تکمیلِ ذات کا آرزو مند ہوں اور دوسرا بھی جواب میں کہے گا کہ وعلیکم السلام' میں بھی اسی طرح سے تمہاری سلامتی کا' تمہاری تکمیلِ ذات کا' آرزو مند ہوں۔

میں نے جیسا عرض کیا ہے' عزیزانِ من! ان لفظوں سے آپ دیکھیے کہ قرآن حمید کس قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جو آج کل ہم نفاذ اسلام یا نظام اسلام کا نفاذ کہتے ہیں' وہ یہ چیزیں ہیں۔ اس قسم کی کوئی شکل پیدا ہو تو نظر آ جائے کہ ہاں واقعی ایک جنّتی معاشرے کی تشکیل ہو رہی ہے' اسلامی معاشرے کی تشکیل ہو رہی ہے جس میں ہر فرد دوسرے کے لیے سلامتی اور تکمیلِ ذات کا آرزو مند ہو۔ وہ یہ چیز ہے۔ قرآن حکیم ایسے افراد پیدا کرتا ہے جن سے ایسا معاشرہ متشکل ہو' جس سے ایسا نظام قائم ہو جائے' جس میں ہر فرد دوسرے فرد کی سلامتی ہی نہیں بلکہ اس کی تکمیلِ ذات کا آرزو مند ہو اور اس کے لیے وہ کوشش کرے۔ یہ سَلٰمًا سَلٰمًا (56:26) میں تو وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ (56:10) کی وہ ساری تفصیل آئی تھی جو یہ لوگ اس نظام کو قائم کرنے کے لیے سب سے پہلے' آگے جانے والے لوگ تھے۔ وہ Pioneers تھے۔ جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ یہ وہ لوگ تھے جن کے حصے میں مشکلات اور مصائب اور صعوبات ہی آئی تھیں۔

انہوں نے بڑے ایثار اور قربانیاں دیں' اور ابھی یہ معاشرہ قائم بھی نہیں ہوا تھا' اس معاشرے کے قائم کرنے کے لیے اس قدر مشکلات کا' صعوبات کا' سامنا کیا اور ان میں سے تو بیشتر ایسے تھے جن کی زندگی میں یہ معاشرہ قائم بھی نہیں ہوا تھا' اسی کوشش کے اندر انہوں نے جان دیدی لیکن یہ یہاں وہ رہے یا اس کے بعد کی زندگی میں جائیں' وہ رہے۔

Life after death کی اصطلاح اور برکت و یمن کا قرآنی مفہوم

میں نے عرض کیا ہے کہ زندگی تو ایک تسلسل کا نام ہے۔ یہ ایک ٹرم (اصطلاح) مجھے پسند آئی جسے ہم Life after Death کہتے ہیں۔ اس عرب قوم نے یا عرب نے یہ ٹرم استعمال کی۔ یہ ٹرم (اصطلاح) Life after Lif زیادہ بہتر ہے۔ انسان کی جو ذات ہے' وہ اگر تکمیل تک پہنچ جائے تو یہ مرتا ہی نہیں ہے۔ یہ تو زندگی کے ساتھ ہی ایک زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ بہر حال' یہ تھا وہ معاشرہ' اس میں السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ(56:10) کی یہ کیفیت تھی' اور اس کے بعد وہ معاشرہ قائم ہو گیا' وہ نظام قائم بھی ہو گیا۔ اب جو اس میں رہنے والے ہیں' ان کا فریضہ اس نظام کو مستحکم کرنے کا ہے' فروغ دینے کا ہے' ترقی دینے کا ہے۔ ان کو بھی کہا کہ وَاَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ مَآ اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ (56:27) برکت والے لوگ' جن کے حصے میں ہر قسم کی برکات آئیں گی۔ شاید آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے برکت کے معنی بتائے تھے۔ یہ بڑا جامع لفظ ہے' جو اس زبان کے لیے قرآن کریم نے اپنے ہاں لے لیا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جو اپنے مقام پر مستحکم طور پر کھڑی بھی ہو اور نشوونما بھی پا رہی ہو۔ اس کے اندر دونوں صفتیں ہوں: اپنے مقام پہ جم کر کھڑی بھی ہو اور اس کے ساتھ ہی وہ ابھر بھی رہی ہو' نشوونما بھی پا رہی ہو' اس کے اندر ارتقاء بھی ہو اور وہ ایک مقام پر اس کا پاؤں جما ہوا ہو۔ جیسے میں نے پودے کی مثال دی تھی' درخت کی مثال میں نے دی تھی کہ اس کی جڑیں اپنے مقام پر مضبوط ہوتی ہیں۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ (14:24) جس کی جڑیں محکم طور پر زمین میں گڑی ہوئی ہوں اور اس کی شاخیں فضا میں جھولے جھول رہی ہوں تو وہ اپنے مقام کے اوپر قائم بھی ہوتا ہے اور نشوونما بھی پا رہا ہوتا ہے۔ صاحب! یہ ہے جو خصوصیت بتائی برکت یا یمین کی۔ تو یہ وہ لوگ ہوں گے' جو پھر اس معاشرے کے قیام کے بعد اس کے استحکام اور اس کے فروغ اور ارتقاء کا موجب بنیں گے۔

وحی کی زبان نہ شاعری اور نہ نثر اور بقول نیٹشے نابغہ کی بھی

کہا ہے کہ فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ o وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ o وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ (56:28-30)۔ کیا بات ہے صاحب! عرب سچے تھے جو کہتے تھے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا' نہ ہم اس کو شاعری کہہ سکتے ہیں' نہ نثر کہہ سکتے ہیں۔ یہ تو اسلوب بیان ہی کچھ اور ہے۔ یہ اسلوبِ بیان ان کی سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا اور بات ٹھیک بھی ہے۔ وحی کی تو بات ہی اور ہے۔ جو Genius ہے' یہ نیٹشے نے لکھا ہے جب وہ اپنی

آخری کتاب لکھ رہا تھا: یہ عجیب شخص ہے‘ یہ ان کے ہاں بہت بڑا Genius (نابغہ) تھا۔ اس نے یہ چیز کہی ہے۔ وہ عجیب قسم کی وہ زبان (Lexicon) دیکھی ہوگی‘ ہمیں تو پتہ نہیں۔ ہم نے تو اس کا ترجمہ ہی پڑھا ہے۔ اس زمانے کے جو ادیب تھے یا جو اس زمانے کے صاحبِ تصنیف تھے‘ وہ یہ کہتے تھے کہ یہ کچھ عجیب قسم کی زبان لکھ رہا ہے۔ تو اس نے یہ بات کہی تھی کہ یہ جو چیزیں کشف والہام سی ہوتی ہیں جسے غالب نے ’’صریرِ خامہ نوائے سروش ہے‘‘ کہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ Intuition (وجدان) کہہ لیجیے‘ وحی تو وہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ ’’یہ جو اس طرح سے خیالات آتے ہیں‘ ان کے اظہار کے لیے زبان بھی مختلف ہوتی ہے‘‘ اور واقعی یہ جو اتنے بڑے بڑے نابغہ یا Genius گزرے ہیں‘ ان کے ہاں جو زبان یا اظہار کے لیے زبان یا اسلوبِ بیان استعمال ہوتا ہے‘ وہ اس زمانے کے عام اسالیب سے بالکل مختلف ہٹا ہے‘ ہوٹا ہوا ہوتا ہے۔

قرآن حکیم اور اس کے اسلوبِ بیان کی چند ایک بے مثل خصوصیات: جنّتی معاشرے کے نعماء

قرآن حکیم تو وحی تھی‘ وحی نے تو جو زبان بھی استعمال کی ہے‘ وہ بھی منفرد ہے۔ اس زمانے کا جو عرب تھا‘ جو باقی ساری دنیا کو گونگا کہتا تھا‘ وہ عرب یہ کہہ کر ہتھیار ڈال چکا تھا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس اسلوبِ بیان کو ہم کیا کہیں‘ نہ یہ شاعری ہے‘ نہ نثر ہے‘ یہ وہی ہے جسے ’’اما تو چیزے دیگری‘‘ کہا جاتا ہے: ایں کتاب نیست چیزے دیگر است۔ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ سِدۡرٍ مَّخۡضُوۡدٍ (56:28)۔ عام طور پہ ایسے پھل بھی ہوتے ہیں‘ جن کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ پھولوں میں تو عام طور پہ آپ دیکھ لیجیے کہ ایک پھول توڑنے میں پتہ نہیں کتنے کانٹوں سے بچنا ہوتا ہے لیکن یہاں یہ کہا ہے کہ یہ ایسے درخت ہیں‘ جن کے پھل تو ہوں لیکن ان کے ساتھ کانٹے نہ ہوں۔ واہ واہ واہ! آگے کہا کہ وَّطَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ (56:29)۔ ’’طلح‘‘ باافراد پھلوں کو بھی کہتے ہیں اور یمن کے اندر یہ لفظ اکیلے کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا‘ کیلا وہیں ہوتا ہوگا کیونکہ کیلا تو بہت زیادہ پانی چاہتا ہے۔ عرب والوں کو تو پانی پینے کو بھی نہیں ملتا تھا لیکن بہرحال ان کے ہاں کے ریاض وغیرہ کی قسم کے ایسے خطے ہونگے تو اس کے معنی یا تو کثرت سے پھل ہے یا یہ کیلے کے متعلق بھی کہا جاتا ہے جو تہ بہ تہ درخت پہ لگے ہوئے ہوں۔ آگے کہا کہ وَّظِلٍّ مَّمۡدُوۡدٍ (56:30)۔ پھر وہی عرب سامنے مخاطب تھے۔ جن چیزوں کو وہ بے حد پسند کرتے تھے‘ سایہ ان کے لیے تو نعمت صغریٰ تھا اور سایہ بھی پھر وہ جھاڑیوں کا سایہ نہیں تھا‘ وہ پیلو کا سایہ نہیں تھا‘ جھاؤ کا سایہ نہیں تھا‘ بلکہ وَّظِلٍّ مَّمۡدُوۡدٍ (56:30) ہے۔ بہت دور تک پھیلا ہوا سایہ کہ قافلے کا قافلہ اس سائے کے نیچے آجائے۔ یہ اس قسم کا سایہ ہے‘ یعنی یہ الفاظ‘ یہ سایہ‘ آسائش کی چیز ہے‘ تکان اتارنے کی چیز ہے‘ ستانے کی چیز ہے اور وہ ممدود ہو‘ پھیلا ہوا ہو‘ یہ نہ ہو کہ آدمی زیادہ ہیں سایہ تھوڑا ہے کہ کسی کے حصے میں آیا‘ کسی کے حصے میں نہیں آیا‘ وہ تو ہر ایک کے حصے میں آئے گا‘ تو جب وہ جنّتی معاشرہ بنے گا‘ کوئی ایک بھی محروم

رہ جائے گا تو وہ جنت نہیں ہوگی اس لیے یہ کہا ہے کہ وَّمَآءٍ مَّسۡكُوۡبٍ (56:31)۔ یہ لفظ ماءٍ پہلے آیا تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ مآء معین تو پہلے آ چکا ہے۔ یہ چشمہ جاریہ چلا جا رہا ہے' یہ سلسبیل ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ عربوں کے ہاں پانی سب سے بڑی نعمت تھی' زندگی کا مدار ہی اس پانی کے اوپر تھا اور یہ بڑی کمیاب چیز تھی کہ وہاں پانی کا چشمہ ملے۔ ٹھیک ہے اس میں خصوصیت یہ ہے کہ ایک تو یہ ہے کہ کنواں کھود کر پانی نکالا جائے' اس میں بڑی مشقت پڑتی ہے اور پھر ایسے صحرائی علاقے ہیں کہ جن کے اندر پانی کہیں بہت دور جا کر ملے۔ اس میں تو کنواں کھودنا کارِزار ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اتنا کچھ کھودا جائے تو پھر پانی بھی نہ ملے اور اگر وہاں سے پانی ملے تو کھاری پانی ملے۔ یہ تشبیہہ کے طور پر کہا کہ وہ ایسا پانی ہو' جو اس طرح مشقت طلب کنواں کھود کر نہ ملے بلکہ خدا کی طرف سے ہی جاری چشمہ تمہارے سامنے آ گیا ہو اور وہاں اس جنّتی معاشرے میں جگر پاش مشقتوں سے رزق حاصل نہیں کیا جائے گا بلکہ وہ ایسا پانی ہوگا جو مشقت سے کنواں کھودنے کے بعد نہیں' بلکہ خود بخود زمین کے اندر سے پھوٹ کر بہے۔ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيۡرَةٍ (56:32) بہت کثرت سے پھل ہوں گے۔

خدا نے رزق کے تمام سرچشمیں نوعِ انسان کے لیے بلا مزدو معاوضہ پیدا کیے مگر زمین پر ملکیت کی لکیریں ہیں

عزیزانِ من! پھر میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کریم اس قسم کی نعمتوں کو بیان تو کرتا ہے مگر اپنا جو اصل مقصد ہے اسے دو دو لفظوں میں صاف صاف بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ اوپر وَكَاۡسٍ مِّنۡ مَّعِيۡنٍ (56:18) وہ پانی کا پیالہ جو بہتے ہوئے چشمے کی طرح ہو' اس کے اوپر کہیں بند نہ لگا ہوا ہو۔ قرآن کریم نے اس معاشرے کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں ذرائع رزق پر کہیں بند نہیں لگا ہوا ہوتا کہ اس حد تک میری ملکیت ہے' اس میں کسی اور کا حق نہیں ہے کہ وہ آ جائے۔ وہ ممنوع نہیں ہوتا' بند نہیں لگا ہوتا' وہ رزق تمام انام کے لیے ہے۔ قرآن کریم میں خدا کہتا ہے کہ ہم نے ارض کو انام کے لیے پیدا کیا ہے' تمام مخلوق کے لیے پیدا کیا ہے' متنفس کے لیے' تمام جاندار کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان وسائلِ رزق پر بند لگا کر' لکیریں کھینچ کر' حد بندی کر کے' یہ کہے کہ یہ میری زمین ہے اور یہ اس کے بعد کی زمین کسی اور کی ہوگی۔ اسے یہ حق ہی حاصل نہیں ہے۔ یہ سامان پرورش کے لیے' نشوونما کے لیے دیا ہے۔ انسانوں کے بنے ہوئے قانون میں بہرحال اور چیزیں تو آتی ہیں لیکن ابھی تک اس دھوپ پر تو کوئی ایسے بند نہیں لگے ورنہ ان کے بس میں ہو تو اس کو بھی روک دیں کہ یہ بھی ہماری ہی ملکیت ہے' کسی کو حق حاصل نہیں۔ ہوا کے متعلق بھی ابھی یہاں غنیمت ہے' اگرچہ اسے اتنا Polute (مکدّر) کر دیا ہے کہ کس قدر ہم جراثیم میں ملوث ہیں۔ یہ ہمارے ہاں کی ہوا بھی ان جراثیم میں ملوث ہے۔ صاف ہوا کا ایک سانس بھی ہمارے نصیب میں نہیں ہے لیکن بہرحال جو زمین ہے اس کو اپنے قبضوں میں لیا ہوا ہے' اس پہ تو لکیریں کھینچی ہوئی ہیں' اس پہ تو

ذاتی ملکیتیں بنی ہوئی ہیں۔

ارض کے متعلق قرآن حکیم کے غیر متبدل اصول کی وضاحت

قرآن حکیم کہتا ہے کہ بتاؤ اس زمین پر یہ حقِ ملکیت تم کس طرح ثابت کر سکتے ہو نہ تم نے اسے بنایا' نہ تمہارے باپ دادا نے بنایا۔ جب پہلے انسان پیدا ہوئے' زمین موجود تھی اور زمین ہی وسائل اور ذرائع رزق میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں سے فصل وغیرہ جو کچھ پیدا ہوتا ہے' وہ براہِ راست کھانے کے کام آتا ہے یا باقی چیزیں' جتنی بھی اس میں سے نکلتی ہیں' وہ بھی رزق کا ذریعہ ہی بنتی ہیں تو رزق کا بنیادی ذریعہ زمین ہے' ارض ہے' اور ارض کے متعلق قرآن حکیم نے بار بار کہا ہے کہ **سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيۡنَ** (41:10) یہ تمام ضرورت مندوں کے لیے یکساں طور پر کھلی ہونی چاہیے' کسی کو ذاتی ملکیت کا حق حاصل نہیں ہے۔ زمین پہ ذاتی ملکیت کا سوال ہی قرآن حکیم کی رو سے پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا انتظام ایسا کیا جائے گا کہ اس میں سے فصلیں زیادہ سے زیادہ اُگیں' زیادہ سے زیادہ پیداوار ہو لیکن تمام انسانوں کے لیے ہو اور میں نے کہا ہے کہ قرآن حکیم جہاں جنّتی معاشرہ یا جنّتی زندگی کی خصوصیات' ان نعمتوں کی روسے' گنا تا ہے کہ اتنے پانی کے چشمے' ایسے پھل' ایسے پھول' ساتھ ہی یہ سب کچھ فوراً وہاں لے آتا ہے کہ **لَّا مَقۡطُوۡعَةٍ وَّلَا مَمۡنُوۡعَةٍ** (56:33). پہلی چیز تو یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوگا کہ کچھ موسم ہیں' جس کے اندر تمہیں یہ چیزیں ملیں گی اور دوسرا موسم آ جائے گا کہ اس کے اندر سے یہ چیزیں ہونگی ہی نہیں۔ یہ نہیں ہوگا' اس کے اندر یہ چیزیں مسلسل رہیں گی اور اگلی چیز یہ کہی کہ **وَلَا مَمۡنُوۡعَةٍ** (56:33) نہ ہی یہ ہوگا کہ کوئی شخص اس کے اوپر بند لگا کر دوسروں کو اس سے فائدہ اٹھانے سے محروم کردے۔ یہ ممنوع کا لفظ تو ہمیں معلوم ہے کہ منع کر دیا گیا کہ یہاں کوئی دوسرا نہیں آ سکتا اس لیے نہ تو یہ ہے کہ یہ اس قسم کا فطرت کی طرف سے انتظام ہو کہ یہاں تین مہینے یا چھ مہینے کے لیے تو یہ ساری چیزیں اُگیں اور اس کے بعد بالکل ایک پھل ہی پیدا نہ ہو یا کوئی چیز پیدا نہ ہو۔ کہا کہ یہ بات نہیں ہے ۔ قرآن کریم نے دوسری جگہ کہا ہے کہ **اُكُلُهَا دَآئِمٌ** (13:35) یہ کھانے کی اشیاء ہمیشہ رہنے والی چیزیں ہوں گی۔ یہ جتنی چیزیں' سامانِ رزق اور وسائلِ نشوونما ہیں' یہ مسلسل پیدا ہوتی چلی جائیں گی۔ یہ تو ہوا فطرت کا انتظام۔

عزیزانِ من! اب آ گے رہے انسان کہ جنہوں نے اس کا انتظام کرنا ہے۔ کہا کہ **وَلَا مَمۡنُوۡعَةٍ** (56:33) یہ بھی نہیں ہے کہ یہ کسی کے لیے کھلی ہوئی ہوں اور جو دوسرے ہیں' وہ ان کے لیے Out of Reach ہو جائیں' یہ ان کے لیے ممنوع ہو جائیں کہ تم یہاں نہیں آ سکتے' کچھ نہیں لے جا سکتے۔ یہ بات نہیں ہوگی' بند نہیں لگائے جائیں گے' باڑ نہیں لگائی جائے گی کہ کوئی آئے اور کوئی نہ جائے۔ یہ ہر

ایک کے لیے ضرورت کے مطابق ہوگا' ہر ایک کی ضرورت پوری ہوگی' جمع نہیں ہونے دیا جائے گا' زائد از ضرورت کسی کے پاس نہیں رہنے دیا جائے گا اور ضرورت سے محروم کوئی نہیں رہے گا۔ یہ ہے جنّتی معاشرہ جس کا ذکر قرآن کریم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ لَّا مَقۡطُوۡعَةٍ وَّلَا مَمۡنُوۡعَةٍ (56:33) اس معاشرے میں ہر ایک کو سامانِ زیست بلا روک ٹوک فراوانی سے ملے گا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جنّتی معاشرے میں مرد بھی ہوں گے اور عورتیں بھی ہوں گی۔

دورِ اولیٰ میں عرب دنیا کے علاوہ دوسری جگہ لونڈیوں کا ہجوم تھا

عزیزانِ من! عورتوں کے متعلق عرب کا وہ معاشرہ صرف عرب کا ہی نہیں تھا' اس معاشرے میں تو ساری دنیا میں ہی یہ بیگمات یا جنہیں گھر کی عورتیں کہا جائے گا' مستورات کہا جائے گا' ان کی تعداد بہت تھوڑی سی ہوتی تھی' باقی سب لونڈیاں ہوتی تھیں' جو بکا کرتی تھیں' ان کا نیلام ہوا کرتا تھا۔ عورتوں کا نام لونڈی رکھنے سے' ہمارے ذہنوں میں کچھ ایسے ہو گیا کہ لونڈی کہنے سے وہ عورت ذہن میں ہی نہیں رہتی کہ وہ عورت ہوتی تھی۔ ہاں تو جی! لونڈیاں بکا کرتی تھیں' عورتیں بکا کرتی تھیں نہیں کہتے۔ یہ تو ان سلاطین کے حرم میں تین تین سو لونڈیاں ہوتی تھیں۔ ذہن میں نہیں آتا کہ یہ عورتیں تھیں؟ انہیں عورتوں کی صف میں سے ہی نکال دیا۔ وہ عورتیں ہی تھیں۔ اس معاشرے کا ذکر کر رہا ہے بلکہ یہ کہیے کہ تاریخ کے اس دور کا ذکر کر رہا ہے۔ یہ عرب کی خصوصیت نہیں تھی' جتنی بھی اس زمانے کی نام نہاد مہذب سلطنتیں تھیں' ان سب کے اندر غلام اور لونڈیاں تھیں' اور ان عربوں کے ہاں تو بڑی بھرمار تھی۔ اب جو عورتیں قرآن حکیم کہے گا تو اس میں تو وہ بیشتر وہی ذہن میں آئیں گی جو اس زمانے میں لونڈیوں کی شکل میں تھیں۔

عورت کے معاشرتی اور تمدنی حقوق کی خاطر مرد کا مروجہ کردار

کہا ہے کہ اس جنّتی معاشرے میں یہ کیفیت نہیں ہوگی ان کے لیے کہا کہ وَّفُرُشٍ مَّرۡفُوۡعَةٍ (56:34) نہایت عمدہ فرشوں پہ بیٹھی' نہایت باعزت بیگمات ہوں گے۔ عورت کا جو مقام ہے' ہمارے ہاں اس کے متعلق بحثیں ہو رہی ہیں یعنی جیسے یہ کوئی اور صنف ہو' کوئی اور ہی مخلوق ہو' تو اس کے متعلق مرد بیٹھے ہوئے یہ طے کریں کہ ان کا مقام کیا ہے' یعنی یہ انسان نہیں ہیں۔ اب سوچیے تو سہی' کہ ہم نے ملوکیت کے دور کی یہ جتنی بھی لعنتیں ہیں' کس طرح ہمارا ذہن ان کی گرفت میں آیا ہوا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ایک انسانی مسئلہ ہے' مرد اور عورت دونوں انسان ہیں' یہ دونوں ایک مسئلے کا حل دریافت کریں۔ یہ بات نہیں ہے کہ عورتوں کے حقوق کا جو فیصلہ ہے یہ مرد کریں' وہی ذہن میں ہے کہ لونڈیوں کے متعلق جو مرد ہوتے تھے' وہ آقا ہوتے تھے' وہ فیصلے کرتے تھے کہ انہیں کس حد تک آزادی دی جائے گی' کہاں تک ان کو پابندیاں لگائی جائیں گی' کہاں جانے دیا جائے گا' کہاں نہیں جانے دیا جائے گا' کہاں یہ بیٹھ سکیں گی' کہیں نہیں بیٹھ سکیں گی۔ یہ تھا اس

دور کے اندر مرد۔ وہ ان کے متعلق یہ سب کچھ کرتے تھے وہ تو بہر حال کوئی لونڈیاں تھیں۔ لونڈیاں تو نہ رہیں لیکن وہ عورتیں تھیں تو عورتوں کے متعلق ذہنوں میں یہی چیز چلی آ رہی ہے کہ مرد ان کے اوپر حاکم ہوتا ہے' مرد ان کے اوپر داروغہ ہوتا ہے' حاکم اور داروغہ لونڈیوں کے اوپر ہوتا تھا' تو ان بیچاریوں کا میری بیٹیو! معاف رکھنا' انہوں نے صرف بدل دیا ہے۔ آج تک بھی یہ لونڈیاں ہی ہیں' ان کے حقوق مرد متعین کرتے ہیں اور مرد ہی ان کے داروغہ مقرر ہیں' ان کو کہاں تک آزادی ملے گی' ان کے ذہن سے وہ لونڈیوں والا تصور گیا نہیں' عزیزانِ من! یہ انسان ہیں' قرآن حکیم نے جو کچھ انسان کے متعلق کہا ہے' اس میں مرد اور عورت برابر کے شریک ہیں۔ یہ مومن اور مومنات برابر حقوق رکھتے ہیں۔ جو کچھ قرآن حکیم نے مومن کہہ کر کہا ہے' وہ ان دونوں کے لیے کہا ہے۔ ان میں سے کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسرے کے متعلق فیصلہ کرتا پھرے۔ اس صنف کے اوپر ایسے ہے جیسے یہ کچھ Especiall دیکھنا ہے۔ الگ ہی ہوتی ہیں کہ ان کو کیا کیا اختیارات دیئے جائیں' کیا کیا حقوق دیئے جائیں یعنی مالک تو یہ مرد ہیں' انہوں نے ہی ان کے حقوق کا تعین کرتا ہے۔ وہ آقا اور لونڈیوں والا جو تصور تھا' کس طرح سے وہ ہمارے تحت الشعور میں مضمر اور پوشیدہ چلا آ رہا ہے۔

قرآنی معاشرے میں ہر عورتوں کی حیثیت بیگمات کی سی ہوتی ہے

اُس دور میں عورت کی پوزیشن کو مردوں نے پامال کیا ہوا تھا' پاؤں تلے روندا ہوا تھا۔ لونڈیوں کی صورت میں یہ عورتیں ہی تھیں۔ قرآن حکیم نے یہ کہہ کر اس کی تردید کر دی کہ اس جنّتی معاشرے کے اندر' جو قرآن حکیم کی رو سے قائم ہوگا' اس کے اندر بیگمات اور لونڈیوں کی تفریق نہیں ہوگی۔ ساری عورتیں ہی بیگمات کی حیثیت رکھتی تھیں اور رکھتی ہیں۔ قرآن حکیم نے انہیں مَـرۡفُـوۡعَةٍ (56:34) بلند و بالا کہا ہے۔ یہ پست نہیں ہیں' یہ تو مَرۡفُوۡعَةٍ (56:34) ہیں' یہ عالی مرتبت بیگمات کی طرح ہیں۔

خون بہا کا معاملہ ہو یا عورت کی گواہی کا' اس کے لیے ایک حیران کن آرڈیننس کا نفاذ

عزیزانِ من! آگے چار الفاظ آئے ہیں۔ یہ جو آج کل عورتوں کی شہادت کے متعلق بڑے زور شور سے مسئلہ چل رہا ہے' میں نے اسے درس کا موضوع نہیں بنایا' کہ وہ آیت یوں سامنے نہیں آتی لیکن ایک دلیل دی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم میں' سورۃ البقرۃ کی آیت 282 میں' یہ کہا گیا ہے کہ قرض کی تحریر کے حوالے سے' اگر قرض لینے والے کے لیے دو مرد موجود نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں بلا لیا کرو۔ وہ اس بات پر کچھ نہیں بتاتے کہ وہ آیت کیا ہے' اس کے معنی کیا ہیں' یہ ایک مرد اور دو رتیں کیوں کہا گیا ہے۔ اس سے آگے پھر ہر معاملے میں دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر ہوگئی' تو آدھی رہ گئی ہے' تو اس کا ووٹ بھی آدھا' یہ اگر قتل ہو جائے تو اس کا خون بہا' جو خون کی قیمت ہے' وہ بھی مرد سے آدھی اور کہا کہ وہاں یہ لکھا ہوا ہے کہ ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتیں ہیں۔ وہاں پہ صرف کہا یہ گیا ہے۔ یاد

رکھیے! سارے قرآن کریم میں شہادت یا گواہی کے متعلق متعدد مقامات میں آیات آئی ہیں۔

پہلی چیز تو یہ یاد رکھیے کہ قرآنِ کریم میں کسی آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ گواہ عورت نہیں ہوسکتی، صرف مرد ہوسکتا ہے۔ جہاں آپ کے ہاں اب تک جو نئے قوانین نافذ ہوئے ہیں، وہ زنا، سرقہ، کذب وغیرہ کے متعلق آرڈیننس ہیں جو 1979ء میں Issue (جاری) ہوئے تھے۔ جن کو اسلامی کہا جاتا ہے اس میں عورت گواہی سے بھی خارج ہی کر دی گئی ہے، اس میں شرط رکھی ہوئی ہے کہ وہ Male (مرد) ہوں گے، وہ مرد ہی ہوسکتے ہیں، عورت گواہ ہو ہی نہیں سکتی یعنی کسی ماں کے سامنے کسی نے اس کے بیٹے کو آ کر ذبح کر دیا، قتل کر دیا، تو یہ اپنے بیٹے کی اس موت کی ماں گواہ نہیں بن سکتی۔ کیوں نہیں بن سکتی؟ کہا کہ جی! یہ عورت ہے۔ دس عورتیں بھی کسی کو چوری کرتے ہوئے دیکھ لیں تو چوری ثابت نہیں ہوسکتی کیونکہ گواہ مرد ہونا چاہیے اور یہ تو عورتیں ہیں یعنی ان کے اپنے گھر میں چور گھس گیا ہوا ہے، وہ ان سب کے سامنے، انہیں لوٹ رہا ہے، عام طور پہ تو اب جو آج کل ہو رہا ہے، وہ رسیوں سے ان کو آ کر باندھ ہی دیتے ہیں، اور وہ دیکھیں کہ بٹ بٹ تکدیاں نے پیاں، یعنی وہ تو ٹھیک ہے رسی سے باندھا ہوا مرد اور عورت بے بس ہوتا ہے، لیکن اگلی بات یہ ہے کہ ان کے سامنے وہ چوری ہو رہی ہے، ان کو معلوم ہے کہ چور کون ہے، یہ چلے گئے یہ وہاں جا کر گواہی نہیں دے سکتیں کہ یہ چور تھا۔ پہلی چیز تو یہ ہوگئی کہ عورت کی گواہی اس آیت کی رو سے نہیں ہے۔ یہ کہا کہ جن معاملات کے اندر گواہی ہوگی یعنی یہ تو خود فیصلہ کر لیں ان میں جو ابھی تک قوانین جاری ہوئے ہیں کہ ان میں تو عورت گواہ ہو ہی نہیں سکتی، جن معاملات میں عورت کے متعلق یہ کہیں گے گواہ ہوسکتی ہے تو ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتیں آئیں گی۔

قرآن کریم نے وہاں صرف ایک مقام پہ یہ بات کہی ہے کہ اگر قرضے کے لین دین کی کوئی بات ہو اور اس کے لیے ایک دستاویز لکھی جائے تو اس تحریر کے اوپر، دستاویز کے اوپر، وہ جو گواہ شدہ نیچے لکھا ہوا ہوتا ہے۔ گواہی ہو تو وہ دو مردوں کی گواہی ڈلوائی جائے۔ اگر ایسا کہیں مقام ہو کہ دو مرد نہ ہوں تو اس میں دو عورتوں کو گواہ شد کر لیا جائے اور اس کے آگے لکھا ہوا ہے کہ یہ اس لیے کہا گیا ہے کہ اگر ان میں سے گواہی کی ضرورت پڑ جائے، تو گواہ تو ایک ہی عورت ہوگی لیکن اگر وہ کہیں بھول جائے، اس عدالت میں آ کر اس کو گھبراہٹ ہو جائے، کسی طرح Confuse ہو جائے تو وہ اس کے ساتھ، اس کی جو بہن ہے، وہ صرف اس کو بتا دے کہ بات بہن یوں نہیں، یوں ہوئی تھی، تمہیں غلطی لگ گئی ہے۔ یہ اس بہن گواہ کو بتائے گی، عدالت کو نہیں۔ ایسا موقعہ آئے یا نہ آئے، یہ قرآن حکیم نے نہیں کہا کہ اس ایک نے گواہی دیدی ہے تو اس کے بعد پھر یہ دوسری عورت جو کھڑی ہے اس کی بھی گواہی لی جائے گی۔ بالکل نہیں، گواہی ایک ہی کی ہے۔

زیورات کے سائے میں پرورش پانے والی عورت کی نفسیاتی کیفیت اور اس کا تدارک

عزیزانِ من! اب سوال پیدا ہوا کہ اس مقام پہ یہ کہنے کی ضرورت کیا آئی کہ اگر اس کو کہیں کوئی Confusion ہو جائے' گھبراہٹ ہو جائے' بھول بھی سکتی ہے' قرآن کریم کے الفاظ میں کوئی Confuse ہو جاتی ہے' گھبراہٹ ہوتی ہے' تو کہا کہ یہ کیوں ضرورت پیش آئی؟ اور پھر خود ہی (43:18) بتا دیا کہ تم نے اس کی حالت یہ بنا رکھی ہے۔ اس کی یہ وجہ ہے۔ کہا کہ **اَوَمَنۡ یُّنَشَّؤُا فِی الۡحِلۡیَۃِ وَھُوَ فِی الۡخِصَامِ غَیۡرُ مُبِیۡنٍ** (43:18) تم نے ان کو زیورات پہنا کر گڑیا بنا کر گھر میں رکھا ہوا ہے۔ اس بیچاری کی یہ حالت کر رکھی ہے کہ گھر میں اس کا اپنا کوئی کیس ہو تو یہ اس کو بھی صاف طور پر بیان نہیں کر سکتی یعنی اس حالت میں تم نے عورتوں کو بنا رکھا ہے کہ جو اپنا معاملہ گھر میں بھی صاف طور پر بیان نہیں کر سکتی' زیورات میں پلی ہوئی ہے۔ کیا بات ہے! قرآن کریم نے ایک تشبیہ دے کر بات ختم کر دی۔ وہ تو پھر بھی چودہ سو سال پہلے کی بات تھی۔ ہمارے ہاں کی آج جو پردہ نشیں مستورات ہیں' ان میں سے کسی کو پہلے پہل عدالت میں لے جایئے' جہاں عام مرد بھی ہیں' مجسٹریٹ بھی مرد ہے' وکیل مرد ہے پھر وہاں جرح کرنے والے وکیل ہیں' فریقِ مخالف بھی کھڑا ہے۔ اکیلی پردہ نشین عورت کو' گھر سے نکال کر وہاں جا کر کھڑی کر دیجئے' پسینے چھوٹ جائیں گے' اس کے اوسان خطا ہو جائیں گے یعنی قرآن حکیم نے اس عجیب بات کے لیے تجویز کیا ہے' کہا کہ اس بیچاری کو ایک نفسیاتی تقویت ہونی چاہیے کہ کوئی بات نہیں' ایک میری ہمنفس' ہمنوا' میرے ساتھ کھڑی ہے' میں یہاں تنہا نہیں ہوں اور اس کو عدالت میں یہ رعایت دی ہے کہ اگر کہیں تم سے بھول چوک ہو جائے' تو یہ تمہیں بتا سکتی ہے' حالانکہ اس کی عام طور پہ یہ اجازت نہیں ہوتی۔ یہ تمہیں بتا سکتی ہے اور جو کچھ یہ بتائے گی ہم اس کو اس کمزوری کی بنا پہ Accept (قبول) کر لیں گے کہ تم نے اس کی یہ حالت کر رکھی ہے' زیورات میں پلی ہوئی ہے' اپنا معاملہ گھر کے اندر بھی یہ صاف بیان نہیں کر سکتی' عزیزانِ من! آج بھی آپ غور کریں گے تو دیکھیں گے کہ کتنی ہمارے ہاں کے گھر کے اندر بھی جو رہنے والی ہیں' جن مستورات کا میں ذکر کر رہا ہوں' اور واقعی ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ وہ سب کچھ کر کے بھی دیکھتی ہے کہ معاملہ میرے خلاف ہی جا رہا ہے' وہ بیان نہیں کر سکتیں۔

عدالت میں عورت کی گواہی کے دوران کسی دوسری عورت کی موجودگی صرف ایک نفسیاتی سہارے کے لیے ہوتی ہے

قرآن کریم کہتا ہے کہ اس لیے ہم نے ان حالات کے تابع یہ کہا ہے کہ اگر وہ اکیلی وہاں چلی جائے گی تو اس کی بھی یہ کیفیت ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ کوئی نفسیاتی سہارا ہونا چاہیے کہ ایک بہن تو میری ہے اور اس کو عدالت کے اندر رعایت دے دی گئی کہ یہ تمہیں بتا بھی سکتی ہے اور تم اس کی تصدیق بھی کر سکتی ہو اور ہم اس کو Accept (قبول) کر لیں گے جو اس نے کہا ہے۔ یہ نہیں کہا ہے کہ کسی

دوسرے کی شہادت لی جائے گی' عورتیں دو گواہ نہیں ہیں' یہ پوری آیت نہ کوئی کوٹ (Quote) کرتا ہے' نہ بتاتا ہے' بس اتنا ہی بتاتا ہے کہ صاحب! اس نے کہا ہے کہ اگر دو مرد نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں۔ لہٰذا دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر اور دوسری کی شہادت کا ذکر نہیں۔

قرآنی معاشرے میں عورت کی تعلیم وتربیت کا معیار اور اس کے اثرات

عزیزانِ من! اب آیئے جو آیت ہمارے سامنے تھی۔ وہ تو میں پوری کرلوں۔ کہا یہ گیا کہ یہ تو بڑی باعزت مرفوع بلندی کے مقام کے اوپر بیٹھنے والی بیگمات ہیں۔ ان کے ذہن میں نہیں آسکتا تھا' وہ لونڈیاں تھیں یا ان کے ہاں کی عورتیں تھیں' وہ ایک ہی سطح پر تھیں۔ وہ مشرکین عرب عورت ہونے کی حیثیت سے' لڑکیوں کو زندہ زمین میں دفن کردیا کرتے تھے۔ وہ سوچیے تو سہی کہ عورت کا مقام ان کے ہاں کیا تھا۔ کہا کہ یہ ہے جو کچھ تم نے عورت کو بنا رکھا ہے۔ اِنَّـآ اَنۡشَـاۡنٰهُـنَّ اِنۡشَآءً (56:35). قرآنی معاشرے میں ان کی اس طرح سے تربیت وتعلیم ہوگی کہ یہ کچھ کا کچھ بن جائیں گی۔ کیا بات ہے اس لفظ قرآن کی! کہ یہ ایک نئی مخلوق بن جائیں گی۔ ہم ان کی اس طرح سے تربیت کریں گے' ان کو ایسی تعلیم دی جائے گی' ایسی تربیت دی جائے گی' ایسی نشوونما کی جائے گی کہ یہ یہ نہیں رہیں گی جو آج تمہارے سامنے ہے' کہ تم نے ان کو لونڈیاں بنا کر گھروں میں رکھا ہوا ہے۔ یہ کچھ اور بن جائیں گی۔ کیا بن جائیں گی؟ کہا کہ فَـجَـعَـلۡـنٰهُـنَّ اَبۡكَارًا (56:36). یہ ایک نئی مخلوق بن جائیں گی۔ اس مخلوق میں کیا ہوگا؟ عُرُبًا (56:37) نہایت فصیح البیان ہو جائیں گی۔ جو آج گھر میں بھی اپنے معاملے کو' خود اپنے Cause (سبب) کو Describe (بیان) نہیں کرسکتی یہی عُـرُبًـا (56:37) ہو جائے گا۔ یہی عرب جو اپنے آپ کو ساری دنیا کے فصیح البیان کہا کرتے تھے کہ کوئی ہمارے مقابلے میں نہیں' باقی گونگے ہیں' کہا کہ یہ جو آج گونگی بنا کے تم نے بٹھایا ہوا ہے وہ اَنۡشَاۡنٰهُنَّ اِنۡشَآءً o فَجَعَلۡنٰهُنَّ اَبۡكَارًا (56:35-36) . یعنی اپنی طرف کہا ہے کہ ہم ایسا انتظام کریں گے کہ جنّتی معاشرے میں ان کی تعلیم وتربیت اس قسم کی ہوجائے گی کہ یہ کوئی اور نئی مخلوق بن جائیں گی۔

بدلے کچھ ایسے طور سے' بے طور ہوگئے

ایسا بدلتا ہے جس طرح وہ کہ

تم تو شباب آتے ہی' کچھ اور ہوگئے

یہ چیز ہے فَـجَعَلۡنٰهُنَّ اَبۡكَارًا (56:36) کے معنی کے لیے۔ یہ وقت تھوڑا ہے۔ میں ابھی پھر ادھر نہیں آتا کہ پھر ان کو کیسے مسخ کیا گیا اور کیا کیا معنی پہنائے گئے۔ کہا ہے کہ ان میں کیا ہوجائے گا؟ کہا کہ عُـرُبًـا (56:37) پوچھو ان عربوں سے کہ یہ لفظ جو ہے' یہ کس چیز کی

تردید کے لیے ہے کہ وہ جو کہا گیا تھا کہ اپنے معاملے میں' Cause کو بھی یہ بیچاری اچھی طرح سے Describe (بیان) نہیں کرسکتی' اس کی ایسی تربیت کی جائے گی' ایسی تعلیم کی جائے گی کہ یہ مردوں کے مقابلے میں فصیح البیان ہوگی'

جنّتی معاشرے میں ہم خیال ہونے کے ثمرات

عزیزانِ من! یہ اگلی بات اَتۡـرَابًا (56:37) کہی۔ اگر یہ مرد اور عورت کا ذکر ہے تو پھر یہ ہے کہ دونوں ایک ہی مٹی سے پیدا ہوئے' یہ نہیں کہ یہ الگ مٹی سے پیدا ہوگی' اور وہ الگ مٹی سے۔ یہ ہم خیال' ہم مزاج' ہم طبیعت' ہم فکر' ہم کُل جس کو محاورے میں کہتے ہیں' ایک مٹی سے پیدا ہوئے اگر عورتوں کا ہی آپس میں ایک معاملہ ہے تو پھر ان کی عورتوں میں حسد اور رشک اور رقابت کی یہ چیزیں تھیں۔ کہا کہ یہ آپس کے اندر' اس معاشرے کے اندر' بالکل ہم مزاج اور ہم خیال ہونگی' نہ مرد اور عورتیں مختلف مٹی کے بنے ہوئے ہونگے' نہ عورتیں ایک دوسرے کے مقابلے میں مختلف مٹی کی بنی ہوئی ہونگی۔ یہ سب ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے ہونگے اور یہ ایسی فصیح البیان ہوجائے گی کہ اب جو آج گونگی بنا کر تم نے رکھ دیا ہوا ہے' یہ ایسی نہیں رہے گی۔ لِّاَصۡحٰبِ الۡيَمِيۡنِ (56:38). یہ ہے بابرکت معاشرہ' جس میں عورت کی یہ کیفیت ہوگی۔ کہا کہ ثُلَّةٌ مِّنَ الۡاَوَّلِيۡنَ o وَثُلَّةٌ مِّنَ الۡاٰخِرِيۡنَ (56:39-40). یہ ایک بڑی جماعت ہوگی' پہلوں میں سے ایک بڑی جماعت ہوگی اور بعد میں سے بھی ہوگی۔ اب یہ تاریخ کی بات ہے لیکن یہ ہوگا جنّتی معاشرہ۔ اس میں وَالسّٰبِقُوۡنَ السّٰبِقُوۡنَ (56:10). کا پہلے ذکر کیا' پھر اس کے بعد' اس معاشرے کو برقرار اور قائم رکھنے والوں کا ذکر کیا' اور اس کے بعد' اس کے برعکس ان بدبختوں کا ذکر کیا جو دوسروں کی محنت کے سرمائے پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ اس معاشرے میں کس قسم کے جہنم کے اندر ہونگے ❶ اسے ہم' جب جنّتی معاشرہ قائم ہوگا' تو آگے لیں گے۔

عزیزانِ من! سورۃ الواقعۃ کی آیت 40 تک ہم آ گئے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

---

❶ اس کی تفصیل اگلے ہی باب میں دیکھیے ۔

تیسرا باب: **سورۃ الواقعة** (آیات 41 تا 57)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ1983ء کی 4 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الواقعۃ کی آیت 41 سے ہو رہا ہے:(56:41)۔

جنّتی زندگی کے بعد جہنمی زندگی کا تذکرہ

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات میں جنت یا جنّتی زندگی کی تفصیلات اوراس کی آسائشیں، آرائشیں، نعماء کا ذکر چلا آ رہا تھا۔ وہ تصویر کا ایک رخ تھا۔ اس کے بالمقابل جہنمی زندگی ہے اوران آیات میں، جو ہمارے سامنے آ رہی ہیں، جہنمی زندگی کا ذکر آیا ہے اور جیسا کہ میں شروع سے یہ کہتا چلا آ رہا ہوں کہ جنت کی تفاصیل ہوں یا جہنم کے یہ تذکرے یہ سارے تمثیلی انداز میں بیان ہوئے ہیں، مثالی طور، پر تشبیہی طور پر، جسے ہم Allegorically کہتے ہیں، بیان ہوئے ہیں۔ یہاں جو الفاظ آئیں گے، انہیں آگ کہا جائے گا تو وہ سچ مچ کی آگ جو

چولہے میں جلاتے ہیں، جو ہمارے ہاں جلتی ہے، نہیں ہے۔ آگ ایک چیز کا استعارہ ہے کہ وہ شے کو جلا کر رکھ دے۔ اسی طرح سے میں نے جنت کی نعماء کے متعلق بھی کہا تھا، پھر یہ چیز بھی ذہن میں رکھیے جو میں اب بار بار کہتا چلا آ رہا ہوں کہ جنت ہو یا جہنم، جسے آپ جنت اور جہنم کہتے ہیں، متعین طور پر تو ہوسکتا ہے کہ آپ کہیں کہ آخرت میں ہی کچھ اس قسم کی چیزیں ہوں گی اگرچہ یہ بھی بڑا غور طلب Issue ہے لیکن بہرحال جنّتی زندگی یا جہنّمی زندگی اسی دنیا سے شروع ہوجاتی ہے اور یہیں سے پھر وہ مسلسل آگے چلتی ہے۔ ہر شخص اپنا جہنم آپ لے کر آگے جاتا ہے، اپنی جنت ''جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں'' کو ساتھ لے کر جاتا ہے۔ یہ Life کی Continuity ہے، زندگی کا تسلسل ہے۔

جنت کا ذکر تو آ چکا اور پھر بھی آتا رہے گا۔ جہنم کا جو ذکر آئے گا، تو اس میں آپ دیکھیں گے، یہاں کی جو جہنمی زندگی ہے، قرآن حکیم اسے بھی سامنے لایا گیا ہے اور اسی سے تو ہمیں احساس ہوسکتا ہے کہ آگے جا کر اس میں Intensity بھی تو ایک ہی بات ہوگی، کیفیت کے اعتبار سے تو وہی ہوگی، ہوسکتا ہے کہ اس میں Intensity کی شدت زیادہ ہوجائے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ وہاں کیسے ہوگی لیکن ہم یہ جان سکتے ہیں کہ یہاں جو جہنمی زندگی ہے، وہ کیسی ہوتی ہے۔ یہ اگر ہمیں احساس ہوجائے کہ جو ہم پہ بیت رہی ہے یہ جہنمی زندگی ہے تو پھر اس سے نکلنے کے لیے ہم کچھ سوچیں گے اور اگر یہ ہو کہ نہیں، یہ ٹھیک بات ہے، ہم جیسے یہ جی رہے ہیں، بالکل صحیح ہے، آگے بھی جائیں گے تو وہ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت ہمیں بچا کر جنت میں لے جائے گی تو پھر تو راوی عیش لکھا ہے، جو جی میں آئے کرتے چلے جایئے۔ یہ ذہن میں رکھیے کہ یہ جہنم کے بھی جو کوائف قرآن کریم بیان کرے گا، جہاں تک یہاں کی جہنمی زندگی کا تعلق ہے، اس میں اجتماعی طور پر قومیں بھی جہنم کے اندر ہوتی ہیں، ان قوموں کے اندر افراد بھی جہنم کے اندر ہوتے ہیں، قرآن کریم میں جہنم کے لیے النار تو بہرحال ہر جگہ آیا ہے، وہ تو اس جلا دینے والی چیز کی کیفیت ہے۔

جہنم اور جحیم کا لغوی مفہوم اور اس کا منظر نامہ

عزیزانِ من! قرآن کریم میں جہنم اور جحیم دو الفاظ آئے ہیں۔ یہ جہنم عربی زبان [1] کا لفظ ہے۔ جہنم دو لفظوں سے مرکب ہے: جِیُ هَـنُّوم. جِیُ وادی کو کہتے ہیں اور هَـنُّوم ایک شخص کا نام تھا۔ یہ یوں ہوا وادی هَنُّوم، جہاں سے جہنم ہوا۔ اس وادی [2] کے اندر، اس دور کی

---

[1] بعض کا خیال ہے کہ یہ عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں گہرا۔ کہتے ہیں ''دَكِيَّةٌ جَهَـنَّـمٌ'' گہری تہہ والا کنواں''۔ بعض نے اسے عبرانی لفظ گہنّامُ سے معرب مانا ہے۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ عربی الاصل ہے (پرویزؒ: لغات القرآن جلد اول، ص۔ 454)۔

[2] وادی هَنُّوم یروشلم کے جنوب میں ایک مشہور وادی تھی جس میں زمانہ قدیم میں مولوک (عَـمُّونِیّین کے دیوتا) کے حضور آدمی کو جلا کر قربانی پیش کی جاتی تھی لہٰذا جی ھنوم سے مراد تھی وہ وادی جہاں انسان ذبح کیے جاتے تھے اور انہیں جلایا جاتا تھا (محیط المحیط نیز غریب القرآن میرزا ابوالفضل اور پرویزؒ:

لغات القرآن جلد اوّل' ص۔454)۔

آبادی کا ایک منظر تھا۔ مولوک ان کا دیوتا تھا۔ اس کا بہت بڑا مندر تھا۔ اس مندر میں مولوک دیوتا کے سامنے انسانوں کو ذبح کیا جاتا تھا' جلایا جاتا تھا اور اس طرح انسانوں کی اس دیوتا کے سامنے قربانی دی جاتی تھی۔ عہدِ پارینہ کے اندر دیوتاؤں اور دیویوں کے سامنے اس قسم کی یہ قربانیاں چلی آتی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی جہالت کے اندر آپ دیکھتے ہیں کہ بچوں کو ذبح کر دیتے ہیں۔ بہر حال اس دیوتا کے سامنے' اس کے حضور' انسانوں کو ذبح کر کے جلایا جاتا تھا۔ یہ جہنم کی خصوصیت تھی تو جہنم زندگی کی وہ حالت ہے جس میں انسانیت ذبح ہوتی ہو' جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دی جاتی ہو۔ یہ انسانوں کو جلانے والی بات تو کوئی شے ہی نہیں ہے۔ جسم جل جائے تو مرہم لگایئے' آرام آجاتا ہے' لیکن جہاں انسانیت ذبح ہو جائے اور وہ جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دی جائے' یہ وہ جہنم ہے جس میں کہا ہے کہ تم نکل نہیں سکتے۔

جحیم دوسرا لفظ ہے۔ آپ کو یاد ہے کہ میں یہ بتا رہا ہوں کہ قرآن کریم تصور یہ دیتا ہے کہ زندگی آگے چلتی ہے' بڑھتی ہے' ارتقائی منازل طے کرتی ہے' اوپر کو اُٹھتی ہے۔ یہ لائف کا Evolution کا Process ہے اور اسی لیے یہ Continuity ہے' زندگی کا ایک تسلسل ہے' وہ یہاں کی زندگی سے اگلی منزل ہے' ارتقاء کی کچھ اونچی منزل ہے۔ جحیم اس مقام کو کہتے ہیں جہاں کوئی چلتی ہوئی شے رک جائے' تو جہاں کسی کی Progress رک جائے' نشوونما رک جائے' آگے بڑھنا رک جائے' وہیں کا وہیں کھڑا ہو جائے' جامد ہو جائے' جس مقام پر بھی وہ شے منجمد ہو جائے' وہ اس کی جہنمی زندگی ہے اور یہی ہے زندگی' جہاں پھر وہ جلانا شروع ہوتا ہے۔

حقیقی جہنم جہاں انسانیت ذبح ہو یا اس کی نشوونما رک جائے' انسانوں کا محکوم بنا لیا جائے: یہ یہاں بھی ہے اور آخرت میں بھی

عزیزانِ من! یہ کس چیز کا جلانا ہے؟ یہ جسموں کا جلانا نہیں ہے۔ کہا ہے کہ **نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ o الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ** (104:6-7) جہنم کی آگ خدا کی جلائی ہوئی ہے' جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔ یہ تو وہ شعلے ہیں جو دلوں کو لپیٹتے ہیں۔ اب اس کے بعد ہم میں سے ہر شخص محسوس کر لے گا کہ ہم کس قسم کی جہنم میں ہیں' ہمارے دل کس طرح سے جلتے رہتے ہیں' انسانیت کس طرح راکھ کا ڈھیر بنتی رہتی ہے' کن چیزوں سے دل جلتے ہیں' انسانیت تباہ ہوتی ہے۔

یہ جو جہنم کا عذاب ہے قرآن کریم نے کہیں عذاب مہین (2:90;3:178;4:14;22:57;31:6; 34:14;44:30; 45:9;58:5;58:16) کہا ہے' کہیں **عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ** (11:39) کہا ہے' جہاں انسان کو ذلیل کیا جائے۔ جہاں کسی انسان کی تذلیل ہوتی ہے' وہ اس کی جہنم کی زندگی ہے اور اسی لیے جہنم کا جو داروغہ ہے' اس کا نام مالک بتایا ہے۔ جہاں بھی کوئی ایک انسان دوسرے انسان

کا حاکم اوراس کا مالک اوراس کا آقا بن جائے' تو ظاہر ہے اس کا نتیجہ تذلیل ہے' تحقیر ہے فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ (30:16) وہ اپنے آپ کو تباہیوں میں موجود پائیں گے۔ عذاب مہین تو ذلت کا عذاب ہے۔ اب یہ دیکھ لیا کہ وہ جس آگ کے شعلے دلوں کو لپیٹتے ہیں' وہ آگ کیا ہے؟ وہ تذلیلِ انسانیت ہے۔ یہ بھوک پیاس' یہ بیماری' یہ چیزیں' یہ ایسا عذاب ہوتی ہیں' یہ توPhysical چیز ہے۔ وہ چیز جو دلوں کو لپیٹتی ہے وہ تذلیل انسانیت کی ہے تو جہنم میں سب سے بڑی جو چیز ہے' یہ جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ وہاں کا جو داروغہ ہے' اس کو مالک کہا گیا ہے: ایک انسان کا مالک دوسرا انسان۔ یہ تو وہی Slavery (غلامی) ہے اور یہ غلاموں اور لونڈیوں کی زندگی کی بات ہے' انسان کی تو بات نہیں ہے اور جونہی کوئی ایک مالک ہوا کسی دوسرے کا' تو ذلیل تو اس کے بعد فوراً ہوا۔ وہ حیوانی سطح کے اوپر آجاتا ہے۔ انسانی سطح کے اوپر وہ رہتا ہی نہیں۔ ملکیت بھی ان حیوانات کے اوپر ہوتی ہے۔ انسان کی ملکیت دوسرے انسان پر' انسان کی حکومت دوسرے انسان پر' یہ جو زندگی ہے' یہ جہنم کی زندگی ہے اور جو میں نے عرض کیا ہے کہ وہ آگے آنے والی جہنم اپنے مقام پہ برحق ہے میں پھر بار بار یہ کہتا چلا جاؤں گا کہ اس سے انکار نہیں لیکن یہ یہاں اس دنیا میں جہنم بھی ہے۔

انسان کا یہ فریب نفس ہے کہ جہنمی ہونے کے باوجود جہنم کو محسوس نہیں کرتا اور اس سے نکل بھی نہیں سکتا

عزیزانِ من! قرآن حکیم کہتا ہے کہ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ (82:16) تم تو اسے نہیں دیکھ رہے' وہ تم' سب کو' دیکھ رہی ہے' وہ جہنم تو یہاں دیکھ رہی ہے۔ ہماری آنکھیں بند ہیں۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ تم غافلین ہو' آنکھیں بند کیے ہوئے ہو' جو جہنم کو دیکھ نہیں رہے' جہنم یہاں موجود ہے: اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ (9:49) نہ ماننے والوں کو وہ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ جہنم کی آگ تو انہیں گھیرے ہوئے ہے۔ اگر یہ تصور ذہن میں آجائے کہ وہ زندگی جس میں تذلیل انسانیت ہے' جس میں انسان دوسرے کا مالک بنتا ہے' وہ اس کا مالک بنتا ہے' وہ آقا بنتا ہے' یہ محکوم بنتا ہے تو یہاں انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے تو یہ جہنم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہو' اپنے ذہن میں سمجھو کہ نہیں' ہم تو بڑی جنت کی زندگی' عیش کی زندگی' بسر کر رہے ہیں' یہ الگ بات ہے کہ تم اسے نہ دیکھو' جہنم تمہیں دیکھ رہی ہے' وہ جہنم چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ وہ تو آج کی بات ہے جو وہ گھیرے ہوئے ہے۔ اس تصور کو ذہن میں لے کر آئیے۔

برادرانِ عزیز! چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے کبھی سوچیے گا کہ کتنے شعلے ہیں جو ہمارے دلوں کو جلا رہے ہیں' کس کس قسم کی وہ آگ ہے جو بھڑکائی جارہی ہے۔ ہمارے چاروں طرف محیط ہے۔ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (2:167) ہزار چاہیں گے کہ وہاں سے نکل جائیں' نکل بھی نہیں سکیں گے۔ ایک مقام کے اوپر ہے کہ ابھرنے کی کوشش بھی کریں گے' جو کوشش کریں گے تو دھکا دے دیا جائے گا' پھر

وہیں اسے کہا جائے گا کہ اپنے اعمال کا مزہ چکھو۔

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا کیونکہ شعلے دلوں کو لپیٹ رہے ہیں

قرآن کریم نے جہنم کی تفصیل بتائی ہیں۔ آج کی زندگی میں اگر ہم ان کو محسوس کرنا شروع کر دیں تو پھر تو بہر حال اس جہنم سے نکلنے کی کچھ کوشش کریں اور اگر اس جہنم کا احساس ہی نہ ہو تو وہ تو سوال ہی نہیں ہے' اچھے بھلے بیٹھے ہیں صاحب! کھانے کو مل رہا ہے' سونے کو مکان مل رہا ہے۔ ٹھیک ہے' وہ کس مقام پر ہیں؟ قرآن کریم نے اس زندگی کے متعلق یہ کہا کہ اس میں نہ زندگی ہوگی' نہ موت ہوگی۔ عزیزانِ من! کبھی بیٹھ کر سوچیے گا کہ یہ کیا کیفیت تھی کہ قرآن بیان کر رہا ہے: نہ زندہ ہے' وہ نہ مرتا ہی ہے۔ اس میں دوسرے مقام پہ ہے کہ موت چاروں طرف سے آتے دکھائی دے گی لیکن موت آئے گی بھی تو نہیں:

میں نے چاہا تھا کہ اَندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ سِتم گر مرے مرَنے پہ بھی راضی نہ ہوا۔

(اسداللہ غالب)

موت دکھائی دے گی' مرے گا بھی نہیں۔ مرجائے تو جان چھوٹ جائے لیکن یہ تو ابدی جہنم ہے جب تک سانس ہے۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یہ جہنم ہے۔ کہا ہے کہ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ (2:167) بات تو ساری احساس کی ہے۔ احساس ہو جائے کہ یہ واقعی جہنم ہے۔ یہ باہر آگ کی تپش' اگر کہیں زیادہ لگنی شروع ہو' تو دیکھتے ہیں کہ کس طرح بھاگ کر دوسری طرف چلے جاتے ہیں' اس سے بچنے کا مداوا کرتے ہیں لیکن جس آگ کے شعلے دلوں کو لپیٹ رہے ہوں' اس کا انسان کو احساس نہیں ہوتا۔

قرآنِ کریم نے جس طرح جنّتی زندگی کی تفصیل دی ہے اسی طرح جہنّمی زندگی کی بھی دی ہے

ویسے تو قرآنِ کریم میں جس طرح جنت کے متعلق ہے' جنت والوں کے متعلق بتایا ہوا ہے کہ ان کی نشانیاں کیا ہیں' علامات کیا ہیں' خصوصیات کیا ہیں' اعمال کس قسم کے ہیں' اسی طرح جہنم کے متعلق بھی بڑی تفصیل سے بتایا ہوا ہے۔ وہ تو مقصد ہی زندگی کا یہ ہے کہ جہنم کی زندگی نہ ہو' اس سے نکال کر جو جنگ کی زندگی ہے' وہ بسر کرنا سکھائے۔ یہ ہے قرآن کریم کی تعلیم کا مقصود و منتہٰی اس لیے اس نے جہاں جنت کی تفاصیل بتائی ہیں' اسی طرح سے جہنم کے متعلق بھی بڑی تفصیل دی ہے۔

جہنم میں جانے والے تین گروہوں کا تعارف

عزیزانِ من! تفاصیل تو آتی رہیں گی لیکن بعض جگہ اس نے کچھ Categories (شقیں) بتائی ہیں' کچھ گروہ بتائے ہیں کہ اس قسم کی Category (گروہ) میں جو لوگ آتے ہیں' وہ جہنم میں جانے والے ہیں۔ دو تین Categories (شقیں) تو اس نے بڑی نمایاں طور پہ بتائی ہیں۔ سورۃ التوبۃ کی آیت 34 میں دو گروہ بتائے ہوئے ہیں۔ کہا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (9:34) ایک گروہ ان مذہبی پیشواؤں کا ہے جو خود محنت نہیں کرتے' دوسروں کی محنت کی کمائی پر جیتے ہیں' دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم تمہیں خدا کے راستے کی طرف لے جاتے ہیں حالانکہ خدا کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ خود ہوتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ کیا کہا ہے؟ پہلی ہی چیز یہ ہے کہ دوسروں کی محنت کی کمائی پر عیاشی کی زندگی بسر کرنا' ان کا وطیرۂ زندگی ہے اور پھر دوسری یہ چیز ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم تمہیں خدا کے راستے کی طرف لے جارہے ہیں' حالانکہ وہ خدا کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہوتے ہیں' یہ وہاں جانے ہی نہیں دیتے۔ یہ دوسری Category (شق) ہے۔ کہا ہے کہ وَ الَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (9:34) جو لوگ زندگی کی یہ جتنی بھی چیزیں ہیں' یہ انسان کی ضرورتوں کے لیے ہیں' کہ ضرورت پوری ہو جانے کے بعد جو باقی فالتو بچا ہوا ہو' اسے Hoarding کہتے ہیں' جمع کر کے رکھ لینا کہتے ہیں' وہ اس وقت کتنے ہی ضرورت مند انسان' محتاج انسان' فاقے مر رہے ہوتے ہیں' انہیں کتنی ضرورت ہو' وہ ان کی ضرورت کے لیے اسے کھلا نہیں رکھتے۔ اپنی ضرورت پوری ہونے کے بعد جو کچھ فالتو ہے' اس کو بھی دبا کر رکھ لیتے ہیں' حالانکہ یہ سامانِ رزق ان چیزوں کو خریدنے کا ذریعہ ہوتا ہے یہ تو اس لیے بنایا تھا کہ تمام انسانوں کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہیں لیکن یہ اس قسم کا معاشرہ بتاتے ہیں' جس میں تقسیم کی یہ صورت ہو کہ جس کا داؤ چلے' وہ جتنا جی چاہے سمیٹ کر لے جائے اور باقی بھوکے مرتے رہیں۔ کہا کہ یہ لوگ جو اس طرح سے سمیٹ کر رکھ لیتے ہیں تو یہیں' یہ مذہبی پیسوائیت' علماء اور مشائخ کی' دونوں Categories (شقیں) بتادیں۔ اسی آیت میں قرآن نے ذکر کر دیا ہے اور وہ لوگ ہیں' جو اپنی ضرورتوں سے زائد جو کچھ ہے' اس کو اس طرح سے دبا کر' جمع کر کے' رکھ لیتے ہیں۔ ان کے لیے کہا کہ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (9:34) اے رسول! ان کو ایک دردناک عذاب کا اعلان کر دو یَّوْمَ یُحْمٰى عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ (9:35) جب اس سامانِ نشوونما کو' اس مال کو' جہنم کی آگ میں جلایا جائے گا جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ اب قصے کا تمثیلی انداز آ گیا کہ ان کے یہ روپے پیسے' پونڈ' اسٹرلنگ' جہنم کی آگ کے اندر تپائے جائیں گے' ان کے ماتھوں کو' ان کی

پشتوں کو، ان کے پہلوؤں کو، ان سے داغا جائے گا' کہا جائے گا کہ ھٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ (9:35) یہ ہیں' وہ سکّے جنہیں تم نے بجائے اس کے کہ حاجت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے کام آئیں' اپنے لیے جمع کر کے رکھا تھا۔ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (9:35) اب وہ سکّے' مال' آگ ہیں' یہی ہے جو تم نے اس طرح سے دوسروں کو محتاج رکھ کر' اپنے لیے جمع کر لیے۔ اب اس عذاب کا مزہ چکھو۔ غور فرمارہے ہیں' عزیزانِ من! قرآن حمید کیا نظام دے رہا ہے جس میں نہ مذہبی پیشوائیت ہے' نہ سرمایہ داری ہے۔ ہر فرد کی ضروریات زندگی پوری ہوں گی۔

عزیزانِ من! اب یہ جو چیز ہے کہ یہ خدا کے راستے کی طرف جانے میں خود رکاوٹ بن جاتے ہیں' یہ دو گروہ' دو شقیں' دو Categories ہمارے سامنے آ گئیں۔ اب ان عوام کی تیسری کیٹگری آتی ہے سورۃ الاعراف کی آیت 179 سے بات صاف ہو جائے گی۔ اس میں کہا ہے کہ وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ (7:179)۔(Nomadic Tribes and Urban Tribes) جن وانس کی آبادیاں ہیں یعنی یہ آبادیاں متمدن دنیا کے شہروں کی ہوں ❶ یا ❷ باہر کی آبادیاں ہوں' ان میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے حالات بتا رہے ہوتے ہیں کہ وہ جہنم میں جانے والے ہیں یہیں سے پتہ چل جاتا ہے' اس نے علامت بتاء یہ ہے کہ ان کو دیکھ کر پتہ چل جاتا ہے کہ یہ جہنّمی ہیں۔ کیا نشانی بتائی کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کہا کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا (7:179) سینے میں وہ دل تو رکھتے ہیں کہ جن میں سمجھنے کی صلاحیت ہے لیکن ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے' وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا (7:179) آنکھیں رکھتے ہیں' دیکھ سکتے ہیں' دیکھنے کا کام نہیں لیتے' وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا (7:179) کان بھی رکھتے ہیں' سننے کا کام کچھ نہیں لیتے۔ ایک تو وہ ہیں جن میں یہ صلاحیتیں ہی نہیں ہیں' چلیے! کسی سطح پہ لے لیجیے۔ ایک تو یہ ہیں کہ ان کی یہ صلاحیت ہی نہیں ہے یا وہ Mentally ہی ایسے ہو گئے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ یہ سمجھنے کا' سوچنے کا' دیکھنے بھالنے کا' سب کچھ Senses (حواس) رکھتے ہیں' مگر ان سے خود کام نہیں لیتے۔

پہلی کیٹیگری کی فکر ونظر اور اس کا ماحصل

اب آیئے ادھر Priesthood' مذہبی پیشوائیت کے اوپر۔ کوئی معاملہ' کوئی مسئلہ کوئی پرابلم سامنے آئے' یہ نہیں ہے کہ وہ دیکھیں کہ حالات کیا ہیں' اس کے متعلق سنیں' اور پھر سوچیں کہ اس کا حل کیا ہوگا؟ یہ کرتے کیا ہیں؟ جب بھی کوئی بات ہو' ان کا کہنا یہ ہوتا ہے کہ فلاں نے یہ کہا ہے' طبری نے یہ فرمایا ہے' ابنِ کثیر میں یہ آیا ہے۔ ارے بھائی! تمہیں خدا نے آنکھیں دیں' کان دیئے' دل دیا' سمجھنے

---

❶ انہیں ''انس'' کہا گیا ہے (حوالہ: تاج العروس' ایڈورڈ لین کا لغت اور سعید الخوری الشرتونی اللبنانی کا لغت' اقرب الموارد کا نسخہ طبع شدہ بیروت 1889)۔

❷ انہیں ''جنّ'' کہا گیا ہے(حوالہ پرویزؒ: لغات القرآن' ص446)۔

سوچنے کی صلاحیت دی مگر یہ انہیں اپنی ہر کتاب میں اس طرح Quote کیے جاتے ہیں کہ یہ لکھا ہوتا ہے' کچھ اپنی سوچ سمجھ سے بھی بات کرو۔ انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! یہ مذہب کا معاملہ ہے' اس میں سوچنا سمجھنا حرام ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ **لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْإِنسِ** (7:179) جن کی روشِ زندگی سے پتہ چل جائے گا کہ یہ جہنم میں جانے والے ہیں۔ یہ انسان کی سطح زندگی نہیں ہے۔ یہ حیوان کی سطح زندگی ہے۔ پہلے تو یہ کہا کہ **أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ** (7:179) یہ لوگ انسان نہیں' بلکہ بالکل حیوان ہیں۔ اس اعتبار سے تو یہ سمجھ لیجیے کہ جو زندگی ہے' یہ انسان کی نہیں' حیوانوں کی ہے۔ یہ حیوان کی بات ہے کہ ریوڑ چرانے والا اس گلے کو' ریوڑ کو لیے جاتا ہے اس نے تتّا کہا' وہ بائیں طرف چلے گئے۔ اس نے ای تا ای تا تا کہا' وہ بائیں طرف چلے گئے: نہ اپنی آنکھیں' نہ اپنے کان' نہ اپنا دل' جس طرح طرف آواز دی جارہی ہے' اس طرف چلے جارہے ہیں۔ امام طبری صاحب نے یہ کہا ہے' ابنِ کثیر نے یہ فرمایا ہے۔ وہ مذہبی پیشوا کہتا چلا جارہا ہے' یہ مانتے چلے جارہے ہیں' نہ اپنی آنکھیں ہیں' نہ کان ہے' نہ دل ہے حالانکہ یہ سب کچھ موجود ہے۔ پہلی چیز تو یہ کہی کہ روش تو ایسی ہے جیسے حیوانات کی ہوتی ہے لیکن نہیں یہ تو **بَلْ هُمْ أَضَلُّ** (7:179) اس سے بھی گئے گزرے ہیں۔ حیوانات میں تو صلاحیت ہی نہیں تھی۔ اس چیز کی صلاحیت رکھتے ہوئے اپنے دل و دماغ سے کام نہ لینا' اپنے عقل و شعور اور علم و تدبیر سے کام نہ لینا' **كَالْأَنْعَامِ** میں شامل ہے۔ یہ انعام (حیوانات) کی طرح' بھیڑوں کی طرح' آواز پہ چلتے چلے جانا ہے۔ ادھر کیوں جارہے ہو؟ کہ جی! اگلی بھیڑ جو جارہی ہے۔ یہ ایک اندھوں کی قطار ہے' وہ اندھا جدھر چلا جارہا ہے پچھلے اندھے جو ہیں' اس کے پیچھے پیچھے چلے جارہے ہیں۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ یہ کیٹگری ہے کہ یہ سب کچھ رکھتے ہیں' دل اور دماغ اور آنکھیں اور کان رکھتے ہیں۔ کیا بات ہے! پہلے کہا کہ حیوان ہیں' پھر کہا کہ نہیں' ان سے بدتر ہیں اور آخر میں کہا کہ **أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ** (7:179) یہ سب کچھ رکھنے کے باوجود ان سے کام نہیں لیتے۔

جہنمی معاشرے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہاں انسان کا مالک انسان ہوتا ہے اور ایک مزید اہم شق بھی ہے

عزیزانِ من! دیگر کئی ایک اور Categories (گروہ) بھی ہیں۔ انہیں تو اب سرِ دست چھوڑ دیجیے' یہ تین Categories (گروہ) ہی لے لیں۔ وہ نظام جس میں انسان کا انسان مالک ہو' جو جہنم کا داروغہ بتایا گیا ہے' محکومیت ہو' دوسرے الفاظ میں انسانوں کی انسانوں پہ حکومت ہو۔ یہ وہ معاشرہ ہے جس میں اوپر کی Categories (شقیں) تو دو ہی بتا دیں کہ ایک تو وہ ہے جو خدا کی طرف دعوت دینے کے مدعی ہیں اور خدا کی طرف جانے والے راستے کے اندر روک بن کر کھڑے ہوئے ہیں' نہ خود سوچنے سمجھنے سے کام لیتے

ہیں' نہ تمہیں سوچنے سمجھنے دیتے ہیں۔ دوسری Categories (شقیں) یہ ہے کہ کوئی بات بھی سامنے آئے' وہ یہ کبھی نہیں کہتے کہ صاحب! عقل وفکر کی رو سے بھی غور کر کے اس پر دیکھو۔ ان کے ہاں عقل وفکر تو بالکل حرام ہے' وہاں تو یہ ہے کہ Quote کر دیجیے کہ صاحب فلاں نے یہ کہا' فلاں نے یہ فرمایا۔ یہ جو اس Quote کی آواز باہر سے آ رہی ہے' اس کے اوپر بھیڑوں کا یہ ریوڑ چلا جا رہا ہے۔

تیسری کیٹگری یہ ہے کہ زندگی کی وہ ضروریات' جو خدا نے بلا مزد و معاوضہ اس طرح عام کی ہوئی ہیں کہ اپنی ضرورت کے مطابق تو ہر ایک کو لینا ہی ہے لیکن اس سے جو زائد پڑا ہوا ہے' جس میں ہزاروں لاکھوں کی ضروریات پوری ہو جاتی تھیں' انہوں نے اسے جمع کر کے' كَنَزْتُمْ (9:35) رکھا ہوا ہے وہ کسی کام نہیں آ رہا' ضرورت مندوں کو انہوں نے محتاج بنا رکھا ہے۔ وہ اس نظام کی تیسری شق ہے۔

نظام کے اعتبار سے آپ دیکھیے کہ یہ نظام سرمایہ داری ہوتا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کہ ہر فرد کو حق حاصل ہے کہ جتنی جی چاہے دولت' وہ جمع کرتا رہے' اس کو فکر نہیں ہوتی کہ اس دولت سے کتنے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ دولت ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس طرح سے دولت کی گردش نہ کرو کہ وہ ایک اوپر کے طبقے میں ہی پھرتی رہے۔ یہ انسانوں کی نشوونما کے لیے ہے اور اشیاء کے پیدا کرنے یا خریدنے کا ذریعہ ہے۔ اسے سارے طبقے کے اندر گردش کرنا چاہیے۔ اگر یہ اوپر اوپر ہی گردش کرتی چلی جائے گی تو نیچے کا طبقہ محروم رہ جائے گا۔ یہ دو Categories (شقیں) تو یہاں ہو گئیں: مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری۔ اب رہے وہ دوسرے عوام' ان کے متعلق کہا کہ اگر وہ سمجھنے سوچنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود' سمجھ سوچ سے کام نہیں لیتے اور جو کچھ Quote کر دیا جاتا ہے' حوالہ دے دیا جاتا ہے' ریفرنس دیدی جاتی ہیں' کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ فرمایا اور یہ آیا ہے' اور اس کے مطابق وہ بھیڑوں کی طرح چل پڑے۔ یہ بھی جہنم کی زندگی ہے جو بسر کر رہے ہیں۔ آگے چل کر ہمارے سامنے جسے Main Item یا Main Categories آپ کہیں گے وہ یہی آئیں گی: خدا کے نام پہ دھوکا دینے والے' دوسروں کو ضروریات سے محروم رکھ کر اپنے لیے جمع کرتے چلے جانے والے' عقل وفکر سے کام نہ لینے والے' صلاحیتیں رکھنے کے باوجود ان صلاحیتوں کو استعمال نہ کرنے والے۔

عزیزانِ من! اب اس کے بعد ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیے گا کہ کس قسم کی جہنم ہے جو ہمارے اوپر محیط ہے۔ اب یہیں سے وہ جہنم کی بات آ گئی۔ کہا ہے کہ وَاَصۡحٰبُ الشِّمَالِ مَاۤ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ (56:41) یہ پہلے لِّاَصۡحٰبِ الۡیَمِیۡنِ (56:38) تھے' خوش بخت برکت والی زندگی والے تھے۔

اصحاب الشمال اور اصحاب الیمین کا فرق

اب دوسری طرف آئے۔ان کے ہاں یہ دوسری کیٹگری ہے جسے اصحاب الشمال کہتے ہیں۔یہ وہ ہیں جسے عام پر یہ ہم بدنصیب کہا کرتے ہیں' ورنہ قسمت اور نصیب کے الفاظ تو ہم نے اپنے لیے وضع کر لیے ہیں کہ بڑا بدقسمت ہے' بڑا بدنصیب ہے۔وہ ٹھیک ہے کہ اس کے حصے میں کچھ نہیں آتا' یہ قسمت کا تصور تو غلط ہے' غلط نظام ہے جس کے اندر جو جہنم میں پھنسے ہوئے ہوتے ہیں وہ سارے بدنصیب ہوتے ہیں۔کہا کہ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ (56:41) جنہیں بائیں ہاتھ والے کہا گیا ہے۔یہ ان معنی میں ہے جس میں ہم کہتے ہیں کہ ''اب آیئے ان کی طرف' جو بڑے بدنصیب ہیں' بیچارے ہیں کیونکہ اُدھر قرآن کریم نے فَاَصۡحٰبُ الۡمَيۡمَنَةِ (56:8) کہا تھا جس کے معنی دائیں ہاتھ والے ہوتے ہیں یعنی یمن وسعادت کے مالک۔

دلوں کو لپیٹنے والی آگ کا وہ عذاب جسے قرآن حکیم نے صحرا کی لُو کہہ کر پکارا ہے

کہا ہے کہ فِىۡ سَمُوۡمٍ وَّحَمِيۡمٍ (56:42) اب وہ تمثیلی بیان آیا۔یہ وہی ہے جسے عذاب کہا جائے گا' عرب کا ملک صحرا جیسا تھا۔ہم تو جانتے ہی نہیں کہ سموم ہوتی کیا ہے۔وہ تو کبھی کبھی ہمارے ہاں لُو چلتی ہے تو اس لُو میں بھی آپ دیکھیے کہ اس کے تھپیڑے انسان کو کیا کرتے ہیں لیکن یہ لُو تو اس لُو کے مقابلے میں کچھ شے ہی نہیں ہوتی۔اب انہیں جو سمجھانا ہے' تو ان کی زبان میں ہی سمجھایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ مثالی بات ہے جو ہم تمہیں کہہ رہے ہیں' یہ لُو کے تھپیڑے تمہیں چہرے پہ لگتے ہیں' اسے بھی تم لپیٹ لیتے ہو۔عربوں کا لباس اسی لیے اس قسم کا ہے کہ وہ ان لُو کے تھپیڑوں سے لپیٹتے ہیں' تو اس سے بچ جاتے ہو لیکن جو لُو کے تھپیڑے تمہارے دلوں کو گھیر لیں' اس سے تو باہر کا لباس تمہیں نہیں بچا سکتا۔

نظام سرمایہ داری کے عذاب کی ایک شکل جو کارخانے کی چمنی کے دھویں کی مانند ہے: اس میں نہ عزت' نہ توقیر

عزیزانِ من! آگے کہا کہ وَّظِلٍّ مِّنۡ يَّحۡمُوۡمٍ (56:43) صحراؤں کے اندر سایہ دار درخت کا مل جانا بڑی نعمت ہے۔کہا کہ سدا یہ تو کر سکتے ہو۔ایک سایہ وہ ہے جو مہمان کے لیے کیا جاتا ہے۔یہ سائبان شامیانہ لٹکایا جاتا ہے' اس میں ٹھنڈک بھی ہوتی ہے' اس میں عزت بھی ہوتی ہے۔کہا کہ ایک سایہ وہ ہوتا ہے کہ کارخانے کی چمنی کا دھواں نکلے اور سورج کے سامنے آ جائے۔کیا مثال ہے صاحب! کہ سایہ تو اس سے بھی ہوتا ہے لیکن وہ ہوتا ہے لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيۡمٍ (56:44) نہ وہ سایہ ٹھنڈا ہوتا ہے' نہ اس میں عزت ہوتی ہے۔یہ جو دوسروں کی کمائی ہے' میں ابھی عرض کروں گا کہ یہ کن کے متعلق کہا ہے۔کن کی بات کر رہے ہیں؟ کہتا ہے کہ (56:45) یہ وہ لوگ تھے جو اس سے پہلے دوسروں کی محنت کی کمائی پہ زندگی بسر کیا کرتے تھے۔الفاظ موجود ہیں۔اس دولت سے وہ سامان تو خرید لیں گے کہ وہ سائے کا سامان بھی ہوگا' ٹھنڈک کا سامان بھی ہوگا لیکن کہا کہ غور سے دیکھو تو اس سامان کے اندر عزت نہیں ملے گی ٹھیک ہے۔جسم پہ سایہ

ہوجائے گا' ٹھنڈا بھی ہوجائے اوراب توAir Conditioner بھی لائے جاسکتے ہیں' لگاتے ہیں' یہ سب کچھ لگے گا لیکن وہ جو دلوں کو لپیٹے ہوئے شعلے ہیں' ان سے وہ ٹھنڈے نہیں ہوسکیں گے۔ کہا کہ وَ كَانُوا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ(56:46) پھر مصیبت یہ تھی' ان کو کہا جاتا تھا کہ بھئی! یہ انسانیت کا بہت بڑا جرم ہے جو تم دوسرے حاجت مندوں کو محروم کر کے کر رہے ہو' اور اپنے پاس بے فائدہ ایک چیز' بے کار ایک چیز رکھ چھوڑنا' بہت بڑا جرم ہے اور پھر جو انسانیت کی تذلیل ہے یہ تو نا قابلِ تلافی جرم ہے۔ عزیزانِ من! یہ جرم بخشا ہی نہیں جاسکتا۔

قانون خداوندی کی گرفت تو لامحدود قوتوں کی حامل ہے

ان سے کہا جاتا تھا کہ وَ كَانُوا يَقُوْلُوْنَ(56:47) یہ بڑی عجیب بات کہی ہے کہ یہ کہتے تھے کہ صاحب! دیکھ لیجیے ہم تو عیش کرتے ہیں' ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا' ہم گرفت میں نہیں آسکتے' آ بھی جائیں تو ہمیں پتہ ہے کہ کیسے چھوٹ سکتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس سے کہا کہ ایک ہی بات ہے جو اس سے بچا سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہاں تو ان کی گرفت سے ہم چھوٹ سکتے ہیں لیکن خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت سے تو ہم نہیں چھوٹ سکتے۔ اس کی گرفت کا تو یہ عالم ہے کہ یہاں اگر کوئی مجرم مفرور بھی ہوجائے' جسے اشتہاری مجرم کہتے ہیں' وہ بہرحال اسی دنیا میں کہیں پھرتا ہوا' اسی لیے کبھی نہ کبھی پانچ سات سال' دس دس سال کے بعد قابو آجاتا ہے۔ یہ ذہن میں آجائے کہ یہاں ہم بھاگ جائیں گے' چھوٹ جائیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی گرفت سے بھاگ کر کہاں جاؤ گے۔ وہاں تو مرنے کے بعد بھی تم چھوٹ نہیں سکتے۔ زندگی آگے چلے گی' وہاں پکڑے جاؤ گے۔

مکافاتِ عمل پر یقین محکم میں نگاہ کی خیانت

اور ایک ہی چیز ہے' عزیزانِ من! جو اخلاق کو سنوار سکتی ہے' نظام کو سنوار سکتی ہے' جس سے یہ خرابیاں دور ہوسکتی ہیں۔ یہ بنیادی چیز خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان ہے جس چور کو یہ پتہ ہو کہ سامنے سپاہی کھڑا ہے' وہ اس وقت تو کبھی چوری نہیں کرے گا' یہ تو اب محسوس آنکھیں ہیں اور محسوس چوری ہے' جس کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ قانونِ مکافات تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات تک سے بھی واقف ہے' پھر چوری نہیں کی جاسکتی۔ کہا کہ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (2:4) قرآن کریم کے پہلے ہی صفحہ کے اوپر' سورۃ الفاتحۃ کے بعد پہلی سورۃ سمجھ لیجیے۔ پہلی چیز یہ کہی گئی ہے کہ اس بات کا یقین ہو کہ قرآن مجید کے الفاظ میں ہماری نگاہ کی خیانت اور دل کا ارادہ بھی اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔ اس کا اس چیز کے اوپر ایمان ہے۔ ایمان کیا ہو؟ کہ یہ چور کا ایمان ہو کہ وہ سپاہی دیکھ رہا ہے۔ اگر اس قسم کا ایمان ہے کہ خدا کا قانون مجھ پر کیسی نگاہ رکھتا ہے تو اس سے ہی اصلاح ہوسکتی ہے۔ یہ قوانین سازی Formulation of

Law سے نہیں ہو سکتی' اس سے جسموں کو تو گرفتار کیا جا سکتا ہے' ارادوں کو نہیں کیا جا سکتا' دلوں کو نہیں کیا جا سکتا اور انسان کا سارا عمل تو ارادوں کے اوپر مبنی ہوتا ہے صاحب! اگر ارادہ یہ ہو جائے کہ میں نے کوئی پڑی ہوئی چیز نہیں چرانی' تو اس کو نہیں اٹھائے گا' اگر ارادہ ہو کہ وہ پڑی ہوئی چیز چرانی ہے' تو ہزار طریقے' ہزار بہانے نکل آتے ہیں۔ اس کے لیے ارادہ ہونا ضروری ہے۔

اگر قانون کی پاسداری نہ کی جائے تو مسجدیں بنا بنا کر ثواب کا حصول چہ معنی؟

یہ جو مستقل ارادہ ہے جسے یہ یقین کہا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (2:4) ان سے یہی کہا ہے کہ یہ جو اس طرح مترفین کی زندگی بسر کرتے تھے' دوسروں کی محنت کو سلب کر کے' غصب کر کے' لے جاتے تھے اور اس پہ آپ عیش اڑاتے تھے' یہ ان کی بات کی جا رہی ہے کہ کہتے یہ تھے کہ ہمیں کون پکڑ سکتا ہے۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ ان سے کہو کہ صاحب! خدا کے ہاں اس گرفت کا انتظام ہے تو کہنے لگا کہ کوئی بات نہیں' میں نے اس کا بھی انتظام کر رکھا ہے' تم دیکھو گے' مولا چاہے گا' ہم وہاں بھی عیش ہی کریں گے' میں نے جتنی حرام کی کمائی ہے' جتنی دولت میں نے کمائی ہے' اس میں سے ایک مسجد بنوادی۔ اُدھر کا تو میں نے انتظام کر لیا ہے۔ قرآن کریم میں یہ ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ تم دیکھو گے ہم وہاں بھی عیش کریں گے کیونکہ انہیں بتایا گیا ہے کہ یہاں جو مسجد بنا دے گا وہاں اس کا موتیوں کا گھر بنے گا۔ وہ تو پہلے بن چکا ہوا ہے' وہ کسی اور کو دیا بھی نہیں جا سکتا' کوئی کرایہ دار بھی اس میں نہیں ہوگا' وہاں خالی پڑا ہوا ہوگا' چابی ہمارے پاس ہوگی' جائیں گے تو کھول کر بیٹھ جائیں گے۔ کیا بات ہے قرآن کریم کی! کہ تم دیکھو گے ہم وہاں بھی عیش کریں گے۔ ان سے کہا کہ یہ ہے وہ چیز جو روکتی ہے تو پہلی بات ہی یہ کہی کہ صاحب! یہ مر جانا' مرنے کے بعد اس کا پھر اُٹھنا اس کا پھر آگے جانا ہے۔

موت کا فرشتہ صرف انسانی جسم کو چھوتا ہے' اس کے مرکز سے ہمیشہ دُور رہتا ہے مگر یہ بات دیدۂ بینا کے لیے ہے

عزیزانِ من! اب یہاں پہلی بات ہی یہ کہی کہ وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ o اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ (56:47-48) کیا کہہ رہے ہو تم؟ کہ ہمارے جو پہلے مر گئے ہیں' وہ بھی اس طرح سے زندہ ہوں گے' پھر یہ زندگی آگے چلے گی' ہم مر جائیں گے' مرنے کے بعد اس کی گرفت میں آ جائیں گے۔ کیا کہہ رہے ہو تم؟ اس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟ کہا کہ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ o لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (56:49-50) ان سے کہو کہ سوال ہی نہیں ہے کوئی پہلے مر گیا' اب یہ بعد میں مر گیا ہے۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ جسم مٹی میں مل گیا۔ ہڈیاں تمہاری جو ہیں' وہ چورا چورا ہو گئی ہیں' جسم گل سڑ گیا ہے۔ یہاں جسم کا سوال ہی نہیں ہے۔ وہ شعلے تو دل کو لپیٹتے تھے اور وہ دل تو عمل کا محرک ہوتا ہے یعنی دل کے معنی گوشت کا یہ لوتھڑا نہیں جس کو یہ Physically

Heart کہا جاتا ہے' جس کے بند ہو جانے سے موت ہو جاتی ہے' وہ جس کو انسان کہا جاتا ہے آگے جائے گا۔ کہا کہ ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ (56:51) اے اس زندگی کو' قانونِ مکافات کو' جھٹلانے والو! غلط راستے پہ چلنے والو! وہاں تمہیں یہ نظر آ جائے گا کہ یہ کہنے والے تمہیں ٹھیک کہتے تھے کہ خدا کے قانون میں گرفت و مواخذہ ہے۔ اس وقت تمہیں آنکھوں سے نظر آ جائے گا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى (79:36) ان کے لیے جہنم ابھار کر سامنے لایا جائے گا جو اب دیکھنے کی آنکھیں رکھتے ہیں اور ہے تو اب بھی موجود مگر لِمَنْ يَّرٰى (79:36) یہ صرف دیدۂ بینا کے لیے ہے۔ وہاں یہ کہا جائے گا۔ یہ پھر وہی ذرا سی تفصیل ہے اور یہ عجیب چیز تھی۔

الزقوم: جہنمی زندگی کی کیفیت کا بیان

کہا ہے کہ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ (56:52-53)۔ اب یہاں شجرۃ زقوم ہے۔ یہ تھوہڑ کی قسم کا ہوتا ہے ❶۔ یوں اس کے حقیقی معنوں میں تو یوں ہوتا ہے۔ عرب کہا کرتے تھے کہ ''ایسا کھانا جو نہ اگلا جائے' نہ نگلا جائے'' یہ اس قسم کا کھانا ہے۔ اس سے تم اپنا پیٹ بھرو گے۔ دوسری جگہ یہ ہے کہ تم یہ نہ سمجھ لینا کہ وہ سچ مچ کا کوئی تودہ ہے جس کی بات کی جا رہی ہے۔ کہا گیا ہے کہ اس کی جڑیں جہنم کے پاتال سے نکلیں گی تو جہنم جہاں جحیم ہے کہ وہ جحیم کی جڑوں سے اُگتا ہے جہاں یہ اتنی ''آگ'' ہے اور یہ کچھ ہے۔ اس جہنم کی نچلی جڑوں سے وہ ایک پودا پھوٹے گا تو! وہ سچ مچ کا پودا تو نہیں ہوگا۔ وہ یہ رزق ہوگا ❷۔ یہ بھی بات بتا دی یہ کون لوگ ہیں جن کو یہ رزق ملے گا۔ (44:43-45) میں بڑی جہنم کی زندگی کی تفصیلات ہیں' عزیزانِ من! اس طرح سے انسان بچ ہی سکتا ہے۔

کہا کہ اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝ طَعَامُ الْاَثِيْمِ (44:43-44) پہلی بات تو یہ کہہ دی کہ زقوم کھانے سے نشوونما رک جاتی ہے' اس کی ذات مضمحل ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ ہمارے ہاں ترجموں کے اندر اثم (عدوان) وغیرہ کے یہ جتنے الفاظ ہیں ان سب کا ترجمہ گناہ اور گناہ ہی کیا جاتا ہے۔ یہ ایسی بات نہیں ہے کہ یہ شاعری ہے کہ کبھی یہ لفظ کہہ دیا' کبھی وہ۔ یہ وزن تو شعر کے لیے ہوتا ہے۔

---

❶ اَلزَّقُّوْمِ ایک جنگلی پودہ کا نام ہے' جس میں کڑوی سے تیز بو ہوتی ہے اور اس کے چھوٹے گول پتوں کے کنارے بہت بدہیئت ہوتے ہیں اور تنے میں موٹی موٹی گانٹھیں ہوتی ہیں۔

❷ ثعلب نے کہا ہے کہ الزقوم ہر اس کھانے کو کہتے ہیں جو زہریلا اور قاتل ہو (تاج العروس) اور صاحبِ محیط نے لکھا ہے کہ عوام میں اسے بطور ضرب المثل اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص ایسی چیز کھالے یا کوئی ایسا کام کر لے جو اس کے لیے وبالِ جان بن جائے (محیط المحیط نیز دیکھیے پرویزؒ: لغات

القرآن جلد دوم' ص ص۔806 تا807)

لفظ اثم کا لغوی مفہوم اور قوموں کی تباہی اور بربادی کے بنیادی اسباب کی وضاحت: طعام الاثیم

قرآن کریم کا تو ایک ایک لفظ پہاڑ کی طرح اٹل ہے' الگ معنی رکھتا ہے۔ اثم ہوتا ہے ''جس میں انسان تھک جائے' مضمحل ہوجائے' اس میں محنت کرنے کی سکت باقی نہ رہے۔ دوسروں کی کمائی پر جب جینے کی عادت پڑ جائے' اس میں محنت کرنے کی سکت ہی نہیں رہتی' اس لیے اس نے نظام یہ بتایا ہے کہ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39) محنت کا معاوضہ ملنا چاہیے۔ یاد رکھو! اس سے قومیں زندہ رہتی ہیں۔ اگر بغیر محنت کیے آپ اس قسم کی زندگی بسر کر سکتے ہیں تو محنت کرنے کی صلاحیت ہی ختم ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد آپ اس قابل ہی نہیں رہتے کہ زندہ' محنت کرنے والے جفاکش انسانوں کے ہمدوش چل سکیں۔ ان کے ہاں ناقة الاثمه ہے۔ یہ اس اونٹنی کو کہتے تھے جو تکان کی وجہ سے باقی ''ڈار'' ❶ سے پیچھے رہ جائے' ان کے ساتھ آگے نہ چل سکے۔

برادرانِ عزیز! افراد کو چھوڑ دیجیے۔ قوموں کو دیکھیے' ان اقوام کو دیکھیے جو ہم سے زیادہ زندہ قومیں ہیں' جو فزیکلی زندہ قومیں ہیں' جو Materially (مادی طور پہ) زندہ قومیں ہیں' ہم تو ان کے ساتھ چلنے کے بھی قابل نہیں رہے۔ یہ ناقة الاثمة کون ہوگا؟ تھکی ہوئی اونٹنی کون ہوگی؟ کہ قافلہ آگے جا رہا ہے' ڈار آگے جا رہی ہے' ہم ان کے ساتھ نہیں چل سکتے کہ تھک چکے ہیں۔ یہ کیسے تکان آتی ہے؟ کہا کہ یہ جو شجرة الزقوم تھا' یہ جو اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّوْمِo طَعَامُ الْاَثِيْمِ (44:43-44) تھا' یہ کسے دیا جائے گا؟ یہ انہیں دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ ذُقْ (44:49) زور کا ہے۔ عزیزانِ من! اسے کون جانے؟ کہا ہے کہ ذُقْ (44:49) اس کے منہ میں' ٹھونسا جائے گا اور یہ کہا جائے گا۔ یہ قرآن کریم کا لفظ ہی آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایسا ہے۔ قرآن حمید تو ایک لفظ کے اندر بات کہہ آتا ہے' ایک لفظ میں تصویر کھینچ دیتا ہے۔ کہا ہے کہ ٹھونسا جائے جو کھایا نہ جا سکے' نگلا نہ جا سکے۔ اسے کہے کہ ذق۔ یہ چکھنا پڑے گا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ (44:49) وہاں تُو بہت بڑا Honourable بنا پھرتا تھا' اپنے آپ کو بڑا صاحبِ عزت بنا رہا تھا۔ تو عزیز بھی بنا پھرتا تھا کہ میں بڑی قوتوں کا مالک ہوں' یہ بھی سمجھتا تھا کہ صاحب! میں بڑا باعزت ہوں۔

اگر اپنی صلاحیتوں کو زنگ آلود کرنا مقصود ہو تو محنت کے عمل کو خیر باد کہہ دو: یہ ہے گروہِ مترفین

جب آپ کے ہاں' قوت کا' عزت کا' معیار دولت ہوجائے تو آدمی پھر محنت کرنی چھوڑ دیتا ہے' یہ اثیم ہوجاتا ہے۔ دیکھیے! یہ طعام الاثیم کہا گیا ہے۔ کھانے کی تو صلاحیت یہ ہے کہ کھائے تو توانائی آئے' انسان کے اندر قوت آجائے' چلنے کی طاقت آجائے۔ بیمار کے

---

❶ بمعنی قطار

پاس بھی کہتے ہیں کہ صاحب! اینوں کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ او اے تھوڑا جیا تندرست ہووے (اسے کچھ کھلاؤ پلاؤ تو یہ تھوڑا سا تندرست ہو جائے)۔ طعام جو صحیح ہے اس کا یہ نتیجہ یہ ہونا چاہیے لیکن ایک طعام وہ ہے کہ اس کے بعد توانائی اور زیادہ کم ہو جائے۔ وہ طعام یہ ہے جو دوسروں کی محنت کے اوپر آدمی کھا سکے' اس کی توانائی اسی طرح کم ہوتی جاتی ہے' خواہ وہ فرد ہو' خواہ وہ قوم ہو' سعی کی اس کے اندر قوت ہی نہیں رہتی' پھر اس کے اندر محنت کر کے کھانے کی عادت ہی نہیں رہتی۔ یہ ہے **طَعَامُ الْاَثِیْمِ** (44:44) یہ ہے وہ رزق' جس کو زقوم کہا گیا ہے اور کہا ہے کہ **ذُقْ ج اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمُ**(44:49) تُو اپنے آپ کو بڑا واجب التکریم اور صاحبِ غلبہ واقتدار سمجھا کرتا تھا۔ اب اپنے اعمال کا مزہ چکھ۔ یہ ہیں دولت کے وہ انبار۔ تُو بہت بڑا صاحبِ قوت اور صاحبِ رزق کریم بنا پھرتا تھا' بڑا معزز سمجھتا تھا۔ ان کی بارگاہ میں جب استقبالیہ بڑھا جاتا ہے' اور پھر وہ اس کے ہاں فریم کر کے دیا جاتا ہے' اس میں ان کے جو الفاظ ہوتے ہیں' وہ ذرا دیکھیے! عزیز و کریم تو سارے دو ہی الفاظ ہیں' ان کے ہاں دنیا بھر کی عزت و تکریم ہے۔ اس لیے کہ اس نے زیادہ سے زیادہ غریبوں اور محنت کشوں کی دولت کو سلب کیا تھا۔ اب کہا جائے گا کہ **ذُقْ ج اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ**(44:49)۔ عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ پہلے ''اِنَّکَ'' بھی ساتھ ہے' اس میں بڑی شدت سے ایک چیز بیان کی جاتی ہے صاحب! تُو بہت بڑا واجب التکریم بڑا بنا پھرتا تھا' یہ مترفین تھا جو اس کا طبقہ تھا۔ یہ ہے وہ رزق' عزیزان من! جس کے متعلق❶ وہ کہہ گیا تھا کہ

اے طائرِ لاہوتی! اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

یہ پرواز میں کوتاہی آ جاتی ہے۔ اس رزق سے محنت کرنے کی عادت ہی نہیں رہتی۔

محنت کے بغیر حاصل کردہ رزق سے انسان جفاکشی کی لازوال نعمت سے ہی محروم ہو جاتا ہے

عزیزانِ من! پھر وہ افراد بھی اس طرح سے مضمحل ہو جاتے ہیں اور ان کے قویٰ بھی۔ قومیں بھی اس طرح سے تباہ ہو جاتی ہیں' وہ دوسری قوموں کے ہمدوش چلنے کے قابل ہی نہیں رہتیں۔ اس طرح سے اگر مانگ تانگ کر روٹی کھا کر گزارہ بھی کیا تو کیا! لیکن اس رزق سے توانائی بھی اور کم ہوتی چلی گئی۔ ''اس رزق سے موت اچھی''! کیا بات کہہ گیا ہے یہ شخص ہے۔ اسے قرآن کریم نے **شَجَرَةَ الزَّقُّوْمِ** (44:43) کہا ہے' عزیزانِ من! ٹھیک ہے اس سے پیٹ تو بھر جائے گا' توانائی نہیں آئے گی۔ کیا اشارہ ہے

---

❶ یہ مفکرِ قرآنِ کریم جناب ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کی طرف اشارہ ہے۔

فزیکلی رزق تو آپ نے دیکھا کہ ان کے ہاں تو ڈھیر لگے ہوئے ہوں گے' دولت کے انبار ہوں گے مگر اس سے انسانیت کی رمق تک نہیں خریدی جا سکے گی۔

مادی ذرایعے کے سلسلہ میں انسانی ہوس گیری وہ کھولتا ہوا پانی ہے جو ہر چیز کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے

کہا ہے کہ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ (56:54) پینے کے لیے بھی کھولتا ہوا پانی ہوگا۔قرآن کریم میں دو ہی قسم کے پانی بتائے ہیں اور وہ پودوں کی مثال دے کر بتائے ہیں۔ایک تو وہ ابلتا ہوا پانی ہے۔کھیتی کے پودے کی زندگی پانی پہ ہوتی ہے' اسی سے وہ پھولتی ہے' کونپل پیدا ہوتی ہے' اسی سے وہ بڑھتا پھولتا پھلتا ہے لیکن اگر اس پر کھولتا ہوا پانی ڈال دیا جائے' اچھا بھلا پودا بھی جھرمر ہو کر رہ جاتا ہے اور دوسری طرف قرآن کریم نے کہا ہے کہ اگر وہ برف جیسا یخ بستہ پانی ہو' تو اس سے بھی مرجھا جاتا ہے۔افراط وتفریط دونوں واضح کی ہیں۔ اس نے کہا کہ افلاس سے بھی قومیں تباہ ہوتی ہیں' افراطِ زر سے بھی قومیں تباہ ہوتی ہیں۔نہ کھولتا ہوا پانی اس کے لیے مفید ہوتا ہے' نہ یخ بستہ مفید ہوتا ہے۔کہا ہے کہ کھولتا ہوا پانی ہے۔فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ (56:55) آہاہاہا! ایک تو ضرورت ہوتی ہے۔انسان کو بھوک لگی ہوئی ہے' ضرورت ہے ایک روٹی کھالے گا' دو کھالے گا' چار کھالے گا' اس کے بعد تو بھوک ختم ہوئی۔ٹھیک ہے' بھوک کی احتیاج پوری ہوگئی' پینے کے لیے پانی ہے' کتنا پی لے گا۔ بہت ہی زیادہ' دوپہر کے وقت بھاگا ہوا' پیاسا آئے گا' تو ایک گلاس کے بعد دوسرا گلاس آپ دیدیں گے' دوسرا پی لے گا' اس کے بعد پیاس ختم ہو جائے گی۔

ان کے ہاں اونٹوں کو ایک بیماری لگتی تھی۔ پتہ نہیں اِدھر کے جانوروں کو' مویشیوں کو' بھی لگتی ہے۔اسے جھوٹی پیاس کہتے تھے۔جھوٹی پیاس میں مارا مارا وہ پھرتا تھا۔ پانی پیتا تھا' پیاس بجھتی نہیں تھی۔غور فرماتے ہیں آپ' یہ نظامِ سرمایہ داری' یہ سرمایہ داروں کا نقشہ' کیا کھینچا ہے! ضرورت کے لیے تو ایک حد مقرر ہوتی ہے۔اس سے زیادہ کتنا کروڑ پتی کیوں نہ ہو' صاحب! وہ بھی اگر اسکی بھوک دو روٹی کی ہے' تین نہیں کھا سکتا لیکن روپے تو روز بنک میں جمع کرتا چلا جاتا ہے' اس کی حد نہیں ہوتی۔ یہ کیا ہے؟ کہا ہے کہ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ○ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:1-2) ضرورت نہیں ہے' لیکن ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی جو ہوس ہے' وہ اس کو لیے چلے جارہی ہے' یہ بھاگتا چلا جارہا ہے' تھکا ہوا بھاگ رہا ہے' تا آنکہ قبر کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔کہا کہ وہ جو پانی ہے' وہ اس پیاسے اونٹ کی کیفیت معلوم ہے' پانی پیتا ہے' پیاس بجھتی نہیں ہے۔ان کی پیاس وہ حقیقی پیاس نہیں ہے جو ایک یا دو گلاسوں سے بجھ جائے۔وہ تو شُرْبَ الْهِيْمِ (56:55) ہے' اس اونٹ کی پیاس ہے کہ جس کی پیاس بجھتی نہیں ہے: اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ○ حَتّٰى زُرْتُمُ

الْمَقَابِرَ (102:1-2)۔ یہ ایک ریس لگی ہوئی ہے' زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی' اس کے پیچھے بھاگے چلے جا رہے ہیں' جناب! حیم کی طرح' اس اونٹ کی طرح' جس کی پیاس بجھتی نہیں ہے: **حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ** (102:2) تا آنکہ قبر کے گڑھے میں جا پڑتے ہیں۔ یہ ہوگا۔ **هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ** (56:56)۔ نتائج کے برآمد ہونے کا جو وقت آئے گا' اس میں ان کی اس انداز کی مہمانی ہوگی کہ یہ اپنے آپ کو بہت بڑا معزز اور واجب التکریم سمجھا کرتا تھا' خود ان کے اعمال' ان کی سزا بن کر ان کے سامنے آ جائیں گے۔

قرآن حکیم کے تحت انسانی زندگی ایک جوئے رواں ہے

ہاں ایک اور لفظ کہا ہے کہ **نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ** ❶ (56:57)۔ آگے بات اب دلائل پہ آ گئی کہ بات جو تم اس مرنے کے بعد کی زندگی کی کہتے ہو پھر تم زندہ ہو جاؤ گے' قرآن حکیم اس کے لیے محسوس اور مشہود مظاہر سے اسی زندگی کے دلائل کی مثال دیتا ہے۔ جو یہ Physical Life ہے' اس کے دلائل دیتا ہے' یہ نہیں کہتا کہ وہ اسی قسم کی ہے لیکن دلائل دیتا ہے۔ کہتا ہے پہلی چیز یہ ہے کہ تمہیں معلوم ہے کہ یہ کہنے والا کون ہے کہ زندگی آگے چلے گی۔ یہ کہنے والا وہ ہے جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا کہ تم تو کچھ ہی نہیں تھے' کیا دلیل ہے! جو عدم سے وجود میں لا سکنے کے قابل ہے' تم کہتے ہو وہ تو یہی ہے کہ یہ جو تمہارا جسم ہے' بوسیدہ ہو جائیگا' ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی' گل سڑ جائیں گی' چلیے! ان لوگوں سے بھی پوچھیے تو مادہ تو Non- existent (معدوم) نہیں ہوتا' یہ مزید تبدیل ہو جاتا ہے' یہ تمہارا جسم مٹی میں مل جائے' یہ کھا جائیں گے وہ اس کے اجزاء تو پریشان ہو جائیں' ہوا کریں' وہ تو رہیں گے۔ وہ کہتا ہے' یہ کہنے والا وہ ہے جس نے تمہیں اس طرح پہلی بار پیدا کیا کہ تم تو کوئی شے ہی نہیں تھے۔ یہ From nothing to creation ہے۔ اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ جسے تم کہتے ہو کہ موت آ گئی' ہڈیاں گل سڑ گئیں' اور وہ تمہیں زندگی دیدے۔ سوچو تو سہی اس پہ۔ مانتے ہو نا اس چیز پہ کہ واقعی اس حالت پہ اس نے تمہیں زندگی دی اور انسان بنایا اور زندگی قائم ہے۔ وہ کہنے والا یہ کہہ رہا ہے۔ تم اس کو کس طرح سے جھٹلا سکتے ہو: **فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ** (56:57) اور آگے پھر اس دلیل کی تشریح چلتی ہے۔

عزیزانِ من! آج کا وقت ہوگیا' ہم سورۃ الواقعۃ کی آیت 57 تک آ گئے ہیں' 58 ویں سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀......❀......❀

---

❶ (ان سے، اے رسول! کہو کہ یہ بات کہ تم دوبارہ پیدا کیے جاؤ گے، تم سے) وہ خدا کہہ رہا ہے جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا۔ تمہیں اپنی پہلی بار کی پیدائش پر تعجب کیوں نہیں آتا، جو دوسری بار کی پیدائش کو ممکن تصور نہیں کرتے اور اسے جھٹلا رہے ہو (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص1269)

چوتھا باب: **سورۃ الواقعة** (آیات 58 تا 74)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1983ء کی 11 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الواقعة کی آیت 58 سے ہو رہا ہے: (56:57)۔

مترفین کی زندگی، تسلسلِ حیات اور انسانی جسم

سابقہ آیات میں دو باتیں نمایاں طور پر سامنے آئی تھیں۔ ایک تو یہ کہا گیا تھا کہ جہنم کی زندگی یا جہنم میں جانے والے وہ لوگ ہیں جو دوسروں کی محنت کو سلب کر کے عیش اڑاتے ہیں۔ یہ ہیں مترفین ۔ یہ دوسروں کی محنت کو Exploit (سلب ونہب) کر کے، دوسروں کی محنت کی کمائی پر عیش اڑانے والے ہیں۔ سرمایہ داری کا پورا نظام اس میں آ جاتا ہے۔ یہ جہنم والے ہیں۔ ان سے جب کہا جاتا تھا کہ یہ جو کچھ تم کر رہے ہو، یہ تو انسانیت کا بہت بڑا جرم ہے، اس کا نتیجہ تباہی ہوگا، وہ کہتے تھے کہ تم ہماری زندگی دیکھو۔ کیا یہ جہنم کی زندگی ہے؟ ہمیں تو ہر قسم کی آسائشیں، آرائشیں، سامان خورد و نوش، ہر قسم کی زندگی کے ساز و سامان، حاصل ہیں۔ اس سے اور بہتر زندگی کیا ہو سکتی ہے اور وہ

کون ہیں جو ان پہ گرفت کرے' مواخذہ کرے۔ اگر کوئی چیز خلافِ قانون بھی ہوتی ہے تو اس کے لیے ہمارے پاس انتظامات ہیں۔ یا تو ہم وہ قانون ہی بدل دیتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر ہمارا انتظام ایسا ہے کہ ہم گرفتار ہی نہ ہوں' پکڑے ہی نہ جائیں' مواخذہ ہی کچھ نہ ہو۔ ادنیٰ کورٹ سے لے کر سپریم کورٹ تک ہمارے انتظامات موجود ہیں' ہمیں کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ یہ معاملہ سپریم کورٹ تک ختم نہیں ہو جاتا حتیٰ کہ تمہاری اس زندگی تک ہی ختم نہیں ہو جاتا' زندگی آگے چلتی ہے اور جو کچھ یہاں کیا جاتا ہے' اس کے نتائج سامنے آ کر رہتے ہیں' خواہ اس زندگی میں سامنے آئیں یا اس کے بعد کی زندگی میں سامنے آئیں۔ یہ جو زندگی ہے اور وہ زندگی جو میں نے عرض کیا تھا کہ یہ ہم نے ہی تفریق کر دی ہے' قرآن حکیم تو اس کی Continuity (تسلسل) کا قائل ہے کہ زندگی تو مسلسل چلتی ہے' پہلے یہ ندی ذرا باغ کی باڑ سے باہر ہوتی ہے' اس کے بعد یہ باغ کے اندر آ جاتی ہے' ندی تو اسی طرح سے رواں دواں آگے چلتی ہے اپنے اعمال کے اثرات ساتھ لیے ہوئے اور ان کے نتائج' خواہ یہاں برآمد ہوں یا اس کے بعد برآمد ہوں' اس کی گرفت سے تم کہیں باہر جا نہیں سکتے۔ اس پہ ان کا اعتراض تھا کہ ہم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں' انسان مر جاتا ہے' ہڈیاں بوسیدہ ہو جاتی ہیں' اس کا جسم خاک میں مل جاتا ہے تو اس کے بعد پھر کہاں کی زندگی اور کہاں کا پیدا ہونا!!!

جہانِ فردا کی زندگی کے وجود کو باور کرانے کا قرآنی انداز: اس محسوس دنیا کے پیکروں پر گفتگو

عزیزانِ من! یہ جو مقامات ہیں' انہیں ماوراء الطبیعات کہتے ہیں۔ یہ جو فزیکل دنیا ہے' مادی دنیا ہے' اس سے ماوراء جو چیزیں ہیں' ان کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے اور قرآن کریم ان کو یا تو تمثیلاً سمجھاتا ہے اور اس تمثیل میں وہ اس مادی دنیا' اسی محسوس دنیا کے پیکروں کی' گفتگو کرتا ہے اور اس سے وہ نتیجہ برآمد کراتا ہے کہ سوچ سمجھ سے کام لو' کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا یعنی وہ یہ تو نہیں ہے کہ وہ تمہیں دکھا دے کہ یہ دیکھو مرنے کے بعد کی یہ زندگی ہے' وہاں سے کسی کو لوٹا کر لے آئے اور کہے کہ لو پوچھ لو اس سے کہ وہ ہے زندگی یا نہیں؟ یہ تو ہے نہیں' تو اسے سمجھانے کا یہی طریقہ ہے کہ یہاں کی ایسی چیزیں' جن کے متعلق پہلے کہا جائے' کہ تم ذرا اپنی عقل وفکر کی رو سے سمجھاؤ تو سہی کہ یہ کیسا ہوتا ہے' اگر اسی چیز کے متعلق تم کہہ سکو کہ ہے تو یہ واقع' لیکن ہم بتا نہیں سکتے کہ یہ کیسے ہوتا ہے۔ کہو تو پھر یہ اعتراض ٹھیک ہے تو بات یہ نہیں ہے کہ چونکہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بات تم عقلی طور پہ ہمیں سمجھا نہیں سکتے' اس واسطے ہم اس کے وجود سے ہی انکار کرتے ہیں۔

رحمِ مادر میں انسانی زندگی کی ابتدا: محسوس پیکر کی مثال

اس کے لیے پہلی چیز اس نے یہ کہی کہ نَحۡنُ خَلَقۡنٰکُمۡ فَلَوۡ لَا تُصَدِّقُوۡنَ (56:57) موجودہ زندگی جو تمہاری ہے' تم جو ایک انسانی پیکر میں ہو' انسان ہو' موجودہ ہو' اسے تو تم مانتے ہو کہ تم موجود ہو۔ ذرا غور تو کرو کہ یہ تم کس طرح سے موجود ہوئے؟ کہا کہ اَفَرَءَیۡتُمۡ

مَّا تُمۡنُوۡنَ o ءَ اَنۡتُمۡ تَخۡلُقُوۡنَہٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡخٰلِقُوۡنَ (56:58-59) یہ زندگی کی ابتداء جو ہوئی تو بچے کی پیدائش کو لے کر لیجیے۔ وہ کہا کہ سوچو تو سہی' یہ جو مادہ تولید ہے' اس میں کروڑوں کی تعداد میں یہ جرثومے یا سیلز ہوتے ہیں۔ ایک سیل نر کا ایک مادہ کا ہوتا ہے' اس کے اختلاط سے زندگی کی ابتداء ہوتی ہے۔ وہ اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ خوردبین کے سوا دیکھے بھی نہیں جاسکتے۔ کہا کہ کیا تم سمجھا سکتے ہو کہ یہ جو اتنے ایسے سیلز ہیں ان سے اس طریق سے جو بچہ پہلے رحمِ مادر کے اندر بنتا ہے' پرورش پاتا ہے' اس رحم کے اندر' جو بالکل چاروں طرف سے ایک بند غبارہ سا ہوتا ہے' اس میں باہر کی دنیا کی کوئی چیز نہیں ہوتی' بچہ سانس لیتا ہے' بڑھتا ہے' پھولتا ہے' پھلتا ہے' اس کا دل دھڑکتا ہے' دل دھڑکن کی ہر چیز کے متعلق تو ڈاکٹر باہر سے معائنہ کرتا چلا جاتا ہے۔ کہا کہ اگر تمہارا یہ بچہ سامنے نہ ہو یا اس طرح سے تمہارے علم میں یہ بات نہ ہو' تم اس کو محسوس نہ کرو کہ یوں ہوتا ہے تو کیا تم کبھی سمجھا سکتے ہو!!

کچھ بھی ہو کوئی آخری انسان بھی رحمِ مادر میں سانس کو پیدا نہیں کر سکے گا

کہا کہ اس سے بھی پیچھے چلے جاؤ۔ ان جرثوموں میں تو پھر بھی زندگی ہوتی ہے۔ یہ زندگی کہاں سے آ گئی؟ یہ وہ مقام ہے کہ وہ تیرہ سو سال پہلے کا بدو نہیں' بلکہ چودہ سو سال کے بعد کا آج کا بلند ترین Scientist (سائنسدان) بھی' اس مقام میں محوِ حیرت ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو چیز ہے' یہ نہ سمجھ میں آ سکتی ہے' نہ سمجھائی جاسکتی ہے کہ زندگی کیسے آ گئی۔ یہ (Matter) مادہ Inanimate (غیر جاندار) ہے' جس میں زندگی نہیں ہوتی۔ اس کے اندر زندگی کیسے آ گئی' کہاں سے آ گئی' کیسے پیدا ہوگئی؟ سائنس اور سائنٹسٹ اس مقام پہ اسی طرح محوِ حیرت ہے جس طرح سے کہ پہلا انسان' دورِ جاہلیت کا انسان تھا۔ انسانی عقل اس عقدے کو وا نہیں کر سکی۔ ابھی جنوری مہینے کا ہی وہ ریڈرز ڈائجسٹ [1] ہے۔ غالباً اس میں ہے کہ پھر سائنسدان جمع ہوئے' انہوں نے یہ کہا کہ زندگی سائنس پیدا نہیں کر سکتی' کوئی ایسا طریقہ نہیں کہ ہم لائف کو پیدا کر دیں۔ لائف کس طرح سے وجود میں آ گئی؟ یہ ہم نہیں کہہ سکتے؟ ایک سائنسدان نے تو دنیائے سائنس میں یہ کہا ہے کہ یہ عقدہ ایسا ہے کہ وہ جو آخری انسان ہے' یہ ہم اسی کے اوپر چھوڑتے ہیں کہ شاید وہ کچھ بتا سکے' ہم تو کچھ نہیں بتا سکتے۔ عزیزانِ من! وہ آخری انسان بھی بتا نہیں سکے گا کہ زندگی کیسے پیدا ہوگئی' کہاں سے آ گئی۔ یہ زندگی کی نمود ہے جسے ہم ''یہ انسان کا پیکر' جسمِ انسانی'' کہتے ہیں۔ زندگی نے اپنے مظہر کے لیے ایک پیکر تراش لیا ہے' یہ زندگی نہیں ہے' یہ جو اس کے اندر زندگی ہے' وہ کہاں سے آ گئی' اسے کوئی ذہن بھی نہیں بتا سکتا' ترقی سائنس کے انکشافات اسے کوئی حل نہیں کر سکے' نہ اس کا کوئی جواب دے سکا۔ کہا کہ تم یہ بتاؤ کہ یہ جو اس جرثومہ اولین میں زندگی آئی اور پھر اس جرثومے سے رحمِ مادر کے اندر اس انداز سے ایک بچہ بنا' پھر اس کی وہاں نشو ونما بھی ہو رہی ہے' غذا بھی مل رہی ہے' سانس بھی لے رہا ہے' دل بھی دھڑک رہا ہے' پرورش پاتا چلا جاتا ہے' ہر چیز بنتی چلی جاتی ہے۔

مگر یہ زندگی کہاں سے آئی' یہ زندگی کیا ہے' اسے کوئی نہیں بتا سکا۔

---

❶ اس کے لیے دیکھیے: جنوری 1983ء کا ریڈرز ڈائجسٹ۔ اس کے لیے اسی کتاب کا دوسرا باب دیکھیے۔

انسانی دماغ کے متعلق ہونے والی تحقیق جو بڑی ہی حیران کن ہے

عزیزانِ من! آج کل بھی ایک آرٹیکل اور آ رہا ہے۔ وہ Brain کے اوپر آرٹیکل آ رہا ہے۔ سائنٹسٹ دانتوں میں انگلی دبائے ہوئے بیٹھے ہوئے ہیں' صرف ایک اکیلے Brain کی' دماغ کی' جو ساخت ہے' اس کے متعلق جو تجزیئے کر رہے ہیں' صاحب! کہ یہ کس طرح سے کام کر رہا ہے' تو قرآنِ کریم نے اس دور کے بدو کو بات سمجھائی' جو آج کے سائنٹسٹ سے بھی وہی دلیل دی جا سکتی ہے کہ بتاؤ: کیا زندگی تمہاری پیدا کردہ ہے یا خدا کی پیدا کردہ ہے؟ وہ تو ایک طرف' میں نے کہا کہ آئین سٹائن بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ ہماری پیدا کردہ ہے۔ کہا کہ یہ تم مانتے ہو' اس پہ تمہیں نہ حیرت ہوتی ہے' نہ اس سے تم انکار کرتے ہو کہ یہ زندگی کیسے وجود میں آ گئی یا یہ ہو نہیں سکتا' یہ تو تم نہیں کہتے کیونکہ یہ تمہارے سامنے ہے' اور اسی سے اگر ہم بات آگے چلائیں کہ وہ جس نے زندگی کی ابتدا کی تھی' وہی جسے تم مرنے کے بعد زندگی کہتے ہو' یا اس کے لیے مشکل کیا ہے۔ کہا کہ نَحۡنُ قَدَّرۡنَا بَیۡنَکُمُ الۡمَوۡتَ وَمَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِیۡنَ ۝ عَلٰۤی اَنۡ نُّبَدِّلَ اَمۡثَالَکُمۡ وَنُنۡشِئَکُمۡ فِیۡ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ (56:60-61) یہ ہمارے ہی بنائے ہوئے قوانین ہیں' جس کی رو سے یہ تمہارے جسم کی مشینری اس طرح سے چلتی رہتی ہے اور پھر چلتے چلتے وہی قوانین کے تابع ایک دن اس کی نقل و حرکت ختم ہو جاتی ہے۔

انسانی پیکر کے ختم ہونے یا اس کے بدلنے سے زندگی تو ختم نہیں ہوتی

یہ انسانی جسم مرتا ہے۔ کہا کہ یہ ہمارے لیے کیا مشکل ہے کہ نُّبَدِّلَ اَمۡثَالَکُمۡ (56:61) . کیا بات ہے! یہی کہہ رہے ہو کہ یہ ہمارا جسم گل سڑ جاتا ہے' تو پھر ہمیں زندہ ہونا کیا ہوا' یہ ہمارے لیے کیا مشکل ہے کہ یہ تمہارا جو پیکر ہے' اس کی جگہ کوئی دوسرا پیکر لے آئیں۔ یہ بھی تو ہمارے ہی قوانین کا پیدا کردہ پیکر ہے' اس پیکر کے گل سڑ جانے پر تم کہتے ہو کہ زندگی ختم ہو گئی' آگے نہیں چلتی' پیکر اور زندگی کا کیا تعلق' زندگی تو اس وقت بھی موجود تھی جب تمہارا یہ پیکر موجود نہیں تھا۔ کہا کہ نُّبَدِّلَ اَمۡثَالَکُمۡ (56:61). یہ تمہارے جو پیکر ہیں' جن کو تم نے سمجھا ہے کہ اصلِ حیات یہی ہے' یہ نہ رہے تو زندگی ختم ہو جائے' اس پیکر کو بدل کے زندگی کو اسی طرح آگے چلانا ہمارے لیے دشوار کیا ہے!

اس زندگی کے بعد آئندہ کی زندگی کس قسم کا پیکر اختیار کرے گی آج ہمیں اس کی سمجھ آ بھی نہیں سکے گی

کہا کہ وَنُنۡشِئَكُمۡ فِيۡ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ (56:61)۔ اور پھر تمہیں وہ پیکر عطا کریں یا وہ زندگی عطا کریں کہ جسے تم آج اپنی علمی سطح پر سمجھ نہیں سکتے یہ بڑی چیز کہی ہے۔ حیاتِ آخرت کا وجود برحق ہے اور دلیل یہ ہے کہ زندگی کی ابتدا ہی اس نے غیر جاندار مادہ کے اندر کی ہے' جس میں وہ لائف کا جرثومہ ہے اور اس کے بعد وہ لائف تمہارے پیکر میں آئی ہے۔ اس کے بعد دشوار کیا ہے کہ وہ ایک نئے پیکر کے اندر زندگی آئے لیکن یہ جو چیز ہے' یہ تمہارے علم کی گرفت میں نہیں آ سکتی' جس طرح سے کہ پہلی زندگی کی جو بات تھی کہ جو Nothingness تھی' جو عدم تھا' اس سے یہ وجود کیسے آ گیا' یہ بات بھی تمہارے علم کی گرفت میں نہیں آ سکتی' نہ آئی ہے' نہ آئے گی' اس وقت تک بھی نہیں آئی' آ بھی نہیں سکے گی۔

موجودہ زندگی کی حقیقت کو ماننا لیکن دوسری سے انکار کرنا چہ معنیٰ؟

کہنے لگے کہ تم اس لیے انکار کرتے ہو کہ اس کے بعد کی زندگی ہمارے علم کی گرفت میں نہیں آ رہی۔ او! تمہارے علم کی گرفت میں تو موجودہ زندگی بھی نہیں آ رہی' اس سے کیوں انکار نہیں کرتے' تمہاری فکر اتنی سطحی ہے کہ کیونکہ یہ محسوس شکل میں تمہارے سامنے چلتا پھرتا انسان ہے' تم خود بھی ایک محسوس شے ہو' اس کا تو تم اقرار کرتے ہو اور اسی بنیاد پر جب تم سے کہا جاتا ہے کہ یہ بھی تو Nothingness (عدم) سے وجود میں آئی ہے۔ زندگی تو تھی نہیں' پہلے وجود میں آئی ہے' لائی گئی ہے' کسی نے اس زندگی کو اس وجود کی شکل عطا کی ہے' اس کو تو تم تسلیم کرتے ہو اور تمہارے علم کی گرفت میں یہ بات آ نہیں رہی کہ یہ کیسے ہو گیا' لیکن اس کے باوجود اس سے تم انکار نہیں کرتے اور اسی بنا پہ اگر کہا جائے کہ صاحب! یہ اسی طرح سے زندگی آگے چلے گی' اس سے تم انکار کرتے ہو۔ کہا کہ سوچو تو سہی' کیا دلیل قرآن کریم دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ وَلَقَدۡ عَلِمۡتُمُ النَّشۡاَةَ الۡاُوۡلٰى فَلَوۡلَا تَذَكَّرُوۡنَ (56:62)۔ یہ جو پہلی زندگی ہے' یہ تو تمہارے علم کی گرفت میں آ گئی' کہ یہ ہے موجود چلتا پھرتا مادی انسان' یہ تو تمہاری گرفت میں آ گئی' لیکن وہ تو نہیں آئی کہ یہ زندگی بنی' کس طرح وجود میں آئی' کیسے آئی' یہ تو تمہارے علم کے اندر نہیں ہے' تو تمہارے علم کی تو صرف اتنی حد ہے کہ اس قدر محدود علم کی بنا پر اتنی بڑی حقیقت سے انکار کر دینا کہ نہیں صاحب! ہم مانتے ہی نہیں ہیں' اس کو بھی نہ مانو' اس سے تم انکار نہیں کرتے' اس کو تم تسلیم نہیں کرتے' حالانکہ یہ تو ایک ہی حقیقت تھی' دو شکلیں ہیں' تو اس سے بات تم سمجھتے کیوں نہیں ہو کہ یہ ناممکن نہیں ہے' زندگی کا اسی طرح سے آگے چلنا' اتنا تو کم از کم مانو کہ یہ ناممکن نہیں ہے اور ممکن بنائے گا وہ' جس نے یہ ممکن بنایا ہے کہ غیر جاندار مادہ کے اندر زندگی کی نمود۔ کی جس نے یہ ممکن بنا دیا ہے' وہ اس کو بھی ممکن بنا دے گا' پیکر ہی بدلے گا اور اس پیکر کے مٹنے سے' گل سڑ جانے سے' تم اس نتیجے پہ پہنچے ہو کہ زندگی یہی ہے۔

زندگی اور انسان کا پیکر دو الگ الگ وجود ہیں' کھیتی کی مثال بھی اور ملکیت زمین کا مسئلہ بھی

زندگی اور اس کے پیکر کو الگ الگ کر کے بتانا' یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے۔ زندگی ہمارے جسم کی پیدا کردہ نہیں' ہمارا جسم زندگی کا پیدا کردہ ہے۔ وہ جو جرثومہ تھا' وہ زندگی کا پیکر تھا' جس سے انسانی بچے کا یہ وجود عمل میں آیا ہے' اس کی ابتداء ہوئی ہے۔ اس جرثومہ میں زندگی تھی' یہ زندگی ہے جو اتنا بڑھ کر اس پیکر کے اندر آ ئی ہے۔ یہ زندگی کہاں سے آئی' تمہارے علم میں یہ بات نہیں آتی' اس کے باوجود تم اس سے انکار نہیں کرتے کہ ہاں زندگی (Life) ہے۔ کہنے لگا کہ اسی سے پھر آگے چلو۔ تم اس سے کیسے انکار کر سکتے ہو؟ اب ایک اور مثال دی' اور قرآنِ کریم میں جو اگلی مثال ہے وہ عام طور پر مکافاتِ عمل کی ہے۔ قرآن حمید کھیتی کی مثال بھی دیتا ہے اور وہ جو بات تھی کہ دوسروں کی محنت کی کمائی پہ عیش اڑانے والے' اس زمانے میں یہ انڈسٹریز تو ابھی ہوتی نہیں تھیں' جو کارخانے کی مثال دی جاتی' یہ زمین ہی کی مثال دی جا سکتی تھی' کھیتی ہی کی مثال دی جا سکتی تھی' یہ وہ ہے جسے مزارعت کہتے ہیں۔

قرآن کریم نے یہ پہلے کہا کہ یہ زمین تمہاری ملکیت کیسے ہو سکتی ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ کسی بنیاد پہ بھی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ تمہارے پیدا ہونے سے پہلے یہ موجود تھی' یہ کرہ ارض تو انسان کے اس زمین پہ آنے سے پہلے موجود تھا۔ تم پیدا ہوئے تو اس کے بعد تم نے کہا کہ ہم اس کے مالک ہیں' یعنی اس چیز کے مالک جو تمہاری پیدائش سے پہلے موجود تھی۔ تم کیسے مالک ہو گئے؟ کسی جہت سے بھی جو چیز خریدی جاتی ہے اس کا کوئی مالک بن سکتا ہے۔ تم کہتے ہیں کہ یہ زمین وراثت میں ملی ہے۔ کہنے لگے کہ یہ تو بتاؤ کہ جو چیز تم سے پہلے موجود تھی' مالک بننے کے لیے جو شرطیں ہوتی ہیں' ان میں اس پہ کوئی شرط بھی پوری نہیں ہو سکتی اور یہ موجود اس لیے تھی کہ جو ہم نے یہاں جاندار پیدا کرنے ہیں' ان کے زندہ رہنے کے لیے یہ پرورش کا سامان دے۔ ہم خالق ہی نہیں تھے کہ پیدا تو ہم کر دیتے اور پھر ان سے کہتے ہیں کہ جاؤ میاں! اپنا رزق آپ تلاش کرو اور رزق کے جو سامان تھے وہ ہم پیدا نہ کرتے۔ کہتا ہے کہ بتاؤ تو سہی کہ جو خالقیت تھی اُس پہ کتنا ظلم ہوتا' اگر ربوبیت اس کے ساتھ نہ ہوتی۔

پیدا ہونے کے ساتھ ہی ماں کی چھاتی میں دودھ کے چشموں کی بہار کا اور ہاضمے کی قوت کا ذکر

اب دوسری مثال بچے کی ہے۔ ہم تو رحمِ مادر میں بچے کی پرورش کا انتظام کر کے' اس کی ابتداء کرتے ہیں اور جب وہ طریقِ نشو ونما' جو رحم کے اندر ہوتا ہے' وہ ایک درجے پہ پہنچ کر ختم ہوتا ہے' بچے نے پیدا ہونا ہوتا ہے' پیدائش سے ایک دن پہلے بھی ماں کی چھاتیوں میں دودھ نہیں ہوتا' وہ اندر ماں کے خون سے ہی پرورش پا رہا ہوتا ہے' پرورش پانے کا طریقہ آپ سوچیے کہ وہ اس سے کتنا مختلف ہوتا ہے۔ جونہی وہ پیدا ہوتا ہے' اس کا سامانِ نشو ونما' پرورش کا سامان' دودھ کے چشمے کی شکل میں اس کی پیدائش کے ساتھ ہی موجود ہوتا ہے۔ یہ اندر ہی اندر کونسی فیکٹری ہے' کونسا اس کا Manager (منتظم) ہے' جو سارے انتظامات کر رہا ہے؟ کہا کہ یہ پیش پا افتادہ چیزیں تمہیں نظر آتی

ہیں۔ یہ تمہارے سامنے موجود ہیں۔ ورنہ ایک ایک قدم کے اندر تم محوِ حیرت رہ جاؤ کہ یہ ہوتا کیسے ہے اور وہ جو میں نے کئی دفعہ مثال دی ہے۔قرآنِ کریم میں مثال دی گئی ہے کہ جوں جوں بچے کے اندر ہضم کی قوت زیادہ ہوتی چلی جاتی ہے' ماں کے دودھ میں وہ جو پانی کی مقدار ہے' وہ کم ہوتی چلی جاتی ہے؟ آپ قوتِ عاضمہ کہتے ہیں' وہ زیادہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ دودھ گاڑھا ہوتا جاتا ہے۔ وہ گاڑھا ہونے کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ یہ میں پہلے بھی عرض کیا کرتا ہوں کہ یہ جواب دودھ کے ڈبے آتے ہیں' ان ڈبوں کے باہر انہوں نے چارٹ دیا ہوا ہوتا ہے کہ پہلے مہینے کے بچے کے لیے اس پاؤڈر دودھ کے اتنے چمچ اور اتنا پانی۔ وہ بہت پتلا ہوتا ہے۔ دوسرے مہینے کے لیے پانی کم' دودھ ذرا زیادہ' پھر آگے وہ اسی طرح سے چارٹ ہوتا ہے جس میں دودھ کی مقدار زیادہ اور پانی کی کم ہوتی ہے۔ وہ چارٹ انہوں نے ماں کے دودھ کا تجزیہ کر کے بنایا ہوا ہوتا ہے۔ اس انتظام کو سائنس Follow کر رہی ہوتی ہے اور جونہی بچے میں دوسری چیزیں کھانے کے لیے ہاضمے کی قوت ہوتی ہے۔ یہ چشمے بند ہو جاتے ہیں کہ ابھی دوسری چیزوں کی طرف آؤ۔ کہا کہ تم یہ ساری چیزیں دیکھتے ہو۔ ان سے بھی تم انکار نہیں کرتے' ایک تو قرآن کریم یہ مثال دیا کرتا ہے۔

رزق کے حصول کے سلسلہ میں کھیتی کی مثال اور کاشت کے سلسلہ میں بٹائی کی نوعیت

عزیزانِ من! یہ کھیتی کی دوسری مثال ہوتی ہے۔ وہ دو طریقے سے کھیتی کی مثال دیتا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ تم زمین کے مالک بن کر دوسروں کو اس کے ماحصل سے کیسے محروم کر سکتے ہو۔ ہم نے زمین کو تمام انسانوں کی پرورش کے لیے پیدا کیا۔ کسی ایک انسان کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ زمین پر دائرہ کھینچ لے اور کہے کہ یہ میری زمین ہے۔ ارے! یہ تیری زمین کیسے ہوگئی؟ اور پھر دوسرے اس سے محروم ہیں۔ زمین پڑی ہوئی تو کچھ دیتی نہیں' اس میں تو کاشت کرنی پڑتی ہے' پھر دوسرے انسانوں کو تم اپنا غلام بناتے ہو اور کہتے ہو کہ ہل چلاؤ' تم اس میں کھیتی کرو اس پر اس کی سال بھر محنت کی کمائی ہے۔ اس پر ان غریبوں کا پسینہ نچڑ جاتا ہے اور اس کے بعد کم از کم آدھی فصل تمہارے گھر پہنچ جاتی ہے۔ یہ کس بناء پر ہے؟ کہ اس زمین پر پٹواری کے کاغذ میں لکیر تم نے بنوالی تھی' ملکیت کے خانے میں تمہارا نام لکھا ہوا ہے اور بس! کہا کہ تمہیں یہ حق کیسے حاصل ہو گیا اور کاشت کرنے والے کے متعلق بھی کہا کہ ذرا سوچو تو سہی۔

عزیزانِ من! یہ جو آگے آیات آ رہی ہیں' یہ معیشت یا اکانومی کے ضمن میں بھی بڑی اہم ہیں۔ یہ زمین خدا کی ہے۔ اب آیا کاشت کرنے والا۔ قرآن حکیم کا نظام یہ ہے مگر میں پہلے یہ عرض کر دوں کہ معاوضہ یا صلہ محنت کا ہے' سرمائے کا نہیں۔ زمین پہ ملکیت کی لکیر کھینچ کر تم اس فصل کے مالک نہیں بن سکتے۔ پہلے تو زمین ہی تمہاری نہیں' وہ خدا کی ہے۔ اب اس میں آ جایئے۔ جو فصل کا کاروبار ہے' جسے کاشتکاری کہتے ہیں۔ کہا کہ آؤ دیکھو تو سہی' اس میں تمہارا حصہ کتنا ہوتا ہے؟ اور یوں قرآن حکیم بات کرتا ہے۔ (مثلاً اگر) دو بزنس والے

آپس میں مشترک بزنس کریں اور کہیں کہ دیکھو بھئی! تمہارا اس میں کتنا انوسٹ کیا ہوا ہے اور ہمارا کتنا ہے، تو کہا کہ یہ کرتے ہو کہ جس حد تک کسی کی انوسٹمنٹ ہوتی ہے اس کو اس میں سے اتنا ہی منافع ملتا ہے، وہ سارا تو نہیں لے جاتا۔ کہا کہ آیئے! اس کاروبار پر ذرا دھیان تو دیجیے۔ کہا ہے کہ اَفَرَءَ یْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ (56:63) یہ جو تم کھیتی باڑی کرتے ہو، کاشت کرتے ہو، کبھی اس پہ بھی تم نے غور کیا ہے؟ کہا کہ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ (56:64) تم تو صرف اس میں ہل چلا کر زمین کو ہموار کر کے اس کے اندر ایک دانہ ڈال دیتے ہو، اس سے آگے تمہارے اختیار میں ہی نہیں ہوتا کہ اس دانے میں سے کونپل پھوٹے، کر لو جتنی بھی کوشش کرنا چاہتے ہو، جو جی میں آئے کر لو۔ بتاؤ! یہ جو فصل اُگی ہے اس میں تمہارا کتنا حصہ ہے کہ تم نے زمین کو ہموار کیا ہے اور اس کے اندر ایک دانہ ڈال دیا ہے۔ یہ تمہاری محنت ہے۔ کیا تم دانے میں سے کونپل، کونپل میں سے پودا، پودے میں سے فصل پیدا کر سکتے ہو؟ بتاؤ یہ کون کرتا ہے؟ کہا کہ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ (56:64) تم کرتے ہو یا یہ ہمارے قانون کے مطابق یہ کچھ ہوتا ہے؟ کہا کہ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ○ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ○ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ (56:65-67) دانے کو فصل میں تبدیل کرنے کا ہمارا یہ نظام نہ رہے یا کبھی ہنگامی طور پہ ایسا ہو جائے کہ بارش ہی وقت پر نہیں ہوتی، وہ یوں چلتی ہے، تو ایک دانے سے سات سات سو دانے بننے تو ایک طرف رہے، وہ جو تم نے بیج ڈالا ہے، وہ بھی ضائع ہو جاتا ہے اور تم ماتھا پکڑ کر بیٹھ جاتے ہو کہ ہماری محنت بھی گئی، ہمارا بیج بھی گیا۔ کہا کہ تمہارے اس بیج کو اس طرح سے فصل کے اندر تبدیل کس نے کیا ہے؟

فصل کی پیداوار کے سلسلہ میں کائناتی عوامل کا وہ کردار جو قدم قدم پر غور و فکر کا متقاضی ہے: عملِ تقطیر

کہا کہ اَفَرَءَ یْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ○ ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ○ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ (56:68-70) اب اس کے بعد تم نے دانہ زمین میں تو ڈال دیا، اب اسے پانی کی ضرورت ہے، بارش کی ضرورت ہے۔ وہ بارش کی شکل میں ہو یا نہروں کی شکل میں، نہروں کی شکل کا پانی بھی ابتدا میں برف کی شکل میں پہاڑوں پہ ہوتا ہے۔ بہرحال وہ انسان کا پیدا کردہ نہیں ہوتا۔ کہا کہ یہ بھی چھوڑو کہ تمہارا پیدا کردہ نہیں ہے۔ ذرا غور کرو کہ ان بادلوں سے جو بارش برستی ہے، سمندر کا پانی جو کہ ساری دنیا میں غالباً 1/5 حصہ خشکی ہے، باقی سمندر ہی سمندر ہے لیکن وہ پانی یہ ہے کہ ایک گھونٹ پانی پی نہیں سکتے۔ پانی میں زندگی ہوتی ہے اور سمندر کا پانی جو اس قدر لا انتہا میں ہے، وہ مرگ آفریں ہوتا ہے۔ Coleridge (1772-1834AD) کی ایک نظم ہوا کرتی تھی۔

There was water, water eveywhere
But not a drop to drink.

کہا کہ اس پانی کی یہ کیفیت ہے کہ اس کا ایک ڈول کھیتی میں ڈال دیجیے، وہ جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ کہتا ہے کہ ذرا ہمارا انتظام سوچو تو سہی۔

اس جگہ قرآن حمید کے بیان کردہ ایک انتظام کی تشکیل آ گئی۔ اب چونکہ بات سامنے سمندر کی آ گئی ہے۔ میں پانی پینے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ ہمارے ہاں عرب کے ممالک یا خلیج فارس وغیرہ والے جو ہیں' ان کے ہاں پینے والے پانی کی بہت کمی ہے۔ وہ ملک سمندر کے کنارے پہ واقع ہے۔ آپ سمندر کا ایک گھونٹ پی نہیں سکتے۔ انہیں پینے کے لیے سمندر کا پانی Distill کرنا پڑتا ہے۔ جسے آپ کشید کرنا کہتے ہیں' وہ اس میں سے جو کھاری ❶ چیزیں ہیں' جو کھاری مادے ہیں' ان کو الگ کر کے اسے پینے کے قابل بنانا ہوتا ہے۔ پینے کے پانی کی جو انہوں نے ابتداء کی ہے' اس پہ تجربے وغیرہ کیے ہیں تو وہ اتنا مہنگا پڑتا ہے۔ میں نے بھی وہاں دیکھا جو میں عمرہ کرنے گیا تھا۔ پانی کی ایک بوتل تھی اس میں سے زیادہ سے زیادہ تین گلاس نکلتے تھے' وہ دس روپے میں ملتی تھی' تین روپے میں ایک گلاس ہوتا تھا۔ میں اپنی ''ترے مارلیندا اساں کہ گلاس نئیں سی پیندا۔ کتھے تین رپئے ہور پے جان کسے اوتے'' (میں اپنی پیاس مار لیتا تھا' گلاس پانی نہیں پیتا تھا کہ کہیں تین روپے اور نہ پڑ جائیں) وہ کشید شدہ پانی ہے' وہ کہتا تھا کہ اس پر اتنی Cast (لاگت) آتی ہے کہ اس سے کم ہم پانی پینے کا ایک گلاس Afford ہی نہیں کر سکتے۔ اسی سمندر کے پانی کو اس قابل بنانا اور کھیتی میں دینے کے لیے پانی اس قابل بنانے کے لیے تو بہت زیادہ رقم چاہیے اگر پانی کشید کر کے کھیتی کو دیا جائے اور اس سے فصل ہو' تو ہمارے ملک کی دولت گیہوں اُگانے پہ صرف ہو جائے۔ کہا کہ یہ چیزیں پیش پا افتادہ ہیں۔ تم چلتے پھرتے رہتے ہو' کبھی غور نہیں کرتے۔ سوچو تو سہی کہ سمندر کا پانی ایسا پانی کھیتی کو چاہیے جیسے Distilled Water (کشید شدہ پانی) ہے اور Distilation (عمل کشید) کی کیفیت یہ ہے کہ ایک گلاس پانی کشید کرنے کے اوپر' وہ کہتے تھے' کہ جی! ہم یہ پانی کاسٹ (لاگت) کے اوپر نہیں دیتے' ہم اپنی طرف سے Subsidies بھی کرتے ہیں یعنی وہ پانی انہیں تین روپے میں پڑتا نہیں تھا' دس روپے میں گلاس پڑتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ تو تمہاری کیفیت ہے جو اس پانی کو کشید کرو۔ ہماری کیفیت کیا ہے؟ یہ کہ اسی سمندر کے اوپر سورج کی حرارت سے Evaporation (بخارات بننے کا عمل) ہوتا ہے۔ اب یہ Distilation (کشید) کا Process (عمل) شروع ہو گیا۔ کشید کا پروسیس یہی ہوتا ہے کہ پانی کے نیچے آگ جلاتے ہیں' اس میں سے بھاپ اُٹھتی ہے۔ پانی میں یہ خصوصیت رکھی ہے کہ جب وہ کشید کیا جائے تو اس کے اندر گھلے ہوئے مادے ہوتے ہیں' Dissolve (گھل کر) وہ نیچے رہ جاتے ہیں' خالص پانی بھاپ بن کر اوپر اُٹھتا ہے۔ یہی ہے وہ مشینری' جو انہوں نے لگا رکھی ہے تو Distilled Water کا بوتل یا گلاس ملتا ہے۔ کہا کہ سوچو تو سہی کہ اتنا بڑا سمندر' اسی میں سے پانی کشید کرنا ہے' اتنی بڑی بڑی بھٹیاں چاہئیں' ہم نے ایک بھٹی لگا رکھی ہے اور وہ اوپر ہے' اس کی کرنیں سمندر میں جتنی کھاری چیزیں ہوتی ہیں' وہ سمندر میں چھوڑ دیتا ہے اور وہ کرنیں کشید شدہ پانی کے ڈول بھر بھر کر اوپر لے جاتی ہیں۔ اگر وہ اوپر جا کر پانی کی شکل میں ہو' تو وہاں سے نیچے جائے وہیں آگے پھر پانی پہ برس جائے' وہ سمندر کا پانی سمندر میں مل جائے۔

اس نے کہا کہ وہاں یہ پانی کی شکل میں نہیں رکھا جاتا' بھاپ کی شکل میں رہتا ہے جسے تم بادل کہتے ہو' پھر اگر وہ اسی مقام کے اوپر بادل رہے تو پھر بھی وہ پانی کے اوپر رہا۔ کہتا ہے کہ پھر ہم ہوائیں چلاتے ہیں' جو اس بادل کو دھکیلے ہوئے لیے چلی جاتی ہیں۔ وہ بادل چلا جاتا

---

❶ کڑوے، نمکین زہریلے اجزاء۔

ہے' بارش نہیں اُڑتا ہے اور پھر ہمارا انتظام ہے کہ جس مقام کے اوپر پانی برسنا ہوتا ہے' وہاں ٹھنڈ پیدا کر دی جاتی ہے۔ اس ٹھنڈک کی وجہ سے وہ بادل بھاری ہوتا ہے۔ بھاری ہونے کے بعد پھر وہ پانی کی شکل میں تبدیل ہوتا ہے۔ اب وہ سمندر کا کھاری پانی' جو ورلڈ واٹر سپلائی ہے' اس کی رو سے وہ کشید شدہ پانی تمہاری زمین پہ گرتا ہے۔ اس سے فصل اُگتی ہے۔ فرمایئے! حضور فرمایئے! کہ یہ جو پانی برسا ہے' اس میں جناب کا کتنا حصہ ہے اور ہمارا کتنا حصہ ہے۔

اتنے ہی پروسیس میں آپ دیکھیے کہ پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس بزنس کا جو Base ہے' وہ ہماری زمین ہے' تمہاری نہیں۔ تم نے ایک دانہ ڈالا۔ پانی نہ ہو تو وہ بھی ویسے کا ویسا پڑا رہے' سڑ جائے' گل جائے۔ اس کو مقطر شدہ پانی چاہیے' مقطر نہیں تو وہ کشید شدہ ہی ہوتا ہے۔ وہ فلٹریشن ہوتی ہے' جسے تقطیر کہتے ہیں۔ اسے مقطر' کشید شدہ Distilled Water چاہیے۔ کتنی مقدار میں چاہیے؟ پھر اگر وہ سارا ایک ہی وقت میں برس جائے تو پھر کھیتی نہیں ہوتی' تو باقی جو ہوتا ہے ہم جو پہاڑوں سے ریز روائر بنا رکھے ہیں' وہاں وہ برف کی شکل میں جما رہتا ہے' گرمیوں میں وہاں سے وہ برف کو ہم پگھلاتے ہیں' پھر وہ پانی کی شکل میں تمہارے گھروں کے آگے سے گزرتا چلا جاتا ہے' کھیتیوں کے پاس سے گزرتا چلا جاتا ہے۔ لیجیے سارا کام کشید شدہ پانی! اس طرح سے یہ تمہارے آگے سے گزرتا چلا جاتا ہے۔

سبز شاخوں کے اندر آگ کے شعلوں کو پنہاں کر دینے والی ہستی

یہ کہا ہے کہ فرمایئے جناب! اس میں آپ کا کتنا حصہ ہے' اس میں ہمارا کتنا حصہ ہے۔ کاروبار کر رہا ہے۔ یہ سمجھانے کا بڑا عجیب انداز ہے۔ کہنے لگا کہ زندگی میں اس پانی کی مثال سے آگے چلیے تو پھر یہ آگ کے اوپر تمہاری زندگی ہے' حرارت پر ہے۔ کیا بات ہے! کہتا ہے کہ اَفَرَءَیۡتُمُ النَّارَ الَّتِیۡ تُوۡرُوۡنَ o ءَاَنۡتُمۡ اَنۡشَاۡتُمۡ شَجَرَتَهَاۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡمُنۡشِـُٔوۡنَ (56:71-72) یہ آگ کہاں سے پیدا ہوتی ہے؟ درختوں کی شاخیں سبز ہوتی ہیں۔ کیا کبھی سبز شاخوں میں بھی آگ ہوتی ہے؟ وہ جو (اسد اللہ خان) غالب نے کہا تھا کہ

شعلہ خس میں جیسے' خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا❶

کیا تشبیہ تھی! وہ کہتا ہے کہ ہم نے سبز شاخوں کے اندر آگ کے انگارے بھر کر رکھ دیئے ہوتے ہیں' جب تک ضرورت ہوتی ہے' وہ سبز رہتی ہیں' اس کے بعد پھر وہ ایندھن بن جاتی ہیں' اسی سبز شاخوں سے آگ نکلنے لگ جاتی ہے۔ کہیے کہ کیا یہ اسکیم تمہاری پیدا کردہ

ہے یا ہماری پیدا کردہ۔ آؤ اور حساب کریں۔ کہا کہ نَحۡنُ جَعَلۡنٰهَا تَذۡكِرَةً (56:73) جو کچھ ہم نے اس وقت تک کہا ہے وہ اس لیے

---

❶ غالب کا یہ شعر یوں ہے:

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط
شعلہ خس میں جیسے خُوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

ہے کہ تم غور و فکر کر کے سوچ لو اور ایک نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرو۔ تذکرہ اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو سامنے رکھیے اس پر غور و فکر کیجیے وہ جیسے سوال حل کرتے ہیں، حساب کا۔ اس کے بعد ایک نتیجے پر پہنچو۔ کہا یہ ہے کہ یہ سارا پروسیس، یہ سارا کھیتی باڑی کا نظام، جس کا تم اپنے آپ کو پوری فصل کا وحدہ لاشریک مالک سمجھتے ہو، ہماری ہے۔ اس میں کہتا ہے کہ دیانتدار بزنس مین کی طرح آ کر حساب کرو۔ ہم دھاندلی نہیں کرنا چاہتے۔ ہم تمہارا کچھ نہیں چھیننا چاہتے۔ ایمانداری سے ''اللہ دی سوں کھا کے تسی آپ دسو''۔ (اللہ کی قسم کھا کر آپ خود بتائیں) کہ اس میں تمہارا حصہ کتنا ہے۔ ہمارا کتنا ہے۔ جو تمہارا ہے تم لے لو، جو ہمارا ہے ہمیں دیدو۔ مگر ایمانداری نال (یہ سارا کچھ ایمانداری سے کرو) کہا کہ تم کہو گے کہ جی ٹھیک ہے، ہم نے حساب کر لیا، اس میں سے اپنا حصہ لے لیا۔ یہ جو اتنا باقی بچا ہوا ہے، وہ تو شاید نوے فیصد ہو گا، تو آپ کو کہاں دیں، آپ تو یہ بات ٹیلی فون پہ کر رہے ہیں، سامنے آتے ہی نہیں ہیں۔ اس کو کہاں دیں؟ عزیزانِ من! ایک فقرہ میں جواب دیا کہ وَّمَتَاعًا لِّلۡمُقۡوِيۡنَ (56:73) یہ بھوکوں کو دیدو، ہمیں پہنچ جائے گا، ہم تک پہنچ جائے گا۔

عزیزانِ من! آپ کا سارا نظامِ معیشت (Economic System) ایک مثال میں حل کر کے رکھ دیا۔ کہا کہ لَيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39) تم انہی کے حقدار تھے، ہم اس میں ایک دانہ بھی نہیں لینا چاہتے لیکن یہ تمہاری بھی زیادتی ہو گی کہ جو ہمارا حصہ ہے اس میں سے لے جاؤ۔ ہمارا حصہ ہمیں دیدو اور میں نے جیسا عرض کیا ہے، بات تو یہ ہے جو آخر میں قرآنِ کریم ایک لفظ میں کہہ گیا۔ وہی اگر چھوڑ دیتا تو پھر یہ بھی چیز ہوتی کہ صاحب! پھر ٹھیک ہے وہ جو کہتا ہے۔ قرآن حکیم کے یہ مذہبی پیشواؤں کی صورت یہ ہے کہ حصے لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جی! یہ ہمارا سہی، یہ آپ کے مُردوں تک پہنچانے کا سہی، اور یہ اللہ واسطے کا کہتے ہیں، اپنے والا بھی لے جاتے ہیں، جسے اللہ واسطے کا کہتے ہیں، وہ بھی لے جاتے ہیں۔ بات تو ٹھیک ہے کہ وہ کہیں کہ اللہ سامنے ہو تو اس کو ہم دیں۔ قرآنِ کریم کے ایک لفظ نے سارا اکنامکس سسٹم بتا دیا، کوئی زیادتی نہیں، کوئی ظلم نہیں، کوئی دھاندلی نہیں، کوئی استحصال نہیں، Exploitation (سلب ونہب) نہیں، ہم دوسرے کی محنت سے ایک پائی نہیں لینا چاہیے۔ ہمارا جو حصہ ہے، وہ تو دینا پڑے گا اور یہ جو اعتراض ہو گا کہ آپ کیسے دیں وہ تو سامنے نہیں ہیں۔ کہا کہ وَّمَتَاعًا لِّلۡمُقۡوِيۡنَ (56:73) اقبالؒ نے یہی جو چار پانچ آیتیں ہیں الارض للہ! کے عنوان سے ان آیتوں کا یوں کہیے کہ بڑا خوبصورت ترجمہ کیا ہے۔ اَلۡاَرۡضُ لِلّٰهِ (زمین خدا کی ملکیت ہے) کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون

کون دریاؤں کی موجوں سے اُٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھّم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے' کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے' خوشہ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خُوئے انقلاب؟

اوخدایا! گاؤں کے مالک جو بنے پھرتے ہو۔

دِہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں' تیری نہیں' میری نہیں

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

قرآن حکیم کے پیش کردہ معاشی نظام کے خدوخال اور ہماری حالتِ زار

یہ ہے' عزیزانِ من! آپ کا معاشی نظام۔ آپ کمیشن پہ کمیشن' کمیٹیاں پہ کمیٹیاں' کا ہے کے لیے بٹھا رہے ہیں؟ اس لیے کہ دوسرے کی محنت کے Expliitation (سلب ونہب) کو کس طرح جائز قرار دیا جائے۔ یہ اکنامکس کے طریقے ہوتے ہیں۔ سود نہیں۔ آپ نے اکنامکس سسٹم کی کمیٹیاں بٹھائیں۔ انہوں نے کہا کہ اس کو منافع کہیے بالکل ٹھیک ہے۔ بزنس میں محنت وہ کرتا ہے' یہ کچھ پیسے انوسٹ کرتا ہے' منافع آتا ہے۔ اس کے گھر بغیر محنت کے چلا جاتا ہے۔ اس کی کیا بنیاد ہے قرآن کریم تو کہتا ہے کہ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39) معاوضہ محنت کا ہے۔ یہ قرآن حکیم کی بنیاد ہے' یہ معاشی نظام کی بنیاد ہے۔ وہ محنت نہیں کر رہا' محنت یہ کر رہا ہے' یہ معاوضہ اپنے سرمائے کا لے رہا ہے' محنت کا نہیں لے رہا ہے' یہ سرمائے والے کے گھر پہنچ رہا ہے۔ یہ جو کمیشن بیٹھا تھا' اس نے کہا جی! کہ اس کا نام آپ مزارعت رکھ لیجیے' چلو معاملہ ختم ہو گیا۔ یہ کچھ جائز ہے' حلال ہے۔ انہوں نے کہا کہ جی! یہ کھیتی باڑی کا نظام ہے' اس کے اندر واقعی یہ تو قرآن حکیم یہ کہہ رہا ہے کہ نہ زمین تمہاری' تمہارے باپ کی بھی نہیں ہے۔ اس میں جتنا پروسیس ہو رہا ہے' وہ سارے کا سارا تم صرف محنت کرتے ہو' باقی سارا ہمارا ہے۔ یہ کس طرح سے زمیندار' جو زمین کا مالک بنا بیٹھا ہے' وہ لے جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے جی! یہ ایسے تو نہیں لیا جا سکتا۔ اس کو مزارعت کہتے ہیں اور وہ جائز ہے۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ (53:23) یہ کچھ نام ہیں' کچھ تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے تھے' کچھ تم رکھ دیتے ہو اور ناجائز کو جائز بناتے چلے جاتے ہو۔

کہا کہ ایک تو یہ بتایئے کہ جو خشک دانے کو اس طرح سے کھیتی میں تبدیل کر سکتا ہے جس کا قانون یہ ہے کہ اتنا سا وہ ذرا کہ جسے نا چیز کہیں گے اس سے ایک درخت بنتا ہے کیا وہ تم بناتے ہو؟ کیا وہ تمہارا تخلیقی نظام ہے؟ ذرا اپنی حالت پہ غور تو کرو۔

خالق کائنات کے پیدا کردہ بڑ کے ایک ایک درخت کی تخلیق اور ایک ایک بیج کی نوعیت: نظامِ ربوبیت

یہ تو چھوٹی چھوٹی کھیتی کی بات ہے۔ یہ اتنے اتنے بڑے پیڑ بنتے ہیں۔ عزیزانِ من! وہ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ بڑ کا درخت کہیں جا کر دیکھیے یا ادھر ہمارے ہاں تو وہ چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں انڈیا میں ایسے ایسے بڑ کے درخت ہیں جن کے سائے تلے قافلوں کے قافلے بیٹھے ہیں۔ کہا کہ تم نے سوچا ہے کہ یہ بڑ کا درخت کس چیز کا پیدا ہوا تھا۔ اس بڑ کے اندر جو گلر لگتے ہیں ایک درخت کے اندر وہ لاکھوں کی تعداد میں ہوتے ہیں اور ایک گلر کے اندر ہزار کی تعداد میں خشخاش کے دانے کے برابر وہ چیز ہے جس میں سے ایک جو ہوتا ہے جی! اس سے یہ بڑ کا درخت بنا ہوا ہوتا ہے۔ کہا کہ یہ جو ہمارا تخلیقی نظام ہے اس پہ غور کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں کہ ہم اس مرنے کے بعد جو زندگی ہے وہ زندگی چلتی رہے۔ اور دوسرا نظام اسی مثال میں ہے دوسری چیز نظام معیشت کی رزق کی مثال ہے کہ پرورش کے لیے یہ جو کچھ ہم نے کیا ہے یہ کاہے کے لیے کیا ہے؟ آپ اس تقسیم کو دیکھنا چاہیں پھر وہ بیچ میں سے جو میں نہیں چاہا کرتا وہ ''میں اور میری'' آ جاتا ہے۔ نظامِ ربوبیت جو میری کتاب ہے اسے آپ دیکھیے گا۔ قرآنِ کریم کا یہ جتنا نظام اس نے دیا ہے وہ سارا اس کے اندر آ گیا ہوا ہے۔

اسلامی نظام کا فریضہ اور اس کو اپنانے یا نافذ کرنے کا طریق

عزیزانِ من! میں عرض کروں کہ وہ نظام کیا ہے؟ یہ نظام ہے جسے آپ اسلامی نظام کہتے ہیں۔ اس کا فریضہ مملکت کے تمام افراد کے سامانِ نشو ونما یا بنیادی ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا ہے۔ یہ کا اس نظام کے ذمے ہوتا ہے۔ پہلی بات یہ سمجھ لیجیے کہ کسی نظام کو اسلامی اس وقت کہا جائے گا جب وہ یہ ذمہ داری قبول کرے جو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس بستی میں ایک فرد بھی رات کو بھوکا سو جائے اس بستی سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے اور یہ وہی ہے جو حضرتِ عمرؓ کا قول ہے جو ہم دہرائے چلے جا رہے ہیں۔ کوئی ایک انسان تو ایک طرف اگر دجلہ کے کنارے یعنی وہ مدینے سے اتنی دوری کے فاصلے پہ دجلہ کے کنارے پہ بھی کوئی کتا بھوک سے مر جائے تو عمر سے اس کی بھی باز پرس ہو گی۔ یہ وہ نظام ذمہ داری ہے تو اب وہ یہ ذمہ داری کیسے پوری کرتا ہے؟ وہ کہتا یہ ہے کہ ہر شخص جو بھی کام اس کے ذمے لگے یا وہ کرنے کے قابل ہے وہ پوری محنت سے کام کرے اس میں سے اس کی جو ضروریات اور اس کے بچوں کی جو ضروریات ہیں

وہ پوری کرنے کے لیے خواہ وہ خود رکھ لے یا وہ نظام کے سپرد کر دے یہ دونوں صورتیں ہے۔ یہاں قُلِ الْعَفْوَ (2:219) بھی ہے کہ اپنی ضرورت کے مطابق رکھ کر باقی جتنا زائد ہے وہ اس نظام کے حوالے کر دے تاکہ وہ ان لوگوں کی ضرورتیں پوری کرے جو خود اپنی محنت سے ضرورت پوری کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ یہ ہے جی سارا نظام۔ نہ دولت کسی کے پاس زائد از ضرورت رہ سکتی ہے یہ دولت کا ہے کے لیے رہے گی جی اس دولت نے تو پیدا ہی کچھ نہیں کرنا۔ کسی کو قرضہ دے کر اس پہ سود نہیں لے سکتا کاروبار میں انوسٹ کر کے منافع میں حصہ نہیں لے سکتا زمین خرید کر پیداوار کا حصہ نہیں لے سکتا تو یہ در دِسر وہ کا ہے کے لیے مول لے گا۔ پڑا ہوا روپیہ تو بچے نہیں دیتا۔ وہ تو کسی کو محنت کرنے کے لیے دیا جاتا ہے تو اس کی محنت کا معاوضہ ہوتا ہے جو آپ لے رہے ہو۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جتنا زائد از ضرورت ہے وہ اس نظام کے حوالے کیجیے تاکہ وہ اس سے تمام ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرے۔ یہ ہے اسلامی نظام کا فریضہ۔

روٹی کھانے سے پہلے ایک غور وفکر کا مقام

عزیزانِ من! بنیادی طور پر یہ جو زمین کا انتظام ہے جیسا میں نے عرض کیا ہے اس کی قرآن کریم میں زیادہ مثال دی ہے کہ بات اس دور کی مخاطب قوم سے تھی سمجھ میں آ سکتی تھی ابھی وہاں Industrialization نہیں ہوئی تھی۔ زمین والی جو بات ہے وہ تو پھر بھی کچھ ظلم ہوتا ہے وہ تو خیر! پسینہ ہی نچوڑتے تھے یہ تو جو نظامِ کارخانہ داری ہے جو سرمایہ دارانہ نظام ہے اس میں تو خون نچوڑ لیتے ہیں۔ یہ تو پوچھو نہیں کہ کیا کرتا ہے۔ یہ (80:24) زمین ہی کے متعلق ہے۔ کہا ہے کہ فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ (80:24) یہ جو روٹی تمہارے سامنے آ گئی ہے لقمہ توڑا ہے منہ میں ڈالنے سے پہلے ایک منٹ کے لیے ذرا ٹھہر جاؤ۔ کہا کہ سوچو کہ یہ کس طرح سے روٹی کا ٹکڑا بنا ہے؟ یہ سوچو کہ اس میں پھر وہی بات آئی ہے کہ ہمارا کتنا حصہ ہے اور تمہارا کتنا ہے؟ کہا کہ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا (80:25) پہلی چیز تو یہی کہ یہ پانی جس کے اوپر زندگی کا دارومدار ہے وہ پانی ہم نے برسایا تم نے نہیں برسایا۔ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا (80:26) پھر زمین میں یہ صلاحیت رکھی کہ وہ پھٹ جائے اور وہ جو بیج ہے وہ کونپل کی شکل میں اوپر آ جائے۔ فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا o وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا o وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا o وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا o وَّفَاكِهَةً وَّ اَبًّا (80:27-31) پھر اس بیج پہ پانی جو پڑا ہے یہ اجناس گیہوں دالیں میوے درختوں کے پھل کھجوریں یہ سب چیزیں پیدا ہوئیں تو اس سے یہ سب کچھ پیدا ہوا ہے۔

متاع کا لفظ قرآنِ حکیم کے پورے معاشی نظام کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے

یہ سارا کچھ کا ہے کے لیے ہے؟ یہ تھی وہ چیز جو وہاں کہا تھا کہ بھوکوں کو دیدو۔ کہا کہ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (79:33;80:32) یہ تمہارے لیے سامانِ زندگی ہے تمہارے مال مویشی کے لیے سامانِ زندگی ہے اس میں سارے انسانوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔ میں نے

پہلے بھی عرض کیا تھا' اسے پھر دہرا دوں کیونکہ اس میں نظامِ معیشت ہے' یہ لفظ جو قرآن حکیم نے استعمال کیا ہے' اس ایک لفظ کے اندر پورا نظام آ گیا ہے۔ میں نے پہلے بھی جب یہ لفظ کسی درس میں آیا تھا' تو کہا تھا کہ یہ متاع کا لفظ آیا ہے۔ ہمارے ہاں تو جو متاع ہے' وہ ساز و سامان ہوتا ہے' اور پنجابی اچ تے مال متاع کیندے نیں اے مال ہوندا جینوں متاع کیندے نیں۔ اے مال متاع عجیب لفظ ہے۔ (پنجابی زبان میں مال متاع کہتے ہیں۔ یہ مال ہوتا ہے جسے متاع کہتے ہیں۔ یہ مال متاع عجیب لفظ ہے) یہ سمجھانے کے لیے ہے۔ اس زمانے کا مسافر چلتا ہے تو پوری ایک گاڑی سامان کی بھر لیتا ہے۔ پہلے چلنے والا مسافر' ریگستان میں چلنے والا مسافر ہوتا تھا۔ راستے میں بھی اس کے ہاں نہ کوئی ریستوران ہوتے تھے' نہ کوئی ہوٹل ہوتا تھا' اپنے ساتھ اس نے کچھ سامان لے کر چلنا ہوتا تھا' جو اس کے راستے میں کام آئے' وہ ایک چھوٹا سا تھیلا ہوتا تھا۔ اس میں کچھ ستو' کچھ کھجوریں' ایک لوٹا' اس کے ساتھ ایک ڈوری رسی' جو بڑی ضروری چیز تھی' ایک لکڑی لٹھ یا کلہاڑی جیسی چیز' دو کپڑے رکھ لیتا تھا۔ یہ جو زادِ سفر تھا' سامانِ سفر تھا' وہ متاع ہوتا تھا' وہ اسے متاع کہتے تھے اور اس کے لیے وہ کہتے تھے کہ کوئی مسافر ایسا پاگل نہیں ہوتا کہ وہ ضرورت سے زیادہ چیز اپنے پاس لاد کر رکھ لے۔ وہ کبھی دو لوٹے لے کر نہیں چلے گا۔ وہ بوجھ ہو جائے گا۔ جتنا لمبا سفر ہوتا' اس کے مطابق ہی ستو یا کھجوریں لے کر چلتا' ایک بوری بھر کے نہیں لے جاتا۔ ساتھ تو وہ متاع ہوتا تھا کہ جتنا سفر لمبا ہے اس کے لیے جو بنیادی ضرورتیں ہیں' وہ ساتھ رکھے' اس سے کم نہیں کہ راستے میں ختم ہو جائیں تو مر جائے' اس سے جو زائد ہے وہ تو بوجھ ہے۔ وہ اتنا ہی لے گا جتنا اس کی ضرورت کے لیے کافی ہوگا۔ اگرچہ ذوق کے شعر میں شعریت تو ہوتی نہیں لیکن بہر حال وہ کچھ وعظ ہوتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ

کیوں اتنا گراں بار ہے جو زاد سفر بھی
ہے راہروِ ملک عدم اُٹھ نہیں سکتا

کوئی اس قسم کا مسافر جس نے اپنے کندھے پہ لاد کر سفر کا سامان لے جانا ہو وہ زائد از ضرورت لے کر ہی نہیں چلے گا اور اگر ضرورت سے کم ہے تو راستے میں مر جائے گا۔ اتنا سامان ہو کہ جسے وہ ضرورتاً اپنے ساتھ لے کر چلے اور وہ راستے میں ختم نہ ہو تو اس اتنے سامان کو متاع کہتے تھے۔

بنک بیلنس کروڑوں کا لیکن کھانے کے لیے صرف پردہ چھلکے کا

قرآن کریم میں جہاں بھی رزق کہا ہے' اسے متاعاً لکم کہا ہے۔ اے کاروانِ حیات کے مسافرو! تمہارے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا ایک مسافر کے لیے زادِ سفر ضروری ہوتا ہے۔ کیوں؟ اگر اس سے زیادہ لاد کر اپنے پاس رکھتے ہو تو بوجھ ہے۔ یہ جو مرتے وقت

کروڑوں کا بنک بیلنس چھوڑ جاتے ہیں' مرتے کیا ہو' ہم نے تو دیکھا ہے' مرنے سے پہلے بھی ان کے حصے میں جو ایک مزدور کھاتا ہے' اس سے بھی دسواں حصہ وہ کھا سکتا ہے' صحتیں خراب ہو گئی ہوتی ہیں۔ میں نے کروڑ پتیوں کو دیکھا ہے' زندگی کے آخری دنوں کے اندر میں کسی کی مثال کیوں دوں۔ کھانے کا وقت آیا تو وہ ہمارے ہاں چھلکے کا پچھلا پردہ ہوتا ہے' اور وہ مونگ کی دال کا شوربہ' شوربہ کیا وہ پانی ہوتا ہے' وہ یہ کھار ہا ہوتا ہے۔ یہ تو زندگی کے آخری دنوں میں ہے اور جب ختم ہو جاتا ہے تو یہ بھی نہیں کھایا جاتا۔ کہا کہ اتنا لو جو متاعاً لکم ہے۔ یہ جو باقی سارے کا سارا ہے' یہ تمہارا متاع تو نہیں ہے' تمہارے سفر میں کام نہیں آیا' تو یہ جو نظام ہے کہ مسافر کو متاع دیا جائے۔ ایک تو ہر انسان کو اس دنیا کے سفر میں' ایک مسافر کی حیثیت دیدی۔ کیا بات ہے یہ مقیم نہیں ہے' مسافر ہے۔ مسافر کو زادِ سفر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اتنا ہر ایک کو ملنا چاہیے۔ اس نے کہا ہے کہ مزید زادِ سفر اُٹھانا حماقت ہے۔ اس کی یہ عادت نہیں ہونی چاہیے۔ اس لیے کہا کہ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ (79:33;80:32) تمہارے اور تمہارے مال مویشیوں کے لیے متاع ہے۔ کہا کہ یہ ہے متاع۔ تمہیں اتنا ہی چاہیے جتنا کہ ضروری ہے۔

لفظ تسبیح کا لغوی مفہوم تو اپنے اندر ربوبیت عالمینی کا پروگرام لیے ہوئے ہے

عزیزانِ من! اب آگے ایک اور لفظ آتا ہے۔ کہا ہے کہ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (56:74)۔ ہمارے ہاں تو میں نے عرض کیا ہے کہ بس وہ جو ترجمے ہوئے ہیں' اس سے تو پتہ ہی نہیں چلتا۔ عزیزانِ من! اب آگے ایک اور لفظ آتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ کچھ کہنے کے بعد آگے ہمارے ہاں یہ ترجمے ہیں کہ اپنے رب' عظمت والے نام کی تسبیح کر۔ او گل کی بنی اے؟ (یہ بات کیا بنی؟) یہ یہاں تک یہ کچھ کہتا چلا آ رہا ہے۔ آگے جا کر کہہ رہا ہے کہ ساڈے سارے دھندے اے ہیگے نیں (ہمارے سارے دھندے یہ ہوتے ہیں) کہ تسبیح کر لے اپنے رب عظیم کی' تسبیح کر۔ سبح کے معنی ہوتا ہے ''کسی مقصد کے حصول کے لیے انتہائی کوشش کرنا۔ وہ جو گھوڑے کی انتہائی رفتار ہوتی ہے' وہ اس طرح سے جو چلتا ہے' تو اسے سرپٹ کہتے ہیں۔ سبح یہ تیراک ہے جو پورے ہاتھ سے اس طرح سے تیرتا ہے اس کو تسبیح کہتے ہیں یعنی جتنی بھی تمہاری سرگردانی کی انتہائی کوشش ہو سکتی وہ یہ کرتا ہے' سرگرداں رہتا ہے۔ کاہے کے لیے؟ کہا کہ تم یہ ربوبیت چھوٹے چھوٹے پیمانے پر کرتے ہو کہ میری ضرورت ہے' میرے بچوں کی ضرورت ہے' کہتا ہے کہ ہر شخص یہی کرتا ہے' یہ تو جانور بھی کرتے ہیں' حیوانات بھی کرتے ہیں۔ حیوان میں اور انسان میں پھر فرق کیا ہوا؟ تم میں اور ان میں فرق کیا ہوا؟ یہ ربوبیت محدود نہ رکھ۔ کہا کہ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (56:74) عظیم ربوبیت جو وسعت کی ہے' پورے نوعِ انسانی کے لیے' اس کے لیے کوشش کر۔ اب آپ نے غور فرمایا معیشت کا سارا فلسفہ بیان کر کے' سامانِ رزق کا جو انتظام ہے' اس کو دہرا کر آخر میں کہا کہ اپنی ذات تک ربوبیت نہ رکھ۔ یہاں

فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الۡعَظِیۡمِ (56:74) میں رب کے لفظ پر غور فرمائیے۔ جہاں سامانِ نشوونما دینے والا آئے گا' اس کے معنی ہوں گے ''خدا نے جو ربوبیتِ عامہ کے لیے یہ انتظام کیا ہے' اسے بروئے کار لانے کے لیے سرگرداں ہو' انتہائی کوشش کر'' اور اس کے بعد یہ ہے کہ پھر جو ہم نے پہلے باتیں کی ہیں' وہ ساری قانون کی ہیں' پھر اس کے مطابق ہماری خارجی کائنات میں سب کچھ ہوتا رہتا ہے تو وہ ہوتا ہے کیونکہ ہمارا قانون ہے اور ان کو اس طرح اس کا اختیار نہیں کہ وہ اس قانون کی خلاف ورزی کریں۔ اب آؤ! تمہیں بتائیں کہ اس کائنات میں ہمارا قانون کس طرح سے روبہ عمل ہوتا ہے۔ یہ اگلی آیت میں آئے گا۔

عزیزانِ من! سورۃ الواقعۃ کی آیت 74 تک ہم آ گئے' 75 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀.....❀.....❀

پانچواں باب: **سورۃ الواقعۃ** (آیات 75 تا 82)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1983ء کی 18 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الواقعۃ کی آیت 75 سے ہو رہا ہے: (56:75)۔

قرآن حکیم کی ساری تعلیم خدا تعالیٰ کے غیر متبدل اصولوں کے گرد گھومتی ہے

اب یہ حقیقت تو آپ کے سامنے آ چکی کہ قرآن حکیم کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ جو قوانین خدا کی طرف سے مقرر ہوئے ہیں، وہ غیر متبدل ہیں، ابدی ہیں اور اسی کو قرآنِ کریم اس عالمِ محسوسات کے نظام کے مختلف ادراک اور گوشوں کی مثالوں کی مدد سے سمجھائے چلا جاتا ہے۔ سابقہ آیات میں انسانی تخلیق کے متعلق یہ بتایا کہ اسے دیکھیے کہ یہ کس قدر قانون کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور قوانین کیسے غیر متبدل ہیں، پھر زراعت کی مثال سے سمجھایا کہ تم دیکھو کہ کس طرح قانون کی پابندیوں سے، وہ ایک چھوٹا سا دانہ پروان چڑھ کر ایک اتنا بڑا درخت بن جاتا ہے، فصلیں پیدا ہو جاتی ہیں، ان سے سامانِ رزق مہیا ہوتا ہے اور یہ ایسا سلسلہ ہے کہ جب سے انسان کے شعور نے آنکھ کھولی، اس وقت سے آج تک، وہ دیکھتا چلا آ رہا ہے کہ یہ قوانین غیر متبدل ہیں: گندم از گندم بروید جواز جو۔ یہ ایک مسلمہ ہے، یہ ایک غیر متبدل کلیہ ہے اور اس سے وہ پھر اس چیز پہ لاتا ہے کہ انسانی زندگی کے متعلق ہم نے جو قوانین قرآن حکیم میں دیئے ہیں، وہ بھی اسی طرح سے ابدی غیر متبدل ہیں اور ان کے نتائج اٹل ہیں۔ یہ ہے وہ بنیادی نکتہ، یہ ہے وہ محور، جس کے گرد قرآن حکیم کی ساری تعلیم گردش کرتی

ہے۔اب اسی کو وہ اگلی آیت میں لے آیا اور یہ سورۃ الرحمٰن کی وہ آیت یا آیات ہیں' جن میں نظامِ فلک کی مثالیں ہیں۔

اَبلہ مسجد کے بجائے کائناتی علم عقل انسانی کو حقیقت کے قریب تر لے آتا ہے

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہوگا کہ جب سورۃ الرحمٰن کی وہ آیت یا آیات (55:5-9) سامنے آئی تھیں تو ان میں جو قرآنِ کریم نے ستاروں کی گردش' نظامِ افلاک کے کرّے' عظیم الشان سورج اور چاند کی مثالیں دے کر سمجھایا تھا کہ تم دیکھتے نہیں ہو کہ کس طرح وہ جزئیات تک قانون کی پابندی کی گردشوں کے اندر جکڑے ہوئے ہیں۔اُسی مفہوم کی ایک آیت یہاں آئی ہے اور سابقہ آیات کے تسلسل میں ہی یہ بات کہی گئی کہ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ o وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ (56:75-76). ہم شہادت میں پیش کرتے ہیں ان ستاروں کو' نظامِ فلکی کو' ان عظیم الجثہ کرّوں کو' جو فضا کی پہنائیوں میں اس طرح مصروفِ گردش ہیں اور آگے کہا کہ اگر تم علم کی بارگاہ سے پوچھو تو وہ تمہیں بتا دیں گے کہ یہ شہادت کتنی عظیم شہادت ہے۔پہلی چیز کے لیے تو اس لیے بھی کہا کہ علم کی ضرورت ہوگی اور ظاہر ہے کہ یہ علم تو یہ نہیں جو آپ کے دارالعلوموں میں اٹھارہ علوم پڑھائے جاتے ہیں' جن میں یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آسکتی کہ یہ چاند ایک کرّہ ہے جس کے اوپر انسان جا بھی سکتا ہے۔یہاں جو علم کہا گیا ہے تو اس سے تو علم الافلاک ہی مراد ہوگا کہ اگر تم علم کی بارگاہ سے پوچھو تو وہ تمہیں بتائے گا کہ یہ شہادت جو ہم پیش کر رہے ہیں' کتنی عظیم شہادت ہے۔جیمز جینز بتا سکے گا۔اسے اَبلہ مسجد نہیں بتا سکے گا[1]۔وہ تو ابھی تک یہ کہہ رہا ہے کہ یہ جو آسمان اوپر تلے ہیں یہ بڑے بڑے آٹھ نو شیشے کے ڈل ہیں اور ان کے اندر جواہرات جڑے ہوئے ہیں جنہیں تم ستارے کہتے ہو۔وہ کیا بتائے گا کہ یہ شہادت' جو قرآن حکیم نے پیش کی ہے، کتنی عظیم ہے! یہ کوئی علم الافلاک جاننے والا ہی سمجھ سکے گا۔اگر تم علم کی بارگاہ سے پوچھو تو وہ بتائے گا کہ یہ شہادت جو ہم نے پیش کی ہے' کتنی عظیم شہادت ہے' کس بات کی شہادت ہے' جو پیش کی گئی ہے۔کہا کہ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ (56:77) دعویٰ یہ ہے کہ ہم قرآنِ کریم میں نظامِ افلاک کی شہادت پیش کرتے ہیں اور کہا یہ گیا ہے کہ اس شہادت کی عظمت تو وہی جان سکے گا' جو ان علوم سے واقف ہوگا۔آپ غور فرمائیے کہ قرآن حکیم کا بات سمجھانے کا انداز کیا ہے! یہ ہے دعویٰ کہ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ[2] (56:77)

قرآن حکیم ہو یا گردشِ افلاک' ان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی کوئی انسان کر ہی نہیں سکتا

عزیزانِ من! اب یہ ستارے یا جن کی قرآنِ حکیم میں شہادت پیش کی گئی ہے' ان میں ایک چیز تو واضح ہے کہ کوئی انسان' کوئی انسانی ذریعہ' ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا۔آپ کو سمجھنا پڑے گا کہ ان کی گردشیں کس طرح سے ہو رہی ہیں' ان کے نتائج کیا ہیں۔یہ نہیں ہے کہ ان میں آپ کوئی تبدیلی پیدا کر سکیں۔یہ ہو ہی نہیں سکتا۔قرآنِ کریم میں کریم کے متعلق بھی یہ کہا تھا کہ عربوں کے ہاں اگر کسی

---

❶ یہ مفکر قرآن جناب ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے:

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق — نے اَبلہ مسجد ہوں، نہ تہذیب کا فرزند — (اقبالؒ: بالِ جبریل)

❷ اس دعوے کے ثبوت میں، ہم ستاروں کے طلوع وغروب کے مقامات کو بطورِ شہادت پیش کرتے ہیں اور اگر تمہیں رموز واسرار کائنات کا علم ہو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ شہادت کس قدر عظیم ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 273)۔

کی کوئی انتہائی صفات بیان کرنی ہوں، یعنی کوئی شخص جامع صفات ہو، بلند ترین صفات کا حامل ہو تو اسے کریم کہتے ہیں۔ اس سے آگے ان کے ہاں اور کوئی لفظ نہیں ہے۔ کسی کی صفات بیان کرنے کے لیے انتہاء ہو جاتی ہے تو قرآن بھی کریم، خدا بھی کریم ہے، اور رسول بھی کریم ہے، تو یہ اس بات کی شہادت میں پیش کر رہا ہوں کہ یہ قرآنِ کریم جو ہے، یہ فِیۡ کِتٰبٍ مَّکۡنُوۡنٍ (56:78) ہے۔ یہ مکنون کتاب ہے، محفوظ کتاب ہے۔ یہ کتاب مکنون، ستاروں کی دنیا انسانی دسترس سے محفوظ ہیں۔ ان میں کوئی اپنی مرضی سے تبدیلی نہیں کر سکتا۔ یہ قرآن کریم بھی محفوظ ہے، غیر متبدل بھی ہے یعنی یہ اسلام کی یا قرآن کی منفردیت ہے کہ اس کی کتاب میں وَ تَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدۡقًا وَّ عَدۡلًا (6:115) اور لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (10:64) یعنی جو قوانین خدا نے انسانیت کے لیے دینے تھے وہ اس میں مکمل ہو گئے، پھر یہ غیر متبدل ہیں، ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ دو صفتیں تو یہ بتا دیں اور تیسری صفت کے لیے کہا کہ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (15:9) ہم نے اسے نازل کیا ہے، ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ یہ مکمل، غیر متبدل، محفوظ، ستاروں کی دنیا کی طرح ہے۔ کیا بات ہے! اس سے بہتر تشبیہ دی ہی نہیں جا سکتی۔ یہ ایک مکمل ہے، ان قوانین کے اندر کوئی اضافہ بھی نہیں ہو رہا۔ پہلے دن سے انسان نے، جو ان کے متعلق قوانین سمجھے ہیں، وہ انہیں دیکھتا چلا آ رہا ہے، وہ جتنا جی چاہے تحقیق کرتا چلا جائے، وہ ان کی نقل وحرکت میں یا جن قوانین کے تابع وہ محوِ گردش ہیں، ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ خدا نے بھی تبدیلی نہیں کی۔ اس کے محفوظ ہونے کی پہلی چیز تو یہی ہے کہ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ قرآن حکیم کی بھی یہ صفت ہے۔ اسی لیے کہا کہ فِیۡ کِتٰبٍ مَّکۡنُوۡنٍ (56:78) محفوظ کتاب کے اندر ہے۔ دوسری جگہ اسی کو قرآن نے لوحِ محفوظ کہا ہے اور یہاں کِتٰبٍ مَّکۡنُوۡنٍ (56:78) کہا ہے۔ اس لوح محفوظ کا حوالہ لے لیجیے بَلۡ ہُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِیۡدٌ o فِیۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ (85:21-22)۔ یہاں یہ لفظ محفوظ آیا ہے اور وہاں مکنون ہے، بات ایک ہی ہے۔ لوح محفوظ یہ ہے۔

لوح کا لغوی مفہوم اور ہمارے ہاں کی تفسیروں میں روایات پر مبنی بیان کا تجربہ

عزیزانِ من! لوح تو کہتے ہی ''کتاب'' کو ہیں۔ اس زمانے میں تختی کو کہتے تھے، اور تختیوں کے اوپر ہی لکھا جاتا تھا بلکہ بعض اوقات تو یہ خشک مٹی کو پکا (Clay) کر، اس کی پکی ہوئی Tablet ❶ (تختیاں) ہوتی تھیں، ان پہ لکھتے تھے۔ آرکیالوجیکلی بابل نینوا وغیرہ کی کھدائیوں میں، جو آثار قدیمہ برآمد ہوئے ہیں ان میں وہ Tablets برآمد ہوئی ہیں اور قرآن کریم میں ''الواح موسیٰ'' ہے۔ اس کے بعد

پھر جس چیز پہ بھی کوئی چیز لکھی جائے' اس کو پھر ''لوح'' کہنا شروع کر دیا۔ یہ بچوں کی تختی کو لوح کہتے ہیں۔ لوح کتاب کو کہتے ہیں۔ اصل میں تو اس کے معنی ہوتے ہیں ''کوئی چیز جو چمک اُٹھے''۔ وہ جو لکھی ہوئی چیز ہے' وہ تو چمک اُٹھتی ہے۔ دماغ میں ہوتی ہے تو وہ محفوظ ہوتی

1- Tablet: a thin sheet or leaf, as of clay, used as a writing surface (The Reader`s Digest Association Limited (1990) Universal Dictionary. London, (P.1538).

ہے اور جب وہ تحریر میں آ جاتی ہے تو اس میں چمک پیدا ہوتی ہے۔ بہر حال یہاں سے لوح ''کتاب'' کو کہتے ہیں کیونکہ قرآن حکیم ایک ایسی کتاب ہے جو محفوظ ہے' مکنون ہے۔ اب اس لوحِ محفوظ سے بات یاد آ گئی۔ ہمارے ہاں تو پھر' جب وہ زیبِ داستاں کے لیے آتے ہیں تو عجیب عجیب چیزیں آتی ہیں۔

لوح محفوظ کے متعلق بھی آپ کو معلوم ہوگا' عجیب تصورات ہیں کہ یہ ایک آسمان پہ ہے وہ کوئی چوتھے آسمان پر ایک تختی ہے' بس اس کے متعلق میں نے دیکھا تو سوچا کہ آپ کو ان چیزوں میں شریک کرتا چلا جاؤں تاکہ آپ کو محنت نہ کرنی پڑے۔ سنیے! ہمارے ہاں تفاصیل میں جو لوحِ محفوظ ہے' اس کی Description (تفصیل) کتنی دی ہوئی ہیں' یہیں بیٹھے ہوئے ہیں' آسمان کے اوپر جو لوح ہے' اس کی تفصیل بیان کی جا رہی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآنِ کریم سمجھنا ہو تو ان تفاسیر سے سمجھو۔ ان تفاسیر میں اس قسم کی باتیں ہیں' تو کوئی بات نہیں' اپنے دور کی جو علمی سطح ہے' اسی کے مطابق انسان سوچ سکتا ہے۔ اس دور میں علمی سطح ہی یہ تھی لیکن یہاں پہنچ کر یہ چیز اتنی زیادہ نقصان دہ ہوئی کہ اپنی ہر بات کے متعلق کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا تھا حالانکہ' وہ ان کی اپنی انسانوں کے ذہن کی تراشیدہ' تفاسیر تھیں یا انہوں نے جو بھی لکھا ہے وہ تھا۔ کوئی بات نہیں' تو وہ حضور نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب ہوگئ' جو عالم الناس ہیں۔ علمِ انسانی کی انتہائی بلندیوں پر ہیں' جب ان کی طرف یہ منسوب ہوا کہ آپ ﷺ نے یہ فرمایا تو اب دیکھیے کہ حضور ﷺ کا مقام اہلِ علم کے نزدیک کیا رہ گیا ہے۔ یہ ہے وہ چیز جس کے متعلق میں یہ کہتا ہوں کہ جو کچھ بھی یہ حضور ﷺ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس امر کی ضرورت ہے کہ اس کو ایک دفعہ کھنگال لیا جائے' پرکھ لیا جائے اور پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے دیکھ لیا جائے' عقل عامہ کی رو سے دیکھ لیا جائے' انسانی تجربات کی روشنی میں دیکھ لیا جائے۔ اگر ان کے مطابق وہ بات پوری اترتی ہے تو ہم کہیں گے کہ اس کی نسبت حضور ﷺ کی طرف صحیح ہے' پھر بھی یقین سے نہیں کہا جائے گا کہ فی الواقعہ حضور ﷺ نے ایسا فرمایا تھا۔ جیسا کلام اللہ کے متعلق ہے کہ جب ہم قال اللہ کہتے ہیں تو وہ پورے عقل و یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ خدا نے ایسا ہی فرمایا تھا جیسا قرآن کریم میں ہے' کسی اور چیز کے متعلق ایسا نہیں کہا جا سکتا لیکن اب یہ دیکھیے کہ میں لوح محفوظ کی تفسیر کو دیکھ رہا تھا تو میں نے کہا کہ آپ کو بھی اس میں شریک کر لوں۔

لوحِ محفوظ کے سلسلہ میں تفسیر ابن کثیر کا بیان اور علامہ غلام احمد پرویزؒ کی ایک التجا

تفسیر ابنِ کثیر بڑی معتبر تفسیر ہے۔ ہمارے ہاں یہ لوحِ محفوظ ہے۔ یوں کہو کہ یہ تو خود ہی اتنی بڑی لوح ہے۔ لکھا ہے کہ حضرتِ انسؓ فرماتے ہیں...... تو یوں یہ صحابہؓ سے روایت شروع ہو جاتی ہے اور ان کے نزدیک جو صحابہؓ سے مروی ہو۔ وہ بڑی معتبر روایت ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ لوحِ محفوظ حضرتِ اسرافیل کی پیشانی پر ہے۔ عبدالرحمٰن بن سلمان فرماتے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہوا' ہو رہا ہے اور ہوگا' وہ سب لوحِ محفوظ میں موجود ہے اور لوحِ محفوظ حضرتِ اسرافیل کی دونوں آنکھوں کے سامنے ہے لیکن جب تک انہیں اجازت نہ ملے' وہ اسے دیکھ نہیں سکتے' بیان ذوق بہ لے لذتِ نظر نہ دہند ہم اسے شاعری سمجھتے تھے' وہ آنکھوں کے سامنے ہے مگر اسے دیکھ نہیں سکتے''۔ حضرتِ ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ لوح سفید موتی کی ہے۔ اس کا طول آسمان اور زمین کے درمیان کے برابر ہے' اس کی چوڑائی مشرق و مغرب کے برابر ہے' اس کے دونوں کنارے موتی اور یاقوت کے ہیں' اس کے دونوں پٹھے سرخ یاقوت کے ہیں' اس کا قلم نور ہے' اس کا کلام عرش کے ساتھ وابستہ ہے' اس کی عقل فرشتے کی گود میں ہے' مقاتل فرماتے ہیں کہ یہ خدا کے عرش کے دائیں طرف ہے۔ تفسیرِ طبری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے لوحِ محفوظ کو سفید موتی سے پیدا کیا۔ اس کے صفحے سرخ یاقوت کے ہیں۔ اس کا قلم نور کا ہے۔ اس کی کتابت نور ہے۔ ٹھیک ہے' اور آگے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دن تین سو ساٹھ مرتبہ اسے دیکھتا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں' طبری فرمائیں یا ابنِ کثیر فرمائے' تو کوئی بات نہیں۔ ٹھیک ہے یہ انسان تھے' اپنے دور کے تھے' انہوں نے اس زمانے میں اور بھی باتیں کہی تھیں۔ زمانے کا جو علم ہے وہ ترقی کرے' ہم کہیں گے کہ نہیں صاحب! یہ غلط ہے جو انہوں نے کہا اور جب وہ کہیں گے کہ رسول اللہؐ یہ فرماتے ہیں' اور یہی تو قصہ شروع ہوا اور جونہی کسی نے کہا کہ صاحب! حضور ﷺ تو ایسا نہیں فرما سکتے اور انہوں نے کہا کہ یہ منکرِ حدیث ہے' خارج از اسلام ہے' کافر ہے' مرتد ہے' واجب القتل ہے یعنی یہ ہے وہ چیز جو میں بار بار اپنے تمام درسوں میں' ساری عمر' یہ کہتا چلا آ رہا ہوں کہ بابا! اگر کوئی یہ لکھ گئے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے' تو پرکھو! کھڑے ہو کر اس چیز کو دیکھ لو لیکن نہیں کہ اس سے یہ جو اسلاف ہے' ان کی شان پر حرف آ جاتا ہے یعنی اسلاف کی شان پہ حرف نہ آئے' رسول اللہ ﷺ کی ذات پہ آتا ہے تو آتا رہے۔ معاذ اللہ۔ اور رسول اللہؐ کے متعلق پھر یہ ہے کہ یہ حضورؐ نے وحی کے ذریعے سے کہا تھا' تو پھر خدا بھی درمیان میں شامل ہوگا' مگر وہ ہوتا رہے' طبری یا ابنِ کثیر کی شان میں کوئی فرق نہ آئے۔ یہ ہے جسے شخصیت پرستی کہتے ہیں۔

قرآنِ حکیم ہی وہ قندیل آسمانی ہے جو لوحِ محفوظ ہونے کے باعث تا قیامت انسانیت کی راہنمائی کا سہارا بنی رہے گی

عزیزانِ من! کہا ہے کہ فِیۡ کِتٰبٍ مَّکۡنُوۡنٍ (56:78) یعنی یہ لوحِ محفوظ میں ہے اور اس کی حفاظت کے متعلق قرآن کریم نے خود کہا کہ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (15:9)۔ وہ تو لفظ بھی حافظون قرآن حکیم نے کہا ہے' اس کی حفاظت کریں گے۔ اس کی حفاظت یہ ہے کہ یہ جو قرآن حکیم ہے' یہ کتاب ہمارے پاس ہے۔ ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ (2:2) قرآن حکیم اس کتاب کے اندر ہے' جو محفوظ رکھی گئی ہے۔ بات بالکل صاف ہے۔ اب کہاں اسرافیل کی آنکھوں کے درمیان ماتھے پہ اور کہاں وہ ایسی جگہ رکھا ہوا جہاں خدا اس کو تین سو ساٹھ مرتبہ ہر روز دیکھتا ہے۔ اس کے اندر کتابِ محفوظ ہے اور ہمارے پاس ہے اور یہ اس کی بہت بڑی صفت ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ جتنے مذاہب سابقہ تھے' ان کے متعلق قرآن حکیم کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کی طرف انبیاء آئے تھے' انبیاء خدا کی کتاب لائے تھے' ان کے پاس خدا کی کتاب تھی۔ اگلی بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی کتاب محفوظ نہیں رہی۔ اب یہ جو انفرادیت ہے' یہ قرآن حکیم کی ہے کہ وہ کتاب محفوظ ہے۔

قرآن حکیم کی تحریم وتکریم کا عملی انداز اور ہمارے ہاں کے تراجم کی کیفیت

عزیزانِ من! اب اگلی بات آ گئی اور کہا کہ لَّا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الۡمُطَہَّرُوۡنَ (56:79)۔ ترجمے عام آپ کو ملیں گے کہ ان کو کوئی نہیں چھو سکتا تاوقتیکہ وہ پاک نہ ہو اور اس فریضے کی ادائیگی یہ ہے کہ وہ غسل کرے یا کم از کم وضو کرے تو پھر قرآن حکیم کو چھوئے یعنی ہاتھ لگائے۔ یہ ''مس'' کے معنی تو وہ ''چھونا'' ہو گئے ''مطہر'' کے معنی ہو گئے ''پاک صاف ہونا' نہا دھو کر یا وضو کر کے''۔ پہلی چیز تو یہ کہ یہ ٹھیک ہے کہ جو چیز بھی آپ کے نزدیک باعظمت ہے' اس کی عظمت کا اظہار کسی نہ کسی محسوس شکل میں ہوتا ہے۔ آپ جب کسی کو سلام کہتے ہیں تو اس کے ساتھ ہاتھ ماتھے کی طرف' تحریک وتکریم میں اُٹھتا ہے۔ تھوڑا سا سر جھکتا ہے۔ آپ ''ہاں'' کہتے ہیں تو غیر شعوری طور پر سر جھکتا ہے۔ جب آپ ''نہ'' کہتے ہیں تو بالکل یکلخت خودبخود سر یوں ہو جاتا ہے۔ یہ آپ کے دل کے جذبات' بلکہ خیالات تک اس کا اظہار غیر شعوری طور پر بھی آپ کے محسوس اجزاء کے اعضا کی نقل وحرکت سے بھی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے میں سمجھتا ہوں کہ قرآن حکیم کی عظمت کی یہ کیفیت ہے کہ یہ نہیں ہے کہ گندے اور غلیظ ہاتھوں سے' ناپاک طریق کے اوپر بھی ہو' تو قرآن پاک کو اس طرح سے پکڑ لیں۔ ٹھیک ہے یہ بھی ایک چیز ہے لیکن اتنی سی بات ہی نہیں ہے کہ آپ نے یہ کیا اور قرآن حکیم کا جو حکم ہے' اس کی تعمیل ہو گئی۔ وہ حکم تو اس کے ساتھ کچھ اور دیتا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ اگر ہم نہ بھی کہیں کہ خدا نے کہا ہے کہ پاک اور صاف غسل کر کے' ہاتھ دھو کے' قرآن حکیم کو ہاتھ لگاؤ تو عقلِ انسانی کا بھی تقاضا یہ تھا کہ پاک وصاف ہو کر اتنی باعظمت کتاب کو یوں کھولے لیکن وہ تو بات ہی کچھ اور کہہ گیا ہے۔

لفظ یمسّہٗ کا وہ مفہوم جو بڑا غور طلب ہے

یہ لفظ یمسہ آیا ہے۔عربی زبان میں اس کو انہوں نے چھونا کہا' لمس بھی ہے' عربی زبان میں ''مس'' بھی ہے۔عربی زبان میں ''لمس'' تو صرف چھونے کو کہتے ہیں یہ جو ''مس'' ہے' یہ آپ کے ہاں بھی استعمال ہوتا ہے۔اتفاق سے اردو میں یہ کہتے ہیں کہ جی! اسے تو ذوقِ لطیفہ سے مس تک بھی نہیں۔کیا معنی ہوتے ہیں؟ اس کے معنی' ہم دوسرے لفظوں میں کہتے ہیں کہ ''اس نے تو اسے چھوا تک نہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس نے اسے Touch نہیں کیا۔''مس'' کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''ذرا بھی نہیں سمجھا' اسے اس کا ادراک ہی نہیں ہے' فہم ہی نہیں ہے' سمجھا ہی نہیں ہے' جانتا ہی نہیں ہے' ادراک ہی نہیں ہے۔'' یہ معنی ہوتے ہیں۔عربی زبان میں بھی ''لمس'' اور ''مس'' میں یہ فرق ہوتا ہے ''مس'' کے بنیادی معنی ہی ''وہ کسی چیز کی طلب اور جستجو اور پالینا ہوتے ہیں' کسی چیز کو حاصل کر لینا' کسی چیز کا ادراک ہونا'' کہتے ہیں۔

مطہر کے لفظ کا استعمال یہاں قرآنی تعلیم کو سمجھنے کے لیے پہلے خالی الذہن ہونے کے معنوں میں آیا ہے

اس پر قرآن کریم نے اگلی یہ شرط لگائی کہ اس کا ادراک کیسے ہو سکے گا۔اب اگلا لفظ مطھرون آیا ہے۔ٹھیک ہے طہر' طہارت' یہ جو الفاظ ہیں' ان کے معنی جسمانی پاکیزگی کے بھی ہیں لیکن جسمانی پاکیزگی ہی نہیں۔قرآن کریم میں دیکھیے یہی لفظ ہے' جسے ہم طہارت کہتے ہیں' طہر کہتے ہیں۔قرآن کریم میں اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُرِدِ اللّٰہُ اَنۡ یُّطَہِّرَ قُلُوۡبَہُمۡ (5:41) دیکھیے اس میں یُّطَہِّرَ کا ذکر آ رہا ہے' وہ تو عرب تھے' عربی زبان میں قرآن کریم تھا' وہ اسے پڑھتے تھے۔قرآن کریم نے کہا کہ نہیں' یہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا' یہ نہیں مانتے' اس لیے کہ ان کا قلب مطہر نہیں ہے۔یہ وہی لفظ ہے: قلب کا پاکیزہ ہونا۔اب ہمیں لفظ پاکیزہ بھی نہیں استعمال کرنا چاہیے' معنی پھر وہیں چلے جائیں گے۔اب قلب کی جو پاکیزگی ہے' اس کے لیے کیا کیا جائے۔انہوں نے تو یہ اپنے ہاں کے افسانے بنا لیے اور نبی اکرم ﷺ کا پھر وہ معراج کی شب جبریل نے آ کر سینہ چاک کیا تھا' پھر اندر سے دل نکالا تھا' پھر زم زم کے پانی سے اسے دھویا تھا' پھر اسے پاک صاف کر کے اندر رکھ کر (یوں کہیے کہ) ٹانکے لگائے تھے۔اب وہ تو قلب کا صاف کرنا ہو گیا۔وہ تو ہو گیا۔اب اور کس کا قلب اس طرح سے صاف ہو گا؟

عزیزانِ من! پاکیزگی قلب و نگاہ تو ہم روز بولتے ہیں' ان لفظوں کو ہم روزانہ کہتے ہیں اور اب بات بالکل صاف ہے۔قرآن کریم کے مقاصد و مفاہیم اور مطالب کو سمجھا نہیں جا سکتا تاوقتیکہ انسان خالی الذہن اس کی طرف نہ آئے۔اگر آپ نے پہلے سے اپنے ذہن میں کچھ خیالات قائم کر لیے ہیں اور اس کے بعد اس مقصد کے لیے قرآن کریم کی طرف آتے ہیں کہ آپ کے قائم کردہ خیالات کی تائید قرآن کریم سے مل جائے یعنی آپ قرآن کریم کو اپنے خیالات کے تابع رکھتے ہیں' صاف صاف مل جائے تو خیر' نہیں تو پھر تاویل کیجیے

تا کہ وہ بات اس کے مطابق مل جائے۔ اس طرح قرآن کریم نہیں سمجھ میں آ سکتا۔ تم قرآن کریم کو اپنی سمجھ کے تابع رکھنا چاہتے ہو۔ قرآن کریم اس وقت سمجھ میں آئے گا' جب پہلے سے دماغ میں کوئی عقیدہ' کوئی مسلک' کوئی تصور' کوئی نظریہ نہ رکھا ہوا ہو' خالی الذہن ہو۔ اسے کہیں گے دماغ کی تطہیر' اسے کہیں گے قلبی طہارت۔ طہر کے معنی ہوتا ہے ''دور کرنا کسی آلائش کا۔'' کیجیے پہلے ان چیزوں کو دور کیجیے تو پھر قرآن کریم سمجھ میں آتا ہے۔

علامہ غلام احمد پرویزؒ نے قرآن حکیم کو کیسے سمجھا اور انہیں کن کن گھاٹیوں کو سر کرنا پڑا

عزیزانِ من! میں عرض کروں گا کہ میں کبھی ''میں'' نہیں کہا کرتا لیکن چونکہ ساری عمر اس قرآن کریم کو سمجھنے میں گزری ہے' آدھی عمر اسی قرآن کریم کو پڑھا' کچھ تھوڑی بہت عربی جانتا تھا' بہت پڑھا' تفاسیر پڑھیں' روایات دیکھیں' قرآن کریم کو پڑھا' قرآن کریم سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ اس لیے سمجھ نہیں آیا کہ پہلے سے ذہن کے اندر معتقدات موجود تھے۔ اس سارے دوران میں اپنے مقام پہ جمے رہے۔ یہاں کسی سطح سے بہ نصِ صریح یا اشارۃً کنایتاً ان کی تائید میں کچھ مل گیا' ہم نے سبحان اللہ کہا' جہاں نہیں ملا' ہم نے کہا کہ نہیں' ہم سمجھ نہیں سکے' بات تو وہی ٹھیک ہے جو ہمارے دماغ میں ہے۔ آدھی عمر تو اسی اندازِ فکر میں صرف ہوگئی اور اسی مقام پہ ہے' جو اعتقادات پہلے ذہن میں تھے۔ یہ میں اپنی واردات بتا رہا ہوں' اور جب یہ بات سمجھ میں آئی کہ قرآن کریم اس صورت میں سمجھا جائے گا کہ ذہن میں لا الــہ آئے۔ یہ اس کی پہلی صورت ہے صاحب! لا الہ کے بغیر' الا اللہ تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ وہ تو کیا پوچھتے کہ خدائے تعالیٰ یہ کیا کر گیا۔ وہ دو فقروں میں' دو لفظوں میں ساری بات کہہ گیا ہے کہ ''لا الہ ہے تطہیر قلب و دماغ''۔ یہاں ہر قسم کا الہ دماغ سے الگ ہو جانا چاہیے' یوں خالی الذہن ہو کر قرآن کریم کی طرف آیئے اور پھر دیکھیے کہ کس طرح الا اللہ [1] سامنے آتا ہے لیکن جہاں صورت یہ ہو کہ قرآن کریم کی کوئی شے آپ کو کسی پہلے سے قائم کردہ عقیدے کے خلاف لگے' کسی بزرگ یا اسلاف میں سے کسی کے قول کے خلاف لگے' وہ بھی تو ہمارے ہاں یہ درجہ لیے ہوئے ہیں تو آپ کانپ اُٹھے کہ ہیں! اس کے خلاف یہ بات ہو نہیں سکتی' نہیں نہیں' میں سمجھا نہیں ہوں' بہر حال قرآن کریم یہ نہیں کہہ سکتا' اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انہوں نے فرمایا ہوا ہے' میں حضور! اس کے خلاف نہیں کہہ سکتا۔ یاللعجب!!

قرآن حکیم کا پیغام اپنی تعلیم میں کسی کو شریک نہیں کرتا جب کہ مذہبی فرقہ بندی سب سے بڑا شرک ہے

عزیزانِ من! سب سے پہلے تو اپنا قائم کردہ عقیدہ اپنے دماغ سے نکال دیا' پھر اس کے بعد ہر انسانی فکر اور سوچ کو دماغ سے نکال دیا' پھر باری تعالیٰ دماغ میں آئے گا' یہ خالی مکان میں آئے گا۔ اگر پہلے ذہن میں کوئی عقیدہ پہلے سے بسا ہوا ہوگا' تو وہ اس صورت میں نہیں آئے گا۔ یہاں عام طور پہ ہم اس مکان میں داخل نہیں ہوتے' جہاں پہلے سے کوئی بسا ہوا ہو۔ پہلے کہتے ہیں کہ صاحب! اس کرائے

دار کو نکالو' پھر ہم قرآنِ کریم کے اندر جائیں گے اور اس کے بعد اگلی بات' عزیزانِ من! یہ ہے کہ جب آپ کسی فرقے سے متعلق ہو جائیں گے تو قیامت تک قرآن کریم سمجھ میں نہیں آئیگا۔ اسلام تو وہ ہوگا' جو اس فرقے کے معتقدات ہیں۔ انہیں آپ چھوڑ یئے' تب قرآن کریم

---

❶ اقبالؒ کے الفاظ میں یوں ہے:

نہادِ زندگی میں ابتداءُ 'لا' انتہا 'الا' — پیامِ موت ہے جب 'لا' ہوُ 'الا' سے بیگانہ (ضربِ کلیم)

کو سمجھو گے۔ یہ تھی وہ مشکل اور فرقہ پھر ایک نہیں' ان کے کہنے کے مطابق بہتر ہیں اور روایات سے بہتر ہزار بنتے ہیں۔ اوا! قرآن کریم کس طرح سمجھ میں آئے۔ یہ دشواری تھی جس کے تحت کہا کہ قرآن کریم صرف تلاوت کے لیے ہے' اس سے ثواب ہوتا ہے' کچھ اپنے پاس رکھ لیا کرو اور کچھ پارسل کر کے مُردوں کو پہنچا دیا کرو۔ بس اس کا مصرف یہ ہے۔ وہاں تو یہ ہوا' باقی رہا قرآن کریم سے اسلام متعین کرنا' عقائد متعین کرنا' زندگی کے مقاصد متعین کرنا' یہ سارا کچھ جو ہے وہ تمہارے فرقے نے تمہارے لیے روایات میں' فقہ میں' تفاسیر میں میں کر دیا۔ یہ یوں کہیے۔

فرقوں کی موجودگی میں قرآن کیونکر سمجھا جاسکتا ہے

اب اسی فرقے بندی کو ساتھ رکھتے ہوئے قرآن کریم کی طرف آیئے۔ معاف فرمایئے' میں کسی خاص فرقے کیخلاف کوئی تنقید نہیں کر رہا' یہ ذہن میں رکھیے۔ اسی قرآن کریم سے میں چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔ اسی قرآن کریم سے وضو میں پانی سے پاؤں دھونے کا بھی آپ کو مل جائے گا اور آپ کو اسی طرح سے پاؤں کے مسح کرنے کا بھی مل جائے گا۔ اگر آپ دوسرے فرقے کے متعلق ہیں اور قرآن کریم کہتا ہے کہ اس کے منجاب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں متضاد بات نہیں ہے۔ چھوٹی سی بات ہے' یہ محسوس سی بات ہے کہ پاؤں دھویا جائے یا مسح کیا جائے' دونوں کو قرآن کریم سے یہ مل رہا ہے' کوئی عقیدہ کا تضاد نہیں ہے کہ اس میں آپ یہ کہیں کہ نہیں صاحب! کچھ یوں کر لیجیے۔

دھونا یا مسح کرنا ایک محسوس چیز ہے' کوئی فرقہ بھی یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں قرآن کریم کے خلاف عقائد رکھتا ہوں۔ قرآن کریم سے کم از کم بہتر قسم کے عقائد مل جاتے ہیں' پھر ان کو یہ متضاد عقائد کیوں مل جاتے ہیں؟ یہ پہلے سے اپنے عقائد اور نظریات کو ذہن میں' محکم طور پر رکھ کر' قرآن کریم کی طرف آتے ہیں' پھر وہ عقائد جس طرح سے ملتے ہیں' یہ ان سے پوچھیے۔ وہ قرآن کریم کو ان عقائد و تصورات کے تابع لاتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ بعض اوقات مضحکہ خیز صورت ہو جاتی ہے لیکن انسان کا عقیدہ ہے' وہ اسی کے اوپر جھومتے ہیں۔ قطعاً نہیں سمجھ میں آسکے گا' عزیزانِ من! یہ سن رکھیے! نہ قرآن کریم سمجھ میں آئے گا' نہ آپ کے ہاں کوئی اسلامی نظام قائم ہوگا' جب تک آپ

قرآن کریم کی طرف ان تمام تصورات کو الگ کر کے نہیں آئیں گے۔ یہ قرآن کریم کی اولین شرط ہے۔ اِنَّـهٗ (56:77) ان اجرامِ فلکی کو شہادت میں پیش کر رہا ہوں کہ یہ قرآنِ کریم ہے؛ لوحِ محفوظ میں ہے اور لَا یَـمَسُّـهٗۤ اِلَّا الْـمُطَهَّرُوْنَ (56:79) یہ پھر اقبالؒ کے الفاظ ان کی سمجھ میں نہیں آ سکے گا' جو مطلب ہفتاد و دو ملت بھی کھو گئے:

کھویا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملت میں

اقبالؒ کا پیغام فرقوں کے نام: ادراک کا بے رنگ ہونا ہے

اب دیکھیے! کہ اسی طرح فرقہ بندی کو کیسے وہ مطلب ہفتاد و دو ملت ❶ کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ

کھویا گیا جو مطلب ہفتا دو دو ملت میں
سمجھے گا نہ تُو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک

(اقبالؒ: بالِ جبریل)

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ (2:138) ایک ہی رنگ ہے جو خدا کا رنگ ہے۔ وہ رنگ اس وقت چڑھے گا جب پہلے دماغ رنگین نہیں ہوگا۔ پہلے رنگ کے اوپر دوسرا رنگ نہیں آئیگا۔ پہلے اس کو دھونا پڑے گا: ''سمجھے گا نہ تُو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک''۔ دوسری جگہ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیے!

فرقہ واریت کے وہ بت جنہوں نے ذہنی طور پر ملت کو صدیوں سے انتشار میں مبتلا کر رکھا ہے

عزیزانِ من! جب تک اپنے قلب اور دماغ کے قبلہ سے' کعبے سے ''لا الہ'' کے لیے ان بتوں کو نہیں نکالیں گے' اس وقت تک آپ حریم کعبہ میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ نبی اکرم ﷺ نے' مجھے تاریخ بتاتی ہے' کعبے میں اس وقت قدم رکھا تھا' جب پہلے سے اس کے اندر بسے ہوئے بتوں کو نکال باہر نہیں کیا تھا۔ وہ تو محسوس بت تھے' پتہ چل گیا تھا کہ رکھے ہیں اور باہر ہیں۔ یہ بت تو دماغوں کے اندر چمٹے ہوئے ہیں اور پھر وہ بت تو اصنام کہلاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک جگہ جمع ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے لیے عربی زبان میں لفظ ہی صنم ہے۔ یہاں تو کیفیت یہ ہے کہ

رہ مدہ در کعبہ اے پیرِ حرم اقبال را ❷

کعبے کے حرم میں اقبال کو نہ جانے دینا' اس لیے کہ

ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر ❸

---

❶ ہفتاد و دو ملت: اسلام کے بہتر فرقے۔

❷ اے حرم کے پیر! اقبال کو کعبہ میں داخل نہ ہونے دے۔

❸ وہ تو ہر گھڑی اپنی آستین میں ایک نیا بت رکھتا ہے۔

یہ تو اپنی آستیں میں خداؤں کو چھپائے ہوئے ہے اور ہر لمحہ ایک نیا خدا ہوتا ہے۔

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر ❶

میری فکر ہر وقت' ہر آن' ایک نیا خدا تراشتی ہے۔

رَست از یک بند تا افتاد در بندے دگر ❷

ایک خدا کی زنجیر سے چھٹکارا ہوتا ہے تو بندہ دوسرے کی زنجیر میں پھنس جاتا ہے۔ جب انسان کے قلب ونگاہ کی صورت یہ ہو کہ ہر دم ایک نیا خدا ہے تو پھر قرآن کریم کیسے سمجھ میں آ سکتا ہے۔

مختلف فرقوں کے مختلف عقائد تو معیوب ترین متاع تصور کیے جاتے ہیں اور ہمارے تراجم!!

عزیزانِ من! یہ حضرات کہتے ہیں کہ جی! دین بڑا آسان ہے۔ کہا کہ جی! کیسے؟ **لَا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الۡمُطَھَّرُوۡنَ** (56:79) بات تو یہ عقیدے کی ہے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ یہ کوئی آسان بات نہیں ہے۔ انسان کا عقیدہ عزیز تریں متاع ہوتا ہے۔ انسان جان دیدیتا ہے مگر عقیدہ نہیں چھوڑتا۔ یہ اس قدر دل کی گہرائیوں میں اترا ہوا ہوتا ہے؟ قرآن کریم نے بنی اسرائیل کے متعلق کہا ہے کہ تم نے ایک جو گئوسالہ تھا اس کو معبود بنا رکھا تھا ٹھیک ہے' اس کو پھینک بھی دیا لیکن ان کے تو دل کی گہرائیوں میں اس کی عقیدت اتری ہوئی ہے۔ اس کو وہاں سے کیسے نکالو گے' یہ بڑا مشکل مرحلہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ **لَا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الۡمُطَھَّرُوۡنَ** (56:79)۔ کہا کہ اس مطہر کے معنی یہ ہیں کہ انسان' معاف رکھیے گا' اگر حالتِ جنابت وغیرہ میں ہے' کم از کم وہ وضو کرے تو قرآن کریم کے اس حکم کی تکمیل ہوگئی۔ بس یہ وضو کر کے قرآن کریم کی طرف آ جائے تو پھر اس کو مس کرے' اس کو چھوئے۔ یہ بڑا آسان ہو گیا۔ اپنے عقائد' اپنے نظریات' اپنے مسالک' اپنی جگہ پہ قائم رکھو۔ وضو کر کے قرآن کریم کو چھو لو' اسے پڑھ لیجیے' خدا کے حکم کی تکمیل ہوگئی جناب! پھر بہتر قسم کا قرآن سمجھے' پھر عملاً دنیا کو یہ بتایا کہ اس میں اتنا تضاد ہے۔ قرآن کریم کا دعویٰ منجانب اللہ ہونے کا یہ ہے کہ یہ اگر خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو **لَوَجَدُوۡا فِیۡہِ اخۡتِلَافًا کَثِیۡرًا** (4:82) بڑے فخر سے کہا گیا ہے کہ جناب! دیوبند سے یہ چیز آئی تھی' غالباً مولانا دریا آبادی نے تفسیر لکھنی شروع کی' وہ

اس سے دارالعلوم دیوبند کے تبصرہ میں یہ چیز جو تبصرہ آیا ہے' اس میں یہ تھا کہ اس وقت تک قرآن کی جو تفسیریں یا ترجمے کیے گئے تھے' وہ عام طور پر شافعی نکتہ نگاہ سے' مالکی نکتہ نگاہ سے کیے گئے تھے' تم پڑھنے پہ مجبور تھے۔ اللہ الحمد کہ اب ایک خالص حنفی نکتہ نگاہ سے قرآن کریم کا

---

❶ ہماری فکر ہر لحظہ ایک نیا آقا تراشتی ہے۔

❷ جب وہ ایک بند (قید) سے نکلتی ہے تو کسی اور بند میں گرفتار ہو جاتی ہے۔

ترجمہ آ گیا ہے۔ یہ قرآن کا حنفی ترجمہ ہے۔ چلے ہیں قرآن کریم سمجھنے' بڑے خوش تھے' قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ جب ان کے سامنے خدائے واحد کا ذکر کرو تو ان کے سینے پہ سانپ لوٹنے لگ جاتا ہے اور جب اس کے سوا کسی اور کا کرو تو **هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ** (9:124) باچھیں کھل جاتی ہیں۔ آ ہاہا! سبحان اللہ حنفی ترجمہ! جناب جی! جشن منا رہے ہیں۔ حنفی ترجمہ' شافعی ترجمہ! قرآن کریم سمجھنے جا رہے ہیں۔ وہ قرآن کریم تو یہ کہتا ہے کہ کیا آپ باوضو ہیں؟ کہ جی باوضو ہیں کیونکہ کہا ہے کہ **لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ** (56:79) نہیں' عزیزانِ من! عشق کا تقاضا توحید یہ ہے۔

با سایہ ترا نمی پسندم
عشق است و ہزار بدگمانی

میں تو تیرے ساتھ تیرا سایہ بھی نہیں دیکھنا چاہتا' عشق کی بدگمانیوں کو تم کیا جانو! توحیدِ خالص والا تو اس کے ساتھ اس کے سایہ کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا **لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ** (56:79) اور یہ قرآن' یہ سب' ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ **تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (56:80) اس رب کی طرف سے ہے جو کسی فرقے کا' کسی گروہ کا' کسی قوم کا' کسی نسل کا' رب نہیں ہے' عالمین رب ہے۔ عالمین کا جو رب ہے' اس کی دی ہوئی کتاب کے اندر' تفرقے کے کیا معنی صاحب! کہ وہ ترجمہ حنفی کا ہو' اور وہ شافعی کا ہو۔ کہا کہ وہ تو عالمین کے لیے قرآن ہے۔ **تَنْزِيْلٌ** (56:80) رفتہ رفتہ نازل ہوا ہوا' بتدریج آیا ہوا' اور پھر یہ جمع ہو گیا۔ یہ ہے قرآن کریم۔ کہا کہ **فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ** (56:75) وہ میں ستاروں کی گردشوں کو شہادت میں پیش کرتا ہوں کہ یہ ہے قرآن **تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (56:80) یہ اس خدا کی طرف سے' بتدریج نازل ہوا ہے جو تمام نوع انسان کا نشو و نما دینے والا ہے۔

لفظ دھنیت کی عملی شکل سے محفوظ رہنے کی تاکید اور نبی اکرمؐ کی سیرت مبارکہ

عزیزانِ من! اور اگلی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ کہہ کر قرآن کریم کے متعلق کہا کہ **اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ** (56:81) اس قسم کی کتاب سے تمہاری کیفیت یہ ہے۔ اس لفظ میں کیا بات آئی ہے صاحب! **مُّدْهِنُوْنَ** (56:81) ''دھنیت'' کہتے

ہیں" "یہ جو دودھ کے اندر چکناہٹ ہوتی ہے یا کوئی بھی چکناہٹ جو ہو وہ ہوتا ہے دھن"۔ کسی فرش کے اوپر کوئی تھوڑا سا دودھ گر گیا ہو اور آپ کو معلوم نہ ہو اس پہ چل کر دیکھیے' وہ جاتا ہے پھسل کے آدمی! یہ جو چکناہٹ ہوتی ہے' اس سے انسان پھسلتا ہے۔ اسی لیے ان عربی زبان والوں نے بات تو یہاں چکناہٹ کی کی ہے' اس کے بعد یہ پھر مداہنت کا لفظ آیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم بھی یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے معنی Compromise کرنا ہوتا ہے' اپنے مقام سے پھسل جانا ہوتا ہے۔ حق کے معنی ہوتے ہیں "جو پہاڑ کی طرح اٹل ہو' کسی طرح بھی اپنے مقام سے اِدھر اُدھر ہٹے نہیں' پھسلے نہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے متعلق بتایا ہے کہ یہ جو مخالفین تھے' ان کے ساتھ اس قدر جھگڑے تھے' اس قدر مخاصمت تھی' تصادمات ہوئے' جنگوں تک کی صورت ہوئی۔ وہ کہتے کیا تھے؟ وہ کہتے یہ تھے کہ ہماری خاطر اس قرآن کریم میں کچھ تھوڑی سی تبدیلی کر دو' پھر ہم تمہارے ساتھ ہو جائیں گے۔ تھوڑا سا Compromise کر لو۔ حضور ﷺ کا جواب ہر بار یہ تھا کہ بابا! یہ میرے بس کی بات نہیں ہے' یہ کتاب میری نہیں ہے جو اس میں' میں یہ کر دوں' وہ تو کسی اور کی کتاب ہے' میں تو صرف پہنچانے والا آیا ہوں۔ او! میں اس میں کچھ نہیں کر سکتا۔ انہوں نے کہا کہ تھوڑی بہت مفاہمت ہی سہی۔ آپ ﷺ نے کہا کہ ایک لفظ کی مفاہمت بھی نہیں ہو سکتی' No Compromise کوئی مفاہمت نہیں' اس میں کوئی نظریہ ضرورت کام نہیں دے سکتا' یہ اٹل ہے اپنے مقام پر پہاڑ کی طرح محکم ہے۔ اسی لیے وہ یہ چیز کہتے تھے۔

حق کی عظمت اور اس کا مقام

کہا ہے کہ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (68:9). میں قرآن کریم سے "مداہنت" کے معنی پیش کر رہا ہوں کہ (اے رسول!) جماعت مخالفین کے اس نمائندے کی (جو مفاہمت کی پیش کش لے کر آیا ہے) یہ حالت ہے کہ یہ بڑا دنی الطبع' پست ذہنیت کا مالک' اور سخت جھوٹا ہے۔ اسی لیے اپنی بات کو سچا ثابت کرنے کے لیے قسموں پر قسمیں کھائے چلا جا رہا ہے۔ اس لیے حضور ﷺ سے کہا کہ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ (68:8) یہ تکذیب کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ تُو تھوڑا سا اپنے مقام سے پھسل جا' ہٹ جا' ہم اپنے مقام سے ہٹ جائیں گے۔ قرآن کریم نے یہ کہا ہے اور میں بھی اپنی مثال میں بیان کیا کرتا ہوں کہ حق تو وہ ہے جو اپنے مقام پہ اٹل ہے۔ جھگڑا یہ ہو رہا ہے کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں' تم غلط کہتے ہو' دو اور دو چھ ہوتے ہیں۔ اب جھگڑا ہو رہا ہے صاحب! کبھی تو آپس میں ہی ہوتا ہے' کبھی وہ ایک مصالحت کرانے والے آ جاتے ہیں کہ بھئی! یہ تو بات غلط ہے کہ تم اپنے اپنے مؤقف پہ اصرار کر رہے ہو' اس طرح سے "دنیا تے موت وی نئیں ملدی ہیگی" (دنیا سے تو موت بھی نہیں ملتی) یہ جھگڑے یوں نہیں نمٹا کرتے' اس میں تو یہ ہے کہ کچھ تم بڑھو' کچھ وہ ہٹیں' اور ایک مقام پہ صلح ہو جائے' تم دو اور دو چار بھی غلط' دو اور دو چھ بھی غلط' دو اور دو پانچ پہ مان

جاؤ۔قرآن کریم کہتا ہے کہ وہ جو چھ کہہ رہا تھا' اس کی تو اس میں بھی جیت ہے' اگر پانچ ہو جو تم چار کہتے تھے' تم تو اسی وقت ہار گئے' او! تم تو سوا چار بھی نہیں کہہ سکتے۔حق پہ جو کھڑا ہوا ہے' وہ اپنے مقام پر محکم ہوتا ہے' یہ ضد نہیں ہوتی' یہ اصول پرستی ہوتی ہے۔ضد وہ ہوتی ہے کہ دونوں ہی اپنے اپنے اس مقام پہ باطل ہوں' اور جم کر کھڑے ہوئے ہوں۔اصول پرستی یہ ہوتی ہے کہ ایک محکم اصول' پہ ہو' جو ہٹ نہ سکے۔اپنے مقام پہ' جو اس طرح کھڑا ہے وہ کسی صورت میں بھی اس سے ذرا سا اِدھر اُدھر نہیں ہٹتا۔حضورؐ نے فرمایا کہ اگر میں ذرا بھی یہ کروں تو میں تو خدا کے عذابِ عظیم سے ڈرتا ہوں۔یہ الحق ہے' یہ محکم ہے' میں کیسے مفاہمت کرلوں۔میں نہیں کرسکتا۔یہ جو شرکت ہے' یہ میانۂ حق و باطل ہے۔ہاں! پھر اقبالؒ یاد آ گیا۔کہا کہ

باطل دُوئی پسند پرست ہے' حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

حق کے ساتھ باطل کی شرکت ہی فرقہ واریت کو جنم دیتی ہے مگر باطل یہ شرکت کرتا ہے

فرقہ بنے گا ہی اس وقت' جب آپ حق اور باطل میں شرکت قبول کریں گے' ورنہ دنیا میں جو شخص کہیں بھی ہو' کسی مقام پہ ہو' کسی قوم کا ہو' کسی نسل کا ہو' جو وہ دو اور دو چار کہتا ہے وہ ایک قوم کے فرد ہوتے ہیں' وہ اپنے ہی گھر کے اندر اگر دو اور دو چار کہنے والا نہیں ہے' تو اس کے ساتھ مشارکت نہیں کرتے' وہ شرکت میانۂ حق و باطل ہو جائے گا۔وہ یہ نہیں کہیں گے۔وہ جو شرکت کرنے والے ہیں یا یہ ہونگے کہ جن کے ہاں حق ہوگا ہی نہیں' پھر آج شرکت میانہ اس کے ساتھ کل اس کے ساتھ کرلے گا' اس کا کوئی اعتبار ہی نہیں' قرآن حکیم میں جو دنیا کو کہا ہے کہ اگر تم اس کو مانو گے جو امین بھی ہے تو تمہیں یہ امن دیدیگا۔

امت مسلمہ کی عملی شکل اور اطمینان قلب کے حصول کا ایک عظیم فارمولہ

عزیزانِ من! آپ سوچیے کہ یہ امن کیا ہے؟ قرآن حمید کی طرف سے تو یہ ایک ضابطۂ قوانین ہے' ہمارا یہی آئین ہے' یہی قوانین کا ضابطہ ہے' یہی مسلک ہے' یہی مذہب ہے۔اسے سمجھ سوچ کر دیکھ لو' عقل و بصیرت کی رو سے پرکھ لو' دیکھ لو اگر تمہارا دل ٹھک جائے' سمجھ میں بات آ جائے کہ یہ صحیح ہے تو اسے تسلیم کرلو۔تسلیم کرنے کے بعد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ جسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کہتے ہیں' وہ اس کے مطابق احکام نافذ کرے گی' جو تم نے سمجھ لیا ہے۔اب یہ تو ہوسکتا ہے کہ صاحب! اس وقت تو جو قوانین تم اس میں دے رہے ہو' وہ تو ہم نے سمجھ لیے وہ ہمارے لیے قابلِ قبول ہیں۔یہ ہوتا ہے۔جو قانون پہلے سے آپ کے لیے قابلِ قبول ہو یا وہ نافذ ہو جائے تو

اس میں آپ کو کوئی اضطراب اور پریشانی نہیں ہوتی۔ وہ تو آپ نے پہلے سے مانا ہوا ہوتا ہے۔ یہ جو امتِ مسلمہ ہے اس نے ان قوانین کو پہلے سے مانا ہوا ہوتا ہے، جبھی وہ اس امت کا فرد بنتا ہے۔ اس کے مطابق اگر قانون بنتے چلے جائیں تو اسے اضطراب ہی نہیں ہوگا۔ کہا ہے کہ لَا رَیۡبَ ۚ فِیۡہِ (2:2)۔ اسے کشمکش ہی نہیں ہوگی' اس قانون کے خلاف اسے کسی قسم کی گرانی نہیں گزرے گی' اس نے یہ پہلے سے تسلیم کیا ہوا ہے لیکن اگر یہ صورت ہو کہ آج ایک قانون ہے' کل کو دوسرا قانون آنا ہے' آپ کو کسی وقت بھی اطمینان نصیب نہیں ہوتا کہ پتہ نہیں صاحب! کل کو کیا قانون نافذ ہو جائے۔ ٹھیک ہے جی! اس وقت تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہی ہے لیکن اس کا کیا اعتبار ہے کہ کل کو اسے الٹ ہی دیا جائے' منسوخ کر دیا جائے' اس کی جگہ کوئی دوسرا لے آئے' اسے کبھی اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا کہ اگر یہ ہو کہ جو Laws (قوانین) آج ہم قابلِ اطمینان سمجھتے ہیں' ان میں جس وقت جی چاہے تبدیلی ہو جائے' آپ کو کبھی اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ یقین ہو کہ جو تم نے آج مانا ہے' ابدالآباد تک اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ کہا ہے کہ لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (10:64)۔ تو اس سے صحیح اطمینان اور امن نصیب ہوتا ہے اور جسے امن نصیب ہوتا ہے' وہ مومن ہوتا ہی ہے' مومن کا تو مادہ ہی امن ہے تو جب بھی آپ کے دل سے اطمینان گیا' مومن ہونا ختم ہو گیا کیونکہ امن نہیں رہا اور امن کی یہی صورت ہے کہ وہ اپنے مقام پہ اٹل ہو۔ لَا تَبۡدِیۡلَ (10:64) ہو کہ نہیں کبھی نہیں بدلا جائے گا' عزیزانِ من! قرآن نے تو اس امن کی یا خدا نے تو اس امن کی گارنٹی اس حد تک دی کہ یہ تو ہو سکتا تھا کہ کوئی کہہ دے کہ ہاں صاحب! اس کے بعد کوئی انسان اس میں تبدیلی نہیں کر سکتا' یہ تو ہو سکتا ہے کہ بعد میں اس کے اندر خدا ہی کوئی تبدیلی کر دے کہ ایسا رسول پھر آ جائے جو اس میں تبدیلی کرے۔ خدا نے کہا کہ ہم نے نبوت کو ختم کر دیا' بابا! نہ کوئی رسول آئے گا' نہ اس کے اندر تبدیلی ہوگی۔ اتنا بڑا امن قیامت تک کے لیے دیدیا۔ اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر! مکمل' غیر متبدل کتاب دیدی' گارنٹی دیدی کہ ہم تبدیلی نہیں کریں گے۔ یہاں تک کہہ دیا کہ بھروسہ رکھو' کوئی آنے والا آ کر بھی تم سے یہ نہیں کہے گا کہ یہ تبدیل ہو گیا ہے۔ کیوں؟ ہوا نا آپ کو اطمینان نصیب' ہوئے نا مومن آپ! اسی لیے کہا کہ اَفَبِھٰذَا الۡحَدِیۡثِ اَنۡتُمۡ مُّدۡھِنُوۡنَ (56:81)۔ او! اس قسم کی کتاب کے متعلق تم کہتے ہو کہ Compromise یا مفاہمت کر لی جائے' یہاں سے کہتے ہو کہ تھوڑا سا پھسل جائے۔

دارالعلوموں کا دس دس سال کا کورس ان طالب علموں کو رزقِ معاش کی خاطر گلی گلی کوچہ کوچہ' مختلف مساجد میں لیے پھرتا ہے

عزیزانِ من! اگلے لفظ ذرا توجہ سے سنیے کہ یہ سارا کچھ تم کیوں چاہتے ہو؟ کیوں ایسا کرنے کا مطالبہ کرتے ہو؟ کیوں یہ روش اختیار کرتے ہو؟ کاہے کے لیے یہ کچھ کرتے ہو؟ کہا کہ وَتَجۡعَلُوۡنَ رِزۡقَکُمۡ (56:82) تم نے اس کو اف وہ! بڑی دکھتی ہوئی رگ کو کڑ چ ❶

کیا ہے۔ یہ سارا دھندہ معاش کا ہے۔ جو تم اپنے فرقے کے ساتھ چمٹے ہوئے ہو' ہے کیا بات جناب! اس محلے کے اندر ایک مسجد' اس مسجد کے اندر فلاں حنفی قسم کے امام۔ وہ امامت کرا رہے ہیں صاحب! دوسرے عقیدے کا انہی کے ہاں کا کوئی آ گیا۔ بریلوی حنفی وہ آ گیا' اب وہ اس مسجد کے اندر تو وہ بیٹھا ہوا ہے' اسی قسم کی نماز پڑھائی جا رہی ہے۔ یہ کیا کرے؟ ان طالب علموں کو تعلیم یہ دی جاتی ہے کہ نو دس سال

---

❶ کاٹ کر رکھ دیا ہے۔

عزیزانِ من! ان دارالعلوموں کے اندر بسر ہو جاتے ہیں۔ اس نو نو دس دس سال کے بعد جب یہ باہر نکلتے ہیں تو یہ تو چھوڑ یئے کہ وہ دین کا ہوتا ہے یا نہیں کیونکہ قرآن حمید تو اس نصاب میں ہے نہیں۔ ایک وقت کی روٹی کمانے کا بھی کسی کو ڈھنگ نہیں آتا۔ یہ میں کوئی طنز و مزاح کی بات نہیں کر رہا۔ زندگی ایک عملی حقیقت ہے۔ کیا کھے گا؟ یہ سانپ کا بچہ تو ہے نہیں جس کے ساتھ وہ گزارا کر لیں گے۔ وہ ایک مسجد تھی' اس میں وہ بیٹھا ہوا' اس کا رزق وہاں لگا ہوا ہو' یہ کیا کرے گا؟ بس یہی فساد!

ہمارے ہاں دارالعلوموں کے علاوہ مکاتب اور مساجد کی تعداد کا ذکر اور قیامِ پاکستان کے وقت کی ایک تجویز

عزیزانِ من! وہاں پھر یہ ان کو کہے گا کہ یہ جو کچھ نماز تمہیں پڑھا رہا ہے' یہ صحیح نہیں ہے' تمہاری نمازیں باطل ہو رہی ہیں' صحیح نماز جو ہے وہ میرا فرقہ پڑھائے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ الگ جماعت ہو اور ضروری ہے کہ الگ مسجد ہو' ضروری ہے کہ الگ امام ہو۔ اب اس کی روٹی اسی صورت میں وہاں لگ سکتی ہے کہ یہ اس مسجد سے الگ مسجد بنائے۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ پاکستان بنا ہے تو اس خطے کے اندر اتنا ہی جو اب پاکستان ہے' کتنی مساجد' کتنے دارالعلوم' کتنے مکاتب تھے۔ یہاں گن کر دیکھو اور آج کتنے ہیں' انہیں بھی ذرا گن کر دیکھو۔ ان کے رہنے کے اتنے گھر نہیں' جتنی یہ مسجدیں' مدرسے بن گئے۔ کیوں؟ ہر سال کم از کم انہی کی گنتی کے مطابق نو دس ہزار طالب علم ان سے نکلتا ہے۔ یہ کوئی کاروبار نہیں جانتے' کوئی دھندہ نہیں جانتے' رزق کمانے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے' اور یہی ایک ذریعہ ہے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد میں نے پہلی بات یہ کہی تھی کہ جتنے ہم لوگ' وہاں سے آئے ہیں جنہیں پناہ گزین کہا کرتے تھے' اتنے ہی ان دارالعلوم کے فارغ التحصیل وہاں سے یورش کر کے ادھر پاکستان میں آئے ہیں' اب یہاں ایسے ایسے وسائل موجود ہیں کہ ان کو دیدیئے جائیں تو ان کو کچھ دقتیں تو ضرور ہوں گی لیکن تھوڑے سے وقت کے بعد یہ محنت مشقت کر کے اپنی اپنی جگہ پاؤں ٹکا لیں گے اور ان کی روٹی کا انتظام ہو جائے گا۔

قیامِ پاکستان کے وقت میں نے کہا تھا کہ ایک گروہ ایسا ہے جس کے لیے قرآنِ حکیم کے علاوہ رزق کا ذریعہ بنانا ممکن نہیں اور وہ ہے یہ علماء حضرات کا گروہ جو یہاں آئے ہیں۔ یہ جتنی مساجد ہیں' ان میں تو پہلے سے آئمہ خطیب موجود ہیں۔ وہ تو اب کسی کو دے نہیں

سکتے۔ ہندوؤں، سکھوں، اور عیسائیوں کی جو پرستش گاہیں ہیں، مندر ہیں، گرجے ہیں، وہ الاٹ کر نہیں سکتے۔ یہ کہاں جائیں گے؟ یہ کیا کریں گے؟ میں نے یہ تجویز دی تھی کہ ان کے لیے باعزت روٹی کا انتظام کیجیے اور آئندہ کے لیے نجی طور پر یہ جو کچھ بن کر نکلتے ہیں، اس کو ختم کر دیجیے، ورنہ آپ کے ہاں مستقل مصیبت رہے گی۔ یہ نہ صرف اقتصادی ہوگی بلکہ سیاسی بھی ہوگی۔ میں نے آکر یہاں یہ چیز کہی تھی۔کون سنتا ہے؟ آج اندازہ لگا لیجیے کہ یہ آپ کے لیے سب سے بڑی پرابلم یہ کس طرح سے ہوا؟ میں نے کہا کہ فرقہ تو بنا ہی اس طرح سے کہ یہ شرکت میانہ حق و باطل ہوئی۔اسے مداخلت فی الدین کہا گیا۔ یہ قرآن حکیم کے اصل مقام سے تھوڑا سا پھسلے گا تو ایک نیا فرقہ بنے گا۔ وہ اِدھر کو پھسلا، یہ اُدھر کو پھسلا۔کہتا ہے کہ مُدۡهِنُوۡنَ o وَتَجۡعَلُوۡنَ رِزۡقَكُمۡ (56:81-82) قرآن کو ذریعہ رزق بنا رہے ہو اور اس میں مداہنت برت کر پھر ان چیزوں کو کر رہے ہو۔ یہ چیز ایمان نہیں ہے۔کہا کہ اَنَّكُمۡ تُكَذِّبُوۡنَ (56:82) زبان سے مان رہے ہو، قرآنِ کریم کو عملاً جھٹلا رہے ہو، قرآن کریم کو ماننے کے مدعی ہو مگر مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

قرآن حکیم نے کسی جگہ بھی فرقہ بندی کی تائید نہیں کی

عزیزانِ من! قرآن حکیم کی اس سے بڑی کوئی تکذیب نہیں کہ وہ فرقے کو شرک نہیں قرار دیتا ہے، آپ کہتے ہیں کہ ہر فرقہ قرآن کریم کے مطابق ہے۔اس سے بڑی تکذیب اور کیا ہو سکتی ہے اور کہتے ہو کہ قرآن حکیم اس کی بھی تائید کرتا ہے، اس کی بھی تائید کرتا ہے، اس کو بھی دلائل دیتا ہے، اُس کو بھی دلائل دیتا ہے، ان کو نچا رہا ہے تو کہنے لگے کہ یہ قرآن کریم ہے۔کہا کہ یہ قرآن حکیم کی تکذیب ہے جو تم کر رہے ہو۔ستاروں کی دنیا میں تم یہ تکذیب نہیں پاؤ گے۔قسم ہے مجھے ان ستاروں کے آسمان کی! اس میں یہ تکذیب نہیں ہے اس لیے کہ وہاں مداہنت نہیں ہے، وہاں فرقے نہیں ہیں، انہوں نے اس کو ذریعہ معاش نہیں بنانا۔اَنَّكُمۡ تُكَذِّبُوۡنَ (56:82)۔درس میں آیتیں تو چند ہی آئی ہیں لیکن بہر حال وقت ہو گیا۔اب کہنے کی اگلی بات یہ تھی کہ صاحب! نہیں، یہ غلط ہے۔ہم کسی قانون کے تابع نہیں رہنا چاہتے، ہم اپنا قانون آپ بنائیں گے۔عملاً وہ یہی کہتے ہیں کہ ہم خدا کے قانون کے تابع نہیں ہیں، نہیں رہنا چاہتے۔زبانی کہتے ہیں، عملاً نہیں رہتے۔کہتے ہیں کہ یہ صورت ہے۔قرآن حکیم کہتا ہے کہ اوہ! جو تم یہ دعویٰ کر رہے ہو کہ ہم کسی خدا کے قانون کے تابع نہیں رہ رہے، ہم نہیں مانتے۔کہا کہ ادھر آؤ، ہم تمہیں بتائیں کہ مانتے ہو یا نہیں مانتے۔اور یہ اگلی آیات میں بتائے گا، وہ بڑی عجیب چیز ہے۔اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

چھٹا باب: **سورۃ الواقعۃ** (آیات 84 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من ! اپریل 1983ء کی پہلی تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الواقعۃ کی آیت 83 سے ہو رہا ہے (56:83)۔

مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں انسان کی دوہری سوچ اور قرآنِ حکیم کا بیان

سابقہ جمعہ کو خصوصی درس تھا اس لیے تجدیدِ یادداشت کے لیے یہ عرض کردوں کہ سلسلہ کلام یوں چلا آ رہا تھا اور ویسے تو قرآنِ کریم کا بنیادی نکتہ اور بنیادی تعلیم مکافاتِ عمل ہے۔ وہ زور ہی اس پر دیتا ہے کہ انسان کا ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے اور وہ نتیجہ انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ یہ تو اس کے اختیار میں ہے کہ جونسا راستہ جی چاہے' اختیار کرلے' یہ اس کے اختیار میں نہیں ہے کہ راستہ غلط اختیار کرے اور صحیح منزل پر پہنچ جائے۔ ہر راستے کی منزل متعین ہے۔ یہ اس کے اختیار کی بات ہے کہ کونسا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اب جو انسان اور انسان میں فرق پڑتا ہے وہ یہی ہے کہ کچھ انسان ہیں' وہ یہ کہتے ہیں کہ نہیں' مکافاتِ عمل کوئی شے نہیں ہے' انسان خود ہی اپنے لیے ایک راستہ تجویز کرے اور خود ہی اپنے لیے منزل تجویز کرے اور اس کے بعد کوئی غلطی ہو جائے تو اس کی تصحیح کرے' کوئی قوانین ایسے نہیں ہیں جو غیر

متبدل ہوں' جس سے متعین طور پر معلوم ہو جائے کہ یہ منزل یہ جا پہنچا۔ جیسے قرآن کریم کہتا ہے کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی' یہ قانون ہے قرآن کریم کی رو سے یہ ایک اصول ہے' جو غیر متبدل ہے۔ ایک نکتہ نگاہ تو یہ ہے کہ اس چیز پر یقین ہو کہ واقعی یہ قوانینِ خداوندی غیر متبدل ہیں۔ اب دوسرا یہ ہے کہ نہیں' جو جی میں آئے کرتے جاؤ۔ اس کے لیے اگر آپ تدبیر کر لیتے ہیں' مختلف خدشات اور خطرات کے راستے بند کر دیتے ہیں' تو پھر راوی عیش لکھتا ہے' کوئی گرفت نہیں' کوئی مواخذہ نہیں' کوئی اور غلط نتیجہ نہیں۔ اصل میں قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہی ہے' اسی کے مطابق بات چلی آ رہی تھی کہ تم جو یہ ذرائع پیداوار کو جنہیں ہم نے مخلوق کی پرورش کے لیے بنایا ہے' خدا کی طرف سے یہ پیدا بھی کیے گئے ہیں' خدا کی طرف سے تمہیں مفت ملے ہیں' اور یہ ایک مخلوق بلکہ ہر ذی نفس کی پرورش کا ذریعہ معاش ہیں' انہیں تم اپنی ملکیت تصور کر لیتے ہو اور اس کے بعد حاجت مندوں کو اس سے محروم کر دیتے ہو' یہ غلط راستہ ہے جو تم اختیار کرتے ہو' اس کا نتیجہ تباہی ہوگا اور وہ اس کے بعد یہ کہتے ہیں کہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ کوئی خارج سے قوت ہے جو یہ کہتی ہے کہ اس کا نتیجہ تباہی ہوگا' اگر ہم تباہی آنے والے اسباب وذرائع اور راستوں کو روک لیں اور وہاں ایسے انتظامات کر لیں کہ وہ تباہی نہ آئے تو پھر کوئی تباہی نہیں آ سکتی۔ بات اتنی ہی ہے کہ کیا واقعی انسان کے اوپر کوئی قوانین ہیں۔ جس سے شر کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے اور خیر کا نتیجہ بھلائی ہوتا ہے۔ ایسے قوانین ہیں یا نہیں' یہ ہے ساری بحث جس پہ قرآن حمید کی تعلیم چلی آ رہی ہے۔ اسی سلسلے میں وہ یہ کہتا چلا آ رہا تھا کہ قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ یہ ہے جسے عام اصطلاح میں جنت کی خوشگواریاں کہا جاتا ہے' اس کی خلاف ورزی کرنے کا نتیجہ وہ تباہیاں ہیں' جنہیں جہنم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں چلی آ رہی تھیں۔

قرآن حکیم کا انداز بیان اور مکافاتِ عمل کے لیے موت کی مثال

عزیزانِ من! قرآن کریم کا انداز یہ ہے اور یہی طریق ہو سکتا ہے کہ یہ جتنے بھی Abstract (بسیط) قوانین یا اصول ہیں' محسوس نہیں ہیں' وہ انہیں دلائل سے تو سمجھاتا ہے لیکن وہ اس سطح پر جہاں لوگ دلائل سے زیادہ محسوسات سے علم حاصل کرتے ہیں' محسوسات کے ذریعے سے اچھی طرح سے بات سمجھتے ہیں' تو وہ محسوسات کے ذریعے سے بھی سمجھاتا ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ وہ عمل اور نتیجے کو سمجھانے کے لیے عام طور پر کھیتی کی مثال دیتا ہے' دانے کی مثال دیتا ہے اور دانے میں سے جو فصل پیدا ہوتی ہے اس کی مثال دیتا ہے' تو وہ کہتا ہوا چلا آ رہا ہے اور اس نے یہ بتانا ہے کہ خود اس کو جانتے ہو' دیکھتے ہو کہ ایسے قوانین ہیں' جن کے ہاتھوں تم مجبور ہوتے ہو' تم کسی طرح سے ان کو دور نہیں کر سکتے' ان کے نتائج آ کر رہتے ہیں۔ اب اس کے لیے وہ محسوس مثال دیتا ہے اور محسوس مثال ایسی دیتا ہے کہ جس سے کسی کو نہ انکار کی مجال ہے نہ انحراف ہے' کہتا ہے کہ فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ o وَاَنْـتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ o وَنَحْنُ اَقْرَبُ

اِلَیۡهِ مِنۡكُمۡ وَلٰكِنۡ لَّا تُبۡصِرُوۡنَ o فَلَوۡلَاۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ غَيۡرَ مَدِيۡنِيۡنَ o تَرۡجِعُوۡنَهَاۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ (56:83-87)۔ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ کوئی ایسے خارجی قوانین نہیں ہیں جن کے تابع زندگی بسر کرنے پہ ہم مجبور ہیں تو کہا کہ ذرا یہ فرمائیے کہ مریض جب آخری سانس لے رہا ہوتا ہے' جسے کہتے ہیں جان اس کے حلق میں آ کر اٹک گئی ہوئی ہوتی ہے' اور اس وقت تم کبھی نہایت یاس اور ناامیدی سے مریض کی طرف دیکھتے ہو' کبھی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہو' تمہارا کچھ بس نہیں چلتا' اس وقت ہمارا قانون اس مریض کے تم سے زیادہ نزدیک ہوتا ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ کوئی ایسا قانون نہیں ہے' جس پہ تمہارا اختیار نہیں' تم ہی صاحبِ اختیار ہو' تو پھر تمہیں اسے مرنے سے بچا کیوں نہیں لیا کرتے یعنی یہ ایک ایسی مثال ہے جو ہر جگہ وارد ہوتی ہے' ہر ایک کو اس کا تجربہ ہوتا ہے' ہر شخص اسے دیکھ سکتا ہے' اور وہ اپنی بے بسی کا اعتراف کرتا ہے۔ اس مریض کو بچانے کے لیے انتہائی کوشش اور محنت کی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود مریض بچتا نہیں ہے' موت آ جاتی ہے۔ کہا کہ یہ جو ایک قانون ہے کہ وہ موت آ جاتی ہے' اسے تم اپنی ہزار کوششوں' ہزار خواہشوں کے باوجود ٹال نہیں سکتے تو تمہاری بے بسی ہے۔ اس میں جو بھی وہ قوانین ہیں' وہ اپنا نتیجہ برآمد کر رہے ہیں۔ تو اگر تم یہ کہتے ہو کہ نہیں' کوئی ایسا خارجی قانون نہیں ہے جس پہ ہمیں اختیار نہ ہو تو تم اسے پھر موت سے بچا کیوں نہیں لیتے؟ کہا کہ یہ مثال ہم نے تمہیں یہ سمجھانے کے لیے دی ہے کہ یہاں ہمارے قوانین کارفرما ہیں' ان کے مطابق نتائج نکلتے ہیں۔

خارجی کائنات کی طرح انسانیت کی دنیا کے لیے غیر متبدل اصول کا ذکر

یہ محسوس دنیا کی مثال محسوس زندگی کی مثال ہے اور اسی قسم کی مثال آپ سمجھ لیجیے کہ جسے آپ انسانیت کی دنیا کہتے ہیں' جسے اخلاق کی دنیا کہتے ہیں' جسے عدل و انصاف کی دنیا کہتے ہیں' وہاں بھی اسی قسم کے قوانین ہیں اور اسی طرح سے ان کا نتیجہ نکلتا ہے۔ ظلم اور استبداد کا نتیجہ یقیناً تباہی اور بربادی ہے۔ اس وقت تم نہیں مانتے لیکن جب وہ ہے تباہی اور بربادی آتی تو اس وقت تم اسے روک نہیں سکتے۔ یہ اتنی سی بات ہم تمہیں کہتے ہیں کہ اس کے آنے سے پہلے اس کا اہتمام کر لو کہ وہ تباہی نہ آئے اور وہ اسی طرح سے ہے جیسا کہ بات اس نے یہ شروع کی تھی کہ فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الۡعَظِيۡمِ (56:96)۔ چھوٹے چھوٹے سے پیمانے کے اوپر تو تم اپنے گھر بار کا' بال بچوں کی ربوبیت کا' پرورش کا' انتظام کرتے ہو اور خدا کا نظام یہ ہے کہ عالمگیر ربوبیت ہونی چاہیے دنیا میں کوئی بھی نفس اور کوئی انسان بھوکا نہیں رہنا چاہیے تو اس کے تابع وہ مثالیں دیتا ہوا چلا آ رہا تھا اور یہاں کہا کہ جس طرح یہ ہمارا قانون ہے کہ جب مرض شدت اختیار کر جائے تو پھر موت لازمی آ جاتی ہے' اسی طرح سے ہمارا یہ بھی قانون ہے کہ جب سلب اور نہب اور استحصال (Exploitation) شدت اختیار کر جائیں تو پھر معاشرے پر تباہی آ جاتی ہے۔

اسلامی نظام کی عملی تشکیل کی خاطر کوشاں رہنے والوں کا ذکرِ خیر

عزیزانِ من! اس وقت وہ لوگ آتے ہیں' جنہیں اب پھر قرآن کریم نے دو گروہ گنائے تھے۔ پہلی آیات میں ایک تو وہ Pioneers کا تھا کہ جب اس نظام کے لیے دعوت دی جائے' ابتداء کی جائے۔ اس طرح اس ٹیم میں سب سے جو پہلے لوگ آتے ہیں' ان کے لیے ایثار اور قربانیاں' محنت اور کاوشیں ہوتی ہیں' نتائج بہت دور' بعد میں جا کر برآمد ہوتے ہیں وہ ان نتائج سے متمتع نہیں ہوتے' ثمر بار نہیں ہوتے۔ ان کے حصے میں محنت ہی محنت ہوتی ہے۔ کسان بھی جو پہلے آ کر ہل چلاتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ وہ کھیتی کے بار آور ہونے سے پہلے ہی مر جائے تو ہل تو اس نے محنت کر کے چلایا ہے' فصل کوئی لے کر جائے۔ یہ جو نظامِ ربوبیت کی مثال کا اس نے قرآن کریم میں کہا ہے یا اسے اسلامی نظام کہہ لیجیے تو اس کی ابتداء کرنے والے جو بانی ہیں' جو السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ(9:100) ہیں' وہ جنہیں میں بنیاد کی اینٹیں کہہ کر پکارا کرتا ہوں' وہ جن کی کیفیت یہ ہے کہ عمارت کا سارا بوجھ ان کے سر پہ ہوتا ہے کوئی انہیں دیکھ بھی نہیں سکتا کہ وہ اینٹیں کہاں ہیں اور نہ ہی کبھی انہوں نے ایسا تقاضا کیا ہے کہ ہمیں بھی اوپر کے دیکھ لینے دیجیے کہ یہ عمارت کیسے بنی ہوئی ہے' ان کے حصے میں بوجھ ہی بوجھ آتا ہے لیکن وہی بوجھ ہے کہ جو اس ساری عمارت کو اٹھائے ہوئے ہوتا ہے اس لیے اس نے السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ (56:10) کہا ہے۔

قرآن مجید نے نظام حیات کے ارتقائی مراحل کے مقربوں کے لیے السابقون اصحاب الیمین کے درجات حاصل کرنے والے کہا ہے

قرآن مجید نے انہیں الْمُقَرَّبُوْنَ (56:88) کہہ کر پکارا ہے کہ محنت اور مشقت ان کے حصے میں آتی ہے' اس کا پھل اور ثمر بعد میں آنے والے اٹھاتے ہیں۔ تو پہلا درجہ جو ہے وہ مقربین کا ہے' اس کے بعد جب اس کی کامیابی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں' پودا ذرا اونچا ہوتا نظر آتا ہے کہ اس میں پھل لگ جائیں گے تو یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا(110:2) پھر تو اس نظام کی طرف لوگ فوج درفوج آ جاتے ہیں۔ یہ آنے والے بھی صاحبِ برکت اور صاحبِ یمن ہوتے ہیں۔ اس کو وہ . اَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ (56:90) کہہ کر پکارتا' ہے جن کے حصے میں علم وسعادت آتی ہے لیکن بہرحال مدارج کے اعتبار سے یہ جو وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ(56:10) ہیں' یہ لوگ ان کے بعد آتے ہیں یہ لوگ لیکن اس نے یہ کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے مدارج کے اعتبار سے تو بعد میں آتے ہیں لیکن اس نظام کی خوشگواریوں میں ان کا بھی اتنا ہی حصہ ہوتا ہے بلکہ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ(56:10) سے حصہ ان کا زیادہ ہوتا ہے' گو کہ انہیں محنت کم کرنی پڑتی ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک اخروی جنت اور جہنم کی کیفیات کے علاوہ جنت ارضی کے لیے قرآنی نظام حیات کا ذکر

کہا کہ فَاَمَّآ اِنۡ کَانَ مِنَ الۡمُقَرَّبِیۡنَ o فَرَوۡحٌ وَّرَیۡحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِیۡمٍ ❶ (56:88-89)وہی اس سے پیشتر جنت کی

---

❶ اگر یہ مرنے والا' اپنے اعمال کے لحاظ سے خدا کے ہاں بلند مراتب کا مستحق ہوتا ہے تو اس کے لیے ہر طرح کی آسائش وراحت اور آسودگی وخوش حالی کی زندگی ہوتی ہے(56:10-11)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص1273)

تفصیلات قرآن کریم دیتا چلا آ رہا تھا اور اسے ہر وقت ملحوظ خاطر رکھیے کہ صحیح نظامِ زندگی کی جنت یہاں سے ہی شروع ہو جاتی ہے جس طرح غلط نظام کا جہنم یہاں شروع ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ وہ صحیح نظام کی جنت کی خوشگواریاں اور وہاں کی نسیمِ سحری کی ہوائیں' ہمارے نصیب میں نہیں' وہ ہم نے نہیں دیکھیں۔ جہنم کے لپٹ اور شعلے تو ہمیں پتہ ہے کیسے ہوتے ہیں۔ غلط نظام کے اندر رہنے سے زندگی کس قدر ذلیل میں گزرتی ہے' اجیرن ہوتی ہے' اس کا تو ہمیں علم ہے۔ تو قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ اس جہنم کو تو جنت میں بدل سکتے ہو۔ وَالسّٰبِقُوۡنَ السّٰبِقُوۡنَ (56:10) پہلے ہے' جو محنت ہی محنت کریں گے' پھر بعد میں آنے والے اس سے ثمر بار ہونگے۔ کہا کہ فَسَلٰمٌ لَّکَ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡیَمِیۡنِ (56:91). دونوں کے لیے سلامتی ہے' دونوں کے لیے برکات ہیں۔ وَاَمَّآ اِنۡ کَانَ مِنَ الۡمُکَذِّبِیۡنَ الضَّآلِّیۡنَ o فَنُزُلٌ مِّنۡ حَمِیۡمٍ (56:92-94). اس کے برعکس وہ لوگ جنہیں ہم کہتے رہے کہ اس کا نتیجہ تباہی ہے' وہ کہتے رہے کہ تم جھوٹ کہتے ہو' ایسا نہیں ہو سکتا' ہم نے پورے پورے انتظامات کر رکھے ہیں کہ تباہی نہ آنے پائے۔ آگے کہا ہے کہ وہ تو وہاں ان مقامات سے آیا کرتی ہے کہ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَشۡعُرُوۡنَ (16:45). جو تمہارے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتے' وہ ان راستوں سے تباہی آیا کرتی ہے لیکن بہرحال وہ تباہی آتی ہے تو اس کے لیے اس نے یہ کہا۔ وہی مثال کے طور پر ہے کہ کھولتا ہوا پانی کھیتی کو تباہ کر دیتا ہے' کبھی یخ بستہ کہا کہ وہ بھی اس کھیتی کو جلا کر رکھ دیتا ہے۔ اس میں افراط وتفریط ہوتی ہے۔

یاد رکھیے! قرآن کریم میں یہ کہا ہے کہ غربت اور افلاس سے بھی وہ ایک تباہی آتی ہے اور اس کے برعکس افراطِ زر سے بھی ایک تباہی آیا کرتی ہے۔ ایک طبقے کے پاس ضرورت سے کہیں زیادہ دولت جمع ہو جاتی ہے' وہ بھی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ دوسرا طبقہ نانِ شبینہ سے محتاج ہو جاتا ہے۔ یہ بھی تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ تو ان چیزوں کو بھی وہ مثال دے کر سمجھاتا ہے اور جتنے مثال دو وہ Extreme (انتہائی) ہیں' اور یہ تو ایک کسان بتا سکتا ہے کہ جب کھیتی جھلستی ہے تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس کے لیے پانی کی ضرورت لاینفک ہے' اس کے بغیر تو کھیتی پنپ نہیں سکتی لیکن پانی اعتدال پہ ہونا چاہیے' اس کا ٹمپریچر ایک خاص اعتدال پہ ہونا چاہیے۔ اگر وہ گرم پانی ہے جس میں حرارت سے جوش آ رہا ہے' وہ بھی جلا دیتا ہے۔ اگر وہ یخ بستہ ہے' وہ بھی کھیتی کو جلا دیتا ہے تو اس نے کہا یہ ہے کہ جہنم کے متعلق' یا جحیم کے متعلق' جہاں جہاں قرآن کریم میں آتا ہے وہ اس قسم کی مثالیں ہیں جو وہ دیتا ہے۔ وہ سچ مچ کا پانی نہیں انڈیلا جاتا بلکہ یہ مثال دے کر

سمجھا یا جاتا ہے کہ یہ کھیتی پھر برومند نہیں ہو سکتی جس کی کیفیت یہ ہو کہ پانی تو ملے لیکن اس انداز کا ملے کہ کہیں تو وہ حرارت سے گرم جوش ہو اور کہیں وہ یخ بستہ ہو؛ دونوں ہی جلا دیا کرتے ہیں۔ یہ معاشرے کے اندر افراط اور تفریط طبقاتی ہے جو یہ اس کو جہنم بنا دیتی ہے۔ یہاں لفظ **جحیم** ❶ (56:94) کا آیا ہے تو میں نے کہا تھا کہ وادی جہنم ❷ ہے؛ وہ فلسطین کے قریب ایک وادی تھی؛ جس میں ایک بہت بڑا بت کدہ تھا اور اس کے سامنے انسانوں کی قربانی دی جاتی تھی اور ان کو پھر جلایا جاتا تھا۔ اس لیے اس کو جہنم کہتے تھے یعنی وہ مقام جہاں انسانیت کو جلایا جائے؛ اور ذبح کیا جائے جہاں انسانیت ذبح ہوتی ہو وہ جہنم ہے اور جحیم میں نے کہا تھا کہ وہ ہے جہاں بھی کسی قوم کی؛ ارتقائی رفتار رک جائے۔ وہ صحیح ہے۔

لفظ تقلید کا لغوی مفہوم اور قرآنی تعلیم اور پھر ہماری ہزار سالہ تاریخ

عزیزانِ من! یہ رفتار جہاں بھی جامد ہو جائے؛ منجمد ہو جائے؛ ایک مقام پہ رک جائے؛ ٹھہر جائے؛ آگے نہ بڑھ سکے؛ اسے جحیم کہا جاتا ہے۔ ''زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود'' زندگی تو نام ہے اس ندی کے چلتے رہنے کا۔ یہ چلتی رہے گی تو یہ ندی کہلائے گی؛ رک جائے گی تو یہ جوہڑ بن جائے گی اور زیادہ عرصہ رکی رہے گی تو اس میں بساند اور سڑاند پیدا ہو جائے گی۔ یہ جو زندگی کا کسی مقام پر رک جانا ہے یہ ہے جسے جحیم کہا جاتا ہے۔ یہ جہنم کا دوسرا نام کہہ لیجیے۔ اصل میں تباہ ہی وہ قوم ہوتی ہے جو اس زندگی کے مصاف اور راستے میں؛ کسی مقام پہ کھڑی ہو جائے؛ رک جائے۔ رک جانے کے بعد پھر وہ اس رک جانے کو بہت مقدس بنا لیتی ہے؛ اسلاف کی پیروی کرتی ہے؛ جو چلا آ رہا ہے؛ ہمارے ہاں کے مسلک؛ ہم اسی کے پیرا ور ہیں گے؛ کھڑے ہو کر ہم سوچیں گے بھی نہیں کہ وہ صحیح ہے یا غلط ہے؛ قرآن کریم کے مطابق ہے یا نہیں؛ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اب یہ رک گئے۔ اسے بڑے فخر سے تقلید کہا جاتا ہے اور تقلید قلد سے ہے۔ تو اس رسی کو کہتے ہیں جو مویشی کے گلے میں باندھ دی جاتی ہے کہ چل نہ سکے۔ ایسی قومیں چلتی نہیں ہیں؛ زندگی میں ہزار برس؛ جہاں پہلے آپ کی قوم کھڑی تھی؛ وہ وہاں ہی کھڑی ہے؛ دنیا کہیں سے کہیں چلی جاتی ہے اور وہ ان اقوام کے افراد اسی مقام پر کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ جحیم ہے۔

عزیزانِ من! کہا ہے کہ یہ ہے وہ قوم جو ایک مقام پہ رک جاتی ہے؛ آگے نہیں بڑھتی اور پھر وہاں اس کی انسانیت جل جاتی ہے۔ کیا آگے الفاظ ہیں کہ یہ باتیں تو ہم تمثیلی انداز سے سمجھا رہے ہیں لیکن یاد رکھیے! **اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ** (56:95) یہ محض مثالیں نہیں

---

❶ اس کا مادہ ج ح م ہے۔ اَجْحَمَ عَنْهُ وہ اس سے رک گیا۔ اَلجحَّامُ بخیل جو مال و دولت کو روک کر رکھ لیتا ہے (تاج العروس)۔ قرآنِ کریم میں اَلْجَحِيْم؛ جہنم کے لیے آیا ہے۔ اس کے لیے دیکھیے (37:55,64,68 اور 44:47)۔ جحیم انسدانی زندگی کو وہ منزل ہے جس میں وہ آگے بڑھنے سے رک جائے۔ قرآنِ کریم کی رو سے فرد یا قوم؛ جس مقام پر رک جائے؛ وہ جحیم ہے۔ مزید تشریح کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن (جلد اوّل) طلوع اسلام؛ لاہور 1960؛ ص ص۔ 20-419)۔

❷ یہ عبرانی الاصل ہے اور گہنّام سے معرب ہے۔ یہ دو الفاظ کا مرکب ہے: جی؛ جس کے معنی وادی ہیں اور ھنوم۔ ھنوم ایک آدمی کا نام تھا۔ وادی ھنوم یروشلم

کے جنوب میں تھی جس میں زمانہ قدیم میں مولوک (عمونین کے دیوتا) کے حضور آدمیوں کو جلا کر قربانی پیش کی جاتی تھی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد اوّل، طلوع اسلام، لاہور، 1960ء ص ص (455-454)

ہیں جو ہم دے رہیں، تشبیہات اور استعارات نہیں ہیں۔ یہ ایک یقینی Reality (حقیقت) ہے جو ہم بیان کر رہے ہیں۔ یہ اسلوبِ بیان ہے جو ہم مثالوں کے ذریعے تمہیں بات سمجھا رہے ہیں لیکن یاد رکھو! یہ ایک یقینی حقیقت ہے۔ الحق بھی یقینی چیز ہوتا ہے۔ اپنے مقام پہ اٹل ہوتا ہے، اس میں مزید شدت پیدا کرنے کے لیے اس کے ساتھ حـــق الیـــقیـــن کہا ہے صاحب! تو یہ ایک یقینی Reality (حقیقت) ہے جو ہو کر رہے گی، یہ نتائج مرتب ہو کر رہیں گے۔ اسے یاد رکھو! یہ محض مثالیں نہیں ہیں۔ جب یہ بات ہے تو پھر دیکھیے بات کہاں سے شروع کی تھی۔ وہی کہا کہ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (56:96).

نظام ربوبیت کا قیام انسانیت کو منزل تک پہنچنے کے لیے ایک احسن طریق بھی ہے اور انقلابی پروگرام بھی

وہ اسی سورۃ کی 74 آیت ہے، جو وہاں تھی کہ تمہیں پھر یہ چاہیے کہ چھوٹے چھوٹے دائروں کے اندر یہ جو پرورش کا سامان تم اپنے بچوں کے لیے کرتے ہو، یہ سب کچھ عالمگیر انسانیت کے لیے کرو۔ وہاں سے بات چلی تھی اور سورۃ کی آخری آیت میں یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد کہا کہ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (56:96). وہی کہ یہ ہے کرنے کی بات: فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (56:96). اتنا بڑا انقلابی پروگرام ہے جو قرآن حکیم نے دیا ہے کہ اس کا نتیجہ جنتِ نعیم ہوگا۔ اس کے خلاف نظام قائم کرو گے جہاں وسائلِ رزق کی طبقاتی تقسیم ہوگی تو اس کا نتیجہ جہنم ہوگا اور کہا یہ کہ تمہارے لیے کوشش کرنے کی بات یہ ہے کہ تم اس ربوبیتِ خداوندی کو عام کرو، جو عظیم ربوبیتِ خداوندی ہے۔ اس کا نظام قائم کرو۔ اس کے لیے سَبِّحْ سرتوڑ کوشش کرو۔

ہم نے قرآن حکیم کے انقلابی پروگرام کو تسبیح کے دانوں میں پرو رکھا ہے

اب ہمارے ہاں تو جب دین مذہب سے بدلتا ہے تو الفاظ وہی رہتے ہیں، مفہوم بدل جاتا ہے۔ سبح کے معنی ہو گئے ''تسبیح کرو''۔ یہ سارا کچھ کہنے کے بعد اتنا بڑا پروگرام جو اتنی بڑی جدوجہد ہے، جس کے لیے کہا ہے کہ جاں فشانی اور کاوشیں اور کوششوں کی ضرورت ہے، اس کے لیے جانیں دینے کی ضرورت ہے، میدانِ بدر اور حنین کی ضرورت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی جنگِ احد میں خود زخم کھانے کی ضرورت ہے۔ یہ سارا پروگرام ایک طرف، اور اسی سبح کا ترجمہ کہ ''تسبیح کیا کرو تم اپنے رب کی'' قرآن کریم کے حکم کا فریضہ ادا ہو گیا اور باقی جو کچھ ہے کہ صاحب! وہ بھوکے مر رہے ہیں، اس کو وہ ملتا ہے کہ صاحب! وہ تو رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے، جسے چاہے وہ غریب کر دے، جسے چاہے وہ امیر کر دے۔ چلیے! قصہ ختم ہو گیا جناب! وہ سامانِ رزق اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے اور تمہارا کام یہ ہے کہ ''تسبیح کرتے رہا کرو''۔

ہمارا آج کا اسلام صرف دعاؤں تک محدود ہے

عزیزانِ من! معاف رکھیے گا' سوال ذہن میں یہ پیدا ہو رہا تھا کہ یہ کچھ ایسا ہے جیسا اس خدا کا اپنا کام ہے جو ہم سے کرانا چاہتا ہے۔ یہی چیز ہے ہمارے ہاں جتنا پرستش کا تصور ہے' اس میں تو وہ کچھ اس خدا کا کوئی کام ہے جو کیا جاتا ہے' اس کے سامنے جا کر کھڑے ہو کر قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ الحمدللہ' ان کے ترجموں کے مطابق تو بڑا بہت بڑا' تیری شان بڑی' تیری حمد و ستائش ہم کرتے ہیں' ہم تیری پرستش کرتے ہیں' اس کا کچھ کرتے ہیں اور اس کے بدلے میں تُو ہمارا یہ کر دے' تُو ہمارا یہ کر دے یعنی صبح سے شام تک ہر کام جتنا بھی ہے' وہ اللہ میاں کرے گا' تمہارا اللہ یہ دیدے' اللہ یہ کر دے' اللہ وہ کر دے۔ وہ اس کام کے لیے رکھا ہے اور یہ اس کی پرستش کرتے ہیں' عبادت کرتے ہیں' قصیدے پڑھتے ہیں' یعنی یہ تو گویا خدا کے لیے سبح تسبیح کرنا ہے' یہ خدا کا کوئی کام ہے جو کچھ ہم کر رہے ہیں۔ کہا کہ یہ ہے تمہارے ذہن میں۔

عزیزانِ من! قرآن کریم کا معجزانہ انداز دیکھیے! یہ سورۃ الواقعۃ کی آخری آیت ہے کہ تم یہ کرو تو جو ذہن میں خیال پیدا ہوا کہ خدا ہم سے یہ کچھ اپنے لیے کرانا چاہتا ہے تو اگلی سورۃ الحدید شروع ہوئی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

❀......❀......❀

سورة الحديد

پہلا باب: سورۃ الحدید (آیات 1 تا 5)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنی سورتوں میں بھی تسلسل، عالمگیر ربوبیت کے لیے سرتوڑ کوشش کا حکم اور قوتِ نافذہ کی ضرورت

اگلی [1] سورۃ الحدید شروع ہوئی اور اس کی پہلی آیت ہے کہ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ [2] (57:1) اسے تمہاری تسبیح کی کیا ضرورت ہے، کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے تسبیح کرتی ہے۔ اب یہاں یہ جو سبّح کا لفظ آیا ہے، یہ وہی ہے جو پہلے آیا ہے۔ اس کا ترجمہ وہی تھا کہ ہر شے تسبیح کرتی ہے۔ کہا تھا کہ کائنات کی ہر شے تسبیح کرتی ہے۔ کہنے لگے کہ ہاں، وہ سب کرتی ہیں لیکن تم ان کی تسبیح کو دیکھتے نہیں ہو، وہ بہرحال تسبیح ہاتھ میں نہیں رکھتیں۔ ہر شے تسبیح کرتی ہے تم بھی تسبیح کیا کرو۔ یہ سارا نظام، سارا پروگرام اس میں لگا ہوا ہے کہ تسبیح کیا کرو۔ جناب! پھر وہ لاکھ لاکھ دانے کی تسبیح کے ڈھیر لگے ہوئے ہوتے ہیں کہ یہ کرو تم، صاحب! یہ کیسا ربط ہے کہ ایک سورۃ الواقعۃ ختم ہو رہی ہے اور سورۃ الحدید کی ابتدا ہو رہی ہے؟

عزیزانِ من! یہ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّکَ الْعَظِیْمِ [3] (56:96) کا حکم ہو رہا ہے کہ یہ کرو اور یہ کہ یہ ہماری خاطر نہیں ہے۔ ہم تم

---

1. یہ سورۃ پچھلے ہی درس کے تسلسل میں آئی ہے۔
2. کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، سب خدا کے متعین فرمودہ پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص 1275)۔
3. پھر تمہارے لیے اس کے سوا اور کونسی روشِ زندگی ہو سکتی ہے کہ تم اپنے نشوونما دینے والے کے ربوبیت عامہ کے پروگرام کو مشہود طور پر مستحق حمد و ستائش بنانے کے لیے سرگرمِ عمل رہو۔ یعنی اسے اس انداز سے متشکل کرو کہ ساری دنیا پکار اُٹھے کہ فی الواقعہ قابلِ صد ہزار حمد و ستائش ہے وہ ذات جس کا نظام ایسے خوشگوار اور انسانیت ساز نتائج پیدا کرتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص 1274)۔

سے کہتے کہ کچھ ہمارا کام رکا ہوا ہے تم کرو۔ تم کیا؟ یہاں تو یہ ہے کہ **سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (57:1) اس طرف توجہ دلائی کہ خارجی کائنات، جو محسوس پیکر میں تمہارے سامنے آئی ہے، وہ دیکھو تو سہی کہ وہاں لاقانونیت ہے یا کسی قانون کے تابع وہ مصروفِ گردش ہے؟ آپ کو معلوم ہے اب تو ان الفاظ کے معنی آپ کے سامنے مدتوں سے آرہے ہیں۔ پچیس برس سے یہ درس بھی ہو رہا ہے۔ سبح کے معنی ہوتے ہیں کہ ''کسی مقصد کے حصول کے لیے پوری پوری کوشش کر لینا۔'' وہ محسوس طور پر جو سمجھانے کے لیے عربوں کے ہاں استعمال ہوتا تھا وہ گھوڑا تھا جو پورے پاؤں اس طرح سے اُٹھا کر چلتا ہے کہ وہ انتہائی تیز رفتار ہوتی ہے۔ اس کو سبح کہتے ہیں۔ اسی طرح تیرنے والا جب وہ پورا ہاتھ اس طرح سے کر کے تیرتا ہے، اس تیراکی کا نام تسبیح ہوتا ہے۔

تمہیں کہا گیا کہ **رَبِّکَ الْعَظِیْمِ** (56:96) عالمگیر انسانیت کی ربوبیت کا نظام قائم کرنے کے لیے انتہائی کوشش کرو، ہمارے قوانین کے تابع اس نظام کو قائم کرو اور پھر اس کا نتیجہ دیکھو۔ دیکھتے نہیں ہو کہ خارجی کائنات کا نظام کس حسن وخوبی سے چل رہا ہے، ہر شے اپنے اپنے وقت پر، جو بھی قانون اس کے لیے مقرر ہے، اس پہ فرمانبرداری سے سرگرداں پھر رہی ہے اور نتائج کتنے خوشنما نکلتے چلے جا رہے ہیں۔ ہر شے کا نتیجہ اس قانون کے مطابق برآمد ہوتا ہے جو ہم نے مقرر کیا ہے۔ کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ وہ اس قانون کی اطاعت کر رہی ہوتی ہے۔ کائنات کی ہر شے اس پروگرام کی تکمیل کے لیے مصروفِ گردش ہے۔ جو خدا نے اس کے لیے مقرر کیا ہے، تو ایک پروگرام تمہارے لیے بھی مقرر کیا ہے، تم بھی وہ کرو تو اسی انداز سے کرو۔ یہ تمہاری زندگی تمہارا معاشرہ ہو جائے گا جس حسن وخوبی سے یہ خارجی کائنات چل رہی ہے۔ صاحب! اب دیکھ رہے ہیں کہ یہ تسبیح کے معنی کیا ہو گئے اور ایک سورۃ کی آخری آیت اور دوسری سورۃ کی ابتدائی آیت سے ہی وہ لنک (Link) ملتا ہوا چلا گیا ہے۔ کہا ہے کہ **سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ** (57:1) کیا بات ہے صاحب! قانون کی اطاعت کے لیے قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ جو سارا کچھ اس طرح سے چل رہا ہے، اس کے پیچھے خدا کی قوتِ نافذہ ہے جو اس طرح سے چلا رہی ہے۔

خارجی کائنات میں فلکیات کی وسعت کا ادراک کون کرے گا

ہم تو زمین اور سورج کو دیکھ کر ہی محوِ حیرت رہ جاتے ہیں کہ زمین ہے اور اس سے تیرہ لاکھ گناہ بڑا کرہ سورج۔ وہ تو ماہرِ فلکیات سے پوچھیے۔ وہ کہتے ہیں کہ کائنات کے ریگستان میں یہ کرہ سورج تو ذروں سے بھی کم ہے۔ اس کائنات میں، جنہیں تم یہ کرّے کہہ رہے ہو، اس کا سوال ہی نہیں کہ اس کا کوئی احاطہ کر سکے، انہیں کوئی حیطہ تصور میں بھی لا سکے کہ وہ کیا ہیں۔ یہ جسے تم کہکشاں [1] (Galaxy) کہہ کر

---

[1] کہکشاں = گاہ + کشاں۔ گاہ (ف-اسم-مؤنث) کٹی ہوئی سوکھی گھاس۔ کشاں (ک-شاں) (ف) کھینچے ہوئے (یعنی وہ وہ ایسا نشان جیسے کہ کٹی ہوئی سوکھی گھاس کو کھینچے ہوئے لے جانے سے بنتا ہے۔ یہ ہے شاعری میں کہکشاں)۔

پکارتے ہو'اس میں تو میں نے بتایا تھا کہ یہ شاعری ہی ہے اور ہمارے ہاں کے شاعر کہکشاں کے علاوہ اس کا اور کیا نام رکھتے ہیں۔ ریت کے اوپر سے گھاس کا ایک گٹھ کھینچ کر لے جایئے تو جو نشان پیچھے بنتا ہے یہ کہکشاں اس قسم کا نشان ہے: کوئی گھاہ کھچ کے لے گیا' تے پیچھے نشان چھڈ گیا (کوئی گاس کا گٹھ کھینچ کر لے گیا تو اپنے پیچھے یہ نشان چھوڑ گیا)۔ کہکشاں یعنی گھاس کو کھینچتے ہوئے وہ چلے گئے۔ ہم تو یہیں تک پہنچ سکتے تھے۔ شاعری ہے۔ کہکشاں کا ان سر جیمز جینز سے پوچھیے۔ جیمز جینز سے پوچھیے: ان کی کتاب The Mysterious Universe ہی کم از کم پڑھ لیجیے۔ یہ اس کی ایک ابتدائی کتاب ہے۔ آپ وہی پڑھ لیجئے' پوچھیے نہیں کہ وہ کس طرح منہ اُٹھائے آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ شخص کہتا ہے کہ نظمِ کائنات کی کیفیت یہ ہے کہ میں تمہیں سمجھانے کے لیے جب انگلی اٹھاتا ہوں تو کہکشاں کے ستارے تک اس کی حرکت پہنچتی ہے۔ میں نے شاید آپ کو بتایا تھا' ایک چھوٹی سی کتاب تھی: The Great Design[1]۔ یہ کتابیں یہاں تو ملتی نہیں۔ یہاں تو آہستہ آہستہ علم کی ضرورت ہی نہیں رہی' علم مفقود ہوتا چلا جا رہا ہے' علم کی ضرورت نہیں ہے' اس ملک کے اندر کتابیں ہی نہیں ملتیں۔ اب تو یہ بہت آگے چلے گئے۔

دنیا بھر کے ماہرین فلکیات ایک سوال کے جواب میں حیرت زدہ ہیں

میں تو بہت پہلے کی بات کر رہا ہوں' جب یہ کتابیں تھیں تو اس (سر جیمز جینز) نے کیا یہ تھا' بلکہ یہ ایک سوسائٹی[2] تھی۔ خارجی کائنات کے مختلف علوم کی اس دور کے جو ماہرین تھے' وہ چوٹی کے اساتذہ تھے' ان سے کہا تھا کہ ہمیں یہ بتایئے کہ جس شعبے میں تم تحقیق کر رہے ہو' تمہاری تحقیق کس نتیجے پہ پہنچ رہی ہے کہ کیا یہ سارا کچھ جسے ہم یونہی الل ٹپ کہتے ہیں' ہنگامی طور پر ایسے ہی ہو رہا ہے یا By Chance ہو رہا ہے یا اس کے پیچھے کوئی نظم ہے' کوئی آرڈر (Order) ہے' کوئی لاء (Law) ہے' کوئی قانون ہے؟ بتاؤ کہ تم کس نتیجے پہ پہنچے ہو۔ انہوں نے یہ ایک سوال کیا تھا۔ یہ کوئی دس بارہ علوم کے بڑے بڑے اساتذہ تھے جن سے یہ سوال کیا تھا اور انہوں نے ان کے

---

[1] The Great Design: Order and Progress in Nature (1934). (Ed.Frances Mason and Introduction by Sir.J. Arthur Thomson). London: Duckworth.

اس کتاب کے افتتاحیہ کا دوسرا ہی پیراگراف یہ ہے:

The Great Design attempts to show some of natures problems, and law they ar working out--- and that behind nature though we may not understand, we can see evidence of an Infinite Intelligence that holds the worlds in order (p.6)

[2] اس سوسائٹی کا نام تھا Creation by Evolution۔ 1928ء میں اس کے پیش رووں نے...... Creation by Evolution کے انجمن کے توسط سے کس طرح سے اس سوال کے جواب کی وضاحت کی تھی کہ How have things come be as they are?

جوابات اسی طرح سے شائع کر دیئے تھے۔ان میں سے ہر ایک کا جواب یہ تھا کہ ہماری تحقیق جس نتیجے پہ ہمیں پہنچاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس میں کس قدر نظم وضبط ہے کوئی قوت اس انداز سے اس کو اپنے کنٹرول میں لیے ہوئے ہے کہ ہم محوِ حیرت رہ جاتے ہیں۔اب سوال یہ ہے کہ کس کس نے جیمز جینز سے یہ کہا تھا۔

ایک سبز پتے کے اندر دھاریوں کی کیفیت کا بیان

وہ تو کہکشاں یا ان کرّوں کے متعلق یہ بات کہی تھی۔ان علوم کے ماہرین مین ایک مصنف تھا۔یہ درختوں کا 'سبزیوں کا ماہر تھا۔اس نے اپنے مقالے کا ایک Greenly Leaf (سبز پتے) Heading (عنوان) دیا تھا۔وہ اپنے مقالے میں کہتا تھا کہ اس سبز پتے کی دھاریوں کے اندر جو کچھ ناچ رہا ہے میں ساری عمر اس پہ تحقیق کرتا تھک گیا ہوں مگر انتہا نہیں ہو رہی صاحب! کہ یہ ایک سبز پتے کے اندر کیا ہو رہا ہے۔کہا ہے کہ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (57:1)۔یہ کیوں ہو رہا ہے؟ اس لیے کہ اس ساری کائنات کی ہر شے اس پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرداں ہے جو اس کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔

خدا تعالیٰ کی ایک صفت عزیز کا مفہوم

عزیزانِ من! آپ پوچھیے ان سے یہ کیوں ایسا ہو رہا ہے؟ یہ اس لیے ہے کہ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (57:1) وہ صاحبِ غلبہ ہے۔یہ جسے ہم عزیز کہتے ہیں' عزت کہتے ہیں' اس کے معنی اصل میں غلبہ اور استعداد ہوتا ہے۔عزیز ہے صاحبِ غلبہ ہے اور صاحب غلبہ تو ہلاکو چنگیز اور فرعون اور نمرود بھی ہوتے ہیں۔یہاں اس کے ساتھ الحکیم بھی ہے۔یہ اس کا غلبہ دھاندلی کا غلبہ نہیں ہے' یہ حکمت پر مبنی ہے' قانون پر مبنی ہے' وہ ہر چیز کو Rationally کنٹرول کر رہا ہے۔

''خدا یہ کرتا ہے یا خدا یہ کہتا ہے'' کے معنی یہ لینے چاہیں کہ خدا کا قانون یہ ہے

جسے آپ کہتے ہیں غلبہ ہے اور حکمت پر مبنی غلبہ ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے اپنے مفوضہ پروگرام کی تکمیل میں انتہائی سرگرداں ہے اس لیے کہ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (57:2) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں اقتدار اور قدرت اسی کا ہے' کسی اور کو یہ چیز حاصل نہیں ہے۔اقتدار اسی کا ہے' ملک اسی کا ہے' تمہاری زندگی کی انتہا بھی جو ہے وہ ہے کہ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ (57:2) جو تمہاری زندگی اور موت ہے وہ بھی اس کے ہاتھ میں ہے بلکہ یہ اس کے قانون کے ہاتھ میں کہیے۔جب بھی قرآن کریم میں آپ یہ کہیں کہ خدا یہ کرتا ہے' خدا نے یہ کیا' تو اس کا ترجمہ یوں کر لیا کیجیے کہ خدا کے قانون کے مطابق یہ ہوا' خدا کے قانون کے مطابق یہ ہوگا' بات بڑی صاف ہو جائے گی' جونہی آپ نے یہ چیز نکالی اور یہ کہا کہ خدا رزق دیتا ہے' خدا بھوکا مارتا ہے تو وہاں تو پھر بات بہت دور تک جا پہنچتی ہے۔

ہمارے ہاں کے تراجم کی پھیلائی ہوئی غلط سوچ کا نتیجہ

وہاں تو آپ کے ہر خطبے میں اور جمعہ کا ہی خطبہ نہیں ہے وہ آپ کے ہاں تو نکاح کے خطبے میں بھی اور ہر مقام کے اوپر وہ جو خطبے کے پہلے وہ پڑھتے ہیں اس میں یہ ہے کہ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِىْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (39:23) ترجمہ دیکھیے کہ جس کو خدا گمراہ کردے اس کو کوئی راہِ راست پہ نہیں لاسکتا یعنی خدا گمراہ بھی کیا کرتا ہے (معاذ اللہ) سوچیے! بات کہاں جا پہنچتی ہے اور یہ نہیں ہے کہ یہ کوئی گمشدہ اوراق ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ وہ ہے کہ جو ہو رہا ہے۔ اندازہ لگائیے ہر خطبے میں حتیٰ کہ نکاح تک کے خطبے کے اندر بھی یہ الفاظ دہرائے جاتے ہیں۔ کوئی کھڑا ہو کر سوچتا نہیں ہے کہ ہم اس کا کیا ترجمہ کر رہے ہیں: جسے خدا گمراہ کردے اسے کوئی راہِ راست پہ نہیں لاسکتا۔ وہ ٹھیک بات ہے مگر پھر وہ اگلی آیت میں ہے کہ پھر ہم اس کو جہنم میں جھونک دیتے ہیں۔ آپ ہی گمراہ کر دیتا ہے پھر اونوں جہنم اچ سٹ دینداا ے (پھر اسے جہنم میں پھینک دیتا ہے)۔

اوتھے کیہہ پروا اے راقب! اوتھے بے پروائیاں
پھر لیے عملاً والیاں نوں چھڈ دیئے اوگن ہار نوں

(اے راقب! خدا بڑا بے پرواہ ہے۔ اس کی بے پرواہیوں کا عالم یہ ہے کہ وہاں نیکوکار پکڑے جاتے ہیں اور گنہگار چھوٹ جاتے ہیں) کہ اَللّٰهُ الصَّمَدُ (112:2) اور پھر اس کا ترجمہ بے پرواہ ہو گیا اوتھے کی پرواہ اے اوتھے بے پروائیاں (وہاں کیا پرواہ ہے! وہاں تو بے پرواہیاں ہی ہیں) وہ عزیز بھی ہے اور وہ حکیم ہے لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ (57:2) اور اگلی ہی بات ہے کہ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (57:2)۔ ترجمہ ہو گیا کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو چاہے کردے۔ اب آپ کے ہاں یہ سارا تصور ہی نظم وضبط، قانون، قاعدہ اور ضابطہ دریا برد ہو گیا، جیسے کہا کہ وہ ہر چیز پہ قادر ہے، ہر چیز کر سکتا ہے۔ وہ کر سکتا ہے تو ٹھیک ہے پھر نظم وضبط کا ہے۔ جب خدا کا یہ تصور آیا تو کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ کیسے پیدا کیا گیا۔ قرآن کریم کا خدا کا تصور تو قانون دینے والے خدا کا تصور ہے۔ جب آپ کے ہاں ملوکیت آئی اور ان کے ہاں کیفیت یہ ہوئی کہ بادشاہ کا حکم آرڈیننس کے طریقے سے جاری ہوگا، اس میں کسی قاعدے قانون کی ضرورت نہیں ہے صاحب! جب وہاں یہ ہوا تو پھر یہ ہوا کہ صاحب! اس قسم کے واقعات، اس قسم کا اقتدار، ایسی حکومت، کس طرح سے جائز ہو سکتی ہے تو کہا کہ اَلسُّلْطٰنُ الْعَادِلُ ظِلُّ اللّٰهِ عَلَى الْاَرْضِ بادشاہ عادل زمین پر خدا کا سایہ ہے۔ تمہارا خدا اس قسم کا ہے کہ جو جی میں آئے حکم دیدے، جو جی میں آئے کردے، کسی کی کوئی مجال نہیں کہ اس سے سرتابی کرے۔ یہ ایسا خدا ہے کہ جی ہاں، تو جو ایسا خدا ہے اس کا سایہ بھی اسی قسم کا ہے تے جتھے او کچھ کردے نیں تے اے کچھ ایہو کردا پیا اے۔ (جہاں وہ کچھ کرتے ہیں تو یہ

کچھ وہی ہے جو وہ خدا کر رہا ہے)۔

انسانی زندگی کی راہنمائی کے لیے خدا کے صحیح تصور سے آگہی خشتِ اول ہے

عزیزانِ من! میں کیا عرض کروں میرے پاس ابھی ذہن میں کہنے کو بہت کچھ ہے آپ کو جو تاریخ پڑھائے جانے کی ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے قرآن کے یہ تصورات (Concepts) کس طرح سے بدلے۔ آپ نے ایک اتنی سی بات میں دیکھا کہ خدا کو اس قسم کا کیسے بنایا کہ جس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ ہے نہ کوئی قانون ہے۔ سعدی کے الفاظ میں یہ ہے کہ کبھی اس کو سلام کیجیے تو وہ سولی پہ چڑھا دیتا ہے کبھی اس کو گالی دیجیے تو وہ خلعت بخش دیتا ہے۔ ہاں جی! بادشاہ جو ہے جو چاہے کرے۔ ''جو چاہے کرے'' والا خدا کا تصور دیا' اس زمانے میں' جب یہ نیچے آئے یعنی یہ ملوکیت آئی' سلاطین آئے تو کیا جو حکم جی چاہے وہ دے' اسے ماننا ہوگا اور سند اس کی یہ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (57:2) ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک خدا کے تصور کو سمجھنے کے سلسلہ میں مذہبی پیشوائیت اور ملوکیت کا کردار

عزیزانِ من! یہ قرآن عربی مبین میں ہے۔ قدر کے معنی ہی پیمانے مقرر کرنا' اندازے مقرر کرنا ہے' اسی کو تو قانون کہتے ہیں۔ قانون کا تو لفظ ہی قرآن حکیم میں نہیں ہے۔ عربی زبانِ قرآن میں اس کے لیے پیمانے اور ضابطے اور Measurement ہی تھا اور پھر قدیر کا تو جو باب ہے اس کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ وہ پیمانہ کسی ایک وقت کے اندر نہیں بلکہ مستقل طور پر خدا کا انداز یہ ہے کہ وہ ہر شے پیمانے' اندازے اور قانون کے مطابق کرتا ہے۔ قرآن حکیم کی انفرادیت تھی کہ اس نے خدا کا یہ تصور دیا اور اس میں پھر بار بار کہا کرتا ہوں کہ اگر صرف خدا کا صحیح تصور قرآن کریم کی رو سے متعین کر دیا جائے تو سارا اسلام سمجھ میں آ سکتا ہے' سارا نظام سمجھ میں آ جاتا ہے لیکن

ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے!

دماغوں میں بہت خانے مذہبی پیشوائیت نے پیدا کیے اور عملی طور پر ملوکیت ادھر آنے نہیں دیتی کہ یہ کہا جائے کہ ہر چیز قاعدے اور قانون کے مطابق ہونی چاہیے۔ یہاں کہا ہے کہ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (57:2) جو چاہے وہ کرے کیونکہ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (57:2) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں بادشاہت اسی کی ہے اور جو جی چاہے کرے تو گویا اس انداز کا بادشاہ ہوا کہ وہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (52:2) ہے۔ مگر خدا نے ہر بات کے لیے پیمانے اور قانون مقرر کر رکھے ہیں۔ لفظ قدیر کا تو باب بتا رہا ہے کہ یہ مسلسل فعیل کے وزن کے اوپر ہے کہ ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے' ایسا ہوتا چلا جائے گا۔

انسان اور کائنات کے مابین فرق صرف اختیارات کا ہے

عزیزانِ من! یہ ہیں وہ قوانین جن کے اتباع میں کائنات کی ہر شے سرگرمِ عمل ہے۔ کہا کہ جب خارجی کائنات میں اس کے

قوانین یوں عمل پیرا ہیں تو تم اپنی انسانی دنیا کے اندر یہ کیوں نہیں کرتے۔فرق صرف یہی ہے کہ انہیں ہم نے مجبور پیدا کیا ہے' ان کے اپنے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ اس قانون کے مطابق چلیں یا اس کی خلاف ورزی کریں۔انسانی زندگی میں ہم نے تمہیں صاحبِ اختیار کیا ہے کہ چاہے اسکے مطابق چلو' چاہے اسکے خلاف چلو۔یہ ایک چیز صاحبِ اختیار بنا دینا ہے جو ہم نے تمہیں دی تھی۔یہ بڑی شرف اور عزت کا باعث تھی یہ تو خدا نے اپنی ایک عظیم صفت کا شائبہ تھا جو انسان کو دیا ہے۔اس پہ فخر کرنا چاہیے لیکن وہ اس طرح سے Misuse (غلط استعمال) کر رہا ہے۔

غیر متبدل اصولوں سے استفادہ لیے بغیر اطمینان قلب میسر ہو ہی نہیں سکتا

اس کو اسی اختیار و ارادے کے متعلق اس نے یہ کہا ہے کہ یہ انداز ہونا چاہیے اور ہنگامی نہیں ہونا چاہیے۔یہاں قدیر ہے یہ مسلسل پیہم التزاماً انداز ہونا چاہیے کہ ہم نے ہر شے کے لیے جو قانون مقرر کیے ہیں۔اس کے مطابق چلتے رہنا چاہیے اور پھر اس کی ملکیت' اس کا قانون' اس کا نظام' اس کی سلطنت' یہ نہیں کہ وہ آج کہیں سے آ گیا' اس سے پہلے کسی اور کی تھی' کل کو وہ ختم ہو جائے گا' اس کے بعد کسی اور کی آ جائے گی۔اس قسم کی سلطنت' اس قسم کے قوانین ہوں تو ان میں تو انسان کو اطمینان ہی نہیں ہو سکتا کہ پتہ نہیں جی! کل کیا ہو جائے گا۔ یہ سلاطین ''بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں''۔نام ہی بدل گیا ہے۔وہ امریکہ کے صدر کا انتخاب ہونا ہوتا ہے تو دو دو تین تین مہینے پہلے ہی مختلف ممالک اور مختلف سلطنتوں کے اندر کھلبلی شروع ہو جاتی ہے کہ پتہ نہیں جی! کس قسم کا صدر آ جائے۔ارے! تمہیں کیا؟ کہ جی! تمہیں کیا کیا۔کہ ساری دنیا کی سیاست پہ جا کر اس کا اثر پڑتا ہے' بدلنے والی چیزوں میں اطمینان اور امن نہیں ہو سکتا مگر قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ لَا تَبۡدِيۡلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (10:64) یہ قانون بدلے گا نہیں۔اس سے کتنا بڑا اطمینان دلا دیا۔

خدا کی خدائی میں نہ خدا بدلتا ہے اور نہ ہی اس کے متعین کردہ اصول اور نہ ہی ان کے نتائج

پھر کہا کہ جی! آپ کا قانون تو نہیں بدلے گا۔اب اگر آپ ہی نہ رہے تو پھر کہا کہ هُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالۡبَاطِنُ[1] (57:3). آہاہا! یہ نہیں کہ کبھی کسی اور کی بادشاہی تھی اور اب اُس کی آ گئی اور اب اِس کی ہے اور کل کو کسی اور کی ہوگی۔کیا

---

[1] اُس کی ذات' زمان و مکان کی نسبتوں سے ماوراء ہے۔سب سے اوّل بھی وہی ہے اور سب سے آخر بھی وہی۔اس کے لیے نہ ابتداء ہے نہ انتہا۔ وہ ہر شے پر غالب ہے لیکن اس کا غلبہ غیر مرئی اور غیر محسوس طور پر کام کرتا ہے (قانون ہوتا ہی غیر مرئی اور غیر محسوس ہے' لیکن اس کے نتائج محسوس اور مرئی ہوتے ہیں۔یا یوں سمجھو کہ جملہ کائنات' اس کی صفتِ خالقیت و ربوبیت کی مظہر اور اس کی ہستی کی زندہ شہادت ہے' لیکن اس کی ذات' انسانی نگاہوں سے پنہاں اور مستور ہے۔اس اعتبار سے وہ باہمہ بھی ہے اور بے ہمہ بھی (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص ص 1275/1276)

بات اس نے سمجھا دی ہے! پھر یہ بھی نہیں ہے کہ صاحب! یہ ظاہرہ جو کچھ دیکھا جاتا ہے اس کے اوپر تو جو مرئی کائنات ہے جو محسوس دنیا ہے اس کے اندر تو یہ اس کی کارفرمائی اس کے قانون کی یا غلبہ کی ہے لیکن یہ وہ دنیا ہے جو نظر نہیں آتی۔ اخلاق کی دنیا کی مشکل یہی ہے کہ نظر نہیں آتی۔ آدمی جھوٹ بولتا ہے تو اس کی زبان کالی نہیں ہوتی۔ وہ تو بچے کو ہم یونہی ڈرا دیتے ہیں۔ یہ الظاہر نہیں ہے۔ یہ ہوتا تو پھر تو بات ہی کچھ اور ہوتی، پھر یہ انسان کا اختیار کچھ معنی نہ رکھتا، پھر تو مجبوراً یہ سچ بولتا کہ یوں تو دنیا دیکھ لے گی، زبان کالی ہوگئی ہوتی ہے۔ وہ کالی یوں نظر نہیں آتی، اس کا رنگ نہیں بدلتا کچھ اور بدلتا ہے۔

کائنات کا معاملہ ہو یا انسانوں کی دنیا کا، یہاں ہر قسم کا محسوس اور غیر محسوس تغیر خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے

یہ جو کچھ ظاہر ہو جاتا ہے وہ قانون کی مطابقت سے یا خلاف ورزی سے ہوتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ بھی تمہارے سامنے ہے۔ وہ چیزیں جو یوں سامنے نہیں آتیں لیکن اندر ہی اندر کارفرما رہتی ہیں، وہ بھی ساری اس کے قانون کے مطابق ہوتی ہیں، یہاں اول اور آخر آیا ہے هُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالۡبَاطِنُ (57:3) جو چیز محسوس طور پر تمہارے سامنے آتی ہے اس میں بھی اسی کا قانون کارفرما ہے، جو چیزیں یوں سامنے نہیں آتیں لیکن نتیجہ خیز ہوتی ہیں، اس میں بھی اسی کا ہی قانون کارفرما ہے۔ انسان کی جو دنیائے اخلاقیات ہے وہ غیر محسوس ہے، کسی کے جسم کے متعلق جو قوانین ہیں وہ محسوس ہیں۔ یہ وہ الظاہر والی بات ہے لیکن یہ جو چار الفاظ ہیں بلکہ یہ دو الفاظ اَلظَّاهِرُ وَ الۡبَاطِنُ (57:3) ہیں۔

تصوف کی دنیا میں وحدتِ وجود کا غلط تصور اور اس کی تباہ کاریوں کی ایک مثال

وہ جو قرآن حکیم نے کہا ہے کہ یُضِلُّ بِهٖ كَثِيۡرًا وَّ يَهۡدِىۡ بِهٖ كَثِيۡرًا (2:26) اسی قرآن سے بہت صحیح راستے کے اوپر چل نکلتے ہیں اور اسی سے پوچھو نہیں کہ کتنی غلط راہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ ان دو لفظوں نے آپ کے ہاں وہ قیامت برپا کی ہوئی ہے وَالظَّاهِرُ وَالۡبَاطِنُ (57:3) بات دوسری طرف چلی جائے گی۔ وحدتِ وجود پر تصوف کی بنیاد ہے، یہ وحدتِ وجود کیا ہے یہ ہے؟

''جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے''

رام بھی وہی ہے رحیم بھی وہی ہے۔ یہ سب کچھ خدا ہی خدا ہے۔ تُو بھی خدا ہے، میں بھی خدا ہوں، یہ بھی خدا ہے، وہ بھی خدا ہے، سب کچھ خدا ہے۔ ارے! وہ جو سب سے پہلے، جس نے ہمارے ہاں اس کی بنیاد رکھی، بات تو یہ ہندو فلسفہ سے لی ہے، ان کے ہاں یہ ویدانت ہے۔ یہ محی الدین ابنِ عربی جنہیں شیخ اکبر کہتے ہیں، یہ تصوف میں سب سے بڑے ہیں۔ آپ کبھی اُٹھا کے تو پڑھ کے دیکھیے، حیرت ہوتی

ہے کہ یہی نہیں ہے کہ وہ اس کو غلمان مانتے ہیں یعنی بلند ترین درجے کے اوپر۔ وہ مازِ قرآن مغز ابرداشیتم ❶ کہ قرآن کا مغز جس نے اُٹھا لیا ہے۔ کیا کہتا ہے وہ؟ کہتا ہے کہ فرعون کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24) کہے۔ کہ میں رب ہوں اس لیے کہ رب اور فرعون جدا نہیں ہیں۔ یہ ہے وحدتِ وجود کا عقیدہ۔ ایک نظر کبھی فرصت ملے تو دیکھ لیجیے ورنہ میری کتاب ''تصوف کی حقیقت'' دیکھ لیجیے گا یعنی لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ ❷ کا مفہوم بیان کرتے ہیں کہ یہ جو الہ باطل ہے یہ بت جو لوگ مانتے ہیں فلاں کو بھی' عیسیٰ کو بھی' خدا مان لیا اور بڑے بڑے اوثان کو بھی خدا مان لیا اور بت کو بھی لا الہ یہ کوئی الہ نہیں ہے۔ یہ الا اللہ یہ اللہ ہی اللہ ہیں سارے۔ اب ترجمے ملاحظہ فرماؤ کہ جی! یہ سب اللہ ہیں۔ او تہاڑا ستیاناس ہو۔ اور یہ کسی بھگڑ خانے کے چرسیوں کی بات نہیں ہے کہ اس نے سوٹا مارا اور کہا کہ وہ کہے شاہ حسین❸ (فقیر نماناں) کہ ''توں وی مئیں ہیں'' تے اندروی مئیں ہیں' تے باہروی مئیں ہیں' تے میں وی توں ای ایں' تے توں وی تو ہے حسین نماناں نئیں۔

ابن عربی اور علماء کی طرف سے بیان کردہ اور لکھی جانے والی سو سو جلدوں کی تفسیروں کا انداز

اتنے اتنے بڑے یہ ابنِ عربی ہیں اور پھر تصوف کے اندر تو یہ سارے علماء ہیں۔ ان کی سو سو Volumes (جلدوں) کی تفسیروں کی لکھی ہوئی' وہ کتب ہیں۔ ایک نے کہا کہ میں تو بسم اللہ کی سو تفسیریں لکھ سکتا ہوں' دوسرے نے کہا کہ میں ب کے بسم اللہ کے نقطے کی سو تفسیریں لکھ سکتا ہوں' میں نے کہا کہ نقطہ نہ وی ہووے تے تاں وی تو سُو لکھ سکنا ایں۔ اے لکھدے ترے جان' تے تینوں نقطے دی وی کی

---

❶ اصل الفاظ میں یوں ہے:

مازِ قرآں مغز را برداشتیم استخواں پیشِ سگاں انداختیم (رومی)

❷ یہ برہنہ الفاظ میں بیباک شاعری کا اس طرف اشارہ ہے۔

اے پسر لا الہَ الا اللہ ایں ز شرکِ خفی است آئینہ دار
ہست شرکِ جلی رسول اللہؐ خویشتن را ازیں دو شرک برار (معاذ اللہ)

یا اسے یوں کہیے کہ

نہ کوئی آدم نہ کوئی شیطاں
بن گئی کُل کُوڑ کہانی (خواجہ فرید)

(درحقیقت نہ کوئی آدم ہے' نہ شیطان۔ یہ سب افسانے ہیں۔ حقیقت میں سب وہی ہے)۔

❸ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ شاہ حسین (فقیر نماناں) بھنگ' چرس اور شراب پیتا' مادھولال کے عشق میں سرشار ناچتا اور گاتا ہے۔

رانجھن رانجھن مینوں سب کوئی آکھو ہیر نہ آکھو کوئی جس شوہ نوں میں ڈھونڈھ رہی ساں لدھا شوہ سوئی
رانجھا میں وچ' میں رانجھے وچ' ہور خیال نہ کوئی میں نئیں' اوہ آپ ہے' اپنی آپ کرے دلجوئی

لوڑھیگی ۔اے لکھی جا' وحدت الوجود تے ۔ یہ جسے وہ وجود یہ کہتے ہیں یہاں ابتداء تو انہوں نے اس سے کی کہ رسول اور خدا کو ایک بنایا۔

وہی جو مستوئ عرش تھا خدا ہو کر

اتر پڑا وہ مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر (معاذاللہ)

اگرچہ ظاہر میں وہ عرب ہے

مگر حقیقت میں ع۔رب (عین رب) ہے!

انسانوں کے خودساختہ تصورات کی تردید

یہاں اس شعر میں دیکھیں کہ وہ (ممتاز نعت گو) عرب کو عین رب کہہ رہا ہے' ہر جگہ بشکل بتِ عیار [1] بنا دیں۔جس پیکر میں تو آئے' ہم جانتے ہیں تو' ہی ہے حقیقت میں' گھونگٹ لہا او میرے یار! انکھ وکا او میرے یار! یہ کیفیت ہے۔ یہ سارا کچھ قصہ بنیاد ہے یعنی وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (57:3) وہی ظاہر ہے' وہی باطن ہے' سب تُو ہی تُو ہی ہے صاحب! کیا بتائیں صاحب! یہ قرآن حکیم سے تائید لائی جارہی ہے اور میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کریم تو ہمارے ان دلوں کے اندر کے' جو من کے چور ہیں' خدا تو جانتا تھا۔اس کے آگے عجیب بات ہے۔کہا ہے کہ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (57:3) ہم جانتے ہیں' ہم ہر شے میں علم رکھتے ہیں کہ تسی کی کرو گے (کہ تم کیا کرو گے)۔اگلی ہی آیت میں اس کے دو الفاظ خود اس کی تردید کر دیتے ہیں۔وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ (57:4) ذرا سی عربی جاننے والے بھی جانتے ہیں کہ هُوَ مَعَكُمْ (57:4) میں ھو وہ ہے اور کم کا تم ہو' تو اس نے تو خود کہہ دیا کہ ھو وہ ہے اور کم تم ہو۔یہ تم اور وہ ایک نہیں ہو یعنی دو لفظوں میں ساری وحدت الوجود کی جتنی عمارت ہے' اس کو منہدم کر کے رکھ دیا۔جب ھو خدا ہے' کم انسان ہے' تو انسان اور خدا تو دونوں ہی الگ ہو گئے اور وہاں تصوف و ہدایت میں یہ چیز ہے کہ ہر انسان بھی خدا ہے' ہر بت بھی خدا ہے' ہر چیز خدا ہے' قرآن بھی خدا ہے۔زبان جرأت نہیں دیتی ورنہ وہ تو اتنی بیبا کی تک چلے جاتے ہیں کہ در مذہب عاشقاں یک رنگ [2]۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا استغفراللہ اور آگے وہ ابلیس

---

[1] رومی بھی ابن عربی کی طرح وحدۃ الوجود کے قائل ہیں۔اس سلسلہ میں یہ ان کی ایک غزل کی طرف اشارہ ہے:

ہر لحظہ بشکل بتِ عیّار برآمد' دل بردونہاں شد ہر دم بلباس دگر' آں یار برآمد' گہ پیروجواں شد

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خودِ گل کوزہ' خود رند و سبوکش خود برسرِ آں کوزہ خریدار برآمد' بشکست و رواں شد

خودگشت صراحی و مے و ساغر و ساقی' خود بزم نشین شد خوردآں مے و سرمست پیازار برآمد' شورِ دل و جاں شد

[2] یہ الفاظ حدیقہ سنائی میں ایک شعر کے ہیں جسے لکھتے وقت ہزار بار روح تھرتھراتی ہے اور دل کانپتا ہے۔اس لیے دل پر پتھر رکھ کر اور صد بار نقل کفر کفر نباشد کہتے ہوئے یہ شعر لکھ رہا ہوں۔ در مذہبِ عاشقاں یک رنگ ابلیس و ......است یک سنگ

یہاں نبی اکرم کا اسمِ گرامی ہے۔استغفراللہ ثم استغفراللہ۔

ابلس و...... یک سنگ ہم سنگ کیا پوچھتے ہو! اور انہیں مقربین بارگاہِ خداوندی شمار کیا جاتا ہے کہ یہ صحیح اسلام پیش کرنے والے ہیں۔ کیا بتائیں کہ ہمارے ساتھ کیا تماشہ ہوا ہے!

تاریخ کے لیے اس کا حقیقی معیار متعین کرنا ازبس ضروری ہے

عزیزانِ من! تاریخ یہ لکھی جانی چاہیے کہ ہمارے ساتھ کیا تماشہ ہوا۔ یہ نہیں لکھنی چاہیے کہ بنو امیہ کب تک رہے اور بنو عباسی کب تک رہے' لکھنی یہ چاہے کہ اس اسلام کے ساتھ ہوگا کیا' کیا کہا ہے کہ وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ o ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ (57:3-4) دیکھیے! قرآن کریم کس طرح اس باطل عقیدے کی ساتھ کے ساتھ تردید کرتا ہے۔ کہا ہے کہ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ (57:4) وہ جس نے اس سارے سماوات اور ارض کو پیدا کیا ہے۔ وہ تو خالق ہوا تو وہ جو کچھ ہے وہ بھی آپ ہی ہے۔ لیکن ان کا کیا کہنا خود کوزہ' وخود کوزہ گر و خود گل کوزہ کہا۔ وہ خالق کہنے لگے کوئی بات نہیں: آپ مٹی' آپے چک' آپے کمہیار' خود کوزہ' خود کوزہ گر' خود گلِ کوزہ' خود رند و سبوکش پھر اس نے پیالہ بنایا پیالے میں خود ہی شراب ڈالی دینے والا بھی خود بر سرِ آں کوزہ خریدار بر آمد' آپ ہی پھر اس کا خریدار بن کے آیا' جو شکست و رواں سے توڑ کے چلا گیا❶۔ کیا بات ہے پوچھو نہیں! پھر یہ وجد میں آتے ہیں' حضرت صاحب! خود کوزہ و خود کوزہ گر یعنی اس نے جو کہا ہے کہ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ (57:4) وہ تخلیق' وہ عملِ تخلیق Creation and Creator کے لیے' وہ Creator تو الگ ہوگا' اپنی Created سے۔ میں نے کہا کہ اگلے لفظوں میں یہ تو خدا علیم جو اس نے اپنے آپ کو کہا ہے' یہ چیزیں دیکھ کے وجد آ جاتا ہے۔

حقائق کی بجائے لطائف کی آبیاری کا نتیجہ نیز تورات کے پیدا کردہ تصورات

عزیزانِ من! زمانہ نزولِ قرآن میں ابھی ہمارے ہاں یہ عقائد نہیں آئے تھے۔ یہ تو بہت بعد میں آئے ہیں۔ اس نے پہلے سے پیش بندی کر دی ہوئی ہے۔ وہ علیم ہے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ محی الدین ابن عربی کیا کرے گا۔ کہا کہ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (57:4) خالق اور تخلیق تو دو الگ الگ ہوتے ہیں لیکن میں نے کہا کہ یہ ساری شاعری ہے' عزیزانِ من! جو کچھ یہ لوگ پیش کرتے ہیں۔ یہ حقائق نہیں ہیں' لطائف ہیں: خود کوزہ و خود کوزہ گر نہیں یہ دونوں الگ الگ ہیں۔ کہا کہ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ

---

❶ مٹی وی آپ' کمہار وی آپ' چاک وی آپ' پیالہ وی آپ' بنانے والا بھی آپ' پین والا بھی آپ' خریدن والا بھی آپ' توڑن والا بھی آپ' چلے جان والا بھی آپ (خود ہی مٹی' خود ہی کمہار' خود ہی چاک' خود ہی پیالہ' خود ہی بنانے والا' خود ہی پینے والا' خود ہی خریدنے والا' خود ہی توڑنے والا' چلانے والا بھی خود ہی (بس وہ تو خود ہی خود' آپ ہی آپ ہے)۔

سِتَّةِ اَیَّامٍ❶ (57:4) اس نے مختلف Stages (مدارج) کے اندرانہیں پیدا کیا۔ آگے کہا کہ **ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ**❷ (57:4) اور پھر آ گیا وہی ترجمہ کہ پیدا کرنے کے بعد پھر کیا ہوا؟ ان کے ہاں ترجموں سے کہا ہے کہ پھر وہ آپ ویلا ہوا کے عرش کے اوپر جا کے بیٹھ گیا۔ تورات سے یہ تصور لیا۔ اس نے یہ کہا ہے کہ خدا نے چھ دن میں کائنات پیدا کی کہ بہت تھک گیا تو ساتویں دن پھر اس نے چھٹی کا دن آرام کیا جسے Holiday کہتے ہیں۔ یہ وہ ساتواں دن ہوتا ہے جس دن خدا نے آرام کیا اور سو گیا کہ تھوڑا جیا ارام وی مینوں کرن دیو۔ ساتواں دن سبت ہے۔ جس دن کوئی کام نہیں کرتے۔

انسانی زندگی میں تعطیل کا تصور جدوجہد مسلسل کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے

یہ جو Sabat Day (یومِ سبت) ہوتا ہے' یہ یہودیوں کا تصور ہے۔ وہ اس دن کوئی کام نہیں کرتے۔ اسی کا نام Holiday ہے۔ ہم نے بھی اس کے لیے تعطیل کا لفظ اپنے ہاں لے لیا۔ ہفتے میں ہم بھی ایک دن تعطیل مناتے ہیں۔ یہ ذہن میں ہی نہیں آتا کہ یہ یہودیوں کی چیز ہے جو کچھ ہم کر رہے ہیں اور یہودی خدا کے اس تصور میں کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دن خدا بھی سویا تھا' ہم بھی سوئیں گے صاحب! کوئی کام نہیں کریں گے۔ آپ کے ہاں تعطیل کا تصور کیا ہے؟ یہی ہے۔ کام کرنے والی قوم میں تعطیل کا تصور نہیں ہے۔ کیا یہ کام کو معطل کر دینا ہے؟ نہیں' ایسا نہیں ہے۔ تعطیل کے یہ معنی ہیں کہ (کام) معطل کیا اور آپ چلے گئے۔ سب سے بڑا Holiday آپ کے ہاں یہ مقدس دن ہے۔ یہ ہے Holyday (مقدس دن) آپ بھی اس کو Holiday کہتے ہیں' اپنے ہاں۔ اگرچہ جب اس کے ساتھ Holi لگ جائے تو پھر او ہولی ہو جاندی اے جیہڑی ہندواں دی ہوندی اے۔ اب یہ Holiday Mood ہے۔ ہماری نئی نسل نے تو ہندوؤں کی ہولی بھی نہیں دیکھی ہوگی کہ کیا ہوتی ہے کہ جو کسی کے جی میں آئے وہ کرتا رہا ہے دوسرے کے ساتھ۔ یہ Solidary Holyday بھی ہوتا ہے۔ وہ Holiday مقدس دن ہوتا ہے۔ مقدس کونسا دن ہے؟ وہ جس میں کوئی کام کاج نہ کیا جائے۔

خدا کی ذات' ٹائم اور Space کی حدود سے ناآشنا ہے؟

یہاں کہا ہے کہ **ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ** (57:4) وہ پھر عرش پر جا کر بیٹھ گیا۔ پھر وہ جو جا کر وہاں بیٹھا ہے تو اترا نہیں۔ اب درس کا وقت پورا ہو گیا لیکن اس آیت کے چار الفاظ ابھی باقی ہیں وہ بھی میں پورے کر ہی دوں۔ مکا ہی دوں کہا ہے کہ **یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی**

---

❶ اس نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو چھ مختلف ادوار میں' متنوع منازل سے گزار کر پیدا کیا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 1276)۔

❷ اور اس کا مرکزی کنٹرول اپنے دستِ قدرت میں رکھا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 1276)۔

اَلْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا (57:4) وہ نظامِ کائنات کی جزئیات تک سے واقف ہے۔ یہ تمام اس کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ اسے معلوم ہے کہ زمین کے اندر کیا چیز جاتی ہے' فضا میں اوپر کیا چیز ابھرتی ہے' کونسی چیز میں عروج ہوتا ہے' کونسی چیز میں زوال ہوتا ہے' کون نیچے اترتی ہے' کون اوپر جاتی ہے' سارا نظامِ کائنات' جتنا بھی ہے' وہ سارا اس کے علم میں ہے۔ جب اس نظامِ کائنات کی یہ کیفیت ہے تو تم اس کے حیطہ اقتدار سے باہر کیسے جاسکتے ہو؟ نہیں جاسکتے اور آگے کیا ہے کہ **وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ** (57:4) کیا بات ہے! کہا ہے کہ جہاں تم ہو' وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے' اس کا قانونِ مکافاتِ عمل تمہیں گھیرے ہوئے ہوتا ہے' محیط ہوتا ہے' تم کہیں باہر نہیں جاسکتے۔ یہ تمہارے گرد کا ہے کے لیے گھیرا ڈالے ہوتا ہے؟ اس لیے کہ **وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ** (57:4) جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے دیکھتا ہے۔ **لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** (57:5) اقتدار کائنات میں صرف اس کا ہے اور بات وہ ہے جس کے لیے یہ سب کچھ وہ کرتا ہے کیونکہ **وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ** (57:5) تمام امور کے فیصلے اس کے قانون کے مطابق ہوتے ہیں' یاد رکھو!

سورۃ الحدید کی آیت 5 تک ہم آ گئے' عزیزانِ من! چھٹی آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

دوسرا باب: **سورة الحدید** (آیات 4 مسلسل تا8)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اپریل 1983ء کی 8 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحدید کی آیت 4 ہی سے ہو رہا ہے اگرچہ اس کی ابتدا تو سابقہ درس میں ہوگئی تھی: (57:4)

ہمارے ہاں کی تفسیروں کے مطابق خدا کی ذات عرش پہ مقیم ہے جس کی تفصیل کچھ یوں ہے

سابقہ درس میں بات وہ چلی تھی جو میں نے کہا تھا کہ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (57:3) اس سے وہ کس طرح وحدتِ وجود کے لیے سند لاتے ہیں' وہ میں نے تفصیل سے عرض کر دیا تھا کہ وہ تو اگلی ہی آیت میں خود قرآنِ کریم نے اس کی وضاحت کر دی کہ خدا کا اور کائنات کا تعلق کیا ہے۔ کہا ہے کہ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ (57:4)۔ وہ خالق ہے اور یہ مخلوق ہے۔ یہ تو اس کی تخلیق ہے تو وہ خالق اور مخلوق تو ایک ہو نہیں سکتے۔ یہیں سے اس نے اس چیز کی خود تردید کر دی۔ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے کہ کائنات کی تخلیق کی تکمیل چھ مختلف Periods (ادوار) میں ہوئی۔ ایام کے معنی دن ہی نہیں ہیں' منازل' پیریڈ' جسے Phases بھی کہتے ہیں اور اب تو یورپ کے سائنسدان' جو تحقیق کر رہے ہیں' وہ ان مختلف منازل کو' مراحل کو' متعین کر رہے ہیں' جن سے گزر کر یہ محسوس کائنات اس شکل میں آئی' جس میں یہ اب ہمارے سامنے ہے تو وہ یہی Periods (ادوار) ہیں' جن کے متعلق قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ اس کی تخلیق اس طرح تکمیل تک پہنچی اور اس کے بعد پھر وہی بات نیچے آ گئی کہ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (57:4) تو میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے ہاں ترجمہ بھی یہی ہوگا اور تفسیریں بھی یہی ہوں گی کہ پھر اس تخلیق کے بعد خدا عرش پر بیٹھ گیا' تخلیق سے فارغ

ہو گیا' عرش پہ بیٹھ گیا اور پھر عرش کو متعین کیا گیا کہ وہ کہاں ہے' کیسا ہے' خدا اس کے اوپر بیٹھا ہوا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ عرش کی یہ تفصیل احادیث کی رو سے' روایات کی رو سے' کی گئی تھی۔ آپ کو شاید یاد ہو گا کہ وہ یہ ہے کہ یہ جو آسمان نظر آتا ہے' یہ چھ ایسے مختلف آسمان جیسے شیشے کے ڈل ہوتے ہیں۔ ایک اور دوسرے کے درمیان پانچ پانچ سو سال کی راہیں ہیں' پھر وہ چھٹے آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے۔ سمندر کی گہرائی بھی پانچ سو سال کی راہ کی ہے اور اس سمندر میں چھ پہاڑی بکرے ہیں۔ وہ اتنے بڑے ہیں کہ یہ سمندر ان کے گھٹنوں تک آتا ہے اور ان بکروں کے سینگوں کے اوپر خدا کا عرش ہے اور اس عرش کے اوپر خدا مستوی جم کر بیٹھا ہوا ہے۔ استوٰی کے معنی یہ کیے گئے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا' ٹھیک ہے اس قسم کی یہ روایات ہیں اگر تو یہ ہو کہ اس صاحبِ تفسیر نے اپنے ذہن سے یہ کچھ لکھا ہے تو ہم کہیں گے کہ ٹھیک ہے اس کے ذہن کی تخلیق ایک افسانہ ہے لیکن جب وہ یہ کہیں کہ رسول اللہؐ نے یہ فرمایا ہے تو وہاں پھر مشکل آجاتی ہے۔

اس قسم کی تفسیروں سے نبی اکرم ﷺ کی ذات پر جو حرف آتا ہے اس کا آخر ذمہ دار کون ہے؟

اب ان حضرات کا تو کچھ کہنا نہیں ہے' دراصل ان واضعینِ احادیث نے اپنے ہاں سے یہ باتیں کیں' اپنے حجرے میں ہی بیٹھ کے یہ گفتگو کی' اپنے ہی سامعین کو یہ چیزیں سنائیں' اپنے شاگردوں کو پڑھائیں' وہیں تک بات ہوئی' لیکن جب آپ اس قرآن کریم کو' نبی اکرم ﷺ کے علم و فضلیت کو' دنیا کے سامنے پیش کریں گے تو پھر وہاں آپ سوچیے کہ اس قسم کے افسانوں کا اثر ان کے اوپر کیا ہو گا' پہلی تو یہی چیز ہے کہ یہ کائنات چھ دنوں میں پیدا کی تو میں نے عرض کیا تھا کہ یہ چھ دن تورات میں ہیں' قرآن حکیم کی رو سے تو ایام چھ پیریڈز ہیں پھر اگلی بات یہ ہوئی کہ اس کے بعد وہ عرش پر' مستوی ہو کے' مستولی ہو کر' بیٹھ گیا' مسلط ہوا اور عرش کی یہ تفصیل بتائی گئی تو اب ہم اسی مقام پہ پہنچ گئے جہاں یہ تورات و انجیل تھی اور جنہیں ہم محرف کہتے ہیں کہ وہ اپنی اصلی شکل میں نہیں رہیں تو وہیں قرآن حکیم کو بھی لے آئے۔ یہ میں نے عرض کیا تھا کہ جب تک یہ ذہن میں نہ آئے کہ یہ جو الفاظ ہیں ان کے کچھ مجازی معنی بھی ہوتے ہیں' قرآن حکیم کی بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اب ان چیزوں کو اگر حقیقی معنوں کو ہی آپ مستولی کریں گے تو پھر تو آپ کو متعین کرنا پڑے گا۔

لفظ تخت کا مجازی مفہوم کنٹرول ہوتا ہے

اپنی زبان میں جب آپ تخت و تاج کہتے ہیں تو وہ سچ مچ کا ایک تخت نہیں ہوتا' سچ مچ کا ہی تاج سر پہ رکھا ہوا نہیں ہوتا۔ وہ تختہ اُلٹ جاتا ہے۔ جب تو وہ کوئی لکڑی کا بنا ہوا تختہ نہیں ہوتا کہ جو سچ مچ الٹ جاتا ہے۔ جب انگریزی زبان میں آپ کنٹرول (Control) بھی کہتے ہیں تو اس کے معنی مملکت کا اقتدار ہوتا ہے۔ یہ اس معنی میں یوں لیا جاتا ہے۔ اس طرح اس کے معنی وہ Power ہوتی ہے۔ مملکت کا

وہ اقتدار ہوتا ہے۔ انہی معنوں میں یہ ''عرش'' کا لفظ بھی مجازی طور پر عربی زبان میں بولا جاتا ہے تو یہ چیز تو کنٹرول کے معنی میں آتی ہے' یہ تخت و تاج مجازی معنوں میں اقتدار کے لیے آتا ہے۔

خالق کی کائنات پر کنٹرول کی کیفیت اور مختلف تصورات

صرف یہ نہیں ہے کہ خالق ہے۔ خالق تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ (مثلاً) کسی نے کوئی مشین بنائی۔ مشین بنانے والا کہیں بیٹھا ہے' وہ کسی جگہ ہے۔ دونوں میں کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ جو بننا تھا' وہ بن چکا۔ اب جہاں جی چاہے اسے رکھا جائے۔ اس طرح خالق اور یہ مخلوق الگ الگ ہوتی ہیں لیکن وہ خالق اس قسم کا نہیں کہ اس نے کوئی چیز پیدا کی اور اس کے بعد اس کا کوئی تعلق ہی اس سے نہ رہا۔ اس پورے نظام پر جو کنٹرول ہے وہ اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے' اس کے لیے اس نے مختلف قسم کے دیوی دیوتا مقرر کیے کہ بارش کا یہ دیوتا اور آندھیوں کا وہ دیوتا' فصلوں کا' یہ اولاد کا' یہ بیماری کا۔ یہ جو تصور تھا یہ پہلی اقوامِ قدیمہ میں ہر جگہ پایا جاتا تھا کیونکہ انسان کا شعور اپنے بچپن کے زمانے میں تھا۔ وہ ذہن میں نہیں لاسکتا تھا کہ کوئی ایک اتھارٹی اس قسم کے مختلف کام بھی کرسکتی ہے۔

خدا کے صحیح تصور کے بغیر قرآن حکیم کے بنیادی حقائق سمجھ میں نہیں آسکتے اور لفظ ثُمَّ کے معنی

قرآن حکیم نے خدا کا جو تصور دیا ہے اور آپ کو یاد ہوگا' میں بار بار کہتا ہوں کہ قرآن حکیم سے خدا کا تصور متعین کر دیا جائے تو سارا اسلام سمجھ میں آجاتا ہے۔ یہ بڑی بنیادی چیز ہے۔ خدا کا تصور اس نے ایک تو یہ دیا کہ اس کا اور کائنات کا اور انسانوں کا تعلق خالق اور مخلوق کا ہے' پھر خالق اس قسم کا نہیں کہ وہ تخلیق کے بعد ان سے الگ ہوکر بیٹھ گیا' اس کا تعلق رگِ جاں کی طرح ہے' اور اب یہ جو سوال ہے یہ بڑا غور طلب ہو جاتا ہے۔ میں پہلے یہاں آگے آجاؤں تو پھر میں عرض کرونگا کہ دونوں میں تعلق کیا ہے۔ کہا ہے کہ **ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ** (57:4) اور پھر ''ثم'' کے معنی یہ نہیں کہ اس کے بعد' جیسے کہتے ہیں تخلیق کے بعد' پھر وہ یوں آگیا۔ یہ نہیں ہے۔ اس کے معنی ''اور''❶ کے بھی ہوتے ہیں۔ استوٰی ہے کہ اس نے جو کنٹرول ہے وہ اپنے ہاتھ میں رکھا۔

خارجی کائنات کی خوبصورتی کا راز کنٹرولنگ اتھارٹی کے غیر متبدل اصولوں کی بنا پر ہے

پوری کائنات کا یہ سارا نظام اس لیے اس حسن و خوبی سے کارفرما ہے کہ اس کا کنٹرول اس کے ہاتھ میں ہے۔ تخلیق کے بعد وہ اس سے الگ ہوکر نہیں بیٹھ گیا۔ کہا ہے کہ **يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ**

---

❶ ''وَ'' بمعنی ''اور'' کے لیے دیکھیے:

Lane, Edward William (1968). Arabic English Lexicon. Beirut: Librairie Liban, p.351.

فِيهَـــا(57:4) یعنی اس کنٹرول کے لیےعلم کا ہونا ضروری ہے' اسے معلوم ہو کہ کہاں کیا ہو رہا ہے۔ کہا کہ اُسے ان جزئیات تک کا بھی علم ہے کہ اس زمین میں کیا داخل ہوتا ہے' کیا ان میں سے نکلتا ہے' اس فضا میں کیا چیز اوپر جاتی ہے' وہاں سے کیا چیز نیچے آتی ہے۔ ان تمام چیزوں کا اسے علم ہے۔ یہ اس نظام پہ یونہی اشاراتی عناصر گنا دیئے کہ ان تمام چیزوں کا اسے علم ہے اور علم کے معنی یہ ہیں کہ ان چیزوں کا کنٹرول اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ اب یہ تو خارجی کائنات اور خدا کا تعلق رہا۔ اس نے انسانوں کے متعلق کہا کہ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (57:4) یہ ہے وہ اہم چیز جو خدا کا تصور قرآن حکیم پیش کرتا ہے۔

خدا تعالیٰ کی انسان سے تعلقات کی نوعیت

عزیزانِ من! اب ہمارے سامنے دو چیزیں آئیں: وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (57:4) جہاں بھی تم ہو' وہ تمہارے ساتھ ہے۔ یہ چیز خدا کی طرف ہے کہ تم جہاں بھی ہو' وہ تمہارے ساتھ ہے۔ یہ چیز ایک طرف آئی اور دوسری طرف اس کی کیفیت یہ ہے کہ لَاتُـدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (6:13) نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں' اس کا ادراک نہیں کر سکتیں' اسے دیکھ نہیں سکتیں بلکہ اسے دیکھنا ہی نہیں کہا' ادراک تک نہیں کر سکتیں' وہ تو تمہارے شعور میں نہیں آ سکتا مگر تمہارے ساتھ ہے' تمہارے شعور میں نہیں آ سکتا۔ اسے "مَعَكُمْ"(57:4) کہا ہے کہ تمہارے ساتھ بھی ہے اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ اور آگے کہا ہے کہ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ (6:100) اس کے متعلق ذہنِ انسانی جو کچھ بھی کہے وہ اس سے بلند اور بالا اور فوق ہے اس سے تو ماوراء ہے۔ لیکن معکم کہا ہے ایک طرف اور یہ جو اس کے ساتھ ہے' اس کے متعلق تو اسے دیکھا بھی جا سکتا ہے' اس کے متعلق ایک ایک چیز گنائی جا سکتی ہے اور اس کے بعد سمجھنا تو کچھ دشوار ہی نہیں ہو سکتا۔ ایک طرف اس کی تو یہ بھی کیفیت ہے کہ وہ معکم بھی' دوسری طرف کیفیت یہ ہے کہ اسے نگاہیں دیکھ نہیں سکتیں' اس کا اداک نہیں کر سکتیں' انسانی ذہن جو کچھ بھی اس کے متعلق کہے' وہ اس سے ماوراء ہے اس لیے کہا کہ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى (6:100) خدا انسان کی سوچ کے باطل تصورات سے مبرا اور بلند ہے' اس کی اس سوچ سے ماوراء ہے۔ یعنی اب یہ دیکھیے کہ کس قسم کا تصور اس کا آ رہا ہے۔ وہ جو عرش کے اوپر بٹھانے کی بات ہے' وہ تو اقبالؒ نے اپنے پہلے دور کی ایک غزل کے ایک شعر میں صاف کر دی تھی' اس میں اس کا انداز بڑا ہی متولا نا تھا۔

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تُو نے اے زاہد!
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

یہ ویسے بھی خوبصورت چیز ہے جب یہ لوگ ناصح واعظ زاہد وغیرہ کو مخاطب کرتے ہیں تو اندر سے ایک متولا نا پن ہوتا ہے جو باہر آتا ہے۔ وہ انداز یہ ہے۔

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تُو نے اے زاہد!
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

یہ بات بڑی صاف ہے کہ یوں نہیں کہ اس نے یہ سب کچھ تخلیق کیا اور پھر اپنی مخلوق سے الگ ہٹ کر' عرش کے اوپر بیٹھ گیا اور وہ کوئی مزید تخلیق تو ہے نہیں اور کام تو کچھ ہے نہیں' اس کے بعد وہ وہاں بیٹھا ہے اور جو مخلوق ہے یہاں' اور مخلوق میں پھر ہم انسان بھی ہیں' اب وہاں بٹھانے والوں نے یہ نہ دیکھا کہ وہ آگے وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (57:4) کہہ رہا ہے اور پھر یہ بھی ساتھ کہہ رہا ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (6:104) مگر تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔ اس کے متعلق تمہارا ذہن کچھ بھی کہے مگر وہ ہے ''برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم''۔

عزیزانِ من! یہ بالکل صحیح ہے وہ تو اس سے ماوراء ہے فوق بھی ہے۔ الٰہیات کے فلسفہ میں دو اصطلاحات Immanent (باہمہ) اور Transcendent آتی ہیں۔ جو اہلِ مغرب ہیں ان کے ہاں کے فلاسفرز اس پہ Discussion کرتے ہیں۔ وہ Transcendent (بے ہمہ) ہے۔ یہ خدا کا ہر جگہ موجود ہونا ہے اور دوسرا رگ کائنات میں' شاعری میں' خونِ زندگی کی طرح دوڑنا کہتے ہیں اور اس کائنات سے ماوراء ہونا ہے یہ بظاہر دو متضاد چیزیں نظر آتی ہیں لیکن یہ خدا کا تصور ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اس چیز پر فلسفیانہ سطح کے اوپر بڑی بحث اور Discussion وغیرہ کی ہوئی ہیں۔

خدا کی ذات کا تعارف اس کی اپنی بیان کردہ صفات سے ہی ہوسکتا ہے

عزیزانِ من! اقبالؒ نے اپنے ہاں دو اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ مقام بڑے مشکل ہیں' الفاظ میں نہیں سمو سکتے' لیکن الفاظ کے بغیر تو چارہ نہیں ہے۔ جب ہم بات کریں گے تو بہر حال ایک لفظ تو اس کے لیے استعمال کرنا ہوگا تو یہ دو چیزیں ہیں جو اقبالؒ نے بھی کہی ہیں۔ وہ یہی ہیں جو وہاں اس پہ بحث ہوتی تھیں۔ کہتا ہے کہ وہ اصطلاحات ہیں: باہمگی اور بے ہمگی۔ میں نے عرض کیا ہوا ہے کہ خدا نے جو اپنی صفات قرآن کریم میں گنائی ہیں وہ یونہی نہیں ہیں جو اس نے اپنی کوئی Description بھیجی ہے اور ہم سمجھیں کہ خدا ایسا ہے' خدا ویسا ہے۔ اس نے صِبْغَةَ اللّٰهِ (2:138) کہا ہے کہ انسان اپنے اندر' اپنی ذات کے اندر' صفاتِ خداوندی کا ایک عکس پیدا کرے۔ یہ میں نے اس لیے کہا ہے کہ خدا کی صفات تو اس کی ذات کی طرح لامنتہیٰ ہیں' محدود نہیں ہیں اور انسان جو کچھ بھی اپنے اندر پیدا کرے گا وہ تو محدود ہوگا اس لیے میں ہمیشہ یہ علیٰ حدِ بشریت لکھا کرتا ہوں کہ جتنا ایک انسان زندگی میں ممکن ہے اس حد تک خدا کی صفات کو اپنی ذات میں پیدا کرنا۔ یہ ہے مقصد۔ جو قرآن کریم نے خدا کی صفات بیان کی ہیں' وہ یونہی نہیں کیں کہ وہاں الفاظ ہیں

اور ہمارے ذہن میں یہ آ جائے کہ ہاں ہاں وہ ایسا ہے تو ایسا ہے تو اس قسم کا ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔

انسانی ذات کی نشو ونما کا طریق صفات خداوندی کو حدِ بشریت اپنے اندر منعکس کرنا ہے

خدا کے حضور کھڑے ہوئے ہم اس کی تعریف اور توصیف بیان کر رہے ہیں۔ مقصد اس کا یہ ہے کہ انسانی ذات اگر اپنے اندر نشو ونما چاہتی ہے' ارتقاء کی منازل طے کرنا چاہتی ہے' تکمیل تک پہنچنا چاہتی ہے' تو اس کا ذریعہ یہ ہے کہ وہ اپنے اندر خدا کی یہ صفات علیٰ حدِ بشریت پیدا کرتی چلی جائے۔ یہ انسان کی ذات میں منعکس ہونی چاہئیں۔ اگر اس نے اپنے آپ کو علیم کہا ہے تو اسے صاحبِ علم ہونا چاہیے' اگر اس نے اپنے لیے ربوبیت رکھی ہے تو اس کی صفتِ ربوبیت انسان کے اندر ہونا چاہیے کہ یہ دوسروں کی نشو ونما بھی کرے' اگر اس نے یہ رزاقیت کہا ہے تو انسان اپنے اندر یہ صفت پیدا کرے کہ وہ دوسروں کی رزاقیت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے۔ تو یہ ہے مقصد خدا کی ان صفات کا۔

انسانی زندگی کا اندازِ زیست اقبالؒ کی نظر میں

معاشرے میں اقبالؒ نے جو خدا کی یہ دو صفات ہیں کہ وہ مَعَكُمْ (57:4) (ہمارے ساتھ) بھی ہے اور ہم سے ماوراء بھی ہے اس نے معاشرے میں انسان کا جو اندازِ زیست ہے اس کے متعلق بڑے ہی لطیف انداز میں بات کہی ہے۔ ہر شخص اپنا جداگانہ تشخص رکھتا ہے۔ میں' میں ہوں' کوئی دوسرا یہ میں نہیں ہو سکتا۔ فرق تو کہا اسی صورت میں جائے گا جب اس کے اندر انفرادیت آئے گی' Individuallity آئے گی۔ یہ Individuality ہے جس سے ہر فرد کا جداگانہ تشخص ہوتا ہے۔ میں جو ہوں' میرا یہ تشخص ہے' کوئی دوسرا یہ نہیں ہو سکتا' میں منفرد ہوں اب اس کے بعد مجھے معاشرے کے اندر بھی رہنا ہے' اپنے معاشرے کا ایک فرد بن کر بھی رہنا ہے۔ آپ میں منفرد بھی ہونا ہے' معاشرے کا ایک فرد بھی بننا ہے' معاشرے کے فرد بننے کی حیثیت سے هُوَ مَعَكُمْ (57:4) والی بات آتی ہے مجھ میں اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لیے جسے اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (57:4) کہا گیا ہے کہ وہ ان چیزوں سے ماوراء ہے' وہ کیفیت پیدا ہونی ہے۔ یہ بالکل دو متضاد چیزیں آتی ہیں اور یہ بڑی اہم چیز ہے کہ معاشرے کے اندر رہتا ہوا سب کے ساتھ بھی رہے' اپنی ذات میں منفرد بھی رہے۔ اقبالؒ کو تو بات کہنی آتی ہے• یہی اس کی انفرادیت ہے

زندگی انجمن آرا ونگہدار خود است (زندگی انجمن آراستہ کرنے والی اور خود کو نگاہ میں رکھنے والی یا اپنی حفاظت کرنے والی ہے)۔

انسان کی بھرے معاشرے میں مَعَكُمْ (57:4) اور ماورا کی دو الگ الگ کیفیات کیسے؟

عزیزانِ من! انسانی زندگی' انسانی ذات کے دو شعوب ہیں' دو Abstract ہیں: انجمن آرا معاشرے کے اندر' انجمن کا ایک فرد

''نگہدارِ خوداست''، اپنی ذات میں منفرد؛ اس کی نشوونما؛ اس کا ارتقا؛ اس کا تشخص ہر ایک کا الگ اور معاشرے کا ایک فرد بھی۔ کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ وہ ایک تشبیہہ میں یہی بات واضح کر گیا۔ میں نے کہا ہے کہ اقبالؒ کی انفرادیت اس کے انداز میں ہے۔ پھر سن لیجیے:

زندگی انجمن آرا و نگہدارِ خود است

اے کہ در قافلہ بے ہمہ شو باہمہ رو ❶

(اقبالؒ: زبورِ عجم)

اللہ اکبر! افرادِ کارواں کی مثال ہے کہ زندگی انجمن آرا کہ چلنا ہے تمہیں قافلے کے ساتھ۔ یہ تو ہوا: وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ (57:4) قافلے کا ایک فرد ہے لیکن اس کے باوجود اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے ہے؛ وہ قافلے کے اندر کھو نہیں جاتا؛ یہ نہیں ہے کہ قافلے کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اور اپنی جداگانہ انفرادیت Individuality یا تشخص کو ختم کر دے اور یہ بھی نہیں ہے کہ رہبانیت کی طرح قافلے سے کوئی تعلق ہی نہ رکھے؛ معاشرے سے کوئی واسطہ ہی نہ رکھے اور خلوت گاہوں میں بیٹھ کر کہے کہ میں اپنی ذات کا تزکیہ کر رہا ہوں؛ اس کا ارتقا کر رہا ہوں۔ یہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اس نے تو انجمن آرا بھی رہنا ہے اور نگہدارِ خود بھی رہنا ہے۔

خدا تعالیٰ کی دو صفات مَعَكُمْ (57:4) اور أَيْنَ مَا كُنتُمْ کی عملی تعبیر اور ذاتِ انسانی کا ذکر

تو یہ جو خدا کی دو صفات ہیں کہ وہ ایسا بھی ہے کہ جسے آپ کی نگاہیں بھی ادراک نہیں کر سکتیں یعنی اتنا ماوراء؛ اتنا منفرد ہے؛ یہ بھی اس کی کیفیت ہے اور دوسرے وہ مَعَكُمْ (57:4) بھی ہے؛ وہ تمہارے ساتھ أَيْنَ مَا كُنتُمْ (57:4) ہے؛ ہر مقام پر تمہارے ساتھ بھی ہے تو یہ بظاہر دو متضاد چیزیں نظر آتی ہیں لیکن فرد جب اپنے اندر خدا کی صفات کو علیٰ حدِ بشریّت پیدا کرے گا؛ منعکس ہونگی؛ پھر اس سے تو اس میں یہ دونوں صفتیں کس طرح سے ہونگی؟ اس طرح کہ وہ معاشرے کا ایک فرد بھی ہوگا؛ رہبانیت نہیں ہوگی کہ وہ معاشرے کو؛ انجمن کو؛ اس کائنات کو؛ اس دنیا کو ترک کر دے۔ وہ اس کے اندر رہتے ہوئے نہگدارِ خوداست بھی ہو اور یہ کتنی خوبصورت تشبیہہ ہے! کہ ''اے کہ در قافلہ بے ہمہ شو باہمہ رو۔ یہ ہے اسلام؛ عزیزانِ من! خدا نے یہ جو کہا ہے کہ ہمارے پاس آؤ گے تو فُرَادٰی ❷ (6:94) آؤ گے۔ وہ یہ ہے کہ جو تمہاری منفرد شخصیت ہے؛ وہ ہوگی؛ اس سے ہم اندازہ لگائیں گے کہ تم نے وہاں اپنی ذات کی کس قدر نشوونما کر لی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اسی نے یہ کہا ہے کہ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً تمہیں ایک امت بنایا ہے ایک معاشرہ بنایا ہے۔ یہ ہے اسلام۔ معاشرے کے بغیر؛ اس نظام کے بغیر؛

---

❶ زندگی انجمن آراستہ کرنے والی اور خود کو نگاہ میں رکھنے والی یا اپنی حفاظت کرنے والی ہے۔ اے وہ شخص جو قافلہ میں شامل ہے! سب کے ساتھ رہ لیکن سب سے الگ چل۔

❷ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى (6:94)

اسلام کا وجود ہی نہیں رہتا لیکن معاشرے میں اگر فرد کی انفرادیت یا اس کا تشخص کھو جاتا ہے' یہ باقی نہیں رہتا تو اس کا مقصد ہی کچھ نہیں ہوتا۔

رہبانیت تو انسان کا خودساختہ تصور ہے

معاشرے کے ساتھ رہنے کے تو معنی ہیں قافلے کا ایک فرد جوان کے ساتھ چلتا ہوا منزل تک جا پہنچے اور اگر کارواں میں' قافلے میں یہ افراد ہی باقی نہ رہیں' قافلہ کہاں باقی رہے گا۔ قافلہ ہی ختم ہو جائے گا۔ یہ تو ان افراد کے تشخص کا باقی رہنا ہے کہ ان سے مل کر وہ قافلہ قافلہ رہتا ہے تو یہ چیز ہے جو قرآن حمید نے کہا تھا کہ ہم نے رہبانیت فرض نہیں کی تھی' ان لوگوں نے خود وضع کر لی۔ رہبانیت کے معنی یہ ہیں کہ انسان انجمن سے' قافلے سے' معاشرے سے' الگ ہٹ جائے اور یہ کہے کہ میں اپنی ذات کی تکمیل کر رہا ہوں تو کہا کہ یہ ہے ہی غلط۔ کارواں نہیں رہے گا' امت نہیں رہے گی' معاشرہ نہیں رہے گا تو یہ جو زندگی کے بسر کرنے کا اسلوب ہے کہ وہ معاشرے کے اندر بھی رہے' اپنا تشخص بھی جداگانہ قائم رکھے' یہ ہے خدا کی یہ جو دو صفات ہمارے سامنے آئی ہیں کہ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یَصِفُوۡنَ (6:100). بھی ہے اور وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (57:4). بھی ہے۔ ان مقامات کو اگر سمجھ لیا جائے جو قرآن حکیم کہتا ہے تو پھر یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ کس قسم کا نظام چاہتا ہے' کس قسم کا معاشرہ چاہتا ہے' معاشرے میں اگر آپ مکینکلی کچھ قوانین کو نافذ کر دیتے ہیں تو اس کا تعلق انسان کی ذات سے نہیں ہوتا وہ تو مشین ہو جاتا ہے' وہ تو اس نے جس انداز کا معاشرہ قائم کیا ہے کہ معاشرے کے اندر ہر فرد کی انفرادیت یا اس کی ذات کی تکمیل بھی ہوتی رہے اور وہ معاشرے کا فرد بھی بنا رہے' نہ تو معاشرے سے الگ ہٹ کے رہبانیت والی بات ہو جائے' نہ اس کی کیفیت ہو کہ معاشرے کے اندر اس کا وجود ہی باقی نہ رہے۔ یہ سیکولرازم ہو جائے گا۔ یہ دونوں چیزیں خلافِ اسلام ہیں۔ مکینکلی اسلام کہیں نہیں نافذ کیا جا سکتا یا Introduce ہوتا۔ اس کے معنی ہی کچھ نہیں ہیں۔ معاشرے کے ہر قدم کا' ہر اقدام کا اثر اس کی ذات پہ پڑنا چاہیے اس کی تکمیل کا اسے موجب یا ذریعہ بننا چاہیے معاشرے کے اندر جو جا رہا ہے۔

تصوف کے علاوہ میکینکل معاشرے اور قرآنی معاشرے میں فرق

جیسا قافلے کے ساتھ چلنے سے وہ منزل کی طرف جا رہا ہوتا ہے' کہنے کو تو یہی ہوتا ہے کہ قافلہ منزل کی طرف جا رہا ہے' قافلے کا ہر فرد منزل کی طرف جا رہا ہوتا ہے' تو اگر تو معاشرے کی یہ صورت ہے کہ اس میں ہر فرد کی ذات کی تکمیل اور نشوونما ہوتی چلی جا رہی ہے اور ہر فرد اپنی ذات کی صفات و خصوصیات کو اس معاشرے کی تکمیل اور حسن کے لیے Contribute کر رہا ہے۔ پھر یہ اسلام ہے اور اگر یہ کچھ مکینکلی ہو رہا ہے' محض قوانین کی رو سے ہو رہا ہے' یہ اسلام نہیں ہے۔ یہ وہی ایک طرف رہبانیت ہے کہ جو ہمارے ہاں کے تصوف نے آ کر لے لی۔ وہ بھی اسلام کے خلاف ہے کہ معاشرہ نہیں ہے' ہر فرد اپنی ذات میں مگن رہتا ہے اور اگر یوں صورت ہے کہ معاشرہ

مکینکل، مشین کی طرح، چل رہا ہے جس میں کسی فرد کی اپنی ذات کا کوئی حصہ نہیں، تو وہ بھی خلافِ اسلام ہے۔ تو یہ ہے اسلام کہ ایسا معاشرہ جس میں ساتھ کے ساتھ افراد کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جائے، اور ہر فرد پھر اس معاشرے کی تحکیم کے لیے، نظم و نسق کے لیے اپنی صفات اور صلاحیتوں کو Contribute کرے اور یوں یہ کارواں ان افراد کو ساتھ لیے ہوئے جانبِ منزل رواں دواں رہے۔ یہ ہے اسلام، عزیزانِ من! یہ ہیں معنی اس کے جسے اگر آپ یوں کہیں کہ وہ عرش پہ بھی ہے، اس سے الگ بھی ہے، بے ہمگی کی یہ کیفیت ہے اور باہمگی کی وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (57:4). باہمگی کی یہ کیفیت ہے کہ وہ ہر فرد کے ساتھ ہے۔ یہ ہے اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (57:4) تم جہاں کہیں بھی ہو۔

لفظ معیت کا لغوی مفہوم اور ہمارے ہاں شیطان کی کیفیت اور اس کا عمل

معیت مَعَكُمْ (57:4) کا یہ عالم ہے کہ وہ تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات سے بھی واقف ہے۔ اس کی یہ معیت نہیں ہے کہ وہ ایک پیکر میں ملبوس ہے اور ہمارے ساتھ چل رہا ہے۔ بات اس کے علم کی ہے، بات اس کے قانونِ مکافات کی ہے، وہ ہر مقام پہ، ہر فرد کے ساتھ ہے۔ عزیزانِ من! بات میں سے بات نکل آئی۔ ہمارے ہاں کبھی کوئی سوچتا نہیں ہے۔ یہ خصوصیت تو صرف خدا کو حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ ہر مقام پہ، ہر فرد کے ساتھ ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم نے کیا کیا؟ ہم نے یہی خصوصیت شیطان کو دیدی ہے کہ شیطان ہر فرد کے ساتھ ہر جگہ ہوتا ہے۔ معاذ اللہ۔ کبھی نہیں سوچتے ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ کہا ہے کہ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (57:4) یہ خدا ہی کی خصوصیت ہے، کسی اور کی نہیں ہے۔ کتنی متضاد چیزیں ہیں جو بیک وقت ہم کہہ جاتے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ غور کرنا، فکر کرنا، سوچنا تو ہمارے ہاں حرام قرار دیا جاتا ہے ورنہ وہ ذرا کہیں کھڑے ہو کر، جیسے قرآن حکیم نے کہا کہ ذرا رک جاؤ، ٹھہرو، ذرا سوچو: ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (34:46). پھر سوچو، ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا یہ دو متضاد چیزیں، خدا اور شیطان کی، وہ ایک صفت جو ہے، بڑی اہم صفت ہے، وہ خدا کی صفت بھی ہے اور دوسری جگہ ہم شیطان کی بھی وہ صفت کہتے ہیں کہ وہ ہر فرد کے ساتھ ہوتا ہے، ہر جگہ ہوتا ہے۔

کراماً کاتبین کے متعلق ہمارے تصورات کی حقیقت

عزیزانِ من! یہ سارا جو کچھ ہے، وہ کاہے کے لیے ہے؟ کہا ہے کہ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (57:4) جو کچھ تم کرتے ہو، وہ یہ نہیں ہے کہ اس نے کوئی رپورٹر مقرر کر رکھے ہوئے ہیں، جیسا ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ کندھوں کے اوپر دو فرشتے ہیں وہ ہیں۔ کراماً کاتبین۔ وہ لکھتے ہیں، وہ پھر عرش پر ڈائری بھیجتے ہیں تو وہاں سے خدا کو معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ مَعَكُمْ (57:4) اس لیے ہے کہ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (57:4) وہ براہِ راست Direct Information حاصل کرنا کہتے ہیں، خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ ان الفاظ میں جو کہا جائے گا جس میں یہ ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے یعنی وہ کسی اور کی پہنچائی ہوئی انفرمیشن کی بنا پر فیصلے نہیں کرتا، ہر

عمل کا' ہر خیال کا' ہر ارادے کا' علم براہ راست رکھتا ہے۔ یہ معنی ہوئے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ وہ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ (57:4) ہے۔ تاکہ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (57:4) اب وہاں آیا جو میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ وہ "عرش" جس کے معنی اقتدار ہے' اس کی وضاحت کرتا چلا جاتا ہے۔ آگے کہا ہے کہ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (57:5)۔ اب مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ نے بتایا دیا کہ "عرش" کے معنی کیا ہیں۔ وہ کسی چیز کا ایک تخت نہیں ہے خواہ وہ تختِ طاؤس ہی کیوں نہ ہو' وہ جواہرات کا بنا ہوا ایسا تخت نہیں۔ اس کے معنی اقتدار ہی کے ہیں کہ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (57:5) وہ قرآن مجید کے ان الفاظ کی اس کی تفسیر کر رہا ہے کہ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (57:4) ہے یعنی کائنات میں اقتدار اسی کا ہے' کسی اور کا نہیں اور آگے کہا ہے کہ وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (57:5) اور جو معاملات بھی کہیں ہوں آخر الامر ان کا فیصلہ اس کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

اناللہ وانا الیہ راجعون جیسے ایک انقلابی اعلان کے برعکس ہمارے ہاں پایا جانے والا تصور اور اس کا حقیقی مفہوم

آپ کو یاد ہے کہ جب اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ (2:156) آیا تھا میں نے بتایا تھا کہ اس کا مفہوم کیا ہے اور ہم کیا کہتے ہیں۔ اس کے معنی اتنا انقلاب آوردہ اعلان ہے اور ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہمیشہ بس اس کے استعمال کا ایک ہی موقعہ رہ جاتا ہے کہ جہاں کسی کے مرنے کی اطلاع ملی اور بے ساختہ ہم نے کہا کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ (2:156) بات اور جگہ چلی جائے گی ورنہ میں کہوں کہ یہ تصور بھی ہم نے ان ویدانت والوں سے یا تصوف والوں سے لیا ہے کہ خدا کی ذات کے ساتھ واصل بالحق ہو جاتا ہے انسان جا کر۔ الیہ راجعون کے یہ معنی اس لیے کیے جاتے ہیں۔ یہ بات دوسری طرف چلی جائے گی یہاں کہا ہے کہ اِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (57:5) ہر معاملے کا آخر الامر فیصلہ اسی کے قانون کے مطابق ہوتا ہے اور فیصلے کے لیے اتنا انتظام ہے کہ وہ براہِ راست ہر ایک کے عمل کا' ہر ایک کے خیال کا' ہر آپ کے ارادے کا علم رکھتا ہے اور فیصلہ پھر اس کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ کائنات میں ہر مقام پہ پھیلا ہوا ہے۔ اس کے ملک کے احاطے سے کوئی فرد باہر جا نہیں سکتا اس لیے ہو نہیں سکتا کہ عمل تو ایک طرف' عمل کا جو ارادہ بھی ہو' وہ بھی اس کے مواخذہ کی حد سے باہر رہ جائے۔ کہا کہ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَیُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ (57:6) کیا حسین انداز ہے اس کا' عزیزانِ من! پوچھیے نہیں' میں تو ایک ایک قدم پہ کھڑا ہو جاتا ہوں' آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا' یعنی وہ نظارہ اتنا پرکشش ہوتا ہے کہ وہ انسان کے پاؤں پکڑ لیتا ہے۔ وہ خارجی کائنات کی مثالیں دیے چلا جا رہا ہے اور جو اس سے مقصد ہے' وہ آخر میں ساتھ کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے۔ ادھر سے یہ چیز تھی کہ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْھَا (57:4) یہ کائنات کی چیزیں' زمین و آسمان کا نظام' کیسے اس میں طبعی طور پر ہوتا ہے اور وہ سارا کچھ "این کنتم" ہے۔ کاہے کے لیے ہے؟ کہا کہ یہ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (57:4) کے لیے ہے۔ کہا کہ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (57:5) کائنات میں سارے کا سارا اقتدار اسی کا ہے پھر وہیں وہ مثال لے آیا کہ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی

الـنَّهَارِ (57:6) رات کی تاریکیاں آگے بڑھتی ہوئیں دن کی روشنی میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور دن سرکتا سرکتا لیل کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ بیان کرنے کیا کیا خوبصورت پیرا ہے! کہ یہ ہو رہا ہے۔

سورج کے غرب ہونے کی کیفیت کے متعلق ایک خودساختہ روایت

چلو جی ہو رہا ہے' ہمیں اس سے کیا واسطہ کہ دن کہاں چلا جاتا ہے اور رات کہاں چلی جاتی ہے' اور پھر اسی تفسیر سے اگر آپ پوچھنا چاہتے ہیں' جو اس دور کے لوگوں کے ذہن کی تخلیق تھی' اور پھر وہی چیز ہے کہ رسول اللہ ؐ کی طرف منسوب ہے کہ حضورؐ سے پوچھا گیا کہ سورج رات کو کہاں جاتا ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ اللہ کے عرش کے نیچے جا کر چھپ جاتا ہے اور دوسری صبح کو فرشتے اس کو کچوکے دے دے کر پھر نکالتے ہیں کہ چل اور پھر آ جاتا ہے۔ عزیزانِ من! ہنسیے نہیں' روئیے اور خون کے آنسو روئیے۔ آپ کے ہاں کے بچوں کو اسلامیات کے نام پہ جو تعلیم دی جاتی ہے وہ یہ ہے' اور اس پہ اگر آپ کی مسکراہٹ ہے تو فوراً انکارِ حدیث کا فتویٰ لگ جائے گا اور آپ مرتد قرار پا جائیں گے۔ کہا یہ جاتا ہے۔ دن اور رات کی اس کیفیت کو بیان کرنے کے بعد پھر اصل مقصد کی طرف آیئے۔ کہا ہے کہ وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (57:6) تمہارے دلوں میں گزرنے والے خیالات سے بھی واقف ہے۔ کہا یہ ہے کہ خدا وہ ہے جس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (57:7). اس خدا پر ایمان لاؤ اور یہ باتیں تمہیں کہاں سے معلوم ہوئیں؟ یہ اس وحی کے ذریعے معلوم ہوئیں' جو خدا نے اپنے رسول کی وساطت سے تم تک پہنچایا اس لیے خدا پر ایمان اس وساطت سے لایا جائے گا جو وحی ہے جو خدا نے دی اور اس لیے کہا کہ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (57:7). تم اس خدا پر ایمان لاؤ اور اُس کے اُس رسول پر جس کی وساطت سے اس نے اپنا قانون انسانوں کی طرف بھیجا ہے۔

خدا تعالیٰ نے یہ پوری کائنات اس لیے پیدا کی کہ اس کی روٹی کا انتظام ممکن ہو سکے

عزیزانِ من! اس سلسلے میں اس تمام اہتمام کا جو سب سے پہلا قدم ہے جو یہاں کیا گیا' وہ ہے سارے کائنات کے باہر نظم و نسق کا۔ یہ کاہے کے لیے ہے؟ صرف اس لیے کہ جو جاندار مخلوق' خدا نے پیدا کی ہے وہ سامانِ پرورش وہاں سے حاصل کر سکتا ہے' یعنی اس کے ساتھ ہی اس نے ذرائع پرورش بھی پیدا کر دیئے ہیں۔ یہ ارض و سما کا انتظام اس کے لیے ہے۔ یہ شیخ سعدیؒ کے الفاظ میں یوں ہے:

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکار تو اند
تا تو نا نے بکف آری و بغفلت نخوری ❶

---

❶ ہوا' بادل' چاند' سورج اور آسمان' یہ سب کے سب تیرے نام میں مصروف ہیں تا کہ تیری روٹی تیری ہتھیلی پہ آ جائے اور تو اسے غفلت سے نہ کھائے۔

یہ سارا نظامِ کائنات سرگرم عمل ہے تا کہ تمہارے لیے روٹی مہیا کی جائے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ اس روٹی کو کھاؤ تو خدا کے قانون سے غافل ہو کر نہ کھاؤ۔ کیا بات ہے صاحب! یہ لوگ جو کہہ جاتے تھے! یہ سارا کچھ کہنے کے بعد کہا کہ ایمان لاؤ اس خدا کے اوپر' جو ہم نے بتایا ہے' اس رسول کے اوپر جس کی وساطت سے یہ باتیں تمہیں معلوم ہوئیں۔ خدا نے اس کو بتائیں اور اس نے تمہیں بتائیں اور اس کے بعد کرو۔ کیا کرو؟ یہ نہیں ہے کہ خلوت میں بیٹھ کر اپنا تزکیہ نفس کرتے چلے جاؤ۔ یہ تزکیہ نفس بھی کرتے ہیں' نفس کو مارتے بھی ہیں۔ عجیب چیز ہے۔

تزکیہ نفس کے موجودہ تصور کے تحت پرویزؒ کی اپنی کہانی ان کی اپنی زبانی اور پھر تزکیہ نفس کے علاوہ ارض و سما کا حقیقی مفہوم

اب تو خود مجھے اپنے آپ پہ شرم آتی ہے کہ تُو ساری عمر کیا کرتا رہا' بہر حال یہ اس کا صدقہ تھا' اس کا احسان تھا' عزیزانِ من! کہ میں ان ظلمات کی وادیوں سے نکل آیا۔ یہ کا ہے کے لیے سب کچھ کرو وَاَنۡفِقُوۡا مِمَّا جَعَلَكُمۡ مُّسۡتَخۡلَفِيۡنَ فِيۡهِ (57:7). پہلا قدم یہ ہے کہ یہ جو کچھ سامانِ رزق تمہیں ملا ہے' اسے نوعِ انسانی کی پرورش کے لیے کھلا رکھو۔ بلکہ ہر جاندار کی پرورش کے لیے کھلا رکھو۔ یہ سارا کچھ کرنے کے بعد پہلی چیز یہ کہی گئی ہے' ایک لفظ میں یہ بات بتا دی' جسے کہتے ہیں کہ صاحب! زمین کی ملکیت ہے' یہ زمین کی زمین ہی ہے نا جہاں سے یہ سب کچھ نکلتا ہے۔ وہ کھانے پینے کی چیزوں کی شکل میں نکلے یا اس میں سے وہ سامان ذرائع دھاتیں وغیرہ نکلیں' جن سے یہ سب چیزیں Industrialize ہو کر بنتی ہیں' کچھ بھی ہے یہ جو ارض انسان کی پرورش گاہ ہے' جو اس کے ذریعے جو سارے وسائل ہیں' وہ زمین ہی سے حاصل ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ پھر جب وہ آسمان کا وہ پانی جو ہے' وہ برستا ہے تو ان دونوں سے مل کر یہ ذرائع پرورش بن جاتے ہیں۔ اس لیے ارض و سما کہا۔

خدا کی اس کھلی زمین کو ذاتی ملکیت میں تبدیل کرنے کا عملی نتیجہ انسانوں کو جیل خانے میں قید کرنے کے مترادف ہے

اس سے کہا کہ یہ جو کچھ تمہیں حاصل ہو رہا ہے' زمین کو تم اپنی ذاتی ملکیت قرار دے لیتے ہو' لکیریں کھینچ لیتے ہو اس کرہ ارض کے اوپر' بڑی بڑی لکیریں ہیں' ان سے قومیں بن جاتی ہیں' پھر ہر قوم کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

ایں می کارد آں حاصل برد
امتِ بر امتِ دیگر چرد دانہ

دیکھیے یہ جو انسان نے لکیریں کھینچی ہیں تو ان لکیروں میں کیفیت یہ ہے کہ ایک لکیر کے احاطے کے اندر بسنے والے انسان دوسروں سے اپنے آپ کو الگ سمجھتے ہیں' الگ ہی نہیں بلکہ ان کو دشمن۔ ہر قوم کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوسری قوم جو ذرا اس سے کمزور ہو' اس کی تمام نعمتوں کے ماحصل کو کسی نے کسی طرح سے نچوڑ کے' کھسوٹ کے' اپنے ہاں لے جائے۔ وہ ہر قوم کی کوشش ہوتی ہے۔ یہ ساری کشمکش جسے آپ کے ہاں' سیاسی کہتے ہیں' وہ ہے ہی معاشی۔ حقیقت میں ہر قوم کی یہ کوشش ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ قوم کیسے بنی؟ وہ بنی یوں کہ ایک لکیر کھینچ دی ہوئی ہے' اس بڑی لکیر کا جو احاطہ ہے وہ جیل خانے کے اندر الگ الگ سیلز (Cells) ہوتے ہیں۔ اس احاطے کے اندر لکیریں کھینچ دیں اور کہا کہ یہ چوہدری فتح خان کی زمین ہے۔ بس لکیر کھینچی ہوئی ہے' پٹواری کے خانے میں رجسٹر اندراج ہے' اس میں یہ لکیر کہتی ہے کہ یہ اس کی ملکیت ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ یہ جو ملکیت کا دعویٰ ہے تم اس کا ثبوت تو پیش کرو۔ یہی کہو گے کہ میں فلاں سے خریدی کیا۔ یہ اس کی ملکیت تھی جو اس نے بیچی ہے۔ خلافِ قانون ہے کہ چوری کا مال جو بیچنے والا جو ہوتا ہے' اس کا خرید جنے والا بھی چور ہوتا ہے' دونوں کو سزا ملتی ہے۔ تم نے جو خریدی ہے تو کیا اس کا اطمینان کر لیا تھا کہ یہ اس کی ملکیت ہے؟ اس کی ملکیت کیسے ہوگئی؟ یہ کہو گے کہ میں نے اپنے باپ سے وراثت میں لی۔ ٹھیک ہے۔ باپ اگر چوری کا مال لے کر بیٹھا تھا اور وہ بیٹے کو وراثت میں مل گیا ہے تو وہ تو پھر چوری کا ہی مال تھا۔ اسے پیچھے لیے جاؤ جہاں تک جی چاہے' عزیزانِ من! سوائے اس کے کہ یہ لکیریں لگی ہوئی ہیں' آپ ثابت کریں گے۔ اس میں ملکیت ثابت نہیں کر سکتے' کسی مقام پہ بھی نہیں ثابت کر سکتے۔ سب سے پہلے انسان کی بھی ملکیت ثابت نہیں کر سکتے وہ زمین تو اسی طرح سے پڑی ہوئی تھی' انسان قابض ہو جاتا ہے پھر وہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس' جس میں قوت ہوتی ہے وہ اس پہ قابض ہو جاتا ہے۔

قوموں کی کشمکش بھی یہی ہے کہ زیادہ قوت والی قوم کمزور قوت والی قوم پہ جب قابض ہوتی ہے تو اس کی زمین پہ قابض ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سے یہ جو انفرادی ملکیت کے قصے ہیں' وہ زمینوں پہ لکیریں کھینچی ہوئی ہیں۔ وہ کوئی زبردست آتا ہے' وہ اس کو نکال دیتا ہے اور اس طرح پہلا قابض خون کے آنسو روتا رہتا ہے۔ اتنے سالوں سے بسنے والے انسان اپنا ڈھور ڈنگر کی طرح وہاں سے ہانکے چلے جا رہے ہیں جو نہیں اُٹھتا ان کو قتل کیا چلا جا رہا ہے۔ کمزور کے مقابلے میں قوت والا قابض ہو رہا ہے' پھر ان کی یہ ملکیت برحق ہو جائے گی' پھر یو این او (UNO) ان کے حق میں فیصلہ دے گا کہ یہ ٹھیک ہے' یہ اہلِ فلسطین کی زمین نہیں ہے' یہ اسرائیل کی زمین ہے۔ یہ کیا تماشا ہے؟ قرآن کیا کہتا ہے؟

کہا کہ اتنا ہی تمہارا استحقاق ہے کہ **جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ** (57:7) جو اس کے پہلے تھے اگر تم ان کو مالک کہو یا جو ان کا انتظام کرتے تھے' جس کے قبضے میں یہ چیز تھی' وہ چلے گئے تو پھر یہ تمہارے قبضے میں آ گئی' جسے تم کہتے ہو وہ اگر نہ چلے جاتے' زندہ رہتے' تو یہ

تمہاری ملکیت میں تو نہیں آ سکتی تھی۔تو ہوا تو اتنا ہی تھا کہ وہ چلے گئے' اس لیے تمہاری ملکیت میں آ گئی۔کیا بات ہے! تو اس سے یہ تمہاری ذاتی ملکیت تو نہیں۔اس کو کھلا رکھو۔یہ ہم نے ارض لِلْاَنَامِ (55:10) تمام مخلوق کے فائدے کے لیے پیدا کیا ہے' تمام جانداروں کے لیے ہے۔یہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (41:10) ہر ضرورت مند کے لیے یکساں طور پر اس کو کھلا رہنا چاہیے کیونکہ ہم نے اس غرض کے لیے اسے پیدا کیا ہے' ہم خالق ہیں' ہم مالک ہیں اور یہ اس کی غرض تھی جس کے لیے' ہمیں پیدا کیا ہے۔

زمین پر ذاتی ملکیت دراصل خدا کے مقابلے میں کسی کو خدا بنانا ہے

قرآن کریم نے اس کو مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا (2:165) کہا ہے کہ یہ جو تم اس کو ذاتی ملکیت میں دیدیتے ہو' یہ خدا کے ساتھ دوسرے خدا کھڑے کر لیتے ہو' تم ناجائز ملکیت والا جو دوسرا مالک ہے اسی کو تم اصطلاح میں شریک کہو گے یہی شرک ہوگا۔ایک رقبے کے دو مالک ہو جائیں۔کہا اتنی سی چیز تھی تو ہم نے تو اسے نوعِ انسانی نہیں' تمام جانداروں کی پرورش کے لیے ذریعہ نشو ونما بنایا تھا۔اس کو کھلا رکھو۔آگے کہا کہ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ (57:7) پہلے کہا ہے کہ اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (57:7) ان حقائق کو تسلیم کرو' ان پر ایمان لاؤ کہ یہ سچی چیز ہے۔ایمان کے معنی ہیں کہ اس بات کا یقین کہ یہ صحیح چیز ہے۔قرآن کریم کے دعاوی کی صداقت پر قلب اور دماغ کے اطمینان کے ساتھ یقین پیدا کر لینا' یہ ایمان ہے۔پہلے کہا تھا۔یہ ایمان کہا کہ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ (57:7) جو لوگ تم میں سے اس طرح سے ایمان لے آئیں گے' اُن حقائق کے اوپر جو ہم بیان کر رہے ہیں۔ وَاَنْفَقُوْا (57:7) اور اسے نوعِ انسانی کی پرورش کے لیے کھلا رکھیں گے لَھُمْ اَجْرٌ کَبِیْرٌ (57:7) یہ ہیں' جن کے لیے بہت بڑا اجر ہوگا۔انفاق وہ چیز ہے۔پہلا قدم یہ ہے۔آگے بات کہہ دی کہ وَمَا لَکُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ (57:8) یہ دلائل ہم نے دیئے' یہ وجوہات بیان کیں ہے' جب ان کا تمہارے پاس کچھ جواب نہیں تو پھر کیا ہو گیا ہے تمہیں کہ اس قسم کے خدا پر ایمان نہ لاؤ جو یہ ہدایات دیتا ہے۔کیا ہو گیا ہے تمہیں! پھر یہاں تو آ وَ۔ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (27:64) اپنے دعوے میں سچے ہو تو دلیل لاؤ۔دلیل تمہارے پاس کوئی ہو گی نہیں تو پھر؟

مقامِ رسالت کے پیشِ نظر اجتماعی طور پر ایک معاشرے کی تشکیل ایک فریضہ کی بجا آوری ہے

کہا کہ وَمَا لَکُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّکُمْ (57:8). اور رسول تمہیں دعوت دے رہا ہے' پکار رہا ہے کہ یہ جو ایک معاشرے کی تشکیل ہوتی ہے' اس میں ایک مرکز کی ضرورت لازم ہوتی ہے' دعوت دینے والا' بلانے والا' اپنے گرد جمع کرنے والا' اس کو کیمسٹری (Chemistry) میں First Crystal کہتے ہیں۔ایک ذرہ سا ہوتا ہے۔اس کے گرد تمام دیگر ذرے جمع ہوتے ہیں' پھر وہ اس سے ایک شے متشکل ہو جاتی ہے تو یہ پہلی چیز رسول کی یہی حیثیت نہیں ہوتی کہ وہ خدا کے پیغام کو دوسروں تک پہنچاتا

ہے بلکہ اس کی حیثیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ ان افراد کو یکجا کر کے ایک معاشرہ متشکل کرتا ہے جس کا First Crystal خود رسول ہوتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ (39:12) . پہلا مسلم یہ ہوتا ہے جس سے پھر نظام متشکل ہوتا ہے۔عزیزانِ من! اگر یہ نہ ہوتو پھر یہ ذرے الگ الگ تو رہیں گے' ریت کے ذروں کی طرح یہ چٹان نہیں بن سکیں گے۔ یہ نظام نہیں ہوگا' یہ افراد ہونگے۔ امت نہیں ہوگی۔اس کے لیے ضرورت ہے کہ ایک دعوت دینے والے کی۔

رسول کا اسوۂ حسنہ احکامِ خداوندی کا عکس ہوتا ہے

دعوت دینے والا سب سے پہلے ایمان بھی لاتا ہے۔رسول اللہؐ سے کہا گیا کہ امنوا باللہ تم بھی اسی طرح سے جو کچھ دیا گیا ہے وحی کی رو سے وہ اتنی سی بات ہی نہیں ہے کہ تمہیں دیا اور آگے پہنچا دیا' کہا کہ اس کے اوپر ایمان لاؤ' اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ (2:285) رسول ایمان لاتا ہے' پھر وہ مسلم کہتا ہے' قوانین کے سامنے جھکتا ہے. اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ (39:12) First Crystal بنتا ہے پھر وہ دوسروں کو دعوت دیتا ہے' کہ آؤ تو جب اس نظام کا یہ شیرازہ بکھر جائے تو اسے بارِ دیگر متشکل کرنے کے لیے وہی Process (عمل) ہوگا' جو قرآن حکیم کا Process دعوت دینے والا ضروری ہے لیکن وہ تو اسی صورت میں دعوت دے سکے گا کہ پہلے اپنے اندر وہ خصائص اور کشش اور جاذبیتیں پیدا کرے کہ جو دوسروں کو کھینچ کر اس کی طرف لے کر آئے۔ یہ ہے وہ اسوہ حسنہ رسول اللہؐ کا جو بتایا ہے تمہارے لیے۔جو رسول کا اسوہ ہے' وہ بہترین نمونہ ہے۔وہ نمونہ اس طرح بنتا ہے کہ اس نے اپنی ذات کے اندر ان خصوصیات کو پیدا کیا ہوتا ہے جو ایک مومن کی خصوصیات ہوتی ہیں اور پھر یہ جو افراد ہیں ان کی بھی یہ صورت ہے کہ اس قسم کے ہونگے تو اس کیطرف کھینچ کر آئیں گے۔

امت واحدہ کی تشکیل کے لیے وحی پر مبنی تصورات' ذہنی طور پر فولادیت کی نشو ونما کا موجب بنتے ہیں

جو فولاد نہیں وہ مقناطیس کی طرف نہیں جائے گا' مقناطیس کا موجود ہونا ضروری ہے فولاد کے ذروں کو اکٹھا کرنے کے لیے' لیکن ان ذروں کا فولاد ہونا بھی تو ضروری ہے۔ یہ خواہ وہ پروسیس جس سے نبی اکرمؐ تیرہ سال کی مکے کی زندگی میں یہ جو فولاد کے ذروں کے اوپر زنگ لگ گیا ہوا تھا' یوں کہیے کہ اپنی تعلیم و تربیت سے اس زنگ کو اتارا' فولاد کے ذرے تھے' یہ جو فولادی ذرے نہیں تھے (مثلاً) ابولہب اور ابوجہل' وہ نہیں آسکے تو اس نظام کو' اس دعوت کو' پورا کرنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہو جاتی ہیں: مرکزی اتھارٹی جس نے مقناطیس کا کام دینا ہے اور وہ افراد کہ جن کے اندر فولادیت ہے اسی لیے سورۃ الحدید اس کا نام ہے۔یوں یہ چیزیں اکٹھی ہوتی ہیں' عزیزانِ من! تو ایک اسلامی نظام متشکل ہوتا ہے .

ایمان وحی کی بنیادی اقدار کو عملی طور پر اپنانے کا دوسرا نام ہے

کہا ہے کہ وَالرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ لِتُؤۡمِنُوۡا بِرَبِّکُمۡ (57:8). رسول اپنے لیے نہیں تمہیں دعوت دیتا ہے کہ اپنے رب کے اوپر ایمان لاؤ۔ رسول کی دعوت تو یہ ہوتی ہے. کہا کہ وَقَدۡ اَخَذَ مِیۡثَاقَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ (57:8). ایمان لاتے وقت تو تم سے ایک عہد لیا گیا تھا بلکہ تم نے خود ایک عقد باندھا تھا' میثاق تھا' یہ معاہدہ کیا تھا' تم نے ایک وہ معاہدہ کیا تھا جو قرآن مجید کے اندر موجود ہے۔ یاد رکھو' عزیزانِ من! کوئی شخص جو مسلمان ہوتا ہے' جسے ہم کہتے ہیں ایمان لاتا ہے' تو وہ یہ چار الفاظ کہنے سے ایمان نہیں وہ لے آتا کہ اٰمنتو ا باللہ و ملائکۃ و کتبہ و رسلہ . یہ نہیں ہے' وہ ایک معاہدہ کرتا ہے اور معاہدہ یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَھُمۡ وَ اَمۡوَالَھُمۡ بِاَنَّ لَھُمُ الۡجَنَّۃَ (9:111). وہ معاہدہ کرتا ہے کہ میں اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہوں اور خدا کہتا ہے کہ اس کی قیمت میں ہم تمہیں جنت عطا کردیں گے یہ ان دونوں کے مابین ایک معاہدہ ہوتا ہے' اس سے ایک فرد مسلمان ہوتا ہے یا مومن ہوتا ہے تو کہا کہ تم نے تو پہلے ایک معاہدہ کیا ہوا ہے اس قسم کا' تو اس معاہدے پر عمل کرنے کا اب وقت آ گیا ہوا ہے بلکہ آ گیا ہے تو کہا کہ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ (57:8). یاد رکھو! واقعی اگر تم اس طرح سے ایمان لائے ہوئے ہو تو اب معاہدے کی پابندی کرو' جس معاہدے کی رو سے تم اس زمرے کے اندر داخل ہوئے تھے' اس انجمن کے' اس سوسائٹی کے ممبر بنے تھے۔

عزیزانِ من! سورۃ الحدید کی آیت 8 تک ہم آ گئے' 9 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

تیسرا باب: سورة الحدید (آیات 9 تا 13)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اپریل 1983ء کی 15 تاریخ ہے۔موسموں کا تغیر اگر معمول کے مطابق ہوتا تو ہمارے ہاں پنجاب میں تیرہ اپریل سے گندم کی کٹائی شروع ہوجایا کرتی تھی۔ یہ بیساکھی ❶ کا میلہ جشن ہوتا تھا۔گندم کی کٹائی یکم بیساکھ ❷ کو شروع ہوجاتی تھی اور اب کیفیت یہ ہے کہ آجکل سردی نومبر دسمبر جیسی ہے اور بارش کا موسم جولائی اگست جیسا ہورہا ہے۔اس کی وضاحت کی ضرورت اس لیے پڑی کہ اس موسمی آب وہوا کا اثر میری صحت پر بڑا مضر پڑتا ہے اور اس دفعہ تو آپ نے دیکھا ہوگا قریب چھ مہینے اسی طرح سے گزر گئے۔ اس کا اثر میری آواز پر پڑتا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ آواز کا اثر آپ کی ذوقِ سماعت پر کچھ گراں گزرتا ہے لیکن کیا کیا جائے ستم بالائے غم ہائے دگر مجبوری ہے۔درس کا آغاز سورۃ الحدید کی آیت 9 سے ہورہا ہے: (57:9)۔

نبی اکرم ﷺ کی قرآنی دعوت میں آپ کے ذاتی تصورات کا ذرہ بھر بھی دخل نہیں تھا

سابقہ آیت میں یہ کہا گیا تھا کہ وَالرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ (57:8) رسول تمہیں دعوت دیتا ہے' بلاتا ہے' پکارتا ہے خدا پر ایمان لانے

---

❶ بیساکھی: مشہور تہوار جو بیساکھ کی پہلی تاریخ کو منایا جاتا ہے۔

❷ بیساکھ۔ ہندی مہینہ جو 13 اپریل سے 13 مئی تک رہتا ہے۔

کے لیے۔ خدا کا تصور تو جیسا کہ آپ کو معلوم ہے Abstract ہے' مجرد ہے' غیر محسوس ہے۔ یہ جو رسول کی محسوس پکار ہے کہ آواز دیتا ہے' آپ کو اپنی طرف بلاتا ہے۔ اب درمیان میں ایک محسوس شخصیت آ گئی۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ جو دعوت دیتا ہے' وہ کس چیز کی طرف دعوت دیتا ہے؟ رسول اپنی ذات کیطرف دعوت نہیں دیتا۔ شخصیتوں کا اس میں سوال ہی نہیں ہے کہ فوراً ہی اگلی آیت میں بات واضح کر دی کہ ھُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِہٖ اٰیٰتٍ م بَیِّنٰتٍ (57:9). وہ دعوت دیتا ہے تمہیں اس قرآن کی طرف جو خدا کی طرف سے اس کے اوپر نازل ہوا ہے' اس کی آیات نے یہیں وضاحت کر دی۔ قرآن حمید کی آیات بیِّنٰت ہیں' مبین ہیں' واضح ہیں۔ سوال یہ بھی ہے کہ قرآن حمید کے نازل کرنے کا مقصد کیا ہے اور یہ جو رسول تمہیں اس کی طرف دعوت دیتا ہے اس کا مقصد کیا ہے؟ کہا کہ مقصد یہ ہے کہ لِّیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (57:9). اس قدر جامع مقصد ہے۔

نوعِ انسانی کی حد تک قرآن حکیم کے نزول کا حقیقی مقصد پیغام موت ہے ہر نوع غلامی کے لیے

عزیزانِ من! قرآن حکیم کے اندر یہ اور متعدد مقامات پر آیا ہے کہ یہ قرآن حکیم ہم نے اس لیے نازل کیا ہے کہ یہ تمہیں زندگی کی تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے۔ دو لفظوں میں اتنی جامع حقیقت بیان کر دی ہے کہ اس کے لیے نہ کسی وضاحت کی ضرورت ہے نہ کسی قسم کے اضافے کی ضرورت ہے: تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے۔ جہاں بھی قرآن حکیم میں یہ چیز آئی اس میں یہ ہے کہ تاریکیاں ظلمٰت تو جمع کے صیغے میں آیا ہے اور نور واحد کے صیغے میں آیا ہے۔ تاریکیاں مختلف قسموں کی ہو سکتی ہیں' روشنی کی مختلف قسمیں نہیں ہوتیں' وہ ایک ہی ہوتی ہے' غلط جواب کئی ہوتے ہیں' صحیح جواب ایک ہی ہوتا ہے' تو پہلی چیز جو ہے جس کی طرف یہ دعوت ہے وہ تمہیں مختلف اختلافات سے نکال کر ایک مرکز پر لاتا ہے اور وہ مرکز ہے یہ جسے النور کہا گیا ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے جو امت متشکل کی گئی ہے' وہ ہے اُمَّۃً وَّسَطًا (2:143). اس میں واحد کا صیغہ ہے۔ یہ ایک امت تو نور کے اوپر چلے گی' قرآن حکیم پر ایمان لانے والی ہوگی تو یہ ایک امتِ واحدہ ہوگی اور جتنے فرقے ہیں یہ سب ظلمٰت ہیں۔ یہ اگر النور ہوتے تو جمع کا صیغہ ان کے لیے نہ آتا۔ فرقے ہیں' یہ ہر فرقے کا ایک الگ الگ جواب ہے۔ سوچیے تو سہی کہ کیا ان کا رسول ایک ہے؟ قرآن حکیم تو ان کے ہاں ہے ہی نہیں۔ قرآن حکیم آئے تو فرقہ نہیں رہتا۔ فرقے کو قرآن حکیم شرک کہتا ہے۔ شرک کیوں کہتا ہے؟ ہر فرقے کا اس سوال کا جو جواب ہوتا ہے' وہ الگ ہوتا ہے' مختلف ہوتا ہے' کوئی ایک سے زیادہ جواب جب ہونگے تو شرک ہو جائے گا۔ النور کی تو یہ ہوگی کہ ایک ہی جواب ہوگا۔ اب یہ فرقے منسوب کرتے ہیں اپنے ان جوابات کو جن کے اوپر یہ چل رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی طرف تو عجیب بات ہوگی کہ ان کا رسول بھی ایک نہیں ہے۔ ذرا سوچیے تو سہی کہ بات کیا بنی؟ یہ امتِ واحدہ صرف دین میں باقی رہتی ہے کیونکہ اس میں جو سند اور حجت ہے' وہ ایک ہوتی

ہے اور وہ ہے جو خود قرآن حکیم نے بتا دیا کہ النور کیا ہے۔ یہ (64:8) اہم آیت ہے اور مقامات پہ بھی ہے لیکن میں ایک ہی آیت عرض کرتا ہوں۔

خدا تعالیٰ نے قرآن حکیم کی راہنمائی کو ایک ایسا النور کہا ہے جس میں ہر قسم کی ظلمات کا علاج مضمر ہے

کہا ہے کہ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا (64:8) قرآن حکیم کو خدا نے النور کہا ہے۔ بس یہ ہے النور، باقی سب ظلمات ہیں۔ تاریکیوں میں، اندھیرے میں ہوتا کیا ہے؟ یہ کہ وہم ہوتا ہے، قیاس ہوتا ہے، گمان ہوتا ہے۔ اندھیرے میں یقینی طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ یہ رسی ہے یا یہ سانپ ہے۔ ایک ماچس کی روشنی آ جائے تو پتہ چل جاتا ہے کہ رسی رسی ہے اور سانپ سانپ ہے۔ یہ جو اتنے اختلافات ہیں، باہمی فسادات ہیں، ہر ایک اپنے اپنے جواب کو صحیح کہہ رہا ہے تو یہ کیوں ہے؟ اس لیے کہ یہ روشنی نہیں ہے۔ روشنی کا تو کام ہی یہ ہے کہ وہ اختلاف مٹا دیتی ہے، کمرے کی ہر شے اپنے اپنے مقام پہ نظر آ جاتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ تاریکی میں یہ کیا ہے۔ اندھیرے میں یہ امتیاز ہی نہیں ہوتا۔ سب سے بڑا کام جو قرآن کریم کرتا ہے، وہ انسان کو انسانوں کی محکومیت سے چھڑا لیتا ہے۔ قرآن مجید نے خود بڑی وضاحت کی ہے۔ سورۃ ابراہیم 14 ویں سورۃ میں یہ کہا ہے کہ الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (14:1) یہ کتاب نازل کی ہم نے تیری طرف اے رسول! تا کہ تُو اس کے ذریعے لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے۔ عام طور پہ کہا جاتا ہے کہ چلتا ہوں تو آنکھوں کے آگے اندھیرا آ جاتا ہے، نظر ٹھیک نہیں آتا۔ کہنے لگے کہ میاں صاحب! یہ بڑھاپا ہے۔ پوچھا کہ حکیم صاحب! رات کو نیند نہیں آتی، آدھی آدھی رات تک جاگتا رہتا ہوں۔ کہنے لگے کہ میاں صاحب! بڑھاپا ہے۔ کہنے لگے کہ فیر (پھر) اوس طرح بنانے والے کی ایسی کی تیسی، جو بات کرتا ہوں کہتا ہے کہ بڑھاپا ہے، بڑھاپا ہے۔ کہنے لگے کہ میاں صاحب! یہ بھی بڑھاپا ہے۔ اس بڑھاپے کے اعتراض اتنے ہوتے ہیں، جی! کہا ہے کہ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (14:1)۔ کیا الفاظ ہیں کہ ظلمات سے نور کی طرف لے جائے گا اور اس کے بعد بتایا کہ یہ بات یونہی Abstract سی، مجرد سی، غیر محسوس سی، نہیں ہے۔ فوراً ایک محسوس، مرئی تاریخی شہادت سامنے لائے کہ بات سمجھ میں آ جائے کہ ظلمات کسے کہتے ہیں اور نور کی طرف کیسے لایا جاتا ہے۔

ظلمات سے وادیٔ نور کے لیے نورانی سفر کی داستاں کا ذکر

کہا کہ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (14:5) موسیٰ علیہ السلام کی طرف بھی ہم نے وحی میں یہ کہا کہ وہ اپنی قوم کو ظلمات سے نور کی طرف لے آئے۔ وہ ظلمات کیا تھیں۔ آیت کا اگلا حصہ ہے کہ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ

(14:5) اس قسم کی نور اور ظلمات کی جو کشمکش ہوتی ہے' اسے ایام اللہ' اللہ کے دن' کہہ کر پکارا ہے اور دن تو سارے ہی اللہ کے ہوتے ہیں لیکن وہ دن جس میں یہ کشمکش انتہا تک پہنچتی ہے اور الحق غالب آتا ہے اس کو اللہ نے اپنا دن کہہ کر پکارا ہے۔ آگے بات آئی کہ وہ ظلمات کیا تھیں جہاں سے نکال کر موسیٰ علیہ السلام نور کی طرف لے آئے۔ کہا کہ وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہِ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ اَنۡجٰکُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ (14:6) قومِ بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلائی اور انہیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آنے کا یہ پہلا قدم تھا۔

آزادیوں میں سب سے بڑی آزادی انسانیت کو انسانوں کی غلام سے آزادی دلانا ہے

عزیزانِ من! یہ پہلی چیز ہے اور میں کہتا ہوں کہ یہ بنیادی چیز ہے۔ انسانوں کی محکومیت کے اندر' انسانوں پر رحم' سب سے بڑی تاریکی ہے۔ یہ تاریکی کیا ہے؟ یہ تو اندھا ہی کر دیتی ہے' انسان کو پھر نظر ہی کچھ نہیں آنے دیتی۔ پہلی چیز یہ گنائی کہ یہ ظلمات کیا ہے۔ اس میں سے یہ جو تاریکی ہے' جسے تاریخی مثال کے طور پر بیان کیا کہ یہ تھی وہ سب سے بڑی تاریکی' جس سے اس قوم کو نکال کر وہ روشنی کی طرف' سینا کی وادیوں میں لے آئے تھے' جہاں وہ کسی انسان کے محکوم نہیں رہے تھے۔ پہلا قدم یہ ہے کہ دوسرے انسانوں کی محکومیت سے آزادی دلائی جائے۔ پھر وہاں اگلا قدم یہ تھا کہ پھر وہ خدا کے احکام کی جو غلامی ہے' اس میں ان کو لایا جائے' ان کی محکومیت کے اندر لایا جائے۔ پہلا حصہ لا الہ کا تھا کہ فرعون کی محکومیت کی' غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر نجات دلانا۔ اس میں ابھی Positive (مثبت) کوئی چیز نہیں آئی' یہ Negative (منفی) ہی ہے ابھی لیکن فرعون کی غلامی کی تاریکی تو اُٹھ گئی' انسانوں کی محکومت سے تو چھٹکارا حاصل ہو گیا۔ اگلی چیز پھر یہ ہے کہ جو مثبت یا Positive آئے گی کہ وہاں احکامِ خداوندی کی محکومیت' فرمانبرداری' اطاعت ہے۔ یہ اگلا حصہ ہے۔ قرآن کریم اس طرح سے تاریکیوں سے نور کی طرف لے آتا ہے اور یہ بعینہٖ ہماری مثال ہے۔

پاکستان کی تحریک بنی اسرائیل کی تاریخ سے مماثلت رکھتی ہے

میں نے کئی دفعہ یہ لکھا ہے کہ ہمارے پاکستان کی مثال بنی اسرائیل کی مثال ہے۔ جو کچھ اس میں ہوا ہے یا ہوا تھا' وہ صرف فرعون کی غلامی سے' آزادی سے ''سینا'' کی طرف ہم آئے تھے' جہاں ابھی کوئی ایسی Positive (مثبت) چیز نہیں تھی۔ پہلا قدم یہ تھا کہ وہاں ہندو اور انگریز کی غلامی سے آزادی دلا کر ایک قطعہ زمین میں لے آئیں' جہاں کسی انسان کی ابھی محکومیت یا حاکمیت نہ ہو اور اگلا قدم یہاں وہ ہونا تھا کہ جہاں پھر حاکمیت خود خدا کی ہو۔ بس ہم اسی حصہ لا الہ کے اوپر رہے' اور آگے بڑھ ہی نہیں سکے۔ ہم آگے Positive (مثبت) حصے کی طرف' الا اللہ کی طرف' آئے ہی نہیں ہیں اور پھر دوسرے مقامات پہ' یہ آپ کے سامنے آیا ہے کہ

جب یہ حصہ ہوا‘ اور ادھر آنے کی جو انہوں نے تبدیلیاں کیں‘ سوچا ہی نہیں‘ فکر ہی نہ کی‘ تو اس زمین کے متعلق جو قرآن کریم نے‘ خود خدا نے کہا تھا کہ اس کا پٹہ ہم نے تمہارے نام لکھ دیا ہے اٹھو اور اس کا قبضہ لے لو۔ کہا کہ اگر تمہارا اندازِ زیست یہی ہے کہ تم حصہ لا کے بعد آگے الا کی طرف بڑھتے ہی نہیں ہیں تو پھر وہ سرزمین‘ چالیس سال تک ان پر حرام قرار دیدی گئی۔ ڈرتا ہوں‘ عزیزانِ من!

حذر اے چیرہ دستاں‘ سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

لا کے بعد الا کے مقام کی اہمیت

خدا کسی کی رعایت نہیں کرتا۔ اس کا قانون یہ ہے کہ حصہ لا کے اندر کوئی قوم بھی زیادہ عرصے تک رہ ہی نہیں سکتی۔ یہ خلا ہوتا ہے‘ یہ Vacuum (خلا) ہوتا ہے‘ سانس لینے کے لیے تو ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلا قدم یہ تھا کہ وہ جو غیر خداوندی قوتوں کی غلامی تھی‘ اس سے نجات دلانا اگلا قدم الا کا ہے کہ پھر خدا کے احکام کی اطاعت کرنا۔ یہ نہ کیا جائے تو اس حالت میں ابدی طور پر کوئی قوم نہیں رہ سکتی اسی لیے خدا نے کہا کہ ہم نے اس زمین کو ان کے اوپر حرام کر دیا جس کا پٹہ ان کے نام لکھ کر دے دیا تھا۔ ہم نے یہ کہا کہ ہمارا یہ رسول تمہیں اس چیز کی طرف دعوت دیتا ہے جو تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے گی۔ یہ النور قرآن کریم نے کہا۔ خدا نے کہا کہ یہ قرآن مجید ہے اور اس کا منشا تاریکیوں سے روشنی کی طرف لانا‘ انسانوں کی محکومیت سے نکال کر قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کر لینا ہے۔ یہ ہر قسم کی آزادی دلا دیتی ہے۔ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (57:9) اللہ رؤف بھی اور رحیم بھی۔ وہ رؤف ہے کہ ان امور کو دفع کر دے جو ضرر رساں ہوں اور رحیم ہے کہ ایسے اور بہم پہنچا دے جو راحت رساں ہوں اور اس طرح وہ چاہتا یہ ہے کہ تمہاری پوری پوری نشوونما ہو جائے۔ تو یہ تھی وہ جو قوم موسیٰ علیہ السلام کی مثال دی کہ فرعون کی سرزمین سے ان کو نکال کر لے آئے۔ اس میں ان کی اپنی کسی جدوجہد کا دخل نہیں تھا۔ وہ وہاں سے نکل کر آ گئے تھے۔

قائداعظمؒ کا احسان عظیم ہے کہ پاکستان کے وقت تک کسی کو قطرہ خون تک نہ بہانا پڑا

ہمیں بھی تو یہ پاکستان مل گیا ہے۔ پاکستان کے حصول تک تو ایک قطرہ خون بھی نہیں بہا تھا۔ یہ تو تقسیم کے زمانے میں جتنی زیادتیاں ہوئی ہیں وہ اور چیز ہے‘ ورنہ یہ سرزمین تو ہمیں جیسے عدالت سے کسی کو ڈگری مل جاتی ہے‘ وہ تو اس مردِ دانا و بینا نے ہمیں بغیر ایک قطرہ خوں بہائے یہ ڈگری لے کر دیدی تھی۔ وہ جو تقسیم کے زمانے کے دوران ہماری وحشت انگیز تباہیاں ہوئی ہیں۔ اس سرزمین کی بات نہیں ہے یہ وہ پاکستان لینے کے لیے تھیں۔ پاکستان یعنی یہ خطہ زمین اس سے پہلے ہی مل گیا تھا۔ ہم کس مقام پہ ہیں؟ ہم اسی مقام پہ ہیں جہاں بنی اسرائیل تھے کہ وہاں سے تو سینا کی وادیوں میں آ گئے۔ آگے کوئی مثبت قدم نہ اٹھایا‘ ہم قوانین خداوندی کی فرمانبرداری میں نہیں آئے تو

رافت یا رؤف جو قرآن کریم نے کہا ہے' وہ ہے اس کا وہ حصہ لا کہ جس میں از خود ایک زمین کا خطہ مل جاتا ہے اور رحمت اس کی یہ ہے۔

قرآن حکیم اپنے ہاں انسان کو اپنا مال دوسروں پر خرچ کرنے کے بجائے اسے کھلا رکھنے کا حکم دیتا ہے' لفظ نیفق کا یہی مفہوم ہے

عزیزانِ من! پھر وہاں ہماری انسانیت کے لیے سامانِ نشو و نما ہوتا ہے اور وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے ہوتا ہے اور یہ اللہ کی رحمت ہے۔ اب اس کے لیے وہ پروگرام دیا گیا۔ آپ پچھلی آیتوں کے اندر دیکھیں گے' کہا ہے کہ **اٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا جَعَلَکُمۡ** (57:7)۔ یہ وہاں بھی تھا۔ پہلا قدم یہ ہے کہ اس نظام کی تشکیل کے لیے' انسانوں کی نشو و نما اور ربوبیت کے لیے' جو کچھ بھی کسی کے پاس زائد ہے' وہ اسے ان کے لیے دیدینا چاہیے' میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ یہ جو انفاق ہے' یہ انفقوا وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں' اس کا ترجمہ عام طور پہ خدا کی راہ میں خرچ کرو' کیا جاتا ہے۔ وہ خرچ کرنے کا تصور اور ہوتا ہے۔ وہ ہوتا یہ ہے کہ وہ چیز تو ہماری ہے' اس میں سے کچھ ہم نے دیدیا' جیسا کہ کہتے ہیں کہ اس مال میں سے ڈھائی فیصد دیدو۔ اگر یہ خرچ کر دو تو جو سارا مال ہے' وہ طیّب ہو جاتا ہے۔ یہ نفق یا انفقوا خرچ کرنا نہیں ہے۔ اس کے معنی ہیں ''کھلا رکھنا''۔ یعنی اس کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر' باندھ کر' نہ رکھیے' یہ حاجت مندوں' ضرورت مندوں کی' ضرورت پورا کرنے کے لیے کھلا ہونا چاہیے۔ اس کے لفظی معنی یہ کھلا رکھنا ہیں یہ تو جو اس کا نیفہ ہے۔ یہ لفظ تو آپ کے ذہن میں ہے' یہ ہمارے ہاں شلوار میں' پاجامے میں نیفہ ہوتا۔ جب ابھی یہ نوٹ روپے نہیں ہوتے تھے' تو وہ ایک اتنی سی بنی ہوئی میانی سی ہوتی تھی' اس میں روپے ڈالے جاتے تھے۔ اگر وہ اس کا اگلا حصہ بند ہوتا تھا تو اس کو یہ نہیں کہا جاتا تھا۔ نیفقٌ ایسی میانی کو کہتے ہیں کہ ادھر سے ڈالتے جائیں اور ادھر سے بھی کھلا ہو' جس کے دونوں منہ کھلے ہوں' عرب اس کے لیے یہ لفظ بولتے تھے۔ اگر اس کے اندر اس نے صرف ڈالنا ہی ہے اور نکالنا نہیں ہے تو اس کے لیے انفاق کا لفظ نہیں آتا تھا۔ انفاق آتا ہی وہاں تھا کہ جہاں آتا چلا جائے اور نکلتا چلا جائے۔

قرآن حکیم کے معاشی نظام کا ابتدائی قدم

کہتے ہیں کہ اسلام میں قرآن حکیم کا معاشی نظام کیا ہے۔ وہ معاشی نظام تو ایک لفظ کے اندر آجاتا ہے۔ جونہی وہ روپیہ کہیں اٹک گیا' انفاق کا لفظ ہی وہاں اس سے ختم ہو جاتا ہے۔ اب پہلا قدم اس کے لیے ہے کہ **وَ مَا لَکُمۡ اَلَّا تُنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ** (57:10) یہ تمہیں کیا ہو گیا کہ اپنی ذاتی ملکیت بنا کر بیٹھ گئے ہو اور اس پروگرام کے لیے جو خدا نے تمہارے لیے تجویز کیا ہے اور جس کا ترجمہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے یعنی دے دیا بابا! خدا کی راہ میں' یہ لفظ خیرات کے معنوں میں آ گیا ہمارے ہاں اس کا جو ترجمہ ہوا' یہ تو وہ پروگرام ہے

جو خدا نے ہمارے لیے تجویز کیا ہے۔ اس پروگرام کے حصول اور تکمیل کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ جو کچھ بھی کسی سے زائد از ضرورت ہے' وہ اس نظام کے حوالے کر دے۔ سوال یہ ہے کہ کاہے کے لیے کر دے؟ یہ نہیں ہے کہ وہ اس کے لیے غریبوں کو دیدیں وہ اس لیے کہ تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنا اس نظام کے ذمہ ہے تو وہ کہاں سے پورا کرے گا؟ وہ نظام یہ تھا کہ کوئی شخص اپنی ضروریات سے زیادہ اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔

خیرات کے متعلق نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی

ذاتی طور پر خرچ نہیں کرتا کہ یہ خیرات ہو جاتی ہے اور خیرات سے تو حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ خیرات سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں بھیک اور Charity (خیرات) کا تصور نہیں۔ یہاں کہا ہے کہ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (51:19) جن کی ضروریات اپنی محنت سے پوری نہیں ہوتی' وہ As of right (بطورِ حق) ڈیمانڈ کر سکتے ہیں۔ اس مال کے اوپر ان کا حق ہے اور انفرادی اس لیے نہیں کہ اس میں پھر احسان کا جذبہ آ جاتا ہے۔ آپ کسی ضرورت مند اور غریب کی اپنے طور پر مدد کیجیے تو وہیں سے اس کے ذہن میں احساسِ کمتری (Inferiority Complex) پیدا ہو جائے گا۔ اور آپ کے ذہن کے اندر Superiority Complex (احساسِ برتری) پیدا ہو جائے گا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ وہ اوپر کا دینے والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بڑھ کر ہوتا ہے' یہی تو وہ Complexes ہیں جو دونوں پیدا کر دیئے ہیں۔ وہ خیرات نہیں' وہ ایک نظام ہے جس نظام کے اندر ہر شخص کی ضرورت سے زائد جو کچھ ہے' وہ وہاں اس نظام میں جمع ہو جاتا ہے اور وہ نظام ضروریاتِ زندگی ہر شخص کی وہاں سے پورا کرتا رہتا ہے۔ یہ ہے قرآن کریم کا نظام۔

قدرت نے پوری کائنات کے خزانے تمام نوع انسانی کی انتظامی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے عطا کیے ہیں

کہا ہے کہ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (57:10). اس پروگرام کی تکمیل کے لیے کیوں نہیں تم کھلا رکھتے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ یہ بہت زور کی بات ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے لیے دلیل کیا ہے. کہا کہ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (57:10) یہ جو کچھ بھی ہے' یہ تمہاری ملکیت تو نہیں ہے' یہ تو ایک انتظامی ضروریات ہیں جن کے لیے جو فلاں ہے اس فلاں کے زیرِ انتظام اتنا لے لیا ہے۔ اس کے لیے دیدیا ہے تو تم مالک تو نہیں بن سکتے۔ اسے کھلا کیوں نہیں رکھتے؟ چٹھی رسان' جو منی آرڈر تقسیم کیا کرتا ہے' اگر وہ سمجھ لے کہ یہ منی (رقم) اسی کی ملکیت ہے تو خود ہی رکھ لے حالانکہ اس کا کام تو تقسیم کرنا ہوتا ہے۔ وہ حضرتِ عمرؓ نے صحیح کہا تھا کہ میرا فریضہ تو صرف خزانچی کا ہے' آتا ہے' جمع کرتا رہتا ہوں' جاتا ہے' اس کو لکھتا رہتا ہوں کہ فلاں کو یہ چلا گیا۔ میرا کام تو اس کے اندر اتنا ہے .

قرآن حکیم میں صحابہ کرام کے مقام کی وضاحت

کہا ہے کہ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ ۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا (57:10). یہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھی، جن کو صحابہ کبارؓ کہا جاتا ہے، کے متعلق قرآن کریم میں متعدد مقامات پر یہ آیا ہے کہ ان کے درجات بڑے بلند ہیں اور سیدھی سی بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے ان کے متعلق یہ متعین طور پہ کہہ دیا ہے کہ ان کے لیے مغفرت ہے اور ہم نے ان کے لیے جنت عطا کر دی ہے، تیار کر دی ہوئی ہے اور صحابہؓ میں تمام مہاجر اور انصار دونوں ہی شامل ہیں۔ یہ بہت اہم مقامات ہیں جن پہ یہ بات کئی دفعہ آ چکی ہوئی ہے۔ جب بھی پھر کہیں آئے گی دہراتا چلا جاؤں گا۔ مہاجر اور انصار دونوں کو یکجا جمع کر دیا (8:74)۔ کہا ہے کہ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا (8:74) وہ کہ جنہوں نے ہجرت کی، جہاد کیا خدا کے اس پروگرام کی تکمیل کے لیے اور وہ جنہوں نے ان لوگوں کو پناہ دی، مدد کی 'یہ انصار کہلائے'، وہ مہاجر کہلاتے تھے، دونوں کا ذکر کر دیا اور کہا کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا (8:74) یہ سب کے سب مومن حقا ہیں، پکے سچے مومن ہیں۔ اس میں ایک کی بھی استثنیٰ نہیں ہے۔ یہ تمام مہاجر تمام انصار ہیں۔ کہا کہ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (8:74) قرآن کی رو سے کسی ایک میں فرق نہیں کیا جا سکتا۔

عزیزانِ من! اب یہ رہا کہ ہوا یہ تھا کہ کچھ تو وہ تھے کہ جنہوں نے وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ (9:100) کیا، انہوں نے پہل کی، بڑی مصیبتیں، مصائب، تکالیف، مشقتیں اٹھائیں، جہاد کیے۔ کچھ وہ تھے جو بعد میں ان سے آن ملے۔ قرآن حکیم نے یہ تو کہا ہے کہ سیدھی بات ہے کہ وہ جنہوں نے اس زمانے میں یہ کچھ کیا کہ جب ایثار ہی ایثار تھا، قربانیاں ہی قربانیاں تھیں، کہیں کوئی چیز ایسی مشینی نہیں تھی کہ اس میں سے ہمیں بھی کچھ ملے گا، بلکہ اس دور کے اندر تو انہوں نے اپنی جانیں بھی دیدیں شہید بھی ہو گئے، انہوں نے وہ نظام دیکھا ہی نہیں ہے جس کے لیے ہم جانیں دے رہے ہیں، وہ کب قائم ہوگا؟ کیسا ہوگا؟ انہوں نے یہ دیکھا تک نہیں ہے وہ اتنے سارے وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ (9:100) تھے۔ قرآن کریم نے ان کو سبقت کرنے والوں میں سے سب سے اوّل کہا ہے۔ یہ جو بعد میں آئے ہیں، ان کی صورت یہ ہے کہ اتنی مصیبتیں مشقتیں نہیں رہیں، اور بعد میں آئے ہیں تو پھر تو یہ نظام قائم ہو گیا، مملکت قائم ہو گئی، یہ سلسلہ جاری رہا۔ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ یہ جو پہلے ''من قبل'' مکہ کے فتح ہونے سے پہلے سات سال کا جو زمانہ تھا وہ بڑی ہی آزمائشوں کا زمانہ تھا۔ اس میں جنہوں نے یہ کچھ کیا ہے اس میں شبہ نہیں کہ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً (57:10) ان کے مدارج خدا کے ہاں بڑے بلند تھے۔

یہاں بھی یہ چیز کہی کہ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْ ۢ بَعْدُ وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ (8:75) ان کو بھی اپنے سے

الگ نہ کرو، وہ سب بھی تم میں سے ہی ہیں۔ قرآن حکیم نے فرق یہ کہا ہے کہ وہ جو پہلے جنہوں نے یہ کیا، ان کے ایثار اور قربانی کے لحاظ سے ان کے درجات خدا کے ہاں بلند ہیں، ورنہ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى (57:10)۔ ان سب کے لیے ایک ایک کے لیے خدا کے بہترین وعدے ہیں، تم ان میں فرق نہیں کر سکتے۔ خدا کے ہاں ان کے درجات میں جو فرق ہے اور وہ ہونا چاہیے تھا، ایک وہ ہیں جو بنیاد کی اینٹیں بنتی ہیں، جن کے سر پہ ساری عمارت کا بوجھ ہوتا ہے، اور وہ کبھی ابھر کر اپنے آپ کو دکھا بھی نہیں سکتیں کہ ہم کہاں ہیں۔ ٹھیک ہے، لیکن کہا کہ یہ درجات ہمارے نزدیک ہیں، تمہارے نزدیک جو کچھ ہے وہ سمجھ لو کہ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى (57:10) ان سب کے لیے خدا کے بہترین حسین وعدے ہیں۔ ہر ایک کے لیے مغفرت ہے، وہ جنت ہے، ان سب کے لیے ہم نے دی۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (57:10) اور ہم جانتے ہیں یہ ہم نے تم پہ نہیں چھوڑا کہ تم فیصلے کرو کہ یہ جنّتی ہے، یہ جہنّمی ہے، اس کا درجہ بلند ہے، اس کا درجہ پست ہے، ہم طے کرنے والے ہیں۔ تم کون ہو یہ کرنے والے؟ اس لیے عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے ان کے لیے جو لفظ کہا ہے وہ ہے وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ (48:29)۔ کہا ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29) یہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جن کو کہا ہے حضور ﷺ کی ساری زندگی میں جنہوں نے بھی اسلام لا کر حضور ﷺ کا ساتھ دیا ہے، معیت ہے، وہ تمام کے تمام اس زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں، خواہ وہ فتح مکہ سے پہلے کے ہوں یا فتح مکہ کے بعد کے ہوں۔ حضور ﷺ کے ساتھیوں میں ان کا شمار ہو۔ ہمارے نزدیک یہ تمام کے تمام خدا کے ان وعدوں کے مطابق ان کے مدارج خدا کے ہاں بلند ہیں۔ ہمارے نزدیک ان سب کے لیے خدا کے حسنا وعدے ہیں اور سب ایک جیسے ہیں۔

قرآنی نظامِ حیات کے قیام کی خاطر اپنے وسائل کو کھلا رکھنے والوں کے لیے اجرِ عظیم

قرآن حکیم نے یہ کہا کہ جو تم اپنے مال سے دیتے ہو، بظاہر تو نظر آتا ہے کہ تم نے اپنے ہاتھ سے دیا۔ کہا ہے کہ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (57:11) یعنی خدا اس کو اپنے ذمے قرض قرار دیتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے! مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (57:10) اس کے لیے ہے لیکن کہہ یہ رہا ہے کہ جو کچھ تم اس وقت دیتے ہو یہ وہ دور ہے کہ جس میں اس زمانے میں ابھی Return کچھ نہیں تھی Investment ہی Investment تھی، دیئے جانا تھا۔ کہا کہ یہ دیئے جا رہے ہو۔ ٹھیک ہے، اس کاروبار میں ابھی تو کوئی ریٹرن (Return) نہیں ہو رہی لیکن یہ جو تم دے رہے ہو، یہ نہ سمجھو کہ یہ گیا۔ خدا تمہارا مقروض ہے کیسی خوش نمائندگی ہے صاحب! قرض ہے اور اگر اس کے قرض کے بھی گہرے معنی میں جایئے تو یہ جو جگالی کرنے والے مویشی ہوتے ہیں، آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ بیل گائے وغیرہ چرتے جاتے ہیں اور وہ ایسا ہوتا ہے کہ جو کچھ کھاتے ہیں، وہ معدے کے اندر انڈیلتے چلے جاتے ہیں، وہ جلدی جلدی چباتے نہیں ہیں، وہ

سارے کا سارا جمع کرتے ہیں۔اس کے بعد وہ اطمینان سے بیٹھتے ہیں۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ آنکھیں بند ہیں' پیٹ ہل رہا ہے اور وہ غڑم سے باہر نکلا ہے اور وہ اس کو چبا چبا کے اس قابل بنا رہے ہیں وہ جسم میں جذب ہو جائے' جزو بدن بن جائے۔اس کے بعد بنتا قرض کہتے ہیں اور مقروض یہیں سے ہے۔اس کو کاٹ کاٹ کر چھوٹا چھوٹا کرنا ہے۔

خدا کی راہ میں کھلا رکھنے والوں کے لیے اجر عظیم کی شکل وصورت

یہ قرض جو تم ہمیں دیتے ہو' کہا کہ یہ Raw Form کے اندر میٹریل ہے جو تم دے رہے ہو اور ہم جو تمہیں واپس دیں گے اسے تو وہ اس شکل میں دیں گے جب یہ تمہاری نشوونما کا ذریعہ بن جائے' accumulate ہو جائے۔یہ تمہیں ہم کر کے دیں گے اور تمہیں واپس دیں گے اور اتنا ہی نہیں دیں گے بلکہ کہا کہ فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ (57:11) اس سے بھی زیادہ۔زیادہ ہو تو عزیزانِ من! اپنی نوعیت کی اعتبار سے بھی یہ ہو جاتا ہے۔وہ Raw Material معدے میں اکٹھا ہوا' وہ جزو بدن نہیں بنتا' یہ جو خدا اس کی شکل پیدا کرتا ہے کہ وہ اس میں جزو بدن بن جاتا ہے' یہ اس میٹریل کے مقابلے میں خود یہی بڑا اضافہ ہے اور پھر وہ تو اسکے ساتھ پتہ نہیں کیا کچھ دیتا ہے تو اس لیے کہا کہ تم یہ ذہن میں نہ رکھو کہ تم نے دیا اور گیا' وہ دریا برد ہو۔کہا کہ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ (57:11). یہ ہے چیز جو اسکا بدلہ ہم دیتے ہیں۔ ریٹرن میں یہ تو دی ہی گئی لیکن یہ جو تم نے اس زمانے میں ایثار کیا تھا' جب ابھی کوئی ایسی چیز سامنے نہیں تھی کہ یہ ہمیں واپس بھی مل جائے گا اور ملے گا تو پھر کچھ ساتھ لے کر بھی آئے گا۔تم نے ہمارے وعدے پہ یقین کیا۔

خدا کو قرض دینے کے بدلے میں یہ زندگی اپنے ارتقائی مراحل کی نعمتوں سے سرفراز ہو جائے گی

تمہارے اس بھروسے اور یقین کے بدلے میں ہمارے ہاں تمہارا مقام بہت بلند ہو گیا ہے۔تم نے ہم پہ اعتماد کیا ہے۔کہا ہے کہ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ❶ (57:12)۔میں نے یہ عرض کیا تھا کہ قرآن کریم کی رو سے زندگی جوئے رواں ہے' یہ مسلسل آگے بڑھتی ہے' چلتی ہے' ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی بلند بھی ہوتی ہے' آگے بھی بڑھتی ہے' بلندیوں کی طرف بھی جاتی ہے۔یہ Evolution (ارتقا) ہے۔اس میں یہ دونوں چیزیں ہوتی ہیں کہ رُکے نہیں' بڑھتی چلی جائے اور بلند ہوتی چلی جائے۔قرآن کریم نے زندگی کا یہی تصور دیا ہے اور جسے جنت کہا گیا ہے' وہ زندگی یہاں سے مسلسل آگے چلتی ہے۔میں نے عرض کیا ہے کہ آپ کو یاد ہوگا کہ میں Life after Death والی جو بات ہے' یہ وہ نہیں کرسکتا۔یہ دراصل Life after Life ہے' ایک

---

❶ ایسے روشن کہ تُو دیکھے گا کہ مومن مردوں اور عورتوں کی پیشانیوں کا نور' ان کے آگے آگے' دائیں (بائیں) چل رہا ہوگا تا کہ ان کی زندگی کی تمام راہیں جگمگا اُٹھیں (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 1278)۔

مسلسل زندگی چلتی ہے اور وہ اس سے آگے بھی چلتی ہے' وہ اس سے اونچی بھی ہوتی ہے۔قرآن حمید کہتا ہے کہ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (84:19) یہ ایک طبقے سے دوسرا اونچا طبقہ ہوتا ہے تو یہ زندگی کی کیفیت ہے۔

جنت کے متعلق ہمارا موجودہ تصور

اب ہمارے ہاں عام طور پہ تصور یہی ہے کہ جنت میں گئے اور وہاں پھر ابدی طور پر اسی حالت کے اندر جنت میں رہنا ہے یعنی وہاں فراوانیوں سے وہ جو کچھ دیا ہوا ہے۔وہ دودھ کی نہریں اور شہد کی نہریں ہیں اور ہرنوں کا گوشت ہے اور حریر و اطلس ہے اور یہ اور وہ ہے اور زیورات وغیرہ ہے۔یہ سارا کچھ دے دلا دیا ہے۔ہم وہاں چلے گئے اب اس کے بعد کیا ہے؟ یہ کہ نہ کوئی کام' نہ کوئی کاج' صوفوں پہ لیٹے ہوئے ہیں یعنی تصور یہ ہے کہ بس کام کاج والی بات ختم ہے۔اتنے میں اس زندگی کے اندر خوش ہو سکتے ہو۔اے تین چار دن ہیٹ اوپر مرغی کھانی پئے نا' تے آدمی دی طبیعت بور ہو جاتی ہے۔او کیندا اے: کتھوں دال یا ساگ وی لے آؤ۔(یہ مسلسل تین چار دن مرغی کھانی پڑے تو آدمی کی طبیعت بور ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کہیں سے دال یا ساگ بھی تو لے آؤ)۔ انسان بور ہو جاتا ہے۔کتنی ہی Tasty چیزیں وہ کیوں نہ ہوں۔چند دنوں کے بعد اگر وہی کچھ ہے اس میں تنوع نہیں پیدا ہوتا تو انسان بور ہو جاتا ہے۔

جنت کی زندگی کسی سکوت کی متحمل ہونے کی بجائے عمل پیہم سے بھرپور ہوگی

اس زندگی میں' اگر آپ کو کوئی یہ کچھ دیدے اور کہے کہ صاحب! بس اسی طور پہ ہی تم نے رہنا ہے' کوئی کام کاج نہیں' کوئی تنوع نہیں' کسی قسم کا Change (تغیر) نہیں۔بس یہ ہے جو کچھ بھی ہے۔کیا ہے یہ جنت؟ اس کے لیے تو قرآن کریم میں لفظ جحیم ہے۔جو جہنم کے لیے وہ لایا ہے۔جہاں زندگی آگے بڑھنے سے رک جائے' وہ رک جانا ہے ایک مقام کے اوپر' جو جہنم ہے' جو جحیم ہے۔جنت میں قرآنِ کریم نے کہا ہے' یہاں صراطِ مستقیم کہا ہے' وہ صراط الحمید کہا ہے' وہ آگے جو یہ راستہ ہے' اس Mile Stone سے جو آگے بڑھے گا' تم جا کر دیکھو گے وہ سڑک یہاں کے مقابلے میں کہیں اچھی بنی ہوئی ہوگی اور اس میں کیفیت یہ ہے کہ یہ ایک لفظ ہے کہ وہاں مومن مرد اور مومنات خاص طور پہ یہ کہا ہے' اس خدا کو پتہ تھا کہ ہم نے ان مومنات کے متعلق کیا کہنا ہے۔اس نے ساتھ ہی مومن مرد اور مومن عورت لگا دیا۔کیا بات ہے صاحب! آگے بڑھیں گے۔

جنت میں مومنین اور محسنات کا ہر قدم نت نئی منزل کی طرف رواں دواں ہوگا

وہاں کوئی مانگی ہوئی روشنی نہیں ہوگی کہ جس سے پھر وہ راستہ طے کریں گے۔کہا ہے کہ نُورُهُمْ (57:12) ان کی پیشانی سے ایک سرچ لائٹ نکلے گی جس کی روشنی میں وہ اگلی منزلیں طے کریں گے۔کیا خوبصورت تشبیہ ہے! روشنی بھی مانگی ہوئی نہیں ہے۔حسنِ عمل کی

پیشانیوں سے جو نکلنے والا ''نورھم'' ہے' وہ آگے آگے چلے گا اور اس کی روشنی میں یہ اگلی منزلیں طے کریں گے تو کہا کہ بُشْـرٰكُـمُ الْيَـوْمَ (57:12) اِدھر اُدھر سے مرحبا کی آوازیں آئیں گی: تمہارے لیے خوشخبری ہے' اس دور میں تمہارے لیے بڑی خوشخبری ہے' مژدہ جاں فزا ہے یعنی عجیب بات ہے۔ قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ کس کی طرف سے یہ آواز آئے گی۔ کہا ہے کہ بُشْـرٰكُـمُ (57:12) ان کے لیے چاروں طرف سے یہ آوازیں آئیں گی کہ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا (57:12) ان کے لیے وہ باغات ہیں کہ جن کی شادابیاں خزاں نا آشنا ہوں گی' کبھی وہ افسردہ اور پژمردہ نہیں ہوں گے۔ اور ایک ہی مثال سے بات واضح کر دی کہ جس باغ کو رواں پانی ملتا رہے' اس کے پورے خشک نہیں ہوا کرتے۔ وہاں بھی یہ رواں پانی ہے۔ جہاں بھی آپ دیکھیں گے: تَجْـرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (57:12) جسے آپ کہتے ہیں کہ جاری پانی ہے۔ وہ رکا ہوا نہیں ہے' آگے چلے گا: تَـجْـرِیْ مِـنْ تَـحْتِهَـا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا (57:12) ہے۔ اور یہ ہے ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (57:12) یہ زندگی کی بہت بڑی کامرانی ہے۔

مذہب کی ساری تعلیم اور اس کے تصورات نجات کے گرد ہی گھومتے ہیں

عزیزانِ من! واہ واہ! ایک لفظ عجیب وغریب آ جاتا ہے صاحب! مذہب میں نجات کا تصور ہے۔ نجات یہ ہے کہ صبح اٹھے تھے' اچھے بھلے تھے۔ دس ایک بجے کے قریب سردی لگ گئی' ٹھنڈ لگ گئی' انفیکشن ہوئی' بخار ہو گیا' بخار رہا' اور اس کے بعد علاج کیا تو شام کو ٹمپریچر پھر نارمل ہو گیا۔ صبح میں اور شام میں کیا فرق پڑا؟ یہ کہ درمیان میں ایک تکلیف آئی اور اس کے بعد پھر آپ as you were (جیسے تھے ویسے ہی) ہو گئے یعنی وہی جو صبح ٹمپریچر تھا شام کو بھی ہو گیا۔ کمایا کیا ہے اس میں جی آپ نے؟ اس کا نام ہے نجات ہو گی۔ ہر مذہب میں یہ ہے کہ انسان کسی مصیبت کے اندر پھنسا ہوا ہو۔ یہ جو ویدانت اور آپ کا تصوف وہ یہ ہے کہ یہ انسان کی روح مادے کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے' چیخ رہی ہے' اب اس دلدل سے جو نکل جانا ہے' یہ ہے زندگی کا مقصد یعنی وہ پھنس گئی ہے' یہ پتہ نہیں پھنسا کس نے دیا ہے' تو کام اس کے لیے یہ رہا کہ کسی نے پھنسا دی ہے اور اس کو اس دلدل سے نکلنا ہے۔ ہندوؤں کے ''آواگون'' کے مطابق 33 کروڑ چکر سے باہر نکلنا ہے۔

عیسائیت کے لیے جنت کے حصول کا فارمولہ

عیسائیوں نے کہا کہ ہر پیدائشی بچہ گنہگار پیدا ہوتا ہے۔ اس گناہ کی آلائش کو دھونے کے لیے اس کو اس زندگی میں بھیجا جاتا ہے یعنی پہلے خدا اس کو گناہ کی آلائش دے کر پیدا کرتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ چل جا اب دھو جا کے اس میں اور کہتا یہ ہے کہ یہ اتنا پختہ ہے کہ یہ تمہارے دھونے سے دھل نہیں سکے گا۔ عیسائیت کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ انسان کے اعمال سے نہیں دھل سکتا۔ حضرتِ مسیحؑ کے کفارے پر

ایمان لانے سے وہ دھلتا ہے۔ خدا کا' خدائے حکیم کا' یہ پروگرام ملاحظہ فرماؤ کہ پیدا کرتا ہے تو ہر بچے کو ایک داغ لگا کے اتنا پکا ہوتا ہے کہ لاکھ کچھ کریں' وہ کچھ نہیں دھل سکتا' اس میں یہ ہے کہ جب خدا نے یہ دیکھا کہ اس طرح سے تو یہ سارے انسان جہنم میں چلے جائیں گے 'جنت میں بھی کوئی جا نہیں سکے گا تو کیا کیا جائے؟ اب یہ فیصلہ کر دیا کہ ان کے اعمال کے بدلے میں تو جنت مل نہیں سکتی' ایسے خود بخود ہی دھل نہیں رہا' تو اس کے لیے باپ بیٹے نے معاذ اللہ۔ ان کے عقیدے کے مطابق مشورہ کیا اور بیٹے نے کہا کہ افسوس کرنے کی بات نہیں ہے' آپ مجھے دنیا میں بھیج دیجیے' یہ مجھے پکڑ کر سولی پہ دیدیں گے' میرے خون کے بدلے میں آپ ان کو بخش دیجیے گا۔ وہ ہندو دھرم میں چکر دیئے جا رہا ہے تو یہ اس طرح سے اس دھبے سے اس کو نجات دلاتے ہیں۔

جنت کے سلسلہ میں بنی اسرائیل کا عقیدہ

ادھر یہودی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ تو جو بنی اسرائیل کے گھر میں پیدا ہوا' اس نے تو جنت میں جانا ہی ہے' بس چند دنوں کے لیے یونہی راستے میں وہ جہنم میں چلا جائے گا وہ اس لیے کہ ہمارے بزرگوں کو ابھی پتہ نہیں ہوگا کہ ہم جہنم میں چلے گئے ہیں۔ ہم چیخیں گے' روئیں گے' وہ آئیں گے' کہیں گے: او کاکا توں کتھے رونداپھرنا ہیگاں' چل گھر نوں۔ تے او فیر لے جان گے سانوں جنت اچ، (او بچونگڑے! تم کہا روتے پھر رہے ہو، گھر چلو تو پھر وہ ہمیں جنت میں لے جائیں گے)۔ یعنی یہ دنیا کے مذاہب میں ہے جسے آپ Salvation کہتے ہیں' جسے نجات کہتے ہیں۔ یہ تصور ہے کہ کچھ حاصل نہیں ہوا' as you were ہے' ہر جگہ as you were ہے' نجات کے معنی ہی یہ ہیں۔

قرآن حکیم نجات کی بجائے فوز کا تصور پیش کرتا ہے

قرآن حکیم کہتا ہے کہ نجات نہیں بلکہ ذٰلِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ(57:12)Achievement ہے' یہ بہت بڑی ہے جو تمہیں حاصل ہوئی ہے۔ ایک لفظ میں' عزیزانِ من! آپ کے ہاں نجات کا سارا تصور بدل دیا۔ Achievement اور Salvation میں جو فرق ہے' عزیزانِ من! یہ ہے اسلام کی فوقیت باقی مذاہب کے مقابلے میں۔ وہاں سب کچھ کرنے کے بعد بھی جو کچھ ہوتا ہے' وہ کسی مصیبت سے چھٹکارا ہوتا ہے' پھر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہاں اسلام میں جو زندگی کا پروگرام دیا جاتا ہے۔ وہ ہے فَوْزُ الْعَظِیْمُ (57:12) اس کے بعد بہت کچھ حاصل ہوگا۔ آگے کہا کہ یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِکُمْ (57:13) قرآن حکیم بتاتا یہ ہے کہ اس دنیا کے اندر جو کچھ کیا ہوگا' اسی کے جو نتائج ہیں اگلی زندگی میں ملیں گے' اس سے وہ Achievement کی زندگی متعین ہوگی۔ کچھ حاصل ہوگا تو زندگی کی اگلی منزل یعنی اگلی کلاس میں Promotion (ترقی) ہوگی' اس کی پاس مارکس حاصل کیے تو ہائر کلاس کے اندر چلا گیا۔ وہ نہیں ہے کہ وہاں جا کر کچھ کرے گا تو پھر وہ اگلی کلاس میں چلا جائے گا۔ وہ یہاں جو

اس نے محنت کی ہوگی' Examination Hold ہونے سے پہلے اس کا نتیجہ ہوگا' جو وہاں ملے گا۔ یہ بڑی سچی بات قرآن کریم کی رو سے کہی۔

کوئی انسان اصلاحِ عمل کے لیے اس دنیا میں نہیں آ سکے گا

اب اس دنیا کی جو اہمیت ہے وہ سامنے آ گئی۔ یہ کلاس میں چڑھنے کے لیے' امتحان پاس کرنے کے لیے' وہ یہاں ہے جو محنت کرنی ہے۔ وہاں جا کر اس کی پروموشن کے لیے کچھ نہیں کرنا وہ اگلی کلاس کی بات اور رہے گی اور جس نے یہ محنت نہیں کی ہوگی' وہ تو پاس نہیں ہو سکے گا' فیل ہوا اور وہاں جو Failed ہیں' ان کے لیے دوبارہ چانس نہیں ہے۔ وہ قرآن حکیم نے متعدد مقامات پہ یہ بات بڑی اہم کہی ہے۔ یاد رکھیے کہ اس کے بعد اس دنیا میں واپس آنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا' جو مر گیا ہے مر گیا۔ وہ اس کے لیے ٹھیک ہی لفظ ہے کہ وہ واپس نہیں آ سکتا۔ یہ جو آپ کے ہاں آئے دن قصہ ہوتا ہے کہ جی وہ آتا ہے' اس کی روحیں آتی ہیں' اور اسکی روح آئی' اور اس نے دروازے کھٹکھٹائے' اور پتہ نہیں کہیں آگ لگاتی ہے' کہیں یہ کرتی ہے۔ یہ عام قصے مشہور ہوتے ہیں۔ یہ سب افسانے ہیں۔ کوئی روح واپس نہیں آتی۔ قرآن حکیم ایک مقام پہ نہیں' متعدد مقامات میں کہتا ہے کہ جو گیا ہے وہ اس دنیا میں واپس نہیں آ سکتا۔ وہ انسان کی شکل میں تو ایک طرف رہا' جسے آپ روح کہتے ہیں' اس دنیا کے ساتھ اس کا معاملہ منقطع ہوا' ختم ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ جو مر گیا ہے وہ تو اگر تم اس کو آوازیں بھی دو' مرادیں مانگو' تو تمہاری سنتا ہی نہیں ہے۔ وہ سن سکتا ہی نہیں ہے اور اس میں ہے کہ بفرض محال سن بھی لیتا تو وہ تو تمہارا جواب ہی نہیں دیتا۔ کہ اسے تو اپنے متعلق بھی کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ میں کب اٹھایا جاؤں گا۔ اس دنیا کے ساتھ تعلق تو ایک طرف رہا' وہ جو ہے کہ وہ حضرت صاحب آئے اور ہماری کشتی پھنس گئی تھی' نکل نہیں رہی تھی' اور بڑی مشکل تھی ہم نے پھر پکارا تو حضرت عبدالقادر جیلانی تشریف لائے اور انہوں نے آ کر ایک کچھ کیا اور وہ کشتی پار چلی گئی۔ ہمیں دیکھتے ہی رہ گئے کہ معلوم ہوا کہ وہ حضرت صاحب تھے جو تشریف لائے تھے۔ سنیے! یہ سب افسانے ہیں۔ یہ افسانے بھی نہیں ہیں بلکہ یہ تصور قرآن حکیم کے خلاف ہے۔

جہانِ فردا میں مومنین کے مقابلے میں منافقین کی حالت زار

عزیزانِ من! کوئی واپس نہیں آتا۔ کہا کہ وہاں جانے سے مومنین کی تو یہ کیفیت ہوگی کہ وہ آگے بڑھتے چلے جائیں گے۔ یہ جو منافقین تھے وہ بظاہر مومنوں کے ساتھ رہتے تھے' اندر سے ان کے خلاف تھے' وہاں یہ ان سے کہیں گے کہ بھئی! ہم تو بالکل تاریکی میں ہیں' اپنی اس روشنی میں سے کچھ تھوڑا سا حصہ ہمیں بھی دو۔ ان سے کہیں گے (57:13) ان سے کہا جائے گا کہ قِيۡلَ ارۡجِعُوۡا وَرَآءَكُمۡ فَالۡتَمِسُوۡا نُوۡرًا (57:13) جو تاریکی میں وہاں سے آیا ہے' یہاں آنے کے بعد اس کو روشنی مل سکتی۔ یہ قرآن کریم میں ہے کہ وَمَنۡ كَانَ فِىۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰى فَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ اَعۡمٰى (17:72) جو یہاں سے اندھا گیا ہے' وہ وہاں بھی اندھا رہے گا۔ وہاں بینائی نہیں مل

سکے گی۔ان سے کہا جائے گا کہ وہ بینائی تو وہاں ملتی تھی' روشنی تو وہاں ملتی تھی' جاسکتے ہو تو وہاں جاؤ۔ وہاں جا کر پھر اکتساب ضیا کرو اور روشنی ملے گی۔ وہاں تم جا نہیں سکتے' یہاں پہ وہ مل نہیں سکتی۔ کہا کہ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُورٍ لَّهُ بَابٌ ط بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ (57:13) ایمان اور منافقت میں فرق کیا ہے؟ یہ ایک باریک سا پردہ ہوتا ہے۔ Otherwise (ورنہ) وہ منافق بھی بالکل شکل وشباہت' معاشرے میں رہن سہن مومن ہی نظر آتا ہے بس وہ سینے کے اندر ایک چیز ہوتی ہے۔

منافق کے سینے کی آگ اسے مسلسل عذاب میں مبتلا رکھتی ہے

قرآن حکیم نے دوسری جگہ اسے حِجَابًا مَّسْتُورًا (17:45) کہا ہے۔ ایک پردہ جو تمہیں نظر نہیں آسکتا۔ وہ پردہ ہوتا ہے اور واقعی منافقت ایک پردہ ہوتا ہے لیکن کہا کہ پردہ وہ ایسا ہوتا ہے جو نظر نہ آئے۔ فرق کتنا بڑا ہوتا ہے؟ کہا کہ فرق یہ ہوتا ہے کہ پردے کے ایک طرف والے جو ہیں' وہ رحمت ہی رحمت کے اندر ہیں' پردے کے دوسری طرف والے جو ہیں وہ عذاب ہی عذاب کے اندر ہوتے ہیں اور عذاب کی بات وہاں کی تو ہم بتا نہیں سکتے۔

ایک شخص' عزیزانِ من! بہروپ بدل کے اندر سے منافق ہو' کافر ہو' نہ ماننے والا ہو' فریب دہی کے لیے وہ اس جماعت کے اندر شامل ہوا ہو' ان جیسا بن کر رہ رہا ہو' اس کے لیے مسلسل عذاب ہوگا' جہنم کی آگ ہوگی جس میں سے وہ ہر آن گزر رہا ہوگا' قرآن کریم کہتا ہے کہ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ (64:4) وہ تو کہیں پتہ کھڑکے گا تو اس کو کہے گا کہ آئی مصیبت میرے لیے۔ یہ منافقت کی زندگی ہے۔ ایک وہ کھلا ہوا کفر ہے۔ دوسرا وہ کھلا ہوا ایمان ہے۔ دو الگ الگ زندگیاں ہیں۔ دھڑکا نہیں لگا ہوا ہوتا کھلے ہوئے کافر کو۔ ٹھیک ہے مخالفت کی زندگی ہے' دھڑلے سے وہ زندگی بسر کرتا ہے۔ مگر منافق اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ کہے۔ اس کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے' ہر آن اس کو یہ پتہ ہوتا ہے کہ مرا! یہ بھی میرے پیچھے چلا آ رہا ہے صاحب! میرے لیے کچھ کر رہا ہے صاحب! کہتے ہیں کہ اونہیں' یہ تو اپنے کام جا رہا ہے۔ کہنے لگا: نہیں' مجھے دھڑکا لگا ہوا ہے' ہر سائے سے ڈرتا ہے۔ اس کی حرکت سے ڈرتا ہے۔ منافقت بڑا سخت عذاب ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے کفار کو تو جہنم کے اوپر کے درجے میں رکھا ہے' منافقین کو سب سے نیچے کے درجے میں رکھا ہے۔ یہ ایک مسلسل آگ ہے۔ کہا ہے کہ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ o الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ (104:6-7) اس آگ میں جس کے شعلے اس کے دل کو ہر وقت لپیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ منافقت کی یہ زندگی ہوتی ہے' عزیزانِ من! تو کہا یہ ہے۔ بہر حال یہ مضمون آگے بھی مسلسل چلتا ہے اس لیے اسی آیت پہ ہم چھوڑتے ہیں۔

سورۃ الحدید کی آیت 13 تک ہم آ گئے' 14ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

چوتھا باب: **سورۃ الحدید** (آیات 14 تا 18)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج اپریل 1983ء کی 29 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحدید کی آیت 14 سے ہو رہا ہے: (57:14)۔

سابقہ آیت میں مومنین کا اور منافقین کا تقابل چلا آ رہا تھا، اُس آیت میں تو یہ کہا تھا کہ مومن اپنے ایمان اور عمل کی شمعوں کی روشنی میں زندگی کی گذر گاہیں طے کرتا ہوا آگے چلا جاتا ہے، بلندیوں پہ پہنچتا جاتا ہے۔ منافق تاریکیوں میں رہتا ہے، راستے اس کے سامنے روشن نہیں ہوتے اور کہا یہ گیا تھا کہ منافقین یہ کہیں گے۔ یہ چیزیں قرآن کریم تمثیلی انداز میں سمجھاتا ہے۔ ان تمثیلات سے اصل مقاصد یا اصولوں پہ نگاہ رکھنی چاہیے کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ اب وہاں وہ منافقین سے کہتا یہ ہے کہ یہ کچھ تھوڑی سی روشنی ہمیں بھی دیدیجیے کہ ذرا سا راستہ ہی روشن ہو جائے تو ان کو جواب دیا جائے گا کہ یہ شمعیں تو اس زندگی کے اعمال کے تیل سے روشن ہوتی تھیں جنہوں نے یہاں وہ نہیں کیے ان کی شمعیں گل ہو گئیں، ان پہ تاریکی چھا گئی تو اس کے لیے تو پھر واپس لوٹ کر وہیں جانا ہوگا اور وہاں واپس جا نہیں سکتے اس لیے کہ وَ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (17:72) معیار اس زندگی میں انسان کے اعمال، سیرت اور کردار کہا ہے کہ وہ کس قسم کے ہیں۔ یہاں عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔ یہ نہیں ہے کہ یہاں جہنم کی زندگی بسر کی اور وہاں گئے اور جنت

آپ کے نصیب میں آ گئی۔ پہلی آیت میں یہ کہا گیا تھا۔

مومن کی تعریف اس کی پہچان اور پھر اس کا انجام

اب اگلی آیت میں اسی کے تسلسل میں یہ ہے کہ یُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ (57:14). میں آیت بھی پوری بعد میں پڑھونگا اور پھر اس کا مفہوم بھی بیان کردونگا' میں پہلے عرض کردوں کہ قرآن کریم کی رو سے منافق ہوتا کون ہے؟ ہمارے ذہنوں میں تو یہ چیز ہے کہ کوئی شخص جو دل میں کفر رکھے اور ظاہر ایمان کرے' بنا ہوا مسلمان ہو' وہ منافق ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے لیکن وہی منافق نہیں ہوتا اور غور سے سنیے! قرآن کریم کہتا کیا ہے؟ مومن تو وہ ہے کہ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (41:30) جو ایک دفعہ دل اور دماغ کے پورے اطمینان سے اس نتیجے پہ پہنچ گئے کہ جو کچھ خدا نے کہا ہے' جو اقدار اس نے دی ہیں' وہ ابدی ہیں' حقیقی ہیں' ان پر ہمیشہ عمل کیا جائے گا اور ہمیشہ عمل کے معنی یہ ہیں کہ مومن کی سیرت ہی اس کے مطابق ڈھل جاتی ہے۔

مومن کی سیرت خود ان کی اپنی پہچان ہوتی ہے

مومن ہے تو اس کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کرے گا' اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوگا۔ آپ پورے یقین اور حتم کے ساتھ کہہ سکیں گے کہ یہ جو اس نے کہا ہے یہ اس کے مطابق کرے گا کیونکہ اس کا اس پر ایمان ہے۔ ایمان کے معنی ہی یہ ہیں کہ جس بات کے متعلق آپ نے کہد یا کہ یہ صداقت ہے پھر آپ کی پوری زندگی اس صداقت کی مظہر ہونی چاہیے اور ہوتی ہے اسی لیے یہ Predictable ہوتی ہے' انسان کہہ سکتا ہے کہ نہیں صاحب! یہ دوسرا اگر کہے بھی کہ صاحب! یہ وعدہ کر گیا ہے' یہ وعدہ خلافی کرے گا' انسان کہہ سکتا ہے کہ یہ وعدہ خلافی نہیں کرے گا اس لیے کہ یہ مومن ہے یعنی مومن کی پہلی بنیادی معیار اور پہچان اور اظہار ہی یہ ہے کہ اس کی سیرت اور کردار کے متعلق آپ کو کوئی شبہ نہ ہو منافق کے متعلق تو اس کی اپنی ہی بات ہے کہ اس کا ایمان کیسا ہے۔ یہاں یہ ہے کہ اس شخص کے سیرت اور کردار کے متعلق آپ کا ردِعمل کیا ہے؟ مومن کے متعلق آپ کا ردِعمل یہی ہے کہ نہیں صاحب! یہ ایسا نہیں کرے گا۔ اس نے وعدہ کیا ہے' یہ پورا کرے گا' یہ بددیانتی نہیں کرے گا بدمعاملگی نہیں کرے گا۔ وہ جو مومن ہے' میں نے عرض کیا ہے کہ اس کا تو مادہ (Root) امن ہے۔ مومن کے ساتھ معاملہ کرنے کے بعد آپ بالکل امن میں رہتے ہیں۔ آپ کو کسی قسم کا تذبذب نہیں ہوتا کہ پتہ نہیں کیا کرے' کیا نہ کرے۔ مومن یہ ہے۔

ایک ہندو کے نزدیک مسلمان ہونے کا معیار اور ایک تیلی کا کردار اور مومن ومنافق میں فرق

شاید میں نے پہلے بھی کبھی یہ واقعہ سنایا ہو۔ یہ ہمارا بچپن کا واقعہ ہے۔ میں ابھی چھوٹا سا تھا۔ گلی سے باہر ہندو تیل بیچنے والے کی ایک

دکان تھی۔ گاؤں کے تیلی مسلمان ہوتے تھے۔ وہ تیل لاتے تھے اس تیلی کے پاس بیچتے تھے' یہ ہندو پھر آگے بیچتا تھا۔ اس کا یہ تیل کا کاروبار تھا۔ پتہ نہیں کیا بات ہوئی' وہ ایک دن میں صبح نکلا' شاید مدرسے جانے کے لیے' چھوٹا سا تھا' اب آپ غور فرمائیے کہ اس زمانے میں ہندوؤں کا مسلمانوں کے متعلق کیا ردِ عمل تھا۔ اس نے مجھ سے کہا' مجھے اب تک یاد ہے' ہیرالال اس کا نام تھا' کہنے لگا: میاں جی' میاں جی! ذرا ادھر آنا۔ ہندو مسلمانوں کو' کوئی بھی ہو' میاں جی کہتے تھے۔ ذرا ادھر آیئے۔ میں وہاں گیا۔ کہنے لگے: اس چراغ دین کو دیکھیے وہ تیلی جو تھا۔ کہنے لگے: یہ مسلمان ہو کر جھوٹ بولتا ہے۔ ہندو لالہ ایک گاؤں کے تیلی کے متعلق یہ کہہ رہا ہے۔ اس کے لیے یہ چیز ناقابل قبول تھی' ناقابل تسلیم تھی یعنی وہ اس بات کے اوپر حیرت تھا کہ وہ ایک چھوٹے سے بچے سے یہ کہہ رہا ہے کہ دیکھنا میاں جی! مجھے اب تک یاد ہے: یہ مسلمان ہو کر جھوٹ بولتا ہے۔ پتہ کیا تو بات روپے آٹھ آنے کا معاملہ تھا۔ اس زمانے میں کوئی آٹھ آنے' روپے' بڑی بات ہوتی تھی اور پھر اس قسم کا جو مزدور ہے کہ جس نے کہیں سے وہ سرسوں یا تل لیے اور پھر اس میں سے تیل نکالا اور اٹھا کر لایا' یہاں آ کر بیچا' بیچنے کے بعد جو اس میں سے بچا' وہ پتہ نہیں اس کے کتنے دنوں کی محنت تھی۔ جس کا ایک روپیہ کا معاملہ تھا۔ اس نے یہ سنا تو میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے اپنے گدھے کو ہانکا اور چل پڑا۔ اس نے آواز دی کہ معاملہ چراغ دین جانے دو' بات صاف ہو گئی ہے' وہ اپنا روپیہ لیتے جاؤ۔ اس نے وہیں سے کہا کہ لالہ! اب تو اگر ایک روپیہ چھوڑ' سو روپیہ بھی ہو گا' میں نہیں لوں گا' تم نے مجھے نہیں' میرے اسلام کو ذلیل کیا ہے۔ گاؤں کا ان پڑھ تیلی' یہ ہے ایمان۔ وہ کہتا ہے کہ مسلمان ہو کر جھوٹ بولتا ہے' تعجب ہے' اس کو حیرت ہے کہ یہ کیا انہونی بات ہے۔ یہ سننے کے بعد اس کی کیفیت یہ ہے۔ پتہ نہیں وہ ایک روپیہ بیچارے کے کتنے دنوں کی مزدوری بنتی ہو گی۔ اس نے یہ کہا کہ یہ تو اگر سو روپیہ بھی ہوتا تو میں اب واپس نہیں آتا' تم نے مجھے نہیں' تم نے اسلام کو گالی دی ہے۔

چھوٹے سے پیمانے پہ میں عرض کرتا ہوں کہ مومن کی پہچان یہ ہے کہ جب وہ آپ سے کوئی بات کرے' کوئی وعدہ کرے' تو آپ پھر اس کی طرف امن میں آ جائیں۔ پھر آپ کو تذبذب نہ ہو۔ اب میں نے یہ جو لفظ تذبذب بولا ہے۔ یہ منافق کے لیے ہے۔ منافق کے متعلق قرآن حمید کہتا ہے کہ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ (4:143) اس کے متعلق یقینی طور پہ کوئی Predict ہی نہ کر سکے' کہہ ہی نہ سکے کہ کل کو یہ کیا کرے گا۔ وہ بھی وعدہ کرتا ہے' خدا کی قسم بھی اٹھاتا ہے' اپنے ایمان کا اظہار بھی کرتا ہے' یہ سب کچھ ہے۔ یہ کونسی بات ہے کہ دونوں میں یہ فرق ہے؟ وہ فرق یہ ہے کہ مومن پابند رہے گا' اپنی اس بات پر جو اس نے کہا ہے کہ میں خدا پہ ایمان رکھتا ہوں۔ منافق کے متعلق آپ کو یقین ہی نہیں ہو گا کہ یہ کیا کرے گا۔

لفظ مذبذبین کا لغوی مفہوم اور اس کی عملی زندگی

عزیزانِ من! یہاں قرآنِ کریم نے "مُذَبْذَبِیْن" (4:143) کہا ہے۔ کیا بات ہے ان عربوں کی! کیا زبان تھی ان کی! مذبذبین (کا مادہ ذ ب ب ہے) ذباب مکھیوں کو کہتے ہیں اور اس کا واحد ذبابۃ ہے۔ غور کیجیے کہ وہ ہزاروں سال پہلے "عرب جاہلیت کا زمانہ تھا" علم وفضل کی وہاں روشنی تک بھی نہیں ہے' وہ الفاظ کیسے بناتے تھے۔ منافقت کے لیے یہ تذبذب کا جو لفظ ہے مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ (4:143) یہ قرآن نے دیا ہے پھر اس کی تصدیق کہاں ہوتی ہے (Erwin Schrodinger (1887-1961)) نے بڑی عمدہ ایک کتاب Limitations of Sicence لکھی ہے۔ وہ بات یہ کہنا چاہتا ہے کہ جو صاحبِ اختیار ہے' اس کے متعلق آپ Scientific Method (سائنسی طریقے) سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا کرے گا۔ وہ Discussion (گفتگو) یہ کر رہا ہے۔ وہ یہ کہہ رہا ہے کہ ایک سائنسدان بھی حتم ویقین سے یہ کہہ سکتا ہے کہ سو سال کے بعد سورج کو گرہن لگے گا' کتنا لگے گا' کتنے بجے لگے گا' اور پھر وہ سورج چٹ صاف ہو جائے گا اور یہ بالکل ٹھیک ہو گا (کیونکہ وہ صاحبِ اختیار نہیں) مگر دس سائنسدان بھی اگر ایک میز کے گرد بیٹھے ہوں اور اوپر ایک مکھی آ کر منڈلا رہی ہو تو وہ دس کے دس' مل کر بھی یہ نہیں بتا سکیں گے کہ یہ مکھی کہاں بیٹھے گی اور اگر بیٹھ گئی ہے تو اس کے بعد وہ نہیں بتا سکیں گے کہ یہ اڑ کر دوبارہ کہاں بیٹھے گی۔ یہ جو مکھی جیسا زندگی کا طرزِ عمل ہے کہ کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ اڑ کر کہاں بیٹھے گی' عرب اس کو منافق کہتے تھے۔ نہ سنیے' عزیزانِ من! ہم میں سے ہر ایک کے اوپر یہ وارد آ جائے گا۔ ہم آپس میں روز صبح سے شام تک وعدہ کرتے ہیں' دشمنوں کے ساتھ نہیں' بڑے قریبی دوستوں کے ساتھ وعدے کی بات کرتے ہیں۔ کیا اس کے بعد واقعی آپ کو امن آ جاتا ہے کہ ہاں صاحب! جو بات ہو گئی ہے' وہ واقعی ایسے ہو گی اور پھر وہ ہے ایسی بات کہ وہ سورج گرہن کی طرح اسی طرح سے سو سال کے بعد بھی ویسے لگے یا وہی کیفیت ہے۔

مومن' منافق اور کافر میں فرق کا تعین

کہا ہے کہ مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ (4:143)۔ مکھی کی سی کیفیت یہ ہے کہ کوئی بتا ہی نہ سکے کہ کہاں بیٹھے گی' کہاں اُٹھ کر جائے گی۔ یہ جو کردار ہے' یہ جو کیریکٹر ہے' اس کا نام منافقت ہے۔ یہ پردہ تو آپ اٹھا کر یا پھاڑ کے دیکھ بھی سکتے ہیں کہ یہ جو بظاہر مسلمان ہے' دل کے اندر سے یہ مسلمان نہیں ہے۔ اس کا کیریکٹر بتائے گا کہ وہ مومن ہے یا وہ منافق ہے۔ کافر تو وہ ہے جو اسی وقت آپ سے کہہ دے کہ نہیں بابا! مجھے یہ منظور نہیں ہے' اسے نہیں مانتا ٹھیک ہے۔ منافق وہ ہے جو قسمیں کھا کھا کر آپ سے کہے کہ نہیں صاحب! بالکل نہیں' آپ غلط فہمی میں مبتلا ہیں' ایسا نہیں ہو گا' میں اپنے معاملے کے اوپر بالکل پکا ہوں لیکن آپ کہہ نہ سکیں کہ یہ کیا کرے گا اور پھر اس کے بعد

اس کا جو کردار ہے وہ خود یہ بتائے کہ اس نے کہا کیا تھا اور کرتا کیا ہے۔ یہ جو کردار ہے' یہ جو سیرت ہے' یہ جو کیریکٹر ہے' یہ جو ردِ عمل ہے' یہ متعین کرتا ہے کہ یہ منافق ہے یا مومن ہے اور وہ جو ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا (41:30) کہہ دیا اور اس بات کے اوپر جم کر کھڑے ہو گئے۔ تو امن میں تو آپ انہی افراد کے ساتھ معاملہ کرنے میں رہیں گے جن کے متعلق آپ کو یقین ہو کہ جو اس نے کہہ دیا ہے' یہ اس پر جم کر کھڑا ہو گا' کچھ بھی ہو جائے یہ اِدھر اُدھر نہیں ہو گا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس کے اوپر اس کا ایمان ہے اور جن کے متعلق آپ یہ کہیں کہ پتہ نہیں۔ وہ جو آپ کا سیاست میں' روز رونا رویا جاتا ہے' وہ کیا ہوتا ہے؟ آپ دیکھیے گنتی میں تو ووٹر آپ کے ساتھ سو میں سے ڈیڑھ سو ہوتا ہے' بکس کھولیے تو اس میں سے پچاس بھی نہیں نکلتے۔ میں تو یونہی ایک ایسی مثال دے رہا ہوں۔ بعد میں دہائی مچ جاتی ہے۔ زندگی میں قدم قدم پہ ہمارے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ کسی شخص کے ساتھ آپ معاملہ کیجیے۔ اس کے بعد آپ مطمئن اور امن میں نہیں ہوتے کہ صاحب! یہ پتہ نہیں کہ وہ اس کے اوپر عمل کرے گا بھی یا نہیں کرے گا۔ یہ ہے منافقت۔

جہانِ فردا میں منافقین کی مومنین سے التجا اور ان کا جواب

آیئے جناب! کہا کہ منافق ان مومنین سے کہیں گے کہ ہم نے تمہیں آواز دی تھی اور کہا تھا کہ کچھ تھوڑی سی روشنی ہمیں بھی مانگے سے دیدو۔ تم نے کہا تھا کہ یہ روشنیاں مانگے سے نہیں ملا کرتیں' یہ اپنے خونِ جگر سے' جو چراغ جلایا جاتا ہے' یہ اسی کی لَو ہوتی ہے جس میں انسان زندگی کا سفر طے کرتا ہے' یہ مستعار نہیں مل سکتی۔ انہوں نے کہا کہ یُنَادُوۡنَهُمۡ اَلَمۡ نَكُنۡ مَّعَكُمۡ (57:14). تم تو ایسی بات کرتے ہو کہ جیسے ہم کچھ اور تھے تم کہیں اور تھے' ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے۔ بالکل ساتھ تھے۔ مردم شماری کے رجسٹر میں سب مسلمان لکھا ہوا ہوتا ہے۔ ہم روز کہتے ہی اپنے آپ کو مسلمان ہیں' منافقین کا کوئی الگ ٹولہ ہی نہیں ہوتا' کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ جامعیت کے ساتھ قرآن کریم یہ مثال بھی بیان کرتا ہے تو جس جامعیت کے ساتھ بیان کرتا ہے وہ ہے۔ قَالُوۡا بَلٰى (57:14). وہ کہیں گے کہ ٹھیک ہے جیسا تم کہتے ہو ساتھ تو تھے تم ہمارے۔

قرآن حکیم نے Dual Personality (دوہری شخصیت) کی اس نفسیاتی اصلاح کو دلوں کا روگ کہا ہے

اب سنیئے' عزیزانِ من! وہ بات جو میں نے ابھی کہی ہے کہ ان کا کردار کیا ہے۔ کہا کہ وَلٰـكِنَّكُمۡ فَتَنۡتُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ (57:14) پہلی بات یہ کہ تم خود فریبی میں مبتلا ہوا' اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو۔ کیا بات ہے قرآن حکیم کی! دوسرے کو دھوکا دینے والا اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوتا ہے۔ یہ Dual Personality (دوہری شہریت) ہو جاتی ہے۔ دورِ حاضر کی نفسیات کی Dual Personality ایک اصطلاح ہے۔ آپ سے وعدہ کرتا ہے' اسی وقت اندر سے اس کی اپنی یہ بات ہوتی ہے کہ میں نے یہ پورا نہیں کرنا۔ Dual

Personality (دوہری شخصیت) ہے۔قرآن حکیم کہتا ہے کہ فِی قُلُوبِھِم مَرَض ان کے دلوں کے اندر ایک روگ ہے۔ چودہ سو سال پیشتر قرآن حکیم کی اصطلاحیں' عزیزانِ من! آج آپ کے ہاں کے یہ نفسیاتی معالج اصطلاحوں کو باقاعدہ Adopt (اختیار) کر رہے ہیں اب تو یہ ایک طب بن گئی ہے۔نفسیاتی امراض جو ہیں ان کا علاج سائیکولوجی کے ذریعے سے' سایئکاٹرسٹ وغیرہ کرتے ہیں۔ Dual Personality بن جاتی ہے ٹھیک ہے تم ہمارے ساتھ تو تھے وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ (57:14) تم نے اپنے آپ کو دھوکا دے رکھا تھا۔دھوکا کیا تھا؟ کہا ہے کہ وَتَرَبَّصْتُمْ (57:14) تم ہر معاملے میں انتظار کرتے رہتے تھے کہ پلڑا کس طرف کا بھاری ہے' کھڑے دیکھتے رہتے تھے یعنی تمہارا اپنا جو ردِ عمل تھا' جو فیصلہ تھا' وہ اس بات پہ تھا کہ دیکھیں' پلڑا کس کا جھکتا ہے اور اپنی کیفیت یہ تھی کہ وَارْتَبْتُمْ (57:14) تم ہر معاملے میں انتظار کرتے رہتے تھے کہ پلڑا کس طرف کا بھاری ہے' کھڑے دیکھتے رہتے تھے یعنی تمہارا اپنا جو ردِعمل تھا' جو فیصلہ تھا' وہ اس بات پہ تھا کہ دیکھیں' پلڑا کس کا جھکتا ہے [1] اور اپنی کیفیت یہ تھی کہ وَارْتَبْتُمْ (57:14) تم ہر وقت شبہ میں ہی رہتے تھے۔

عربی زبان میں اصطلاحات کی نوعیت اور پھر ان میں باہمی فرق کی شکل وصورت

یہ ''شک'' اور ''ریب'' دونوں ہی عربی زبان کے الفاظ ہیں۔''ریب'' شک کے معنوں میں ہی آتا ہے لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ عربی زبان میں کوئی الفاظ بھی مرادف نہیں ہوتے' یعنی دو لفظوں کے Exactly (ہو بہو) وہی معنی نہیں ہوتے عربوں کے رو سے۔تو ان لوگوں کی کیا بات تھی! یہ زبان کی بڑی وسعت ہے کہ کسی ایک چیز کے لیے ایک سے زیادہ الفاظ ہوں ان کی کیفیت یہ تھی کہ ان کے ہاں اونٹ کے لیے 5744 الفاظ' تلوار کے لیے ایک ہزار الفاظ تھے [2]۔لیکن کوئی سے دو الفاظ بھی ایک معنی نہیں دیتے تھے' ان میں Shades کا فرق ہوتا تھا۔ریب ان کے ہاں شک کے معنوں میں تھا' اسے وہ شک کہتے ہیں لیکن ''ریب'' اس شک کو کہتے ہیں جس شک سے آپ کے دل میں اضطراب پیدا ہو جائے۔ایک تو باہر کے کسی معاملے میں ایک شک ہے کہ (مثلاً) یہ جو بندوق چلی ہے' یہاں چلی ہے یا وہاں چلی ہے' آپ ذاتی طور پہ اس سے متعلق نہ ہوں لیکن اگر یہ بات ہو کہ آپ کا بچہ باہر گیا تھا' کہیں اس کو نہ لگ گئی ہو۔اب یہ یقینی بات تو ابھی نہیں ہوئی ہے' شک کی بات ہے۔اس شک سے آپ کے دل میں ایک اضطراب پیدا ہوا۔اس کے لیے وہ ''ریب'' کا لفظ استعمال کریں گے۔

---

[1] Sitting on the Fence

[2] حوالے کے لیے دیکھیے: Richard Maurice Bucke: Cosmic Consciousness, PP.30-31

قرآن حکیم میں شک کے لیے ریب کا لفظ استعمال کیا ہے

کہا ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (2:2) اس کتاب کے ذریعے جو تمہیں یقین پیدا ہوگا' پھر تمہارے دل کو اضطراب نہیں رہے گا صاحب! ایک لفظ ''ریب'' کے اندر یقین اور عدمِ اضطراب یا سکون کی کیفیتوں کو بیان کر جانا' یہ ہے زبان عربی۔ تمہاری کیفیت یہ تھی۔ کہا ہے کہ وَارْتَبْتُمْ (57:14) تمہیں شک تھا اور ایک ایسا شک تھا جو تمہارے دلوں کو اضطراب میں رکھے ہوئے تھا کہ پتہ نہیں یہ ہو کہ پتہ نہیں وہ ہو' کہیں مس نہ کر جائیں چانس' ذرا اور غور سے دیکھو معاملے کو' دیکھو! عجیب قسم کا اضطراب ہوتا ہے' امن نصیب نہیں ہوتا۔ مومن تو وہ ہے جسے امن نصیب ہوتا ہے .

ذاتی مفاد کی کیفیت انسان کو ہمیشہ اضطراب میں مبتلا رکھتی ہے

یہ ہے وَارْتَبْتُمْ (57:14) تم نظامِ خداوندی کی صداقت کے بارے میں ہمیشہ شک اور اضطراب میں رہتے تھے۔ کہا کہ تم یہ سارا کچھ کیوں کرتے تھے؟ قرآنِ کریم نے جواب میں کہا وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ (57:14) تمہارے پیشِ نظر ذاتی مفاد تھا' اس نے تمہیں یہ دھوکا دے رکھا ہے کہ تم کیا روش اختیار کرو گے۔ جو کچھ کہہ بیٹھا ہوں' اس پہ جما رہوں یا اس میں سے پھر نکلنے کی راہیں تلاش کروں جو آپ کو پتہ ہے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ دکاندار سودا کر کے آیا اور آ کر اپنے لڑکے سے کہا کہ میں یہ سودا کر آیا ہوں۔ اس نے کہا کہ ابا جان! غلطی کی۔ اس میں تو نقصان ہو جائے گا۔ کہنے لگے کہ کوئی بات نہیں۔ کوئی گل نئیں' اسی رپھڑ پا دیاں گے (کوئی بات نہیں۔ ہم ہنگامہ کھڑا کر دیں گے) وہ کہنے لگا کہ فیر ابا جی! جاؤ' ہنے ای اے کچھ کرو' دیر نہ ہو جائے۔ (پھر ابا جان! جاؤ' ابھی ہی یہ کچھ کر دو)۔ (باپ) کہنے لگا کہ ہن تے عصر دی نماز دا ویلا تنگ ہو گیا ہے۔ اے ویلا جاندا پیا ہیگا (عصر کی نماز کا وقت تنگ ہو گیا ہے' نماز کا وقت جا رہا ہے) ابھی قرآن کریم اس نماز کے اوپر بھی آتا ہے کہ پھر ان منافقین کی نماز کو دیکھیے کہ یہ کیا کرتے ہیں۔ وہ بعینہٖ یہ بات ہے کہ کوئی گل نہیں' اسی رپھڑ پا دیاں گے'' (کوئی بات ہی نہیں۔ ہم بکھیڑا ڈال دیں گے) اسی لیے کہا ہے کہ تمہیں مفاد کس شکل میں حاصل ہو: اِدھر ہونے میں یا اُدھر ہونے میں' مکر جانے میں یا اس پر قائم رہنے میں۔ یہ کیفیت ہے تمہاری کہ تم کونسی شکل اختیار کرو۔

بینک میں سودی روپے کو پاکیزہ کرنے کی خاطر زکوٰۃ کی کٹوتی کا مسئلہ

یہ جب سے یہ اب آپ کا نیا اسلامی نظام رائج ہوا ہے یہ زکوٰۃ کا مسئلہ جو بنک کے اکاؤنٹس کے اوپر ہے' وہ وہاں سے کاٹی جاتی ہے تو اس میں ہوتا یہ ہے کہ بنک میں جو جمع کیا جائے' اس میں سود ملتا ہے' جو قرآن حمید کی رو سے اسلام کے خلاف بغاوت ہے۔ پھر یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ کتنا ملتا ہے اور اس میں سے یہ جو زکوٰۃ پاکیزہ کرنے والی چیز ہے۔ اس سارے کو جو کچھ وہاں میں نے جمع کیا ہوا ہے ہم اسے یہ

زکوٰۃ کہتے ہیں جو پاکیزہ کر دیتی ہے' وہ کتنا ہے؟ کہیں وہاں جا کے دیکھیے گا تو حساب کر رہے ہوتے ہیں اس بنک والے کے ساتھ۔ اچھا! اس میں سے یوں یوں ملتا ہے اور ویسے ڈیپازٹ کیا جائے تو اسمیں سے یہ شکل ہوتی ہے۔ اس میں زیادہ منافع مل رہا ہے۔ قرآن کریم کہہ رہا ہے کہ وَغَرَّتۡكُمُ الۡاَمَانِىُّ (57:14). تمہارے پیشِ نظر اپنا ذاتی مفاد ہوتا ہے اور اس کے لیے تم پھر گنتے رہتے ہو. جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ (104:2). جو کچھ وہاں جمع کراتے ہو۔ پھر اس کے بعد اس کا وہاں حساب کرتے ہو کہ کس شکل میں زیادہ ملے گا' یہ نہیں کہ کونسی شکل رزقِ حرام کی ہے اور کونسی رزقِ حلال کی۔ تمہارے ہاں فیصلہ کرنے کا معیار یہ نہیں ہوتا۔ معیار یہ ہوتا ہے کہ کس طریق سے مجھے زیادہ فائدہ ہوگا۔ یہ ہے منافقت۔ کہا ہے کہ حَتّٰى جَآءَ اَمۡرُ اللّٰهِ (57:14). تم اسی کشمکش کے اندر گرفتار رہے ہو۔

مومن کی زندگی کا تو ہر ہر قدم قانون کی نگہبانی سے وابستہ ہے

وہ جو ہمارا دور تھا' اس میں تو قدم قدم پہ یہ جماعتِ مومنین ساتھ تھی اور یہ جو مخالفین تھے ان کے ساتھ ٹکراؤ ہوتا تھا' تصادم ہوتا تھا' میدانِ جنگ تک جانا ہوتا تھا تا نکہ آخری فیصلہ خدا کی طرف سے آ جاتا تھا۔ یہ صورت تھی اور تم اس باب میں اکیلے نہیں تھے۔ کہا ہے کہ وَغَرَّكُمۡ بِاللّٰهِ الۡغَرُوۡرُ (57:14). بڑے بڑے فریب کار تھے' جنہوں نے تمہیں اپنے ساتھ ملا رکھا تھا یا انہوں نے اس قسم کے فیصلے کر رکھے تھے' ایسے قانون بنا رکھے تھے' ایسی اسکیمیں تیار کر رکھی تھیں کہ جن میں یہی کچھ تمہاری کیفیت ہو' ہر وقت یہ سوچنا پڑے' فیصلہ کرنا پڑے کہ میرا فائدہ کس میں ہے۔ مومن یہ ایک دفعہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَ اَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَنَّةَ (9:111). ایک دفعہ فیصلہ کر کے جان اور مال دونوں خدا کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے' پھر وہ کہتا ہے کہ جان اور مال میرا رہا نہیں ہے' اس لیے مجھے اس کے متعلق فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ منافق اس کے متعلق قدم قدم پہ فیصلہ کرتا ہے۔ اسے مفاد کی کشمکش لگی رہتی ہے؟ یہ ہیں تمہاری انفرادی مفاد پرستیاں جسے قرآن کریم نے کہا ہے کہ وہ تمہیں طرح طرح کے فریب دیا کرتی تھیں۔ تمہیں دھوکے میں رکھتی تھیں۔ تمہاری کیفیت یہ ہے۔

تو عزیزانِ من! آپ نے دیکھ لیا کہ پھر قرآن کریم کی رو سے منافق کسے کہتے ہیں۔ او ہم جو اپنے آپ کو غلط مفہوم سے اطمینان دلا لیتے ہیں یہ بھی منافقت ہوتی ہے کہ ''نہیں' منافق وہ ہے کہ دل میں وہ کافر ہو' زبان پہ ایمان رکھے' تو میں تو دل میں کافر نہیں ہوں''۔ چل بھئی۔ یہ نہیں کہ منافق وہ ہے جس کے کسی قول اور فعل اور کسی معاملے کی بات کے اوپر کوئی یقین ہی نہ ہو' اس کو اطمینان ہی نہ ہو۔ یہ بات نہیں ہے کہ اس کے فیصلے پہلے سے ہو چکے ہوئے ہیں' اس نے خود نہیں فیصلہ کرنا اور پھر پورا معاشرہ جس میں پھر یہ کہا کہ یہ جو بڑے بڑے ہیں وَغَرَّكُمۡ بِاللّٰهِ الۡغَرُوۡرُ (57:14) تمہیں اللہ کے قانون کے بارے میں تمہاری مفاد پرستیاں طرح طرح کا فریب دیا کرتی تھیں۔

یہ پورا معاشرہ ہی ایسا تو پھر اوپر سے بات چلتی ہے اور نیچے تک پہنچتی ہے [1] ۔ پھر وہ پورا معاشرہ ہی منافق ہو جاتا ہے۔

جنت کی زندگی رزق حرام کی سخاوت سے حاصل نہیں کی جا سکتی

عزیزانِ من! کہا کہ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مَاْوٰكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلٰكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ (57:15) آج اگر یہ کہو کہ صاحب! کوئی بات نہیں جی! ہم نے وہاں سے بددیانتی سے اتنا سا کما لیا تھا' اتنا زیادہ لے لیا تھا' ٹھیک ہے جی! بددیانتی تھی' وہ رزقِ حرام تھا' آج وہ ہم واپس دیدیتے ہیں جی! کہا کہ آج نہیں زندگی کے معاملات اُس زندگی کے ساتھ تھے۔ سوال تو وہاں کا تھا۔ ہمارے ہاں یہ کاروبار نہیں ہے۔ جنت سوداگری نہیں ہے' ہم یہ بیچتے نہیں ہیں کہ تم یہ کہو کہ وہاں تو ہم نے اس طرح سے اتنا کما لیا تھا چلیے' صاحب! اس میں سے اتنا آپ کو دیدیتے ہیں' تو ایک کوٹھڑی ہمیں بھی الاٹ کر دیجیے۔ کہنے لگے کہ یہ یوں بکا نہیں کرتے صاحب! سوداگری نہیں ہوتی ہمارے ہاں۔ اب تو تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے۔

قرآن حکیم نے دلوں کو لپیٹنے والی آگ کے شعلوں کو جہنم کی آگ سے تعبیر کیا ہے

کیا بات ہے! کہا ہے کہ مَاْوٰكُمُ النَّارُ (57:15) تم سب کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ پہلے کہا ہے کہ ایسے ذہن میں ہے' جیسے وہ کہیں مگر ہے وہ آگ جو تمہارا ٹھکانہ ہے۔ کہا کہ هِيَ مَوْلٰكُمْ (57:15) ارے یہ ہے تمہاری پناہ گاہ ہے یہ تمہارا کارساز و رفیق۔ هِيَ مَوْلٰكُمْ (57:15) یہی جہنم ہوتی ہے جس کے شعلے قرآن کریم کے الفاظ میں دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔ جہنم وہ ہوتی ہے کہ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ○ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ (104:6-7) جس پہ خدا کی لگائی ہوئی یہ آگ جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔ هِيَ مَوْلٰكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ (57:15) دیکھا! کیسی پناہ گاہ ملی ہے۔ تم لوگوں کو پناہ کی تلاش تھی' جہاں تمہیں پناہ مل جائے۔ پناہ وہاں ملی ہے جہاں دنیا بھر کا سوز و درد و داغ ہے' یہاں آگ ہی آگ ہے۔ اس آگ کے شعلے دلوں کو لپیٹنے والے ہیں اور یہی وہ تمہاری پناہ گاہ ہے۔

دورِ اولیٰ میں اعراب کی ایک کیٹیگری کے وجود کے تذکرہ کی ایک اہم بات

قرآنِ کریم نے' وہ جو اسلام کا اولین دور تھا اس میں ایک کیٹگری اور بھی گنائی ہے۔ وہ تھے یہ جنہیں اعراب کہتے تھے' بدو صحرا کی آبادیاں تھیں جنہیں وہ جن کہہ کر بھی پکارتا تھا' اعراب کہہ کے بھی پکارتا تھا' اب بھی وہ اعراب کہہ کے بولے جاتے ہیں' وہ لوگ جنہیں ہم لوگ بدو کہتے ہیں۔ وہ بھی جب مدینے میں یہ اسلامی سلطنت قائم ہوگئی' مملکت قائم ہوگئی تھی تو پھر یہ ایسے قبائل تھے کہ جنہوں نے اپنے

---

[1] یہ ہے دوسرے الفاظ میں Downward Infilteration Theory

آپ کو Surrender کر دیا تھا اور اس مملکت کے تابع زندگی بسر کرنے کا عہد کر لیا تھا یعنی انہوں نے دل و دماغ کے اطمینان کے ساتھ ان صداقتوں کو قبول نہیں کیا تھا بلکہ اس مملکت کی شان و شوکت اور قوت و حشمت کو دیکھ کر اپنے آپ کو Surrender کر دیا تھا' وہ ان کے سامنے جھک گئے تھے اور بہر حال اس اعتبار سے وہ اپنے آپ کو مومن کہتے تھے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ **قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا** (49:14)۔ یہ بڑی اہم آیت ہے۔ بدوآ کر کہتے ہیں کہ اٰمَنَّا (49:14) ہم ایمان لے آئے۔ کہا کہ **قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا** (49:14) ان سے کہو کہ یہ بات مت کہیں۔ یہ ایمان نہیں لائے۔ کیا فرق ہے! یہ نہ کہیں' صرف یہ کہیں کہ وَلٰـكِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا (49:14) ہم نے اپنے آپ کو Surrender کیا ہے۔ ہم اس مملکت کے سامنے جھک گئے ہیں۔ یہ جو قوانین نافذ ہو رہے ہیں' طوعاً اور کرہاً ہم انہیں مان رہے ہیں۔ ان سے کہو کہ یہ نہیں کہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ کیا باریک فرق ہے۔ قرآن کریم نے جو دیا ہے! اجازت دیں تو میں یہ کہتا ہوا آگے بڑھوں کہ ہم میں سے کتنے ہیں' عزیزانِ من! جنہوں نے دل و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ قرآن کریم کی صداقت کو تسلیم کیا ہوا ہے اور ان کا قلب اس پہ مطمئن ہے اور ان کی زندگی میں استقامت کی بنا پر کبھی شک نہیں پیدا ہوا؟ کتنے ہیں جو اپنے آپ کو مومن کہہ سکتے ہیں۔

آج ہم بیچارگی کے طور پر خود مسلمان کہہ رہے ہیں

کہا ان سے کہو کہ یہ نہ کہو ۔ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَلٰـكِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا (49:14) ۔ کیوں نہ کہیں کہ ہم مومن ہیں؟ کہا اس لیے کہ **وَلَمَّا يَدۡخُلِ الۡاِيۡمَانُ فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ** (49:14) ابھی ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا تو پھر وہ سیرت اور کردار کے اوپر اپنا اثر پیدا کرتا ہے وہ جسے انسان کے کردار اور سیرت کہتے ہیں اس کی بنیاد تو اس کے فیصلے اور ارادے پہ ہوتی ہے اور اس کے لیے یہ ایک لفظ قلب کا ہی لفظ استعمال ہوتا ہے' جسے عام طور پہ دل کہتے ہیں تو کہا کہ تمہارا ایمان ابھی وہاں نہیں گیا کہ اس نے اس قلب کی ماہیت تبدیل کر دی ہو کہ اس کے ارادے ہی بدل گئے ہوں' اس کے مقاصد بدل گئے ہوں' اس کی خواہشات بدل گئی ہوں' وہ چاہے ہی وہ جو خدا چاہتا ہے۔ یہ ہیں قرآن کریم کے الفاظ۔ ٹھیک ہے یہ بھی ایک عمل کی صورت ہے کہ انسان قسمت کو کہتا ہے۔ جسے عصمت بی بی از بیچارگی کہتے ہیں اور وہ جو کہا ہے کہ کافر نتوانی' ناچار مسلماں شد کہ کافر ہونا بڑا مشکل تھا اس لیے لاچار مسلمان ہو گئے' یہ نہ اس کی کیفیت ہو کہ ہر معاملے میں کہے کہ اچھا بھئی! کیونکہ پھر ہم بہر حال ایمان لے آئے ہیں اس لیے مجبوراً یہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ صورت نہیں ہونی چاہیے۔ دل میں اترنے کے معنی یہ ہیں کہ قلب سے آواز ہی یہ آئے کہ یہ میں نے یہی کرنا ہے جو قرآن کریم نے کہا ہے۔ یہ تھی ایمان کی نشانی۔ اس لیے کہا ہے کہ **وَلَمَّا يَدۡخُلِ الۡاِيۡمَانُ فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ** (49:14).

قرآن حکیم کے سامنے اپنے آپ کو Surrender کرنے والوں کے متعلق ارشادِ خداوندی اور لفظ نخل کا مفہوم

اب یہ جو اسلام لانے والوں کی کیٹگری تھی قرآن کریم نے ان کو Reject (مسترد) نہیں کر دیا' پھینک نہیں دیا' ان کو مردود نہیں قرار دے دیا' ان کو کہا کہ نہیں' وَاِنۡ تُطِیۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ لَا یَلِتۡكُمۡ مِّنۡ اَعۡمَالِكُمۡ شَیۡئًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (49:14) خدا تمہاری موجودہ حالات کو بھی جانتا ہے۔ اب اس کے لیے طریقہ یہ ہے کہ تم اپنے دل کی پوری رضامندی سے یہ جو احکام نافذ کیے جاتے ہیں' ان کی اطاعت کرو۔ اطاعت کہتے ہی اس تعمیل کو ہیں جو دل کی رضامندی سے کی جائے۔ وہ لفظ ہی اس کے لیے بولا جاتا ہے۔ وہ اطاع النخل اس کھجور کو کہتے تھے جو پک کے خود گر جائے' اسے جھانپڑوں سے مار مار کر نہ اتارنا پڑے۔ کیا بات ہے صاحب! تو کہا کہ کوئی بات نہیں ہے' تمہاری یہ جو موجودہ حالت ہے' خدا اس پہ نگاہ رکھتا ہے' اس نظام کے اندر تم آ گئے ہو' ان احکام کو دل کی رضامندی سے مانتے چلے جاؤ گے تو خود بخود تمہاری کیفیت ایک دن ایسی ہو جائے گی جیسی ایمان والوں کی ہوتی ہے لیکن اس کے لیے پروگرام یہ ہے' جس پر عمل کرنا ہو گا۔ یہ ایک کیٹگری تھی۔ اب ان کے متعلق کسی ایک مقام پہ آ کر یہ کہنا پڑا کہ اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُهُمۡ لِذِكۡرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الۡحَقِّ وَلَا یَكُوۡنُوۡا كَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلُ فَطَالَ عَلَیۡهِمُ الۡاَمَدُ فَقَسَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ وَكَثِیۡرٌ مِّنۡهُمۡ فٰسِقُوۡنَ (57:16) کیا وہ لوگ جن کا میں نے ابھی ذکر کیا' جو قرآن کریم نے اپنے ہاں ذکر کیا ہے کہ جو اس طرح سے اس ابتدائی پیریڈ میں سے یوں کہیے کہ انہوں نے اس طرح سے اپنی سیرت اور کردار میں ایک تبدیلی پیدا کرنی تھی اور اس کے بعد کہا جانا تھا کہ کیا واقعی اپنے دلوں میں یہ جھکاؤ پیدا ہو گیا ہے کہ اس طرح سے وہ ان احکام کی اطاعت اور تابعداری کریں؟

خود کو سرِتسلیم کرنے کے بعد دوسری منزل کے سفر کی اہمیت کو ملتوی نہ کرنے کی تاکید

جو کچھ قرآن حکیم نے نازل کیا ہے اس پر اس طرح سے عمل پیرا ہوں وہ نہیں کہ مجبوراً سلطنت کی شوکت اور حشمت کو دیکھ کر اس کے سامنے جھک گئے بلکہ یہ کہ اب ان کے قلوب اس کے سامنے جھکیں۔ کیا ان کے اندر وہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہوئی تو ان سے کہیے کہ پھر اگر یہ لمبا عرصہ پڑا کرتا ہے تو پہلی امتوں کے ساتھ بھی یہ ہوا تھا کہ انہوں نے اس کے اندر لمبی لمبی ہائی کورٹ سپریم کورٹ کی تاریخیں لینی کر دی تھیں کہ کوئی بات نہیں' ابھی جلدی کیا ہے' کر لیا جائے گا' دیکھ لیا جائے گا۔ کہنے لگے کہ نہیں اس کو ملتوی نہ کرو' اس چیز کے اس التواء سے پھر بجائے اس کے کہ دلوں کے اندر وہ گداز رہے اور سوز رہے جو اس کو قبول کر رہے ہیں' دل پتھر کے ہو جایا کرتے ہیں۔ پھر چاہو گے بھی تو وہ قبول نہیں کرے گا۔ اس میں شبہ نہیں صاحب! پہلی دفعہ جب قرآن حمید کے کسی اس قسم کی قدر یا حکم کی خلاف ورزی

کی جائے' تو وہ کچھ تو اندر سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔

اس حسین منزل کے حصول کو التوا میں ڈالنے کا نتیجہ اپنی ذات کو پتھر بنانا ہے

اگر پھر یہی روش اختیار کی جائے اور اس پہ زمانہ گزرتا چلا جائے تو پھر اس کے خلاف کسی قسم کی تحریک پیدا نہیں ہوتی۔ وہ ہے جسے عام طور پہ ضمیر کی آواز کہا کرتے ہیں تو وہ دل پتھر کے ہو جاتے ہیں جیسے قرآن حمید نے کہا۔ پہلی قوموں کے ساتھ یہی ہوا تھا تو اس کے لیے یہ نہ ذہن میں رکھو کہ کوئی بات نہیں ہے' کر لیں گے' جلدی کیا پڑی ہے۔ بعد پھر وہ آپ کو شعر یاد آ گیا ہوگا آپ کو جو میں اکثر پڑھا کرتا ہوں:

کیوں مرے جاتے ہو اب ناصرؔ ابھی جلدی کیا ہے!
تم نے ہونا ہے تو کھا پی کے مسلماں ہونا

نو سوچو ہے اکٹھے کرو پھر حج کا جاؤ...... کہا کہ یہ نہ کرو' اس معاملے میں التواء بھی نہ ڈالو اور یہ قرآن مجید کی بڑی عجیب چیز ہے۔ پہلے ہی جب تمہیں مرض Symptoms (علامات) معلوم ہوں پہلی خفیف سی علامت آپ کو نظر آئے' اسی وقت اس کا علاج شروع کر دیا جائے تو بڑی جلدی آرام آ جاتا ہے۔ اگر اس میں آپ تاخیر کرتے چلے جائیں گے۔ مرض مہلک ہوتا چلا جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے بعد ناممکن العلاج بھی ہو جائے تو اس لیے یہ روش بھی نہیں ہونی چاہیے کہ کوئی بات نہیں' جلدی کونسی ہے ابھی' ورنہ دل پتھر کے ہو جاتے ہیں اور اکثریت پھر اس Pattern سے ہی نکل جاتی ہے جس کے اندر وہ یوں جھک کے آئے تھے جناب! باقی رہا یہ کہ کیا یہ ممکن بھی ہے کہ ایسے لوگ جو اس طرح سے آئے تھے وہ اس پروگرام پر عمل پیرا ہونے سے واقعی مومن ہو جائیں؟ کیا یہ ممکن بھی ہے؟ قرآن کریم کا انداز مثال دینے کا ہے۔ کہنے لگے کہ ممکن کیوں نہیں ہے۔ اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا (57:17) زمین مردہ جو بالکل ویران اور بنجر ہوتی ہے' وہ بھی اگر دوبارہ زندہ ہوسکتی ہے' اس میں بھی نمود ہو جاتی ہے' اور روئیدگی اُٹھ سکتی ہے' تو پھر اس قسم کے تمہارے دلوں کے اندر یہ حق کی نمود کیوں نہیں ہوسکتی؟ ذرا سی مثال بتاتی ہے کہ اس کے اندر صلاحیت تھی' ایسے اسباب نہیں تھے کہ جن کی وجہ سے وہ صلاحیت نمود میں آ سکتی' وہ اس قسم کے حالات پیدا کرو' اس قسم کا Environment (ماحول) پیدا کرو۔ معاشرہ پیدا کروان کے لیے حالات ایسے پیدا کرو تو تم دیکھو! زمینِ مردہ بھی تو دوبارہ زندہ ہوسکتی ہے اور ہو جاتی ہے۔

قرآن حکیم کا انداز بیاں اور اس کی تعلیم عقل وشعور رکھنے والوں کے لیے کافی ہے

قَدۡ بَیَّنَّا لَکُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ (57:17) دیکھو! ہم کس طرح سے باتیں واضح طور پر بیان کرتے ہیں۔ یہ واضح طور پر

بیان کرنے سے مقصد کیا تھا؟ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (57:17) تاکہ تم عقل وفکر سے کام لینا سیکھو۔ قرآن حکیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ عقل سے کام لینا سکھاتا ہے۔ مذہب میں عقل کے پیچھے لٹھ لے کر پھرتے ہیں کہ اسے تو آنکھیں بند کر کے ماننا ہوگا' عقل اور علم اور فکر اور شعور کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہم بہت واضح طور پر یہ باتیں بیان کرتے ہیں' آیات کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں لیکن دوسری جگہ یہ ہے کہ قرآن حکیم لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (57:17) کے لیے ہی ہے۔ وہ قوم جو عقل سے کام لے۔ یہ اندھے بہرے گونگے کے لیے تو قرآن حکیم ہے ہی نہیں۔ کہا کہ ہم واضح طور پہ بات بیان کرتے ہیں۔ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (57:17) تاکہ تم عقل سے کام لو اور اس کے بعد یہ کہا کہ تم نے ایمان کا دعویٰ کیا یہ محض زبان سے چند الفاظ دہرا لینے کا نام نہیں ہے۔ اس کے بعد ہے کہا اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ (57:18) اس کو اپنے عمل اور کردار سے تم نے سچ کر کے دکھانا ہے جو زبان سے کہتے ہو۔ یہاں آ کر انسان پھر ایماندار ہوتا ہے کہ جس چیز کے متعلق کہتا ہے کہ میں اس پہ ایمان لایا ہوں' وہ پھر اپنی سیرت' اعمال سے' کردار سے' معاملات سے' اسے سچ کر کے دکھائے۔

قرآن حکیم مذکر اور مونث دونوں کے لیے مخاطب ہوتا ہے

میری بیٹیوں نے تو دیکھ لیا ہوگا کہ مصدقین ہی صرف نہیں کہا' مصدقٰت بھی کہا ہے' عورتوں کو الگ نہیں کیا' حالانکہ عربی زبان کا ہی قاعدہ نہیں بلکہ یہ لاء (Law) کا عام قاعدہ ہے کہ جہاں کہیں کسی ایک کیٹگری میں مذکر اور مؤنث دونوں مقصود ہوں' تو اس کے لیے Verb (فعل) یا Pronoun (ضمائر) وغیرہ جو ہیں' وہ صرف مذکر کے ہی لاتے ہیں اور مقصد دونوں کو ہی کور (Cover) کر دینا ہوتا ہے۔ یہ قاعدہ ہے قانون کا' قانون کی کتابوں میں یہ لکھا ہوتا ہے اور وہاں جہاں بھی یہ چیزیں آتی ہیں' جس کی Application (اطلاق) تمام قانون پہ ہوتی ہے' وہاں یہ صیغے بھی اور یہ ضمیریں بھی' یہ مذکر کی لاتے ہیں اور اس میں مذکر اور مؤنث دونوں Incriminate (شامل) ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم کا بھی یہ انداز ہے ورنہ یہ جو آج کل عام طور پر تاویل دیتے ہیں کہ دیکھو جی! قرآن حکیم نے جہاں بھی شہادت وغیرہ کے متعلق کہا ہے۔ وہاں صیغے مذکر کے استعمال کیے ہیں تو عورتیں تو اس میں آتی نہیں۔ اگر ان سے کوئی پوچھے' کوئی عقل سے کام لے تو ان سے پوچھے بھی کہ قرآن حکیم نے تو جتنے احکام دیئے ہیں مومنین کے' وہ سارے مذکر کے صیغوں میں ہیں بجز ان چند کے جو صرف عورتوں کے لیے ہوتے ہیں۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (2:183)۔ جو قرآن حکیم نے کہا ہے اور پھر قرآن حکیم نے جتنے احکام دیئے ہیں' وہ تو سارے ہی مذکر کے صیغوں کے اندر ہیں' وہ اس لیے ہیں کہ وہ قانون کی اس لم کو اس نے پیش نظر رکھا ہے کہ جہاں دونوں مقصود ہوں صیغہ مذکر کا ہوتا ہے' ورنہ الگ الگ صیغے اور الگ الگ تذکیر استعمال کرنی پڑیں گی تو قانون کی کتابیں یہ نہیں کرتیں۔ بہرحال جہاں کہیں الگ ضمیر دینا ہوتا ہے' وہاں پھر الگ الگ بھی قرآن حکیم بتاتا ہے اور وہ ایک ایک آیت وہ اتنی لمبی

ہے. اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ (33:35) وہ دونوں ہی Categories بلند کرتا چلا جاتا ہے کہ ان چیزوں کو دونوں ہی کر سکتے ہیں۔

قرآن حکیم نے ہر جگہ جان اور مال کی قربانی کو فضیلت دی ہے

مصدق کے معنی ہوتے ہیں اپنے دعوے کو اپنے کردار سے سچ کر دکھانے والا۔ یہ ہوئی ایمان کی بات سچ کر دکھانے میں اگر چہ بڑے بڑے سخت معاملات آتے ہیں جہاں سچ کر دکھانا ہوتا ہے لیکن قرآن کریم نے عام طور پر اس معاملے میں مال کی جو قربانی ہے اس کو پہلے قرآن حکیم سرفہرست لایا ہے۔ بیشتر مقامات میں وہ جہاد یا جان دینے کا معاملہ تو زندگی میں کبھی کبھی آتا ہے اور ممکن ہے کہ کسی کی زندگی میں وہ آئے ہی نہیں ایسا وقت ہی نہ آئے جہاد یا جنگ کا موقعہ ہی نہ بنے اسے قرآن حکیم نے پہل نہیں دی۔ وہ ہر مقام پہ آپ دیکھیں گے کہ یہ جو ایثار ہے مال و دولت کا اسے کہا ہے۔

مال کی قربانی کے سلسلہ میں انسان کا کردار اور قرآن حکیم کا فرمان

ایمان کی تصدیق یا ایمان کو سچ کر دکھانے کی جو علامت بتائی ہے وہ مال کا ایثار ہے اور اس کی محبت واقعی انسان کے دل کی گہرائیوں میں ہوتی ہے۔

گر جاں طلبی سخن ' دریں نیست
گر زر طلبی ' پھر دریں نیست

''جان مانگتے ہو کوئی بات ہی نہیں ہے صاحب! دیدیں گے۔ پیسہ مانگتے ہو تو پھر کچھ سوچنا پڑے گا''۔ یہ پیسے والے جو لوگ ہیں ان کا پتہ نہیں۔ ان کاروباری لوگوں کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ بڑے پکے نمازی پرہیز گار مسلمان ہوتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے جو یہ سودا کرتے ہیں تو اس میں یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے معاملہ کرتے ہیں کہ اگر اس سودے میں مجھے دس ہزار نفع ہو گیا تو یہ نہیں ہے کہ اس دس ہزار میں سے میں ایک ہزار روپیہ اللہ کے نام پہ دیدونگا۔ کہتے یہ ہیں کہ اگر دس ہزار نفع ہوا تو میں سو نفل پڑھونگا' کیوں؟ اس لیے کہ نفل کے پڑھنے سے وہ جان نہیں نکلتی تھی۔ وہ کاروباری کی ادھر ادھر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ میاں صاحب! کچھ ایتھوں وی مال دیو جان آسانی نال نکلے۔ او کین لگے: میں جان تے دین ڈیاں ہویاں' ہور کی دیاں؟ اے ہتھوں دین والا معاملہ بڑا سخت تھا (کچھ یہاں سے مال بھی دو تا کہ جان آسانی سے نکل سکے۔ وہ کہنے لگے: میں جان تو دے رہا ہوں اور کیا دوں؟ یہ مال دینے والا معاملہ بڑا سخت تھا) اور پھر وہ ہماری دکھتی ہوئی رگ کو جانتا ہے۔ یہاں کہا کہ اپنے عمل سے تصدیق کر کے بتاؤ.

خدا کو قرض دینے کا معاوضہ دودھ کی شکل میں

کہا ہے کہ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (57:18) نظامِ اسلامی کے معاملے میں خدا کے دین کو عملاً متشکل کرنے کے لیے مستحکم کرنے کے لیے یقیناً پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جانوں کی ضرورت تو کبھی کبھی ہوتی ہے جب کہ مال کی قربانی کی ضرورت تو قدم قدم پہ ہے۔ شرطِ اول ہی یہ ہوگی۔ اس لیے قرآن کریم نے ہمیشہ اس پہ زور دیا ہے اور پھر اس کا انداز کاروبار کا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم تم سے ڈاکوؤں کی طرح چھین کر نہیں لیتے، ہم معاملے کے بڑے کھرے واقع ہوئے ہیں، تم سے ہم صرف یہ قرض لیتے ہیں۔ شاید میں نے آپ کو بتایا ہو کہ عربوں کے ہاں قرض کا یہ لفظ کہاں بولتے تھے۔ یہ جو جگالی کرنے والے جانور مویشی ہوتے ہیں۔ ان کو آپ دیکھیے۔ جب وہ اپنا چارہ بھی کھاتے ہیں یا ادھر اُدھر سے چگتے ہیں، تو ہڑپ ہڑپ کرتے ہوئے نگلتے چلے جاتے ہیں۔ وہ چباتے وباتے نہیں ہیں، نگلتے چلے جاتے ہیں اور نگلنے کے بعد اطمینان سے بیٹھ کر پھر وہ معدے کے اندر سے وہ اس نگلے ہوئے کا گولا لاتے ہیں اور نہایت امن میں بیٹھ کر چباتے رہتے ہیں، جسے جگالی کرنا کہتے ہیں۔ وہ اتنا پیستے ہیں کہ اس کے بعد وہ پھر جزوِ بدن بننے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ جو مال اس طرح سے جزوِ بدن بنا دینے کے قابل ہوتا ہے اسے خدا کو قرض دے دینا کہتے ہیں۔ کہتا ہے کہ تم ہمیں Raw Form (خام مال) کے اندر یہ چیز دیتے ہو، ہم لوٹا کر تمہیں اس شکل میں دیں گے، جو تمہارے لیے نشوونما کا ذریعہ بن جائے گا۔ وہ تو لفظ ہی وہ استعمال کرتا ہے۔

قرآنی نظامِ حیات کے خدوخال ذاتِ انسانی کی نشوونما کا بہترین ذریعہ ہے

عزیزانِ من! اسی میں ایک انقلاب آفریں چیز ہوتی ہے۔ اسلامی نظام یوں واپس دیتا ہے۔ وہ ڈاکہ نہیں ڈالتا، وہ نظام چھینتا نہیں ہے، واپس دیتا ہے۔ لیتا ہے تو اس شکل کے اندر تم جتنا جی چاہے روپیہ اپنی تجوری میں رکھ چھوڑ، الماری میں رکھ چھوڑ، ایک روپیہ بھی اس میں اضافہ نہیں ہوتا، نہ وہ تمہارے کسی کام آتا ہے۔ کہا ہے کہ ہمیں دے دو تو ہم تمہیں اس کے عوض میں جو کچھ دیں گے، اس سے تمہارے جسم اور ذات دونوں کی نشوونما ہوگی۔ ہم وہ جگالی کیا ہوا واپس دیں گے۔ یہ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ (57:18) ہے اور ہے بھی وہ دیکھو! کتنا زیادہ ہو گیا جو غذا اجزو بدن بنتی ہے، عزیزانِ من! وہ بڑی غذا ہوتی ہے صاحب! اس غذا کے مقابلے میں جو غیر ہضم شدہ ہے یہ غیر ہضم شدہ غذا معدے میں، انتڑیوں میں، یہی نہیں کہ وہ جزو بدن نہیں بنتی، بلکہ وہ ہزار قسم کے امراض کا موجب بن جاتی ہے۔ غذا وہی غذا ہوتی ہے جو جزو بدن بن جائے۔ کہا کہ ہم تمہارے اس پیسے کو یہ بنا کر تمہارے پاس لوٹائیں اور یہ وہ چیز ہے جو وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ (57:18) ہے۔ یہ اجر ہے اور وہ ہے کریم۔ کریم کا لفظ عربی زبان میں، عربوں کے ہاں، انتہائی محاسن صفات، جتنی چیزیں کسی میں جمع کی جائیں، ان کے لیے یہ لفظ کریم بولتے تھے۔ ہم یہ اس قسم کا تمہیں واپس دیں گے۔ یہ ہے وہ جو اسلامی نظام کرتا ہے۔ عزیزانِ من! جو دیتا

ہے وہ اس کے اس طرح واپس کرتا ہے۔ آ گے کہا کہ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖۤ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الصِّدِّیۡقُوۡنَ (57:19)۔

یہ آیت میں آ گے لوں گا' وقت ہو گیا کیونکہ اس میں الفاظ مختلف آ تے ہیں تو یہاں صرف یہی چیز آئی کہ یہ تصدیق کرنے والے قرآن کریم نے جو کہا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو وَاَقۡرَضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا (57:18) یہ ہے ٹیسٹ اس چیز کا کہ تم اپنے دعویٰ ایمان کو سچ کر کے دکھاتے ہو یا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے متعلق ہی میں اگلے درس پہ یہ عرض کروں گا کہ یہی ایمان اور یہ جنہیں عبادات کہتے ہیں' جب وہ دین کے بجائے مذہب کی شکل اختیار کر لیتی ہیں تو پھر ان کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ وہاں تو یہ اس نظام میں Raw Material (خام مال) اس طرح سے جزو ہے جو بدن بننے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اور یہاں اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے یہ میں پھر قرآن کریم کے الفاظ میں آئندہ درس میں لوں گا' اسی آیت کو پھر لوں گا۔ یوں سمجھیے کہ سورۃ الحدید کی آیت 18 تک ہم آ گئے۔ اب 18 ویں کو بھی اور 19 ویں کو بھی آئندہ سے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

پانچواں باب: **سورۃ الحدید** (آیات 18 مسلسل تا 21)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآنی شعبۂ انفاق کو عملی طور پر اپنانے کی بجائے ہمارے ہاں کی جانے والی سعی و کاوش کی شکل وصورت

عزیزانِ من! آج مئی 1983ء کی 6 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحدید کی آیت 19 سے ہوگا لیکن سابقہ درس میں آیت 18 کا مفہوم کچھ تشنہ تکمیل رہ گیا تھا۔ اس وقت میں نے عرض کیا تھا کہ اب پہلے اسے ہی لے لیں گے۔ وہاں کہا یہ گیا ہے کہ اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (57:18) دعوائے ایمان کو سچ کر دکھانے والے ہیں۔ اب اس کے بعد یہ ''انفاق'' کا ذکر آ رہا ہے۔ اس نظام کی تشکیل کے لیے قرآن حکیم کا جو معاشی نظام ہے وہ یہ ہے کہ ہر فرد اپنی ضرورت کے مطابق رکھ سکتا ہے۔ پھر اس مقصد کے لیے زائد از ضرورت اس نظام کو دیدیتا ہے تاکہ وہ دوسرے ضرورت مندوں کی ضروریات کو پورا کرے۔ یہ نظام ہے تو گویا دعوائے ایمان کو سچ کر دینے کے بعد پہلی بات یہاں یہی کہی کہ وہ انفاق پہ تھے' مال دیتے تھے' دولت دیتے ہیں۔ گویا ہمارے ذہن میں تو یہ ہے کہ دعوائے ایمان کو سچ کر دکھانے کے لیے نمازیں پڑھتے ہیں' روزے رکھتے ہیں' حج کرتے ہیں۔ یہ ذہن میں رکھیے کہ یہ نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ وغیرہ جو اسلام ارکان کہلاتے ہیں' کی اہمیت سے انکار نہیں ہے لیکن یہ کسی مقصد کے حاصل کرنے کے لیے ذرائع ہیں' یہ مقصود بالذات نہیں ہیں۔ وہ مقصد تو اس نظام کو قائم کرنا ہے جو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے کچھ کام کرتا ہے۔ یہ سارے جتنے بھی ہیں' یہ اس پروگرام کے ذرائع ہیں۔ اب اگر ذرائع کو ہی مقصود بالذات سمجھ لیا جائے تو وہ جواب آپ کو یاد ہوگا' میں دین اور مذہب میں فرق

کرتا چلا آ رہا ہوں' دین تو ان مقاصد کا نام ہے جن کے لیے یہ سب ذرائع ہیں اور مذہب میں یہ ذرائع مقصود بالذات ہو جاتے ہیں۔ اب آپ کے ہاں دیکھیے وہ جو مقصد ہے کہ کوئی شخص رات کو بھوکا نہ سوئے' اگر ایک فرد بھی بھوکا سو گیا تو وہ نظام اسلامی نہیں کہلا سکتا' وہ ایک مقصد ہے۔ اب اس کے اوپر آپ دیکھیں گے کہ کوئی زور نہیں دیتا' یہ سوال ہی نہیں ہے۔ زور اس پہ دیا جا رہا ہے کہ صاحب! نمازیں کس طرح سے پڑھی جائیں پھر ایک ایک نماز کی وہ تفاصیل ہیں' وہ جزئیات ہیں' وہ فروعات ہیں اور یہ سارے جھگڑے' ساری لڑائیاں ہیں' آپ دیکھیں گے کہ مسجدوں میں تالے پڑ رہے ہیں' پولیس آ رہی ہے' مقدمات ہو رہے ہیں' عدالتوں میں جا رہے ہیں' جیل خانے جا رہے ہیں۔ یہ کاہے کے لیے ہیں؟ کہ جی اس مسجد میں وہ شخص آ کر نماز پڑھتا ہے جو ہاتھ چھاتی پہ باندھتا ہے' زیرِ ناف نہیں باندھتا۔ ایک فرد آ گیا تھا' اس نے اونچی آواز سے آمین کہہ دی' مسجد میں لٹھ چلنے لگ گئے۔ جناب! وہاں کی یہ جتنی آپ چیزیں دیکھیں گے کہ او تیری نماز نہیں ہوئی ہیگی (تمہاری نماز نہیں ہوئی) کیا ہوا کہ نہیں ہوئی؟ کیونکہ تمہارا پاجامہ ٹخنے سے نیچے تھا۔ اس نے ذرا سا سکیڑ لیا نماز ہوگئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ جزئیات بھی اپنے مقام کے اوپر ضروری چیزیں ہوتی ہیں۔ یہ جیسے Discipline (نظم و نسق) آپ کہتے ہیں' فوج کے سپاہی کے بوٹ کے تسمے بھی صحیح طریقے پہ بندھنے چاہئیں لیکن وہ مقاصد نہیں ہیں' فوج کے ہر سپاہی کا مقصد تو ملک کی حفاظت ہے' دشمن کا مقابلہ کرنا ہے' یہ ساری چیزیں ٹریننگ ہیں' اس کے لیے۔ وہ جو میں مثال کے طور پہ کہا کرتا ہوں کہ آپ ایک ترکھان کو دیہاڑی پہ رکھتے ہیں' وہ آ جاتا ہے' وہ آ کر سب سے پہلے اپنی چھری نکالتا ہے اور پھر وہ سان نکالتا ہے' اس کے اوپر اس کو لگانا شروع کر دیتا ہے۔ آپ نے اس سے دروازہ بنوانا ہے۔ اب اگر وہ سارا دن اسی کو تیز کرتا رہے تو آپ سوچیے کہ آپ شام کو اس کو دیہاڑی کے پیسے دیدیں گے حالانکہ وہ بیٹھا رہا ہے' کچھ کام کرتا رہا ہے لیکن یہ کام وہ تھا جو اس دروازہ بنانے کے مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ تھا۔ یہ جو اپنا سند (اوزار) تیز کر رہا ہے اور اگر وہ سارا وقت سند ہی تیز کرتا رہے تو آپ کا دروازہ تو نہیں بنے گا۔ یہ جتنی چیزیں تھیں' یہ ایک مقصد کے حصول کے لیے ذرائع تھے اور وہ مقصد تھا دین کے نظام کو Establish کر دینا' قائم کر دینا اور دین کا نظام تھا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ (13:17) انسانیت کی منفعت کے لیے کیا کیا جاتا ہے۔ تو مذہب میں یہ سارا زور ان ذرائع پہ دیا جاتا ہے۔ مقاصد ذہنوں سے اوجھل ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہ ہے Ends (مقاصد) اور Means (ذرائع) کا تعلق۔

دنیا بھر میں مذہب کی دنیا نے ہمیشہ اپنے ہاں نظام زندگی کی بجائے پرستش کا ہی تصور پیش کیا ہے

یہ جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ نماز کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن یہ بحیثیت ایک ذریعہ کے ہے۔ نماز کے متعلق قرآن کریم نے یہ بتایا کہ اگر دیکھنا ہو کہ وہ نماز ہوئی ہے یا نہیں ہوئی یعنی قرآن حکیم کی منشا کے مطابق ہوئی ہے تو اسے تو کہا کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ

الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ (29:45) معاشرے میں صلوٰۃ بے حیائیوں اور برائیوں سے روک دیگی' جس معاشرے میں صلوٰۃ ہوگی اس معاشرے میں نہ برائی ہوگی' نہ بے حیائی ہوگی تو نماز کے متعلق معیار تو یہ ہونا چاہیے نا کہ اگر تو وہ معاشرے سے برائیوں اور بے حیائیوں کو دور کردیتی ہے تو نماز ہوگئی اور دورنہیں کرتی ہے تو نماز نہیں ہوئی۔ یہ سارا کچھ کہ ہاتھ کہاں باندھے جائیں اللہ اکبر کے لیے کانوں کی لوتک پہنچیں' چھوڑ دیئے جائیں' باندھ کے پڑھی جائے' یہ ساری جتنی چیزیں ہیں' یہ اس کی ڈسپلن کی چیزیں ہیں تو مقصد تو قرآن کریم یہ کہتا ہے: یقیناً یہ بات یادرکھو کہ الصلوٰۃ یہ کرے گی اور اگر یہ نہ ہوتو پھر وہ ذرائع پہ آپ زور دیتے چلے جایئے الصلوٰۃ تو نہیں ہوگی۔قرآنِ کریم میں یہ جو بنیادی نکتہ ہے' متعدد مقامات پر اس کو واضح کردیا ہے اور قرآن کی عظمت یہ ہے۔ باقی دنیا میں جتنے مذاہب ہیں' وہ سارے ذرائع کے اوپر زور دیتے چلے جائیں گے۔ کسی مذہب میں پرستش کا کوئی مقصد نہیں بتایا جاسکے گا۔قرآن کریم ہے جو یہ زور دیتا ہے کہ یہ جن چیزوں کو ذرائع کہا جاتا ہے انہی کو اگر مقصود سمجھ لیا جائے تو وہ پھر قرآن کریم کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔اس ضمن میں دوتین آیتیں بڑی ضروری میں' انہیں ذہن میں رکھیے۔ یہ بڑا اہم سوال ہے کہ اتنا کچھ مذہب کے نام پہ ہورہا ہے لیکن

نہ دکھ جائے' نہ درماں راس آئے
مگر خبطِ دوا ہے اور میں ہوں

پڑھے جاؤ اور زیادہ پڑھے جاؤ' جتنا پڑھ رہے ہو اس سے کیا حاصل ہورہا ہے' جو اور زیادہ پڑھا دوگے تو اور حاصل ہوجائے گا۔ بات تو وہیں رہے گی سو دفعہ بھی صفر (Zero) لکھ کر جمع کرو تو اس کا نتیجہ صرف ہی ہوگا۔

ہر مسجد کا رخ قبلے کی طرف رکھنے کا مقصد قرآنی اور صرف قرآنی نصب العین کو اپنانے کی ترغیب دیتا ہے

عزیزانِ من! سورۃ بقرۃ کی 177 ویں آیت بڑی اہم آیات میں سے ہے۔کہا ہے کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (2:177) نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرتے ہو یا مغرب کو کرتے ہو۔مثال کے طور پر قرآن حکیم نے صرف ایک بات ہی کہی ہے: مقصد' یہ بھی بڑی اہم چیز ہے منہ طرف قبلہ شریف کے' اللہ اکبر۔کسی مسجد کا اگر رخ قبلے کی طرف نہیں ہوتا تو اس مسجد کے اندر کوئی نماز نہیں ہے' وہ کہتے ہیں نماز ہی نہیں ہوئی۔نمازی کا رخ اگر نہیں ہوتا' ذرا سا ٹیڑھا ہوتا ہے تو پیچھے سے بھاگا ہوا دوسرا نمازی آتا ہے اور اس کو یوں سیدھا کردیتا ہے اور یہ کرنے کے بعد وہ نماز پڑھنے والا بھی مطمئن ہوجاتا ہے کہ ہاں ٹھیک ہوگیا' میرا رخ قبلے کی طرف ہوگیا' جس نے رخ کیا تھا وہ مطمئن ہوجاتا ہے کہ میں نے ایک کام کیا یہ ہے بھی ضروری۔

قرآن حکیم پوری مسلم دنیا کوایک نصب العین کے تحت ایک امت کی نوید دیتا ہے

یادرکھیے! یہ قرآن حکیم کی عجیب چیز ہے کہ تمہارا رخ قبلہ شریف کی طرف ہونا چاہیے۔ یہ بھی ضروری ہے لیکن یہ ایک مقصد کا ذریعہ ہے۔ ادھر یہ بھی کہا کہ یہ بھی ضروری ہے کہ تمہارے اندر یک جہتی' یک نگہی پیدا ہونی چاہیے اور وہ اسی طرح سے ہوسکتی ہے کہ نصب العین جوتمہارے ہاں کا Target ہے' جوتمہارے ہاں کا Point of View (نکتۂ نگاہ) ہے' وہ سب کا ایک ہونا چاہیے۔ قبلہ کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ سوچیے کہ کیا وہ ملت نہ بن جائے گی جس کی تمام زندگی کا مقصد یکساں ہم آہنگی ہوجائے۔ یہ کروڑ آدمی نہیں جی! ایک عرب افراد ہیں جوساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اگران کی زندگی کا مقصود ایک ہوجائے جیسے آپ منہ طرف قبلہ شریف کے کہتے ہیں تو پوچھیے نہیں کہ یہ قوم کیا کردے گی۔

ہزارسال سے ہماراشیوہ عملی طور پراس پروگرام سے کوسوں بعید ہے

لیکن' عزیزانِ من! یہاں ہوا یہ ہے کہ وہ نماز میں رخ قبلے کی' طرف ہے مگربس یہ مقصود بالذات ہے' زندگی کے مقاصد اپنے اپنے ہیں۔ کسی کی نگاہ کا رخ دوسرے کے ساتھ ملتانہیں' کہیں ہم آہنگی نہیں' یکسانیت نہیں' اختلاف ہے' افتراق ہے' لیکن منہ طرف قبلے شریف کے اس نمازی کا بھی ہے جس نے ہاتھ اوپر باندھے ہوئے ہیں' اس کا بھی ہے جس نے نیچے باندھے ہیں' اس کا بھی ہے' جس نے چھوڑ دیئے ہیں' جو کانوں تک اٹھا رہا ہے مگرمنہ طرف قبلے شریف سب کا ہورہا ہے حالانکہ یہی جو اختلاف ہے' اسی سے تو قبلے کی طرف آپ کا رخ رہا ہی نہیں ہے۔ کس اہمیت سے کسی مذہب میں آپ یہ نہیں دیکھیں گے کہ وہاں یہ کہا گیا ہو کہ پرستش کے جو قاعدے ہیں' جو قانون ہیں' ان کی اہمیت نہیں ہے. کہا ہے کہ لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ (2:177) یہ قطعاً نیکی نہیں ہے' یہ مقصود بالذات نہیں ہے کہ تمہارا رخ مشرق کی طرف ہوگیا یا مغرب کی طرف ہوگیا۔

مختلف ذرائع کومقصود بالذات سمجھ لیناہی کافی نہیں ہوتا

میں نے عرض کیا ہے کہ مثال کے طور پر یہ بات قرآن کریم نے کہی' مقصد یہ ہے کہ یہ جو مظاہر ہیں' یہ جتنی چیزیں نظر آنے والی ہیں' یہ جتنا اس قسم کا پروگرام ہے' جس کا تعلق اس ڈسپلن سے ہے' وہ اپنی جگہ پہ وہ ذرائع ہیں کہ اگر رہیں گے تو وہ ٹھیک ہے لیکن اگر انہیں مقصود بالذات سمجھ لیا جائے گا تو یہ نیکی نہیں ہے' اس پہ مطمئن ہوکر نہ بیٹھ جاؤ کہ میری نماز تو ہوگئی اس کی نہیں ہوئی۔ اگر تمہاری نماز بھی معاشرے کو برائیوں اور بے حیائیوں سے نہیں روکتی تو نہ تمہاری ہوئی' نہ اس کی ہوئی' نماز کی شکل صحیح ہوگئی نماز کا مقصد صحیح نہیں ہوا . لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَ لٰكِنَّ الۡبِرَّ (2:177). آؤ بتائیں کہ نیکی کیا ہے۔ اس میں پہلی شرط وہی ایمان کی

ہے. مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (2:177) . یہ تو یہ ان حقائق کے اوپر ایمان ہو گیا' میں نے عرض کیا تھا کہ وہ پھر ایمان کے بعد پہلا زور دولت کو کھلا رکھنے پر دیتا ہے۔ فرمایا کہ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ (2:177) .

مسلمان ہونے کے لیے یہ ایک معاہدہ کرنا لازم ہے

اس نظام کے قیام اور استحکام کے دوران میں جتنی اپنی کمائی ہے اس میں سے اپنی ضرورت کے لیے لینا' باقی سارے کا سارا دوسروں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نظام کے حوالے کر دینا۔ ایک بات یہ ہے اور دوسری چیز یہ ہے کہ جب کہیں جان دینے کا ایسا وقت آ پڑے تو میدانِ جنگ میں چلے جانا جس کو جہاد کہا جاتا ہے۔ دو ہی چیزیں ہیں جو قرآن نے نیکی کی بتائی اس لیے یہ دو ہی چیزیں ہیں جن کے دعویٰ کرنے سے انسان مسلمان ہوتا ہے۔ اب تو یہ ہے کہ کلمہ پڑھنے سے مسلمان ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں جو سورۃ توبہ میں بتایا ہے' کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9:111) مسلمان ہونے کے لیے حد خدا سے ایک معاہدہ کیا جاتا ہے یہ شخص اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اور وہ اس کے عوض میں جنت دیدیتا ہے۔ جاں اور مال یہ دو ہی چیزیں ہیں جو قرآن کریم نے کہی ہیں۔ وہ مال کا ذکر تو ساری زندگی میں آتا رہے گا اور جان جس وقت جان دینے کا وقت آئے گا اسے عام طور پہ جہاد کہا جاتا ہے اور یہ مال کا کھلا رکھنا انفاق کہلاتا ہے۔ یہ کہا کہ نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنا رخ قبلے کی طرف کر لیا ہے' مشرق کی طرف کر لیا ہے یا مغرب کی طرف کر لیا ہے' ٹخنہ ننگا ہے یا ڈھکا ہوا ہے' نیکی یہ ہے کہ تم ان حقائق پر ایمان لانے کے بعد اپنا مال ان مقاصد کے لیے صرف کرتے ہو یا نہیں کرتے۔ قرآنِ کریم میں اسی آیت میں دونوں ہی چیزیں آ گئی ہیں۔ پہلے تو وَ اٰتَى الْمَالَ (2:177) ہے اور آخر میں ہے وَ الصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ (2:177) جنگ کے وقت' لڑائی کے وقت' تصادم کے وقت' ٹکراؤ کے وقت' استقامت سے کام لیتے ہیں' استقلال سے کام لیتے ہیں' ثابت قدمی سے کام لیتے ہیں۔

قرآن حکیم کے نزدیک نیکی کی تعریف یا اس کی وضاحت

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا (2:177) یہ لوگ ہیں جو اپنے دعوائے ایمان کو سچ کر دکھاتے ہیں۔ اگر یہ نہیں ہے تو لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (2:177) . یہ ان چیزوں کے اوپر زور دیئے چلے جانا کہ صاحب! اس انداز سے رخ کیا اور اس انداز سے سجدہ کیا اور ایسے ہاتھ باندھے اور وہاں تک ہاتھ اٹھائے۔ کہا ہے کہ یہ نیکی نہیں ہے۔ نیکی یہ ہے کہ تم اپنے دعوائے ایمان کو ان چیزوں سے سچ کر دکھاتے ہو یا نہیں؟ یہاں تو اتنی سی چیز کہی ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے' وہ بھی اسی کا ہی ایک جزو ہے۔ کہا کہ

اَجَعَلۡتُمۡ سِقَایَۃَ الۡحَآجِّ وَ عِمَارَۃَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ کَمَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ جٰھَدَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ لَا یَسۡتَوٗنَ عِنۡدَ اللّٰہِ (9:19). کیا تم سمجھتے ہو کہ اس قسم کے نیکی کے کام کہ ہم نے حاجیوں کے پانی پینے کے لیے سبیلیں لگا دی ہیں' کعبہ کی تزئین و آرائش کے لیے اتنا کچھ ہم نے کر دیا ہے تو آپ کو یاد ہے' اگلے دنوں پھر یہ خبر آئی تھی کہ پتہ نہیں کتنے سو من جو سونا ہے' کعبے کے دروازے پہ لگایا گیا ہے' کس کس قسم کے وہ پتھروں کے فرش بنائے گئے ہیں' کروڑوں روپے اسکی زینت کے اوپر' اس کی آرائش کے اوپر' خرچ کیے جا رہے ہیں۔ قرآن حکیم کہتا ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ اس قسم کے جو تم نیکی کے کام سمجھتے ہو کہ حاجیوں کو پانی پلانے کے لیے یا کعبے کی تزئین و آرائش کے لیے اتنا کچھ ہم کر رہے ہیں۔

جہاد کا ایک اپنا مقام ہے

اصل چیز تو اس نظام کے استحکام اور بقاء کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے چلے جانا ہے۔ مسلسل یہ جہاد تو اس کا آخری مرحلہ ہوتا ہے جو میدانِ جنگ میں جانا ہوتا ہے ورنہ ہر کوشش' جو اس نظامِ خداوندی کے قائم کرنے اور اس کو محکم بنانے کے لیے کیا جائے گا' وہ جدوجہد میں آ جائے گا' جہاد میں آ جائے گا۔ کہا کہ یہ جو بات ہے کہ حاجیوں کو پانی پلانا ہے اور کعبے کی تزئین و آرائش کرنی ہے' کیا یہ اس کے برابر ہو جائے گا کہ جو شخص جٰھَدَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ لَا یَسۡتَوٗنَ عِنۡدَ اللّٰہِ (9:19) . تم اپنے ذہن میں خواہ کتنا ہی کیوں نہ اپنے آپ کو فریب دے لو کہ یہ دونوں چیزیں برابر ہیں' سن رکھو! خدا کے نزدیک یہ برابر نہیں ہیں۔

نظام دین کے بالمقابل مذہبی تصورات کا نتیجہ

وزن تو وہ ہے جو اس کے میزان میں ہو۔ وہاں اس کا کوئی وزن ہی نہ ہو تو فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُھُمۡ (2:217) اس قسم کے اعمال تمہارے لیے خود فریبی کا باعث بن سکتے ہیں۔ خدا کے میزان میں ان کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ کہا کہ لَا یَسۡتَوٗنَ عِنۡدَ اللّٰہِ (9:19) اور اتنا ہی نہیں ہے' عزیزانِ من! آگے جو الفاظ آتے ہیں آدمی کانپ اُٹھتا ہے۔ کہا ہے کہ وَ اللّٰہُ لَا یَھۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ (9:19) جو انہی ذرائع کو مقاصد سمجھ کر مطمئن ہو جاتی ہے وہ ظالمین کی قوم ہے' گمراہ ہے' ان کو صحیح راستہ نہیں مل سکتا۔ یہ ہے فرق مذہب اور دین میں۔ یہ جو سارا کچھ ہے' یہ حاجیوں کو پانی پلانا' مساجد کی تعمیر اور تزئین کرنا اور یہ سارا کچھ کرنا آپ دیکھتے ہیں کہ سارا زور ہمارے ہاں مذہب میں ان چیزوں پہ لگایا جاتا ہے۔ نماز روزہ ہے تو اس کے لیے یہ جزئیات کتنی ہیں' آپ مسائل پہ مسائل دیکھیے ان کتابوں سے کمرے بھرے ہوئے ہوتے ہیں کہ (مثلاً) روزہ کن چیزوں سے ٹوٹتا ہے' کن چیزوں سے رہتا ہے' حنفیوں کی نماز کیسی ہے' اہل حدیث کی کیسی ہے' شیعہ کی کیسی ہے۔ ان فرقوں کے اندر پھر جو مختلف الگ ٹولے بنے ہوئے ہیں' ان کی کیسی ہے۔ یہ جزئیات پہ جزئیات ہیں'

بحث پہ بحث چلی آ رہی ہے‘اس چیز کے اوپر لٹھم لٹھ ہو رہے ہیں۔خدا کہتا ہے کہ ہمارے میزان میں اس کا وزن ہی کچھ نہیں۔

صدیوں سے قرآن حکیم کا بغیر مطلب سمجھے پڑھنا‘ ناظرہ اور پھر اس کے اہتمامات

عزیزانِ من! اس سے آگے یہ جتنا کچھ مذہب کے نام پہ ہے‘ قرآنِ کریم ناظرہ پڑھایا جاتا ہے۔مکتب پہ مکتب کھلے چلے جا رہے ہیں‘ بغیر مطلب سمجھے ہوئے قرآن کریم کے الفاظ کو دہراتے چلے جا رہے ہیں۔سوچیے عزیزانِ من! دنیا کی کسی کتاب کے ساتھ بھی یہ ہوتا ہے کہ آپ اس کا مطلب نہ سمجھ رہے ہوں اور الفاظ دہراتے چلے جائیں۔آپ اسے ساری عمر اہتمامات کے ساتھ کرتے چلے جائیں۔ اب پوچھو نہیں کہ اس کے لیے کتنے مدارس اور مکاتب کھلے ہوئے ہیں اور پھر جتنا ان کے اوپر خرچ ہوتا ہے‘ جتنا اہتمام کیا جاتا ہے‘ پھر اس کو قائم کرنے والے‘ ان میں چندہ دینے والے‘ اس کا انتظام کرنے والے‘ بڑے مطمئن ہوتے ہیں کہ ہم یہ تگڑا کام کر رہے ہیں خدا کے مذہب کا‘ دین کا‘ اسلام کا۔کتنے ہی مکاتب سہی‘ چلیے! کہ یہ حفظ کرانے والے مکاتب ہیں۔

کچھ ذکر تجوید القرآن کا

اب آگے چلیے۔یہ تجوید القرآن ہے جی! کہ وہ قاری بناتے ہیں‘ اس نے تو حفظ کرایا‘ اس نے یہ سکھایا کہ وہ ’’عین‘‘ کہاں سے نکلے گی‘ ق کہاں سے نکلے گا۔اب یہ عین اور ق درست کرنے والے الگ مکاتب کھلے‘ الگ مدرسے کھلے۔ادھر وہ حافظ بناتے ہیں‘ یہ قاری بناتے ہیں۔یہ تجوید کا الگ علم بن گیا۔اس قرآن کریم کا پہلے سارا مقصد تو اتنا ہی ہوتا تھا کہ وہ رمضان کی تراویح میں‘ حافظ تراویح پڑھا دیتا تھا جسے محراب سنانا کہتے ہیں‘ وہ سنانے والا بھی کچھ نہیں سمجھتا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں‘ یہ سننے والے بھی کچھ نہیں سمجھتے کہ ہم میں کیا سن رہے ہوں ثواب دونوں کو ہو رہا ہے اور یہ سب مطمئن ہیں. کہا ہے کہ لَيْسَ الْبِرَّ (2:177) . قرآن ہے عزیزانِ من! یہ میرے اور آپ کے جذبات کی رعایت نہیں رکھتا‘ حقائق نیکی نہیں ہیں‘ یہ قرآن کو نازل کیا گیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ (41:3)لِقَوْمٍ يَعْقِلُوْنَ (2:164). ان کے لیے جو اس کو سمجھتے ہیں ان کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں یہ تو نازل ان کے لیے کیا گیا ہے۔یہ سارا کچھ اس اہتمام سے ہو رہا ہے‘ سوچیے قوم کا یہ روپیہ انہی تک آ جائیے‘ آگے نہ بھی بڑھیے۔

ہر مسجد کا لاؤڈ اسپیکر الگ‘ مینارا لگ‘ سوچ الگ اور نتیجہ صرف انتشار

یہ مساجد بنانا ہے‘ غور فرمائیے کہ ایک ایک مسجد میں لاؤڈ اسپیکر الگ ہے‘ وہ مینارہ اس کے اندر ایک الگ چیز ہے۔اس پہ جتنا خرچ ہوتا ہے‘ ایک مسجد پہ جتنا خرچ ہوتا ہے‘ پھر وہ مساجد بھی ایسی بن رہی ہیں جن میں وہ سنگِ مرمر اور سنگِ موسٰی اور یہ چیزیں لگی ہوئی ہوتی ہیں‘ مسجدوں پہ مسجدیں بنتی چلی جاتی ہیں صاحب! پھر ان کی زیب و زینت کے سامان ہو رہے ہیں‘ پھر ان کے انتظامات ہو رہے ہیں۔

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن حکیم کے ساتھ یہ کچھ ہو رہا ہے۔ یہ ایک حج کے اوپر، جو آپ کے ہاں پوری ایک ارب قوم ہے، وہ حج کے اہتمام میں سارا سال لگی رہتی ہے۔ ٹھیک ہے، یہ اپنا اپنا اطمینان ہے جسے آپ کر کے آئے۔ قرآن کریم کہتا ہے ہمارے میزان میں تو یہ بات برابر نہیں ہو سکتی۔ ہمارا میزان تو یہ کہے گا کہ نتائج کیا مرتب ہوئے، وہ مقاصد حل ہوئے جن کیلئے یہ چیزیں تجویز کی گئی تھیں یا سارا دن تم فٹبال کو کک لگاتے گئے اور اسے دوسرے کے گول میں پہنچایا ہی نہیں، یہ ککیں نہیں گنی جائیں گی۔ آپ کی مقصد تو اس گیند کا فریقِ مقابل کے گول میں پہنچنا تھا۔ لَا يَسْتَوٗنَ (9:19)۔ میں یہ کہہ رہا ہوں یہ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (9:19) اتنا ہی نہیں کہا کہ یہ چیز Negative ہے۔ منفی ہے اس چیز سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔

ہماری اس سعی لا حاصل کے متعلق قرآن کریم کا فرمان

لہٰذا یہ کہا ہے کہ یہ قوم گمراہ ہے، یہ قوم ظالم ہے جو ذرائع کو مقصود سمجھ کر مطمئن ہو جاتی ہے۔ اگلی آیت میں بتا دیا کہ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (9:20)۔ مقصد یہ ہے کہ اس نظام کے قیام کے لیے زندگی مسلسل جدوجہد میں گزرے۔ وہ مال کا انفاق کرے۔ پھر وہی دوسری چیز جو میں نے ابھی عرض کی ہے، یہ ہے جن کے درجات خدا کے نزدیک اعظم ہیں۔ نماز کے متعلق تو وہ سورۃ الماعون متعدد بار سامنے آ گئی ہے۔ وہ ہر بار لانی پڑتی ہے۔ کہا ہے کہ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ o الَّذِيْنَ (107:4-5)۔ اتنا ہی نہیں کہ وہ اس قسم کے نمازیوں کی نمازیں بیکار گئیں۔ فَوَيْلٌ (107:4) ان نمازیوں کے لیے تباہی ہے، وہ تو نماز نہ پڑھنے والوں کے لیے تباہی بتاتے ہیں۔ یہاں وہ بتا رہا ہے کہ نماز پڑھنے والے جو مصلین ہیں، ان کے لیے تباہی ہے۔

صلوٰۃ کو صرف نماز تک محدود کرنے والوں کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد

یہ کون سے مصلین ہیں؟ کہا ہے کہ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (107:5) وہ جو اپنی صلوٰۃ کے مقصد، مفہوم، اس کے نتائج، جس مقصد کے لیے یہ فرض کی گئی تھی، اس سے بے خبر رہتے ہیں۔ کہا کہ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ (107:6) جو کچھ لوگ دیکھ سکتے ہیں، اس میں ظاہرہ حرکت جتنے مظاہر ہیں، اس کے اس کو ہی صلوٰۃ سمجھ لیتے ہیں۔ تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے جو اس کو صلوٰۃ سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107:7) اور رزق کے ان سرچشموں کو جن کا پانی بہتا ہوا رہنا چاہیے تھا، بند لگا کر اپنے لیے روک لیتے ہیں اور نماز پڑھنے چلے جاتے ہیں۔ یہ ہے فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ o الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (107:4-5)۔

ہماری مصلحت آمیز فرقہ بندی کے متعلق قرآن حکیم کا فتویٰ

آپ غور فرمائیے، عزیزانِ من! کہ قرآن حکیم کو مفہوم کے ساتھ کیوں نہیں پڑھایا جاتا۔ پڑھایا جائے تو ان مقامات کو کیا کریں گے۔ قرآن حکیم میں جہاں جہاں یہ آتا ہے کہ فرقہ بندی شرک ہے، ان آیتوں سے بھی اسی طرح گزر جاتے ہیں جیسے ایکسپریس ٹرین کھڑی ہی نہیں ہوتی اس اسٹیشن کے اوپر۔ کہیں سنیے مجال ہے ان آیات کے متعلق کچھ بتا جائیں۔ جس قوم میں فرقے ہیں، قرآن حکیم کہتا ہے کہ یہ شرک ہے۔

اللہ نے قرآن حکیم میں فرمایا کہ اے رسول! تیرا ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے جو فرقے سے متعلق ہو گئے۔ اب بتائیے کہ کیا کوئی ایک بھی باقی رہتا ہے۔ آپ کے ہاں کیا ہے کہ باقی وہ رہتا ہے جو کہتا ہے کہ میرا تعلق کسی فرقے سے نہیں ہے۔ اس کے خلاف یہ سب کفر کا فتویٰ لگا دیتے ہیں وہ ایک کافر تو شرک سے باقی رہ جاتا ہے۔ یہ سارے مومن جتنے ہیں قرآن حکیم کی رو سے یہ سارے کے سارے شرک آلودہ ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ کہا کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ٥ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ (30:32) یہ ہے مشرک۔ دوسری جگہ کہا کہ! اے رسول! تیرا ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے جنہوں نے فرقہ بنا لیا اور یہاں فخر اسی پہ کیا جاتا ہے کہ ہم فلاں فرقے سے ہیں۔ پوچھا کہ کون ہوتے ہیں صاحب! اگر کہہ دیا کہ مسلمان ہوتا ہوں تو وہ اطمینان نہیں ہوتا۔ جی ارے بھئی! کون مسلمان یعنی آگے بتائیے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی آگے پھر بتایا تھا، کہا تھا کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (6:163) حضور ﷺ نے تو یہ کہا پھر آگے میں نے کہا کہ کیا صحابہؓ نے پوچھا تھا کہ جی فیر کون مسلمان (کون سے مسلمان) سنی یا شیعہ مسلمان۔ اچھا جی! سنی مسلمان۔ او جی پھر سنی تو ہوا، کونسے سنی مسلمان؟ اہل حدیث یا اہلِ فقہ؟ کہ جی! اہلِ فقہ والے۔ اچھا اہلِ فقہ۔ شکر ہے حنفی ہو یا جعفری ہو؟ کہ جی حنفی ہوں۔ صاحب! حنفی ہیں۔ اچھا! دیوبندی ہیں، بریلوی ہیں؟ چل بھئی! تریا چل اوکتھے (چلتے چلے جاؤ کہیں تک بھی)۔ رک بھئی! رکے گا تو وہ جو توحید کے اوپر ہوگا، جو کہا جائے گا کہ اَنَا مسلم بس اور جوان پگڈنڈیوں پہ چلے گا پھر یہ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے کہ چلتے جاؤ، چلتے جاؤ۔

شریعت کے بعد تصوف کی داستان ہے جس کو سمجھا تو اور بھی مشکل

ابھی تو میں نے تصوف کی طریقت نہیں گنائی جن میں ان وادیوں میں ہم گزرے ہیں وہاں پوچھو نہیں کہ کیا کچھ اور ہوتا ہے، صرف مسلمان کہنے سے کوئی مطمئن نہیں ہوتا جب تک ساتھ شرک نہ ملایا جائے۔ اسلام نہیں آتا۔ یہ تھی وہ چیز۔ وہ کہتا ہے کہ اپنے دعوئے ایمان کو سچ کر کے دکھانے والے وہ لوگ ہیں، جو اس نظام کے استحکام اور بقاء کے لیے قائم کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے ہیں۔ ٹکراؤ

کا وقت آتا ہے تو سر ہتھیلیوں پہ رکھ کر میدانِ جنگ میں جاتے ہیں اور میدانِ جنگ میں جانے کا وقت نہیں ہوتا تو اپنی کمائی کو ان کاموں کے لیے کھلا رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو بچ کر دکھاتے ہیں۔

قرآن حکیم کے ان احکام سے اعراض برتنے کے نتیجہ میں قرآنی فیصلہ

عزیزانِ من! دو مقام ہیں جہاں قرآن حکیم نے یہ کہا ہے کہ یاد رکھو! اگر تم یہ نہ کرو گے تو اس کے معنی ہونگے کہ تم نے دین سے اعراض برت لیا۔ اگر یہ کرو گے تو پھر تمہاری جگہ، دوسری قوم آ جائے گی۔ یہ بات سامنے آئی ہوئی ہے تو آ ہی جائے، خدا تمہیں اٹھا کر لے جائے گا، تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا یعنی یہ کوئی کم درجے کی تباہی نہیں۔

عزیزانِ من! ایک تو یہ ہے کہ قوم ہو، اس کو کوئی سزا مل جائے، سزا کے بعد جو بچ جائے لیکن دوسری چیز یہ ہے کہ پھانسی دیدی جائے یعنی اس قوم کی جگہ دوسری قوم لے آئے۔ قرآن حکیم کا اس سے بڑا کوئی اور عذاب ہوسکتا ہے صاحب! کون لوگ ہیں جن کے متعلق یہ کہا۔ یہ دو تین مقام ہیں. کہا کہ هٰٓاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تُدۡعَوۡنَ لِتُنۡفِقُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ (47:38) . وہی بات آ گئی، تم وہ ہو کہ تم سے یہ کہا جاتا ہے کہ اپنا مال و دولت اس مقصد کے لیے دیدو، صرف کردو . فَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يَّبۡخَلُ ۚ وَمَنۡ يَّبۡخَلۡ فَاِنَّمَا يَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِهٖ (47:38) اور تم میں سے وہ لوگ ہیں کہ وہ پھر یہ نہیں کرتے سارا مال و دولت اپنی ذات کے لیے سمیٹ کر رکھ دیتے ہیں تو وہی مال کی بات اور وہی اس کا بخل. کہا کہ وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا (47:38). یاد رکھو! اگر تم اس نظام سے اعراض برتو گے، جو ہم نے کہا ہے کہ اپنا مال و دولت اس راستے میں دیدو، اگر اس سے روگردانی کرو گے، اعتراض برتو گے، رخ پھیر لو گے، اس سے منہ موڑ لو گے، تو کیا ہوگا؟ یہ ہوگا کہ يَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ (47:38) تمہاری جگہ خدا ایک اور قوم لے آئے گا. ثُمَّ لَا يَكُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَكُمۡ (47:38) پھر وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ پوری قوم کی جگہ دوسری قوم لے آئے گا۔ کہتے رہو ہم مسلمان ہیں، گناتے رہو مردم شماری کے رجسٹروں میں ایک ارب اپنی تعداد۔ وہ ٹھیک ہے، وہ کہتا ہے کہ ان کی جگہ خدا دوسری قوم لے آئے گا، جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ یہاں تو آپ نے انفاق کے متعلق 'مال کے متعلق دیکھا، دوسری جگہ سورۃ توبہ میں ہے وہ (9:39) میں ہے تو وہ وہاں میدانِ جنگ کی بات آ گئی یہاں تو وہ انفاق کی بات تھی، مال کی بات تھی، یہاں جان کی بات آ گئی. کہا کہ اِلَّا تَنۡفِرُوۡا يُعَذِّبۡكُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا (9:39) اگر تم منہ موڑ لو گے اس ٹکراؤ اور تصادم اور میدانِ جنگ سے، جہاں جان دینے کا وقت آتا ہے، اگر تم یہ کرو گے تو وَّيَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ (9:39) تمہاری جگہ وہ دوسری قوم لے آئے گا تو عزیزانِ من! اپنے آپ کو ہم فریب دیتے رہیں، سیدھی سی بات ہے، وہ تو یہ کہہ رہا ہے کہ تمہاری جگہ دوسری قوم آ جائے گی۔ یہ کوئی کم درجے کا عذاب یا تباہی نہیں ہے کہ کسی قوم کی جگہ ہی دوسری قوم آ جائے صاحب! کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب دین مذہب میں

بدل جاتا ہے تو پھر جتنے ذرائع ہوتے ہیں' وہ مقاصد بن جاتے ہیں' مقصد سامنے نہیں رہتا اور اسی پہ زور دیا جاتا ہے۔ ذرا کسی وقت بیٹھ کر سوچیے گا جس کے پاس معلومات ہوں' اس سے پوچھیے گا کہ آپ کے ہاں مذہب کے نام پہ یہ قوم کتنا خرچ کرتی ہے' کتنی محنتیں کرتی ہے اور کیا کوئی نتیجہ مرتب ہوتا ہے؟

قرآن حکیم کی طرف سے مومنین کے لیے اعلون ہونے کا ایک واضح سرٹیفیکیٹ اور پھر ہماری حالت زیردست نگری

قرآن حکیم نے کہا تھا کہ مومنین کی جماعت کی پہلی نشانی' علامت' معیار یہ ہے کہ کفار اس کے اوپر کبھی غالب نہیں آسکیں گے' غیر مسلم مسلموں کے اوپر غالب نہیں آسکیں گے۔ یہ اعلون ہونگے' اقوامِ عالم کے سب سے بلند مقام پر ہوں گے۔ یہ پہلی چیز قرآن کریم نے کہی کہ اس کے اوپر پرکھ کر دیکھ لو تو آپ پرکھ کر دیکھ لیجیے ساری دنیا کے مسلمانوں میں ہر جگہ یہ محتاج' دست نگر ہیں' زیردست ہیں' غیر مسلموں کے' وہ ذلیل کرتے ہیں' خوار کرتے ہیں' ان سے مانگ کے روٹی کھاتے ہیں' بظاہر ہم اتنی آزاد مملکتیں ہیں' لیکن کوئی مملکت بھی آزاد نہیں ہے کہ وہ اپنے معاملات کو خود کسی طرح سے طے کرے' قرآن حکیم نے کہا تھا کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ غیر مسلم مسلمانوں کے اوپر غالب آجائیں۔ وہ تو پہلی علامت یہ تھی تو قوم کی جگہ دوسری قومیں تو آہی گئی ہوئی ہیں۔ ٹھیک ہے آپ رہیے' اس چیز کے اندر کہ تمہارا ٹخنہ ڈھکا ہوا تھا یا ننگا تھا' منہ طرف قبلے شریف کے تھا یا نہیں تھا' اس سے تو کام و مقصد نہیں چلتا' عزیزانِ من! کہا کہ **وَاَقْرَضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَھُمْ وَلَھُمْ اَجْرٌ کَرِیْمٌ** (18-57) اس میزان میں جو کچھ تم دو گے' بہت زیادہ دگنا تگنا بن کر واپس ملے گا تمہیں۔ میں نے پچھلی دفعہ کہا تھا کہ جس طرح سے وہ مویشی چارہ چرتا چلا جاتا ہے' وہ تو خام ہوتا ہے پھر جب جگالی کرتا ہے تو جز و بدن بنتا ہے۔ یہ ہے۔ **یُّضٰعَفُ لَھُمْ** (57:18).

قرآنی نظام کے لیے کی گئی Investment (سرمایہ کاری) کا ذات کی نشوونما کی صورت میں ایک اجر عظیم ملے گا

ہمارے ہاں تو جو **یُّضٰعَفُ لَھُمْ** (57:18) ہے وہ ہر بات قیامت کے اوپر رکھی ہوئی ہوتی ہے۔ یہاں یہ خرچ کرو گے تم یہ خیر خیرات دو گے تو قیامت میں اجر ملے گا۔ قیامت میں' عزیزانِ من! اگر وہ مال ملا بھی تو کس کام آئے گا' وہاں کوئی مال و دولت نہیں ہوتی یعنی قرآن حکیم نے **یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْہِ وَلَا خِلٰلٌ** (14:31) کہا ہوا ہے کہ وہاں تو یہ خرید و فروخت والا معاملہ ہی نہیں ہوگا تو اگر وہاں معاملہ ہی یہ نہیں ہوگا تو یہ وہاں جا کے اگر ملے گا یہ مال کے بدلے میں بہت زیادہ مال تو ہمارے کس کام آئے گا' یہ اسی نظام کی صورت ہے'

صحیح اسلامی قرآنی نظام ہو‘ اس میں جو Investment (سرمایہ کاری) ہے اپنی ضرورت سے زائد جو کچھ آپ دیتے ہو‘ پھر آپ دیکھیے کہ آپ کا معیارِ زندگی وہ کتنا بلند کیے چلا جاتا ہے۔ یہاں یوں ملتا ہے اور پھر وہاں جا کے تو پھر جو وہ ملے گا۔ **وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ** (57:18). دو چیزیں قرآن حکیم نے کہی ہیں: **يُضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ** (57:18). یہ اجر کریم ہے جو پھر آگے چلتا ہے۔ یہ پیسے نہیں آپ کو زیادہ وہاں جا کے ملیں گے **يُضٰعَفُ لَهُمْ** (57:18) پتہ نہیں اس نظام کے اندر کس شکل کے اندر یہ ملتا ہے ہم نے دیکھا ہی نہیں‘ یہاں تو یہ ہے کہ آپ جا کر انوسٹ کر آیئے۔ اس کے بعد پھر اس کا نام مضاربت مزارعت‘ منفعت‘ منافع‘ رکھ لیجیے۔ یہ سب کچھ سارے کا سارا سود ہے .

لفظ شہد کے لغوی یا قرآنی مفہوم نگرانی کرنے والا کے ہوتے ہیں

آگے کہا کہ **وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ** (57:19). ایمان لانے والے اللہ پر‘ اس کے رسول پر کہ انہوں نے جو کچھ مقاصدِ حیات کہا ہے اس کو ہم اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں۔ یہ ہیں جو اپنے دعویٰ ایمان کو سچ کر دکھانے والے ہیں۔ یہ ہیں جو نگرانی کرنے والے ہیں۔ یہ **شھــد** کا لفظ جن معنوں میں ہم اپنے ہاں شہید کا لفظ بولتے ہیں‘ ان معنوں میں قرآن کریم نہیں آیا۔ شہادت تو آپ کو معلوم ہے کہ کسی چیز کی گواہی دینا‘ نگرانی کرنا اصل میں اس کے معنی ہوتے ہیں۔ وہ ہیں جو خدا کے نزدیک اس نظام کی نگرانی کرنے والے ہیں‘ خدا نے یہ ان کا فریضہ زندگی مقرر کیا کہ وہ اپنے دعوٰئے ایمان کو‘ اپنے ان اعمال سے سچ کر دکھائیں اور نگرانی کریں۔ اس امتِ وسطا کا فریضہ زندگی یہ تھا کہ **شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ** (2:143) تمام اقوامِ عالم کی نگرانی کریں کہ ان میں سے کون کون صحیح راستے پہ جا رہا ہے اور کون کون ظلم اور استبداد کر رہا ہے۔ اس قوم کا فریضہ ہے۔ کہا کہ **كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ** (2:143) . **عَلَى النَّاسِ** (2:143) دنیا کی غیر مسلم قومیں تمہارے اوپر نگران ہیں‘ ان کا سارا Intelligence تمہارے اوپر کام کر رہا ہوتا ہے۔ آپ نے ان کے خلاف شھد آء کیا بننا ہے صاحب! **شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ** (2:143) . **لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ** (57:18) ان کی مساعی کا نتیجہ یہ ہے۔

مومن کے لیے تو اس کی اخروی زندگی بھی ایک ستانے کا مقام نہیں ہے

وہ جو میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم تو اس کے بعد کی زندگی میں جنت کو بھی آخری مقام قرار نہیں دیتا‘ وہ بھی ستانے کا مقام ہے۔ وہاں کہا ہے کہ ان کا پیشانی کا نور‘ سرچ لائٹ‘ ان کے آئندہ کے راستوں کو روشن کرتا چلا جائے گا تو آئندہ چلنا ہو گا تو وہ راستوں کی روشنی کچھ فائدہ دے گی۔ اگر آگے جانا ہی نہیں ہے‘ وہیں بیٹھے رہنا ہے تو پھر آگے جو راستہ روشن ہوتا ہے اس کا تو فائدہ کچھ نہیں‘ جس انجن

نے جانا نہ ہو پٹڑی کے اوپر اس کی سرچ لائٹ نہیں لگایا کرتے۔ اس کی جلتی ہے جس نے آگے جانا ہوتا ہے۔ قرآن حمید نے ان کی پیشانیوں کی سرچ لائٹ بتائی ہے.

قوم مسلم تو ہزار سال سے تقلید پرستی کے جہنم میں گرفتار ہے

کہا ہے کہ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (57:19) دیکھیے کیا بات قرآن مجید تقابل میں لفظ لاتا ہے حالانکہ جہنم کا لفظ عام تھا۔ فرق یہ ہے کہ جحیم وہ مقام ہوتا ہے' جہاں کوئی رک جائے' آگے چل نہ سکے' یہاں جب کہا کہ پیشانیوں کی ان کے نور ان کی روشنی ان کی سرچ لائٹ ان کو دی گئی تو وہ تو چلنے کی بات ہوئی اور وہ جو اس کے برخلاف والے لوگ ہیں' رک جانے والے' آگے نہ چلنے والے' جہاں جو کوئی قوم رک گئی آگے نہیں وہ چل سکتی' وہی جحیم ہے اور جس قوم کے اندر ان کے مذہب کا عقیدہ تقلید ہو کہ ہزار برس سے پہلے جو کچھ کسی نے کیا تھا' وہیں کے وہیں ہم کھڑے ہیں یعنی آپ کے ہاں اجتہاد کی' اجازت ہی نہیں ہے کہ زندگی کے مسائل کے متعلق کوئی نئی راہیں آپ تلاش کر سکیں' اجازت ہی نہیں جس راستے پہ ہزار برس پہلے وہ چلے جا رہے تھے آپ کے ہاں کے اسلاف اور بزرگ انہی کے اوپر' انہی کے نقشِ قدم کے اوپر' آپ کو چلنا ہے' آپ وہیں کھڑے ہیں' کوئی آپ کے ہاں زندگی کا مسئلہ پیش ہو جائے' دیکھا یہ جاتا ہے کہ صاحب! فلاں امام نے یہ کہا' فلاں مفسر کی یہ رائے ہے' فلاں محدث نے یہ لکھا ہے۔ وہاں اس سے آگے نہیں ہے۔ آپ نے خود کچھ سوچا نہیں یا کچھ یہ تو حرام ہے' وہیں کھڑے ہیں' یہ امت ہزار برس سے جحیم میں ہے' خدا نے تو یہ کہا تھا کہ وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (29:69) جو ہمارے راستے میں جدوجہد کرے گا' ہم کئی راستے ان کو دکھائیں گے آگے چلنے کے لیے مگر ہم نے تو اپنے لیے ساری راہیں بند کر رکھی ہیں' اس کے بعد یہ کہا کہ یہ دیکھو! ہم نے یہ کہا کہ یہ مال و دولت انسانیت کی منفعت کے لیے کھلا رکھنا چاہیے اپنی اپنی ذات کے لیے اس کو منجمد کر دینا چاہیے تو یہ جحیم کی زندگی کے ہے۔

انسانی زندگی کے لیے دو مختلف تصورات اور ان کی وضاحت

اب ہمارے سامنے دو تصورات آتے ہیں۔ ایک وہ ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں سیکولرازم کہتے ہیں یا Materialistic Concept of Life (مادی تصورِ حیات) کہا ہے:

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے؟ انہی اجزاء کا پریشاں ہونا [1]

---

[1] فرائڈ کے الفاظ میں ''زندگی کا منتہا موت ہے۔'' اس کے اصل الفاظ یہ ہیں: Death urge lies at the root of our being

یہ ایک فزیکل لائف ہے' طبعی قوانین کے تابع انسان کا جسم چلتا ہے' انہی قوانین کے مطابق ایک دن یہ مشینری بند ہو جائے گی' انسان ختم ہو جائے گا۔ اس کو مادی نظریہ حیات یا آج کل جسے آپ سیکولرازم کہتے ہیں۔ دوسرا نظریہ حیات قرآن کریم کا ہے کہ زندگی اس چیز کا ہی نام نہیں ہے بلکہ انسان کے ساتھ ایک اور چیز بھی ہے' جس کو اس کا نفس یا ذات یا خودی یا Self یا Personality کہتے ہیں۔ اس کا کچھ بھی نام رکھ لیجیے وہ آگے چلنے والی بات ہے' وہ موت سے مرتا نہیں اور مقصدِ حیات یہ ہے کہ ذات کی نشوونما ہوتی چلی جائے' جس نے آگے چلنا ہے لیکن چونکہ اس کی نشوونما اس سطح زندگی پر جسمِ انسانی کے اندر رہتے ہوئے ہوتی ہے' اس لیے انسانی جسم کی نشوونما' پرورش توانائی بھی ضروری ہے لیکن یہ مقصود بالذات نہیں ہے' اس مقصد کا ذریعہ ہے' یہ انسانی ذات کی نشوونما کا ذریعہ ہے۔ اگر انسان کے جسم کا اتنا تندرست و توانا رہنا ہی مقصد بن جائے جیسا کہ سیکولرازم میں ہے تو کہا کہ پھر یہ چیزیں جتنی بھی ہیں' اسی دائرے میں گھر کے رہ جاتی ہیں۔

انسان کی یہ موجودہ زندگی مقصود بالذات نہیں اور نہ یہ لہو ولعب ہے

یاد رکھیے! قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ آیا ہے کہ اس دنیا کی زندگی لہو ولعب کی زندگی ہے' کھیل تماشے کی زندگی ہے' اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس سے نفرت کرو' اس کے معنی یہ ہیں کہ اسی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لو۔ کہا کہ **اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا لَعِبٌ وَّ لَہۡوٌ وَّ زِیۡنَۃٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَیۡنَکُمۡ وَ تَکَاثُرٌ فِی الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَوۡلَادِ** (57:20) یہاں زندگی کو لہو ولعب کہا ہے۔ یہ لھو ولعب کے یہ الفاظ کئی دفعہ آ چکے ہیں۔ اس کے معنی ہوتا ہے کہ ''کسی ایک مقام کے اوپر کھیل کود میں لگے رہنا' آگے نہ بڑھنا' اگر کشتی بھنور میں پھنس جائے یا موجوں کے تلاطم میں آ جائے تو وہاں تو وہ حرکت کرتی رہتی ہے مگر ساحل کی جانب آگے نہیں بڑھتی۔'' اس کو لہو ولعب کہتے ہیں۔ کہا کہ اگر زندگی میں آپ کے ہاں مکینیکل تصورِ حیات ہے۔ یہ جہاں قرآن کریم نے کہا ہے کہ یاد رکھو دنیا کی زندگی' تو اس کے معنی یہ تصورِ حیات ہیں کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے۔ کہا کہ اس کی کچھ ایسی قیمت نہیں ہے۔ یہ تو یہ ہے کہ **تَفَاخُرٌۢ بَیۡنَکُمۡ** (57:20) مقصد اس سے یہی ہے کہ ایک دورے کے مقابل میں آ کر تم فخر کرو کہ (مثلاً) اس کے پاس ایک موٹر ہے' میرے پاس دو موٹریں آ گئیں صاحب!

لفظ تفاخر یا فخر کا مفہوم اور پھر تکاثر کے جذبے کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے قرآنی مثالیں

''تفاخر!'' کیا بات ہے اس لفظ کی بھی۔ یہ ڈھول کا پول ہمارے ہاں محاورہ ہوتا ہے کہ اندر سے کھوکھلا ہو' آواز اس کی بہت ہو عربوں کے ہاں ایسے مویشی (مثلاً اونٹنی یا بکری) ہوتے تھے کہ جن کے تھن تو بڑے بڑے ہوں لیکن ان میں دودھ بہت کم ہو اور دھار بھی پتلی ہو۔ جن کو وہ <u>انــــــفــــــ کہتے ہیں' ور</u> جس میں دودھ ہوتا ہے' اسے دھوتے ہیں اس کا تھن بڑا پھولا ہوا اور دودھ اس میں سے بس ذرا سا نکلے۔ اسے

فخر کہتے ہیں۔ یہ تفاخر کہا کہ یہ جو اس قسم کا مال و دولت ہے، وہ ایک دوسرے کے ساتھ یہی ہے کہ بڑا بننے کا پھولا ہوا ایک جذبہ ہوتا ہے۔ حقیقت اندر کچھ نہ ہو، بڑا بنا ہوا ہو۔ کہا ہے کہ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ (57:20) ایک دوسرے سے مال اور دولت میں بڑھ جانے کا جذبہ ہے کہ (مثلاً) وہ ان کے پاس ایک محل بنا ہوا ہے ہم چار بنالیں، ان کے پاس دو موٹریں ہیں، ہمارے ہاں دس ہو جائیں گی صاحب! کہنے لگے کہ یہ تکاثر یہ ہے۔ یہ ایک دوسرے سے بڑھ جانا کوئی مقاصد حیات نہیں ہے۔

انسانی زندگی کے دو پہلو ایک طرف کھوٹے سکوں کے انبار اور دوسری طرف انسانی ذات کی نشو و نما کے لیے آبِ حیات کی نوید

اس کے لیے کہا کہ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا (57:20) بس یہ سمجھیے کہ یونہی کہیں کسی پتھر کی چٹان پہ تھوڑی سی مٹی جم گئی، کہیں ذرا سا چھینٹا پڑ گیا، اس کے اندر سے کوئی تھوڑی سی تر و تازگی آئی۔ کہنے لگے کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ بہت بڑی فصل اُگے گی۔ اس میں سے ہوگا کیا؟ یہ کہ کل ہی ذرا دھوپ نکلے گی، چرمر ہو جائے گی، زرد ہو جائے گی، چورا چورا ہو جائے گی، ختم ہو جائے گی۔ کہا کہ وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ (57:20) اور بالآخر اس کے سامنے، اس کھیتی کے اوپر جو محنت بھی کی ہوگی وہ ساری رائیگاں چلی جائے گی، اس کی جڑیں نہیں ہوں گی۔ اس کے مقابلے میں کہا کہ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ (57:20) دوسری قسم کی وہ کھیتی ہے کہ جو قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی کی بنا پر کی جاتی ہے: اچھی زمین، اچھا بیج، پانی ہوا حرارت، سب کچھ، اور پھر حفاظت کا سامان۔ ایک وہ کھیتی ہوتی ہے، تو کہنے لگے کہ دونوں میں تم خود فرق کر کے دیکھ لو۔ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (57:20) متاع کے معنی میں نے عرض کیے تھے کہ ''مسافر جو زادِ سفر اپنے ساتھ لے کر جائے کہ راستے میں میرے کام آئے، وہ کم از کم ہوتا ہے اور وہ ضروری سامان ہوتا ہے، اس سے زیادہ نہیں ہوتا، وہ بوجھ بن جاتا ہے''۔ کہنے لگے کہ یہ تو دنیا کے سفر میں ضروری چیز تھی لیکن اگر یہ متاع الغرور ہو یعنی یہ جھوٹا سکہ ہو۔ یہاں بڑی ہی عمدہ مثال دی ہے۔ آپ نے کہیں سفر میں جانا ہو تو آج کل وہ ٹریولرز چیک مل جاتے ہیں، روپیہ ساتھ نہیں لے جانا پڑتا، چیک لے جاتے ہیں، وہ آپ لے جائیں اور آپ کے ساتھ امریکہ چلا جائے وہاں جا کے میرے پاس دس ہزار روپے کے چیک ہیں، بنک میں وہ چیک دیں، اور وہ کہیں کہ یہ تو جعلی ہے یا اس سے پہلے روپیہ آپ کے پاس ہو، دکاندار کو آپ دیں اور چیز خرید لیں اور وہ کہے یہ تو کھوٹا ہے تو یہ جو جعلی چیک، یہ کھوٹے سکے ہیں، یہ ہیں جسے قرآن حکیم مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (57:20) کہتا ہے۔ مسافر کے پاس جعلی اور کھوٹے سکے ہونا کیا تشبیہ ہے صاحب! وہ اپنے آپ کو مطمئن رکھتا ہے کہ میرے پاس اتنا مال ہے لیکن جب وہ دکان یا منڈی پہ جاتا ہے، اس کو دکھاتا ہے تو وہاں نظر آتا ہے کہ یہ جعلی چیک ہے، یہ کھوٹا سکہ ہے۔ کہنے لگے کہ بس یہ

ہے اس کی کیفیت۔ جو مقصد بتایا گیا تھا وہ بس یوں ہے کہ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ (57:20)۔

قرآن حکیم کے نزدیک دوسروں سے بڑھ جانے کا جذبہ محرکہ

ایک دوسرے سے بڑھ جانے کا جذبہ کہا۔ ہم تمہارے اس جذبے کی رعایت کرتے ہیں۔ یہ انسان کے اندر Instinct (جبلت) ہے' ایک بڑھ جانے کا جذبہ دوسرے سے آگے نکل جانے کا جذبہ ہے۔ یہ جذبہ ہے۔ کہنے لگے کہ جذبے کی ہم قدر کرتے ہیں۔ تمہیں ایک اور میدان دیتے ہیں۔ تمہارا میدان یہ نہیں ہے کرکٹ نہیں کھیلنا آتا' چاہتے ہو دوسروں سے آگے چلنا' تم فٹبال کی طرف آ جاؤ' وہاں اس جذبے کی تسکین ہو جائے گی یعنی وہ میدان بدل دیتا ہے. کہا کہ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (57:21) . آؤ ہم تمہیں بتائیں ایک دوسرے سے بڑھنا ہے تو خدا کا دیا ہوا جو پروگرام ہے اس راستے میں آگے بڑھنے کی کوشش کرو' حفاظت کا سامان وہاں مل جائے گا' آگے جاؤ گے آخر میں تو جنت کی زندگی میسر آ جائے گی۔

جنت کسی خاص مقام کا نام نہیں

چار الفاظ ہیں' عزیزانِ من! کائنات کے چاروں گوشے آ گئے۔ کونسی جنت ہے؟ اس کے متعلق کہا کہ كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (57:21) ہمارے تو ذہن میں یہ ہے کہ وہ مرنے کے بعد وہاں جائیں گے' وہاں جنت کا کوئی ایک مقام ہے' ذہن میں یہی کچھ آتا ہے' وہ باغ ہیں' اس میں چلے جائیں گے۔ ٹھیک ہے ایک مقام تھا لیکن جنت تو وہ ہے کہ جو اس ارض و سما میں ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں بھی آپ کی جنت کی زندگی ہو سکتی ہے لکن ہم جو جہنم میں زندگی بسر کر سکتے ہیں' ہمیں معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ جنت کی زندگی کیسے ہوگی تو وہ جنت کسی خاص مقام کے اوپر نہیں ہے۔ کہا ہے کہ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (57:21) ارض و سما وہ جنت ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہے۔ جہنم کے متعلق بھی تو یہی کہا تھا کہ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ (2:19) وہ تو تمہیں آج بھی گھیرے ہوئے ہے۔

جنت ہو یا دوزخ' یہ دو الگ الگ کیفیات کے نام ہیں' مقام کے نہیں ہیں

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ ساری کائنات میں اگر جنت پھیلی ہوئی ہے تو پھر جہنم کہاں ہے۔ وہ تو وہی ہے کہ جو اس کو کسی خاص مقام میں Localize (مقامی) کر دے Locate کر لے' اس کو مقید کر دے پھر تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ سارے مقام میں اگر جنت ہی ہے تو پھر جہنم کا مقام کونسا ہے۔ یہ مقام نہیں ہے' عزیزانِ من! یہ کیفیات کا نام ہے۔ بہر حال یہ مسئلہ کسی دوسری طرف چلا جائے گا۔ وہ جنت ہے کہ جو ارض و سما میں پھیلی ہوئی ہے۔

اگر یہ سب کچھ خدا نے خود ہی کرنا ہے یا چاہنا ہے تو پھر مکافات عمل کیا ہے

کہا ہے کہ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (57:21). وہ ہم نے ان کے لیے تیار کر رکھی ہوئی ہے' جو صحیح معنوں میں ان حقائق پر ایمان لاتے ہیں اور پھر اس اپنے ایمان کو سچا کر دکھاتے ہیں۔ جیسا پہلے کہا گیا ہے' کہا کہ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (57:21). یہ اب آ گئے پھر ہم مذہب والوں کی طرف کہ یہ جنت اللہ کا فضل ہے يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ (57:21) ترجمہ انہوں نے کر دیا کہ جسے وہ چاہتا ہے دیتا ہے' میرے تمہارے کچھ کرنے سے تو ہوتا ہی کچھ نہیں ہے' جسے وہ چاہتا ہے وہ دیتا ہے اس کو تو یہ سارا کچھ جو وہ کہتا ہوا چلا آ رہا ہے کہ اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (2:195)، جٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (9:19) یہ تمام جدوجہد کوششیں نیک عمل یہ سارا کچھ یہ کاہے کے لیے ہے' اگر یہ کچھ ملنا اسی کو ہے جس کو وہ دینا چاہے اس کو دے۔

اگر خدا کا تصور بدل جائے تو قرآن حکیم کی تفسیر بدل جاتی ہے

میں نے پہلے بھی یہ چیزیں عرض کی تھیں۔ پہلے بھی یہ چیزیں کہ پہلے ہمارے ہاں ملوکیت آئی' جس میں نہج زندگی یہ ہوا کہ وہ بادشاہ کا کہا مانا جاتا تھا' جو وہ کہدے' وہ ہوگا' بس مزاجِ شاہاں تھا اور یہ تھا کہ نازک مزاجِ شاہاں' تاب سخن ندارد۔ کبھی ایسا بھی ہے کہ تم نے سلام کیا اور اس نے کہا کہ اس کی گردن اڑا دو۔ کبھی ایسا ہے کہ تم نے گالی دی' اس نے کہا کہ دیدو اس کو اشرفیوں کی ایک تھیلی۔ بس یہ ہے۔ مزاجِ شاہاں۔

اوتھے کی پرواہ اے راقب! اوتھے بے پروائیاں
پھڑ لئے عملاں والیاں نوں چھڈ دیئے اوگن ہارنوں ❶

قادرِ مطلق ہے! صاحب کون روک سکتا ہے اسکو یعنی اس ٹائپ کا خدا ہم نے بنایا ہے جس ٹائپ کا یہاں نیچے بادشاہ تھا۔ یہ تھا ہمارا سلطان اور اس سلطان کو ظل اللہ علی الارض کہا۔ یہ اس زمین پہ خدا کا سایہ ہے تو اوپر وہ اسی قسم کا خدا بنایا' نیچے اسی قسم کا یہ سلطان بنایا' تو من یشاء والی جو بات تھی پھر اس کے ترجمے یہ ہوئے کہ جو چاہے صاحب! نہ قاعدہ' نہ کوئی قانون' نہ کسی کا عوض' نہ معاوضہ' نہ کوئی صلہ' نہ کوئی اجر اس کا سوال نہیں ہے۔ جس کو چاہے جنت میں بھیج دے' جس کو چاہے جہنم میں بھیج دے۔ تصور ہی یہ آ گیا اور پھر اس کے بعد تقدیر آ گئی کہ سارا کچھ پہلے سے ہی لکھدیا' پیدا ہونے سے پہلے جہنمی اور جنتی لکھدیا' نہ پیدا ہونے میں اس بیچارے کا کوئی اختیار یعنی اس نے کہیں یہ نہیں کہا' کہ جی! مجھے پیدا کر کے جنت میں بھیج دیجئے' دنیا میں بھیج دیجیے۔ یہ کسی بچے کے اختیار میں نہیں ہے۔ پوچھا ہی نہیں کسی

---

❶ اے راقب! خدا بڑا بے پرواہ ہے۔ اس کی بے پرائیوں کا عالم یہ ہے کہ وہاں نیکوکار پکڑے جاتے ہیں اور گنہگار چھوٹ جاتے ہیں۔

نے' وہ بھیج دیا' بھیج دینے کے بعد یہ کہ اچھا تم میں سے جس کو جی چاہے گا' ہم جنت میں بھیج دیں گے جس کو جی چاہے گا جہنم میں بھیج دیں گے۔ ملاحظہ فرماؤ۔

مذہب میں تقدیر کے ایک غلط تصور نے ہمارے ہاں فکرِ قرآنی کو ہی بدل کر رکھ دیا

یہ اب تقدیر کا مسئلہ اور تقدیر کی اہمیت آ گئی۔ قرآن کریم تو ایمان کے پانچ ارکان بتائے: اللہ پر ایمان' رسولوں پر ایمان' کتابوں پر ایمان' ملائکہ پر ایمان' اور آخرت پر ایمان۔ یہ پانچ ہیں اور آپ لوگوں کو معلوم نہیں کہ کبھی وہ یہ جو کلمہ ہے' یہ جو ایمان بالتفصیل پڑھنے کا کہیں موقع ملا یا نہیں' پہلے ہوا کرتا تھا' نکاح کے وقت پڑھایا کرتے تھے۔ اب اس کی جگہ بھی قانون آ گیا ہے۔ یہ وہ پڑھاتے بھی نہیں ہیں۔ پڑھائیں بھی تو پڑھنے والے کو پتہ نہیں ہوتا کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں۔ پانچ ارکان تو یہ خدا نے مقرر کیے اور اس کے اندر ''والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ'' انہوں نے درمیان میں داخل کر دیئے۔ یہ ہے جزو ایمان تقدیر۔ اللہ اکبر۔ جرأتیں ملاحظہ فرمایئے کہ وہ خدا مقرر کرتا ہے پانچ اجزائے ایمان۔ وہ کہتا ہے کہ ان پر ایمان لانے سے مومن ہو تو ان کے انکار کرنے سے کافر۔ وہ کہتے ہیں کہ پانچ نہیں چھ ہیں۔ یہ چھٹا ان کا یہ تقدیر کا ہے۔ یہ دورِ ملوکیت کا' بادشاہت کا ہے۔ جو جی میں آئے کرے۔ یہ آپ کے ہاں جزو ایمان بنا دیا ہوا ہے اور آپ کے ہاں کے جو بڑے بڑے علمائے کرام ہیں' ان کی کتابوں میں ایک پورا حصہ ہوتا ہے یہ چھٹے جزو کا۔ بات لمبی ہو جائے گی۔ اب وقت ہو گیا ورنہ میں بتاؤں کہ یہ کہاں کہاں ہوتا ہے۔ یہ من یشآء ہے کہ جسے چاہے جو چاہے عطا کرے۔ وہ سارا کچھ جو کچھ سارے قرآن حکیم میں وہ سارا دیا ہے اس نے عمل کے اوپر' کام کے اوپر' جہاد کے اوپر' اس سے وہ سارا Wash out ہو جاتا ہے۔ اس ایک عقیدے سے کہ بھئی! ہونا تو وہ ہے جو وہ چاہے گا خواہ مخواہ ٹکریں مارنے سے کیا حاصل ہوگا۔ کہا ہے کہ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (57:21) وہ بہت عظیم فضل کا مالک ہے۔ ہاں اب آگے آتی ہے وہ آیت تکذیب کے متعلق۔ دیکھیے! میں نے کہا' ساتھ ہی وہ آیت بھی آ گئی' لیکن اب وقت ہو گیا ہے۔ سورۃ الحدید کی 21 ویں آیت تک ہم آ گئے' 22 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀......❀......❀

چھٹا باب: **سورۃ الحدید** (آیات 22 تا 24)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1983ء کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحدید کی آیت 22 سے ہو رہا ہے: (57:22)۔

لفظ من یشاء کے ایک غلط ترجمے نے قرآن حکیم کی بنیادی تعلیم کو ہی بدل کر رکھ دیا ہے

سابقہ آیت میں ایک لفظ آیا تھا جو میں نے اس کے متعلق چلتے چلتے بات کی تھی۔ ذکر چلا آ رہا تھا عذاب و مغفرت کا' جنت اور جہنم کا۔ سارے قرآن حکیم میں یہ چیز ہے کہ وہ جو جنت و جہنم ہے' وہ انسانوں کے اپنے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے تو اس آیت میں یہ چیز جنت کے متعلق آئی ہے کہ عَرۡضُهَا كَعَرۡضِ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ (57:21). یہ کہنے کے بعد ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ (57:21) کہ یہ اللہ کا فضل ہے۔ وہ جسے چاہے دے۔ یہ من یشاء کا ترجمہ ہوتا ہے۔

من یشاء کا یہ لفظ ایک جگہ نہیں ہے یہ تو قرآن کریم کی بنیادی تعلیمات میں سے ایک بڑا بنیادی اصول ہے اور وہ اصول ہے مکافاتِ عمل کا کہ ہر شخص کو اس کے عمل کا نتیجہ ملے گا۔ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم ہی یہ ہے۔ کیا یہ جو سارا سلسلہ رشد و ہدایت' خدا نے شروع کیا' انسانوں کو پیدا کیا' اس کے بعد اپنی طرف سے ہدایات نازل کیں' سلسلہ انبیائے کرام نازل کیا' کشمکشِ حق و باطل ہوئی' یہ سارا اس لیے تھا کہ یہ جو اس چیز کی بنیاد ہے کہ انسان کو صاحبِ اختیار پیدا کیا اور کہہ دیا کہ یہ دو راستے ہیں' نجدین ہیں' ہم نے بتا دیا کہ یہ راستہ صحیح منزل کی طرف لے جائے گا' یہ غلط منزل کی طرف لے جائے گا اور اس کے بعد اسے چھوڑ دیا کہ جونسا راستہ تم چاہتے ہو اختیار کر لو' یہ تو تمہارے اختیار میں ہے جونسا جی چاہے راستہ اختیار کرو' اگلی بات تمہارے اختیار میں نہیں کہ راستہ تو غلط اختیار کرو اور پہنچ جاؤ صحیح منزل پر' تو

یہ جو چیز ہے کہ یہ انسان کو صاحبِ اختیار بنانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے ہر عمل کا ذمہ دار ہے اور اس کے کاموں کے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں' اس کی یہ جو آزادی ہے کہ جس قسم کا جی چاہے وہ کام کرے' اس آزادی کی وجہ سے وہ مکافاتِ عمل آتا ہے' اگر وہ مجبور ہو' وہ خود اپنی ارادے سے' اختیار سے' کچھ کر ہی نہیں سکتا' کوئی اور اس سے کرا رہا ہے تو اس کو آپ ذمہ دار قرار ہی نہیں دے سکتے' سوال ہی نہیں ہے' نہ اس کو سزا مل سکتی ہے' نہ اس کی جزا مل سکتی ہے' قرآن کریم کی' وحی کی' انبیائے کرام کی وہ جو ساری تعلیم ہے' وہ اس کی اساس بنیاد نکتہ ماسکہ یہی قانونِ مکافاتِ عمل چیز ہے تو قرآن کریم میں مختلف نہج سے یہ من یشاء وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں: رزق من یشاء' قوت من یشاء' جنت من یشاء' اور اس من یشاء کا ترجمہ کیا'' جسے خدا چاہے اس کو دیدے'' وہ ساری تعلیم ہے' وہ باطل ہو جاتی ہے' اس کی تردید ہو جاتی ہے' یہ اس کے خلاف جاتا ہے لیکن چلا آ رہا ہے کہ'' جسے چاہے وہ دیدے'' یہ ان الفاظ کا' جو مفہوم تھا' یہ کیسے ہوا' یا اس قسم کے دیگر الفاظ یا آیات کا یہ مفہوم کیسے ہوا؟ ہمارے ہاں کے دورِ ملوکیت میں' بادشاہت' شہنشاہیت' شخصی حکومت کی پہلی چیز یہی آئی کہ صاحب! یہ بادشاہ کیسے بن بیٹھا۔ لوگ بہرحال مسلمان تھے' وہ اس کا اطمینان کرتے تھے' اطمینان تو یہ مذہب کے نام پہ ہی کر سکتے تھے' وہ تو مذہب پرست قوم تھی۔ عقیدہ یہ وضع کیا گیا کہ یہ سب کچھ خدا کے ہاں پہلے سے طے شدہ ہوتا ہے اور کو خدا دیتا ہے' جس کو دیتا ہے۔ سلطنت بھی جس کو چاہتا ہے' دیتا ہے جس سے چاہتا چھین لیتا ہے دولت جس کو چاہتا ہے دیتا ہے جسے چاہے غریب بنا دیتا ہے جسے چاہے محتاج کر دیتا ہے' جسے چاہے ککھوں لکھی بنا دیندا اے' جنوں کیندے اوتسی جسے چاہتا ہے۔ اب وہ سارا جو نظام تھا کہ اس نے کچھ قوانین مقرر کر دیئے ہیں اور کہہ دیا ہے کہ جس قسم کا راستہ تم اختیار کرو گے اسی قسم کا نتیجہ تمہارے سامنے آئے گا' وہ جو بنیاد تھی' اصل تھی' وہ بنیاد ساری اکھڑ گئی اپنے ہاں سے۔ جب یہ بات ہو گئی کہ تم نہیں' تمہارا اختیار وارادہ نہیں' خدا جسے چاہے دیدیتا ہے۔ کاہے کے لیے قرآن مجید کی اتنی کھلی ہوئی ساری تعلیم کے خلاف یہ عقیدہ وضع کیا گیا۔

پہلی چیز یہ ہوئی کہ وہ جو قرآن حکیم کی رو سے کوئی شخص بھی زبردستی قوت کے زور پہ سلطنت حاصل ہی نہیں کر سکتا' اسے تو وہ استبداد کہتا ہے' اسے تو وہ فرعونیت کہتا ہے' اب یہ جو اس طرح سے حاصل کی' اس کے لئے شرعی یا مذہبی Justification کس طرح سے ہوئی؟ وہ آ گئے یہ حضرات: ہامان کا جنود۔ عقیدہ وضع کر دیا کہ انہوں نے یہ زبردستی نہیں لی' یہ تو خدا دیتا ہے جس کو چاہے' ان کے خلاف حرفِ شکایت زبان پر لانا خدا کے خلاف شکایت ہو جائے اور خدا کے خلاف شکایت کرنے والا بندہ پھر پوچھو نہیں اس کا کیا حشر ہو جائے گا۔ یہ کہنا عقیدے کی بنیاد بن گئی کہ یہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے' انسان کا اس میں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ آپ غور فرمائیے کہ اس ایک چیز میں کہ وہ انہوں نے ملوکیت یا بادشاہت استبداد اور قوت کے زور پہ حاصل کی تھی' اس کے بعد پھر آپ کا مذہب در آیا۔ پہلی چیز تو یہ ہو گئی۔

حضور ﷺ کا اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ اور اپنی پھوپھیؓ کے لیے پیغام

یہ بات کہاں سے دماغوں میں آئی' اس لیے کہ نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کے زمانے میں تو سوال ہی نہیں تھا کہ اس قسم کی کوئی بات ذہن میں آتی۔ وہاں تو حضورؐ کے اس حیاتِ ارضی کے وہ آخری الفاظ یہ ہیں کہ حضورؐ نے اپنی صاحبزادی اور اپنی پھوپھی سے کہا کہ فاطمہ اور غالباً صفیہؓ اپنے لیے کچھ کرلو۔ میں بھی تمہارے لیے خدا کے ہاں کچھ نہیں کر سکوں گا' اپنے لیے کچھ کرلو۔ جب عقیدہ یہ تھا تو یہ تو آ ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ عقیدہ کیوں پنپا ہے جو حضورؐ نے فرمایا کہ جو کچھ تم کرو گے اس کا نتیجہ تمہارے سامنے آئے گا؟ یہ خلافت تھی' ملوکیت نہیں تھی۔ خود ان میں سے کوئی بھی سلطنت حاصل نہیں کرتا تھا اور سلطنت کیا تھی؟ بس ذمہ داریوں کا مجموعہ تھی۔ جس مملکت کی یا سلطنت کی یا بادشاہت' اس بادشاہت کا تو خیر لفظ ہی غلط ہے' اس کے لیے جس حکومت کی کیفیت یہ ہو کہ اگر دریا کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو عمرؓ کے گلے میں اس کے لیے بھی رسی پڑے گی تو آپ اندازہ لگائیے کہ یہ کیا بادشاہت اور کیا شہنشاہیت' یہ لوگ تو کہتے تھے کہ یہ چیز تو ہمارے گلے میں ڈال دی' امت میں انہوں نے یہ کچھ کر دیا' ہمارے بس میں بات ہوتی تو ہم کبھی قبول ہی نہ کرتے۔

حضرت عمرؓ کے نزدیک خلافت کی ذمہ داریوں کا احساس

حضرتِ عمرؓ سے جب کہا گیا کہ اپنے بعد جو تم ایک شخص ہی نہیں بلکہ دو اشخاص مقرر کر دو تا کہ ان میں سے کوئی خلیفہ چن لیا جائے تو' اس میں اپنے بیٹے ❶ کو بھی رکھ لو تو آپؓ نے کہا کہ بابا! بخشو' یہ ذمہ داریاں ہیں' جو اس کی ہیں' خطاب کے خاندان میں سے ایک ہی شخص اگر اس کے لیے قربانی کا بکرا جو چڑھ گیا ہے' کافی ہے' باقیوں کو تو بخش دو۔ یہ تھی یہ حکومت: تمام ذمہ داریاں اور کوئی اقتدار نہیں۔

خلافت میں ملوکیت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا

دو لفظوں میں اگر کوئی سمجھنا چاہے کہ اسلامی حکومت کسے کہتے ہیں تو سُن رکھو! یہ تمام ذمہ داریاں بلا کسی اقتدار کے ہیں۔ تو اس زمانے میں تو یہ عقائد ہی نہیں آ سکتے تھے۔ پہلے تو ملوکیت کو ضرورت پیش آئی کہ اس انداز سے قوت کے زور پر سلطنت حاصل کرنے کی وجہ جواز کیا دی جائے' Justification کیا دی جائے۔ کوئی Justification نہیں حاصل ہو سکتی۔ میں سمجھتا ہوں اور بات دور نکل جائے گی' اس قسم کا تصور تو عربوں کی سرشت کے خلاف تھا' وہ بڑے صاحبِ اختیار ہوتے تھے اور عام طور پہ یہ صحرائی لوگ جس قسم کے جو بدو ہوتے ہیں' وہ مجبور نہیں' بڑے خوددار ہوتے ہیں' اور بڑے آزاد ہوتے ہیں۔ بدویت کا عقیدہ ہو نہیں سکتا تھا۔

---

❶ بیٹے کا نام عبداللہ ہے۔ ایک شخص نے کہا کہ آپؓ اپنے بیٹے عبداللہ سے کیوں گریز فرماتے ہیں- آپؓ نے فرمایا کہ خدا تجھے غارت کرے تو مجھے کون سے راستے کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ (پرویزؒ: شاہکارِ رسالت' 1987' ص 421)

عباسیوں کے ہاں کا یہ عقیدۂ تقدیر ایران سے آیا تھا

یہ کہاں سے آیا؟ یہ عباسیوں کے دور میں ایران سے آیا۔ ایرانی تو خیر پہلے ہی اسلام لے آئے تھے۔ اپنی سازش کے لیے ایران کا اس زمانے میں برامکا❶ بہت بڑا خاندان تھا۔ یہ مذہبی لوگ یا پیشوا ہوتے تھے۔

یوں تو بادشاہ یا شہنشاہ کے بعد ان کا نمبر آتا تھا لیکن فی الحقیقت سلطنت کے امور میں سب سے بڑا نمبر ہی ان کا ہوتا تھا۔ بادشاہ بھی گویا انہی کی مرضی کے تابع چلتا تھا۔ یہ برامکا ایرانی سلطنت کے احیاء کا عزم لے کر آئے' اپنے ارادے میں کامیاب تو نہ ہوئے لیکن مسلمانوں کی عظیم مملکت عباسیہ میں نہ اسلام رہنے دیا نہ عربیت؟ یہ آئے' اسلام لائے اور یہاں آ کر وزیر اعظم ❷ بھی ہو گئے اور سب کچھ اقتدار جو تھا ان کے ہاتھ میں آ گیا۔ یہ برامکا کے خاندانوں کے ہاتھ میں آیا' لباس تو انہوں نے اسلام کا اوڑھا ہوا تھا۔ یہ اسلام سے بدلہ لینا چاہتے تھے۔ میں نے اپنی کتاب ''شاہکارِ رسالت'' کے آخری باب❸ میں بڑی وضاحت سے یہ تاریخ لکھی ہے کہ ان سے کیسے بدلہ لیا گیا ہے۔ ایرانی بادشاہت کے زمانے کے یہ عقائد جتنے تھے' اور مذہبی پیشوائیت کے یہ جتنے عجمی خیالات و تصورات تھے' انہوں نے ایک ایک کر کے اسلام کو ایرانی رنگ میں رنگ دیا۔ تقدیر کا جو مسئلہ ہے' جو تصور ہے' یہ بھی انہی کا دیا ہوا ہے۔

برامکا کا وضع کردہ عقیدہ تقدیر اور پھر شب برات کا قصہ

ایرانیوں کے مذہب مجوسیت' جسے زرتشیت کہتے ہیں' کی بنیاد تقدیر تھی کہ ہر شخص کی تقدیر پہلے سے لکھی ہوئی ہوتی ہے' وہ مجبور محض ہوتا ہے۔ وہاں یہ عقیدہ کیوں تھا؟ وجہ یہ تھی کہ وہاں صدیوں سے شہنشاہیت چلی آ رہی تھی۔ شہنشاہیت کے اندر تو یہی ایک عقیدہ ہے جو پنپ سکتا ہے۔ ان عقائد کو جزوِ ایمان بنا دیا جاتا تھا۔ برامکا نے نہ صرف یہ عقیدہ وضع کیا بلکہ اسے ایمان کا جزو بھی بنا دیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ آج غالباً شعبان کی پہلی ہو گئی ہے یا آج رات کو چاند ہو جائے گا۔ اگر چاند نظر آ گیا تو شعبان ہے اس کو آپ شب برات بھی کہتے ہیں۔

---

❶ برامکا کے لقب کی وجہ تسمیہ کے متعلق اکثریت کا خیال یہ ہے کہ اس لفظ کی اصلیت ''بر ماہ گاہ'' ہے یعنی ایرانیوں کے سب سے بڑے آتشکدہ کا اعلیٰ ترین متولی یا پجاری۔ اس مندر میں چاند کے دیوتا کا مجسمہ نصب تھا اور نوبہار کہلاتا تھا۔ جاماسپ نوبہار کا پہلا موید تھا۔ (پرویزؒ: شاہکارِ رسالت' 1987' ص 465)

❷ برمکیوں کا جدِ امجد' جاماسپ بن یشتاسپ تھا جو گستاشپ کے زمانہ میں نوبہار کا پہلا موید مقرر ہوا اور اس خدمت کے اعزاز میں اسے پوری مملکت کا موید موبداں (قاضی القضاۃ یا چیف جسٹس) بھی بنا دیا گیا۔ یہ وہ اعلیٰ ترین منصب تھا جس کے سامنے شہنشاہوں تک کی گردنیں جھک جاتی تھیں۔ اس کے بعد اسے مملکت کا دستورِ اعظم (یعنی وزیر اعظم) بھی مقرر کر دیا گیا (ماخوذ از پرویزؒ: شاہکارِ رسالت، 1987، ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) لاہور' ص ص 464-65)

❸ اس کا نام ہے: شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد

شبِ برات ہے۔ برات لفظ کے معنی قسمت ہوتے ہیں۔ یہ قسمت کی رات کیا ہے؟ ایرانی آتش پرست تھے۔ یہ آتش بازی کیوں چلتی ہے؟ اس رات کو ابھی سے یہ وعظ شروع ہو جائیں گے' شبِ برات کی فضیلتیں بتائی جائیں گی اور ان میں بتایا یہ جائے گا کہ اس رات کو آئندہ سال جو کچھ کسی فرد کے ساتھ ہونا ہوتا ہے' وہ سارے کا سارا لکھا ہوا ہوتا ہے۔

پہلے سے لکھی گئی تقدیر کے باوجود سال کے بعد الگ الگ حساب اور فیصلے کا دن

خدا کے پاس کتاب ہے' اس کتاب میں لکھا ہوتا ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ لوگوں کے پیدا ہونے سے پہلے سے یہ سب کچھ اس کتاب میں لکھا ہوا ہے اور پھر جس طرح سال کا بجٹ بنتا ہے یہ جو شعبان کی رات کی چودہ تاریخ ہے' اس رات کو پھر ایک ایک فرد کا الگ الگ حساب رکھ دیا جاتا ہے۔ اسے وہ ''فرد'' ہی کہیے' ہمارے ہاں بھی ''فرد'' ہی کہتے ہیں۔ اس کا الگ الگ حساب الگ کر کے رکھ دیا جاتا ہے اور وہ مشہور ہے کہ وہ بہت بڑا درخت ہے' اس درخت کے نیچے یہ تقدیر کا فرشتہ تھال لے کر کھڑا ہوتا ہے' جس نے اگلے سال مر جانا ہوتا ہے اس کا پتہ اوپر سے گر جاتا ہے' اس تھال کے نیچے آ جاتا ہے۔

تقدیر کے غیر قرآنی تصور کے علاوہ شب برات اور نوروز کے تہوار کا جائزہ

عزیزانِ من! یہ اس قسم کی چیزیں ہیں' یعنی یہی جو انسان کے مجبور ہونے کا عقیدہ ہے۔ یہ مجوسیوں کے مذہب کا جزو تھا' بنیاد تھی اور یہ ان برامکا نے خاص طور پر آ کر اس کو یہاں عام کیا۔ اور ایرانیوں کے ہاں کا جو وہ آپ کے ہاں بھی آیا' وہ اب بھی عید نہیں مناتے ہیں' ''نوروز'' مناتے ہیں۔ انہوں نے یہاں تو نوروز [1] بھی اور یہ خاص طور پہ جسے یہ شب برات کہتے ہیں' ان کے ہاں کے عقیدے کی ایک بنیاد تھی' برات قسمت' تقدیر' نصیبہ' 'براتِ عاشقاں برشاخِ آہو' کس کو کہتے ہیں؟'' دیکھا! ہمارے ہاں شاعری میں بھی یہ چیز آتی ہے اور عجیب چیز ہے میں تو سمجھتا ہوں کہ دور تک بات چلی جائے گی۔ یہ لفظ جو ہم برات کہتے ہیں یہ بھی برات ہی ہے۔ کسی کو پتہ نہیں کہ یہ الفاظ ہم کیوں استعمال کر رہے ہیں۔ ''جتھے برات قسم سنجوگ نصیبہ'' یہ الفاظ ہمارے گھروں میں بولے جاتے ہیں۔ لڑکیوں کی شادیوں کے متعلق برات' شبِ برات۔ یہ عجیب چیز ہے اور جو تہوار ہمارے ہاں ہیں' ان کے لیے کوئی نہ کوئی وجہ تسمیہ وغیرہ بتا دیتے ہیں کہ اس میں یہ ہوا' اس میں یہ ہوا۔

---

[1] چاند کے دیوتا کا مجسمہ ''نوروز'' کہلاتا تھا۔

شب برات کی یہی وجہ تسمیہ ہے

یہ جو شبِ برات ہے اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا جاتا۔ اس رات کو ہر فرد کے جو نصیبے اور مقدر اور قسمت متعین ہوئے وہ الگ لکھے جاتے ہیں۔ بتایا یہ جاتا ہے کہ بھئی! یہ اس طرح سے منائی جاتی ہے کہ ساری رات نفل پڑھنا چاہیے' یہ کچھ کرنا چاہیے۔ یہ آپ کی شب برات ہے۔ یہ جو عقیدہ ہے کہ یہ پہلے سے سب کچھ لکھا ہوا ہے' اس لیے کسی کو یہ جائز ہی نہیں کہ اس کے خلاف حرفِ شکایت بھی زبان پر لائے۔ وہ سارا کچھ استبداد کیا ہوا تو اس ملوکیت کا ہوتا تھا۔ اس میں ظلم' استبداد' سلب ونہب Exploitation ہر چیز ہوتی تھی مگر یہ بیچارے زبان پہ نہیں لا سکتے تھے۔ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ کہتے تھے کہ یہ تو سارا کچھ خدا نے پہلے سے لکھا ہوا ہے' وہ ہو رہا ہے' یہ تو بیچارے مفت میں بدنام ہو رہے ہیں' انہیں کیا کہتے ہو! آپ نے غور فرمایا: عقائد ان وجوہات کی بنا پر وجود میں لائے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ ہے کہ جو خدا نے وحی کیا یعنی اس میں یہ بات ہے کہ کسی انسان کے خیال وتصور کا دخل ہی نہ ہو اس لیے اس خدا نے یہ بات جو یہ کہی کہ رسول کو بھی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ وحی بنائے' کوئی قانون بنائے یا اس میں کوئی تبدیلی کر سکے' یہ اسے بھی حق حاصل نہیں ہے اسی لیے اس نے دین کو دین اللہ کہا ہے' کسی رسول کا دین نہیں کہا۔

اسلامی حکومت کی تعریف اور اس کے بنیادی خدوخال

یہ (3:78) میں ایک ہی چیز ہے جو قرآن حکیم نے آگے کہی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس نے ملوکیت' سرمایہ داری' مذہبی پیشوائیت کی جڑیں کاٹیں۔ کیا کہہ کر اس نے قانون کی حکمرانی کا تصور دیا؟ اس نے جو' عزیزانِ من! تصور دیا ہے جسے آپ اسلامی مملکت کہتے ہیں' اسلامی حکومت کہتے ہیں' وہ اتنا عظیم تصور دیا ہے۔ خدا قادرِ مطلق ہے۔ اس کے ایک ارادے سے کائنات وجود میں آ سکتی ہے' ختم ہو سکتی ہے' وہ لا انتہا قوتوں کا مالک ہے۔ اس نے کچھ قوانین اور کچھ اقدار متعین کر کے' وحی کے ذریعے سے رسولوں کو دیدیں اور رسولوں سے کہا کہ انہیں دنیا میں عام کر دو' انہوں نے ہر شخص کو بتا دیا کہ یہ ہیں وہ قوانین' جن کے مطابق تمہیں چلنا ہے۔ ان قوانین کے بنانے میں کسی انسان کا کوئی دخل نہیں ہے۔ تو انسان کی حکومت تو ابتداً یہاں ختم ہوگئی۔ کوئی انسان قانون بنا ہی نہیں سکتا تو اقتدار ختم ہو گیا۔ قانون فرد نہیں بنا سکتا' افراد کا گروہ نہیں بنا سکتا۔ قرآن حکیم کی رو سے جمہوریت باطل ہے جس جمہوریت کو قانون بنانے کا اختیار ہو' وہ فرد ہو' وہ جمہوریت ہو' پوری نوعِ انسانی بھی کیوں نہ ہو' قانون بنانے کا اختیار کسی کو نہیں ہے۔ انسانوں کا اقتدار تو ختم کر دیا۔ رسول کو بھی اختیار نہیں ہے۔ کہا ہے کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے وہ انسانوں پر حکومت کرے Executive کی نیت سے حکومت کرے' نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں

ہے کہ وہ کسی انسان سے کہے کہ تم خدا کے قوانین نہیں میرے احکام کی تابعداری کرو۔

قرآنِ حکیم کسی انسان کو بھی انسانوں پر حکومت کرنے کی اجازت نہیں دیتا

عزیزانِ من! پوچھتے ہیں کہ اسلامی حکومت کسے کہتے ہیں اور یہ دنیا کے باقی نظامہائے حکومت سے کس طرح منفرد ہے اور وہ کون سی بات ہے جو ان کے ہاں نہیں ہے۔ آپ کوئی بھی نظام لے لیجیے' بہترین نظام اب جمہوریت کا لا رہے ہیں۔ وہ کیا ہے؟ یہ فرد کی ڈکٹیٹر شپ نہیں ہے' ایک گروپ کی ڈکٹیٹر شپ ہے۔ ایک نمبران کے اوپر زیادہ اُدھر آ جائے' جو 51 کا 49 ہے۔ وہ گروپ اور وہ فرد ہو یا گروپ ہو' جہاں آپ قانون سازی اور اختیار آپ نے انسانوں کو دیا ڈکٹیٹر شپ قائم ہو گئی۔ بنیادی یہ ہے۔

اب اگلی چیز ہے منفرد قوانین دیئے۔ حدود متعین کر دیئے۔ Limit مقرر کر دیں' انسانوں کو دے دیں' کہہ دیا کہ ان پہ ہم تمہیں زبردستی نہیں چلانا چاہتے ہیں' ان کو دیکھ لو' پرکھ لو' جانچ لو' پڑتال کر لو' علم و بصیرت کی رو سے' عقل و شعور کی رو سے۔ اگر تم اس سے Satisfied ہو جاتے ہو' سمجھ لیتے ہو کہ یہ تمہارے فائدے کی ہے' اسے قبول کر لو' نہیں سمجھتے تو انکار کر دو' تمہارے خلاف کسی قسم کی سزا نہیں ہے۔ Open ہے۔ جی نہیں چاہتا' نہ سہی' اس راستے پہ نہیں جانا چاہتے' ادھر جانا چاہتے ہو' چلے جاؤ' سمجھ یہ لو کہ یہ راستہ پہنچائے گا فلاں جگہ' لیکن تمہارا اختیار ہے جاؤ اور اگر یہ سمجھ سوچنے کے بعد تم نے ان کو مان لیا تو پہلا اطمینان تو یہ ہو گیا کہ اب کسی انسان کا کوئی اختیار و ارادہ قوت جو ہے وہ میرے اوپر نافذ نہیں ہو سکتی' اطاعت میں نے ان کی کرنی ہے۔ اس سے کتنا امن ہو گیا' اسی لیے ان کو مومن کہتے ہیں جس کو امن نصیب ہو اور جو دوسروں کو امن دینے والا ہو۔ کتنا امن ہے یہ' کہ یہ ہے کچھ Laws' کچھ حدود' کچھ Limitations' کچھ پابندیاں جنہیں میں نے خود قبول کیا ہے اور یہی پابندیاں ہوں گی۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا' کوئی اضافہ نہیں کر سکے گا۔ کوئی منسوخ نہیں کر سکے گا' کوئی رسول بھی نہیں' خدا تو قادرِ مطلق ہے۔ کہا کہ ہم تمہیں اطمینان دلاتے ہیں کہ ہم بھی انہیں تبدیل نہیں کریں گے. کہا کہ وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (6:34). اللہ اکبر اللہ اکبر! ہم بھی تبدیل نہیں کریں گے. لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (3:9) ہم بھی خلاف نہیں کریں گے' قادرِ مطلق جس کے اقتدار' جس کی قوت کی انتہا کوئی نہیں ہے' وہ یہ کہتا ہے کہ یہ دیدیئے ہیں ہم نے' اختیار دیا ہے کہ جی چاہے مان لو' جی چاہے چھوڑ دو۔ مان لیا ہے تو پھر اطمینان رکھو کہ ان میں اور تو اور یہ انسان تو ایک طرف رہے' ہم بھی ان میں تبدیلی نہیں کریں گے۔ تمہارے ہاں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ ہم یہ کرتے چلے آ رہے ہیں' ایک نبی کے بعد دوسرا نبی آ جاتا تھا۔ اس نبی کی وساطت سے ہم کچھ قانون یا شریعتیں ودیعت کر دیتے ہیں۔ جو پہلے سے کچھ مختلف ہوتی تھیں تو ذہن میں آ سکتا ہے کہ صاحب! وہ تو سلسلہ ہے' اس کے ذریعے تو خدا سے کہا جا سکتا تھا کہ آپ کر سکتے تھے' آپ اس کے ذریعے سے کریں گے۔ کہا کہ ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ نبوت

کا سلسلہ بھی ہم نے ختم کر دیا ہے۔

پوچھتے ہیں کہ اسلامی حکومت کسے کہتے ہیں۔اب باقی کونسی چیز رہ گئی جس کا کچھ تھوڑا بھی کھٹکا ذہن میں ہو کہ شاید اس میں تبدیلی پیدا ہو۔ یہ دین جو دیا ہے' اس دین کے اندر یہ تصور آنا کہ انسان مجبورِ محض ہے یا سارا کچھ پہلے سے لکھ لکھا دیا ہوا ہے' اس قادرِ مطلق نے' اس نے تو دوسرا کوئی اور طرف رہا خود انسان بھی اپنی قسمت میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا۔یعنی اس کے یکسر خلاف ایک دوسرا دین' ایک دوسرا عقیدہ' بنیادی عقیدہ' مختلف وہ آزدی بے انتہا' یہ مجبوری محض اور پھر اس کا نام اسلام رکھا گیا۔ملوکیت کو یہی سوٹ کرتا تھا' اسلام ملوکیت جس دین کی یہ کیفیت ہو کہ خدا نے یہ کہہ دیا کہ ہم بھی وعدہ خلافی نہیں کریں گے' کہا کہ اگر تمہیں کہیں یہ خیال پیدا ہو کہ فلاں بات وعدے کے معنی خدا کا قانون ہوتا ہے' یاد رکھیے کہ فلاں بات میں کوئی خلاف ورزی کچھ ہوگئی تو کہا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا (25:16) ہم بھی Accountable (جوابدہ) ہیں' ہم سے بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ تم نے یہ کیوں کیا ہے۔دنیاوی صاحبِ اقتدار تو ایک طرف رہا' وہ تو قادرِ مطلق ہے' میں اس لیے کہہ رہا ہوں۔

خدا کا دین جب مذہب میں بدلا تو خلافت نے اپنے سر پر ملوکیت کا تاج رکھ کر من یشاء کا قرآنی مفہوم ہی بدل دیا

عزیزانِ من! یہ ذہن میں آجائے کہ یہ جو بالکل متضاد قسم کا آپ کے ہاں مذہب ایجاد ہوا' یہ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ یہ ان کو سوٹ (Suite) کرتا تھا جو انہوں نے سازش کی تھی۔ پہلے تو عام طور پہ ہی وہ جتنے لوگ بھی ادھر ایران کی طرف سے آئے ہیں' جنہوں نے آکر اسلام قبول کیا' یہ سارا جتنا بھی آپ کا موجودہ مذہب ہے' یہ سارا ان کا تخلیق کردہ ہے۔احادیث کی رو سے' فقہ کی رو سے' ان تصورات اور عقائد کی رو سے' ملوکیت کے تابع زندگی بسر کرنا' عینِ اسلام ہے' ان کا نام بھی خلیفہ تھا جس طرح حضرتِ عمرؓ، ابوبکرؓ، عثمانؓ، علیؓ تھے۔ان کو بھی خلفا کہا اور یہ جو سارے بادشاہ آپ کے ہاں ملوکیت کے تھے یہ بھی خلفاء تھے۔انہیں بھی خلیفہ ہارون الرشید کہتے ہیں' آپ' اور یہ سارا اسلام اس دور کے اندر بنا۔میں نے عرض کیا ہے کہ اس کی جو بنیاد تھی' وہ قسمت اور تقدیر تھی' جس کی رو سے کوئی بھی جتنا جی چاہے ظلم اور استبداد کرلے' وہ Accountable (جوابدہ) نہیں ہوسکتا' اس سے پوچھا نہیں جا سکا تھا کیونکہ وہ تو مجبورِ محض تھا' یہ تو سب کچھ خدا نے اس کو دیا ہے اور جو کچھ وہ کرتا ہے' وہ خدا کی منشاء کے مطابق کر رہا ہے' وہ بیچارہ مجبورِ محض ہے۔

ہمارے موجودہ مذہبی اسلام نے ہر جرم کو بے لگام چھوڑ دیا

غور فرمایا! ان کے خلاف کچھ سوچنے کا ذہن میں تصور بھی نہیں آسکتا۔کرنا تو ایک طرف رہا' سرکشی اور بغاوت کے تمام امکانات کو ختم

کر کے رکھ دیا۔ ایک عقیدے نے اور پھر انہوں نے جس انداز سے منایا' آپ سوچیے کہ وہ عباسی سلاطین رہے' نہ وہ برامکا وزراء رہے' نہ اس زمانے کے مذہبی پیشوا رہے' لیکن یہ عقیدہ آپ کے ہاں چلا آ رہا ہے' شبِ برات آپ اسی طرح سے مناتے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے مثال کے طور پہ شبِ برات کہا ہے ورنہ ہمارا سارا اسلام مذہب بنا اور جو مذہب بھی ہمارا ہے' وہ اس تقدیر کے مسئلے کے اوپر ہے۔ کہا ہے کہ سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (57:21) تفاخر و تکاثر یعنی ایک دوسرے سے بڑھ جانے کا جذبہ بے شک انسانوں میں ہوتا ہے [1]۔ لیکن تم نے اس جذبہ کی تسکین کے لیے میدان غلط منتخب کیا ہے۔ اس کے لیے صحیح میدان یہ ہے کہ تم قوانین خداوندی کے اتباع سے' تخریبی قوتوں سے حفاظت طلب کرو۔ اس طرح وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (57:21) اور اُس جنت کو حاصل کرو جس کی آسائشیں اور مسرتیں ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ کسی خاص مقام میں محدود نہیں۔ اس کی وسعت زمین و آسمان کو محیط ہے (حوالہ ہے 3:132) اور وہ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (57:21) وہ تیار رکھی ہے ان کے لیے جو خدا اور رسولوں پر ایمان لائیں۔ اس طرح ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (57:21) یہ آسائشیں اور خوش حالیاں اس شخص کو مل سکتی ہیں جو انہیں قوانین خداوندی کے مطابق حاصل کرنا چاہے۔ چاہتا ہے وہ اسے دیتا ہے۔ قرآن مجید کی پوری تعلیم کے اندر یہ دیا ہوا ہے اور عربی زبان کی رو سے بھی لیا جائے تو یہ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (57:21) ہے کہ یہ ہے وہ جنت جس کی وسعتیں ارض و سما میں پھیلی ہوئی ہیں اور خدا اسے دیتا ہے جو اسے لینا چاہیں' انہیں دیتا ہے۔ یہ مَنْ يَّشَآءُ (57:21) عربی زبان کے بڑے سادہ سے الفاظ ہیں۔ کسی عربی جاننے والے سے پوچھ لیجیے کہ صاحب! اس کے یہ معنی ہیں یا نہیں؟ ٹھیک ہے۔ یہ یہاں بھی کتنا بڑا اختیار دیا ہے' جہنم میں وہ نہیں جاتا' جسے وہ نہ چاہے جو اسے لینا ہی نہ چاہے۔ وہ تو سیدھی بات ہے کہ میں جنت لینا ہی نہیں چاہتا تو پھر تو وہ جہنم ہوگی۔ جو لینا چاہے' اسے ہم دیتے ہیں۔ اب لینے کے لیے اس نے کچھ قاعدے قانون مقرر کر دیے ہیں۔ وہ سیدھی بات ہے' جو بھی آئے اس کو بہر حال سفر کرنا ہے تو ٹکٹ لینا ہوگا' اسٹیشن پہ پہنچنا ہوگا' سیٹ ریزرو (Reserve) کرانی ہوگی' اس گاڑی میں بیٹھنا ہوگا جو کراچی کی طرف جانے والی ہے' پشاور والی گاڑی میں نہیں' پھر وہ حکومت سے کہدے تو ہم اسے کراچی پہنچا دیں گے جو کراچی جانا چاہے گا۔ یہ تو پھر بھی کسی الٹی گاڑی میں بیٹھتے تھے۔

---

[1] تحفظِ خویش (Preservation of Self) زندگی کا تقاضا ہے جو ہر جاندار کے اندر جبلی طور پر (By Instinct) موجود ہے۔ دوسروں سے آگے بڑھ جانے کا جذبہ اسی تقاضے کا پیدا کردہ ہے۔ اگر انسان اس جذبہ کی تسکین اس طرح کرے کہ اس کی ذات کی نشوونما دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ ہو جائے تو یہ چیز حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی سطح کا تقاضا بن جائے گی (پرویزؒ: مفہوم القرآن۔ ص 1282 کا فٹ نوٹ)

قرآن حکیم کے صراطِ مستقیم کے برعکس مذہب، اسلام کے بعد طریقت کا سفرِ حیات بڑا ہی کٹھن سنگ لاخ اور کانٹوں کی سیج سے الجھا ہوا ہے

عزیزانِ من! وہ بھی تو تھے جو گھر میں بیٹھے ہی کراچی پہنچ جاتے تھے۔ اب یہ طریقت والے آ گئے۔ انہیں اتنا کچھ کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ کہا ہے کہ یُؤْتِیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ (57:21) کیا بات ہے اس قادرِ مطلق کی! کہا ہے کہ جو لینا چاہے، پھر یہ بات نہیں ہے کہ جو لینا نہ چاہے اسے ہم دے دیں۔ یہاں تو یہ ہے کہ جو لینا چاہے، وہ لے لے، ہم دیں گے، اس کو جو لینا چاہے۔ وہ مجبور ہو گیا۔ جب آپ نے قاعدے کے مطابق ٹکٹ خرید لیا، ریزرویشن کرالی، وہ گاڑی آ گئی جس میں آپ نے جانا ہے، آپ اس میں بیٹھ گئے، اس کے بعد آپ کو جنرل مینیجر تک بھی وہاں سے اُٹھا نہیں سکتا: میں نے قاعدے اور قانون کے مطابق یہ سیٹ لی ہے۔ یہ ہے یُؤْتِیۡهِ مَنۡ یَّشَآءُ (57:21)

قرآن حکیم کی ایک اہم آیت کے غلط ترجمہ کی پھیلائی ہوئی گمراہی اور اس کا نتیجہ

عزیزانِ من! آپ کو قرآن حکیم کی کیا کیا چیزیں عرض کروں۔ اب آ گے آ گئی اس کی تشریح میں اگلی آیت، اور یہ وہ آیت ہے جس نے یہ غلط عقائد پھیلانے کے لیے اس قدر چکر دے رکھا ہے۔ کہیں تو وہ تھوڑا بہت سہارا ہوتا ہے کہ اس آیت کو تو انہوں نے بنیادی سہارا بنا رکھا ہے۔ کہا ہے کہ مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَةٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیۡرٌ ۚ لِّکَیۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ وَلَا تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ اٰتٰکُمۡ ❶ (57:22-23)۔ کوئی ترجمہ اٹھایئے اور پھر دیکھیے کہ کہاں جا پہنچتے ہیں۔ وہ بات جو ابھی میں نے کی تھی کہ سارا کچھ پہلے سے مقدر میں، قسمت میں، لکھا ہوتا ہے اور وہ ایک کتاب ہے جس کو لوحِ محفوظ کہتے ہیں، یہ لوحِ محفوظ ہے، اس میں ہر ایک کے متعلق لکھا ہوا ہوتا ہے، لکھ دیا ہوتا ہے اور پھر اس آیت کا ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی مصیبت جو

---

❶ (ہم نے قانون یہ بتایا ہے کہ معاشی خوشحالیاں اسے حاصل ہوتی ہیں جو انہیں خود حاصل کرنا چاہیے۔ اس سے یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ رزق کمانے کی استعداد، مختلف افراد میں، پیدائشی طور پر، مختلف ہوتی ہے۔ نیز بعض خارجی حوادث کی وجہ سے ایسا ہو جاتا ہے کہ ایک شخص میں کمائی کی استعداد کم ہو جائے، یا بالکل ہی جاتی رہے، تو مندرجہ بالا قانون کے مطابق ایسے لوگ نقصان میں رہیں گے۔ یہ تمام امور ہماری نگاہ میں ہیں۔ اس لیے) ہم نے ان داخلی یا خارجی حوادث کے رونما ہونے سے پہلے ہی اپنے ضابطہ قوانین میں اس کی تلافی کا سامان رکھ دیا ہے۔ ہمارے نظامِ ربوبیت میں اس قسم کی شق کا رکھا جانا، کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ اس نظام میں تمام افراد کی محنت کا ماحصل، تمام انسانوں کی ضروریات پورا کرنے کے لیے کھلا رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس شخص کو اکتسابِ رزق کی استعداد کم ملی ہے یا وہ کسی وجہ سے، کم یا سلب ہو گئی ہے تو اس سے اس کی ضروریات پوری ہونے میں کچھ کمی نہیں واقع ہوتی لہٰذا اس کی اکتسابی قوت میں کمی، اس کے لیے ذرا بھی باعثِ تاسف یا وجہ غم نہیں بنتی۔ دوسری طرف اس سے ہوتا یہ ہے کہ جن لوگوں کو زیادہ استعداد حاصل ہوتی ہے وہ اسے اپنی ذاتی ہنرمندی سمجھ کر اس پر اتراتے نہیں کیونکہ وہ اس کی رو سے حاصل شدہ فراواں رزق کو اپنی انفرادی ملکیت نہیں سمجھتے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص ص 83-1282)

باہر کی دنیا میں آئے' فِی الارض آئے' وَلَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ (57:22) تمہاری اپنی ذات کے اندر آئے وہ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا (57:22) اس مصیبت کے پیدا ہونے یا نمودار ہونے سے پہلے ہی اس کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔

میں عرض کر رہا ہوں کہ اس مَنْ یَّشَآءُ (57:21) کا پھر وہ عام ترجمہ کر کے تو تقویت کیسے پہنچ گئی۔ اس میں پہلے سے لکھی ہوئی ہے۔ بھئی! یہ کیوں لکھدی پہلے سے' یہ سارا کچھ کیا لکھ دیا؟ وہ اس لیے کہا کہ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرٌ (57:22) یہ اللہ کے لیے بڑا آسان تھا' اس لیے کہ وہ تو علیم ہے' اس کا علم تو لامنتہی ہے اور علم الغیب ہے' ہر ایک کے متعلق وہ جانتا ہے کہ اس نے کیا کرنا ہے' کیا نہیں کرنا ہے' اس میں تو سوال ہی نہیں پیدا ہوا کہ اس نے کیا کرنا ہے' یہ کہ ہم نے کیا کرانا ہے' اس سے تو جس کی قدرت یہ ہو کہ وہ ہر فرد کے متعلق جانتا ہے کہ ہم نے اس سے یہ کرانا ہے اور اس کا پھر علم ہو سارا ہی اس کو تو اس کے لیے کتاب میں لکھ دینا مشکل کیا ہے۔ کہا کہ دیکھیے کہہ دیا اللہ نے کہ بڑا آسان ہے ہمارے لیے۔ کاہے کے لیے یہ کہا؟ کہا کہ لِّکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ (57:23) اس لیے کہ تمہیں جو نقصان پہنچ جائے اس کے اوپر' پھر رنج نہ کرو' تم افسوس نہ کرو۔ وہ تو جب کرو گے۔ جب یہ چیز ہو کہ فلاں شخص کے ہاتھوں سے نقصان پہنچ گیا' اس نے مجھے تکلیف پہنچائی' وہ مار کے لے گیا' یہ ظلم کرتا ہے۔ ظلم کرتا ہے یہ جو ہم نے تمہیں بتا دیا کہ یہ پہلے سے لکھا ہوا ہے۔ یہ اس لیے بتا دیا کہ ایسے موقعہ کے اوپر تم اپنے آپ کے اندر پریشان نہ ہونا شروع کر دو۔ اس نے کچھ نہیں کیا ہے' ہم نے یہ سب کچھ کیا ہوا ہے تاکہ تم اپنی تکلیف مصیبت نقصان سے تمہارے اوپر یہ اثر نہ ہو جائے کہ تم اتنے دلبرداشتہ ہو جاؤ' گلہ کرنے لگ جاؤ افسوس کرنے لگ جاؤ۔ بالکل نہیں۔ یہ دیکھا! کہ اس نے یہ ہر قسم کے ظلم اور تعدی اور سلب اور نہب اور Exploitation ہر قسم کی چیزوں سے مطمئن کر دیا محتاج کو' غریب کو' بھوکے کو' مصیبت زدہ کو کہ مصیبتیں آتی رہیں وہ جو کہا جاتا ہے کہ وہ ان کے جسم میں معاذ اللہ کیڑے پڑ گئے تھے تو وہ ایک کیڑا اگر جاتا تھا تو اٹھا کر پھر زخم میں رکھ لیتے تھے اور پھر ہمارے ہاں کا شاعر تو یہاں تک ہے کہ

مرضی یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لیے دعا نہ کریں

تاکہ تمہیں اس کا افسوس نہ ہو کہ یہ مجھ پہ مصیبت کیوں آ گئی۔ عقیدہ جو تمہارا ہو گیا کہ یہ تو پہلے خدا نے لکھ رکھی تھی۔ یہ اس کی طرف سے تو نہیں آئی کہا کہ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِنِ[1] (57:23) اور پھر جو کچھ مل جائے تو اس کے

---

[1] وہ اسے اپنی ذاتی ہنرمندی سمجھ کر اس پر اتراتے نہیں ہیں کیونکہ وہ اس کی رو سے حاصل شدہ فراواں رزق کو اپنی انفرادی ملکیت نہیں سمجھتے۔ وہ جانتے ہیں کہ ایسے لوگ جو خود پسند ہوں اور ایسی باتوں کی وجہ سے بڑا بننے کی کوشش کریں جو ان کی اپنی پیدا کردہ نہیں' قوانینِ خداوندی کی نگاہوں میں پسندیدہ نہیں قرار پاتے (پرویزؒ: مفہوم القرآن ص 1283)۔

اوپر بھی خواہ مخواہ تم متکبر نہ جاؤ' یہ بھی اسی کی طرف سے دیا ہوا ہے' وہ تو چھوڑ دیجیے کون نہیں متکبر ہوتا۔ اصل چیز تو یہ تھی کہ وہ جو تمہیں اس قدر مار پڑے اس کے خلاف حرفِ شکایت زبان پہ نہ لاؤ۔ عقیدہ یہ رکھ دیا کہ پہلے سے کتاب خداوندی میں تو لکھا ہوا تھا اور اس کو کوئی ٹال نہیں سکتا' اس کو کوئی بدل نہیں سکتا' اس کے خلاف میں نے یہ کیا کیا۔ وہ جو وارنٹ گرفتاری لے کر آتا ہے وہ سپاہی' اس سپاہی کے خلاف کیا رنج اور اس کے خلاف کیا گلہ! وہ تو لے آتا ہے کسی اتھارٹی کی طرف سے۔ ایک پروانہ لے کر آتا ہے۔ اس نے جو تکلیف پہنچائی' مجھے نقصان پہنچایا ہے' تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے اس لیے جب تم یہ عقیدہ رکھو گے کہ خدا کی طرف سے ہے' تمہیں کسی تکلیف' کسی رنج کا' کسی نقصان کا اثر دل پہ نہیں ہوا کرے گا' تمہیں افسوس تک بھی نہیں ہوا کرے گا۔

ہمارے ہاں قرآن حکیم کو پیش کرنے کا طریق نکاح نامے پر لکھی جانے والی ایک آیت کی مثال

عزیزانِ من! رکھ لو یہ عقیدہ' بن جاؤ پتھر دل' اس کے خلاف محسوس تک نہ کرو' بس مرضی یار کے خلاف نہ ہو جی! اور وہ تو میں بعد میں عرض کروں گا' ان کی صورت یہ ہے کہ جہاں تک حسبِ منشاء ہوتا ہے' وہیں تک قرآن حکیم کی آیت لیتے ہیں حتیٰ کہ آدھی آیت ہی لے لیتے ہیں اور آدھی چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ تو آپ کو پتہ ہی ہے کہ نکاح کے وقت' نکاح نامے کے اوپر بھی لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ آیت یہ ہے وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَلَّا تَعُوْلُوْا (4:3) اگر تم یہ محسوس کرو کہ (یہ جو ہونا چاہیے ہے) ایک بیوی کے ساتھ' تم عورتوں کے ساتھ' یتیموں کے ساتھ' انصاف نہیں کر سکو گے' میں اس کا مفہوم نہیں بیان کر رہا' میں کہہ رہا ہوں کہ یہاں سے آیت شروع ہوتی ہے کہ اگر یہ صورت پیدا ہو کہ تم انصاف نہ کر سکو تو پھر اس کے لیے تمہارے ہاں کی اجتماعی مشکل کا ایک راستہ ہے کہ ایک سے زیادہ بیوی کر لو۔ یہ ہے۔ آیت نکاح خواں کو کبھی سنیے گا وہ پہلا ٹکڑا وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی (4:3) پڑھتا ہی نہیں ہے۔ فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (4:3) سے شروع کرتا ہے یعنی یہ نہیں کہ اگلی آیت ہے' اسی آیت کا آدھا حصہ نکاح نامہ جو چھپا ہوا ہے' اس میں آپ دیکھیے گا۔ اس میں بھی یہ آدھا ہی حصہ چھپا[1] ہوا ہوتا ہے۔

ہم نے قرآنِ حکیم کو نظروں سے اوجھل بھی رکھا اور اسے بیچا بھی

عزیزانِ من! کچھ ایسی تحریف بھی کبھی آپ نے دیکھی ہے؟ وہ یہودی یا عیسائی لوگ تحریف کرتے تھے تو وہ پوری کی پوری آیت ہی غائب کر دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ آیت تھی تو ٹھیک ہے کوئی اس کو Detect ہی نہیں کر سکتا۔ یہاں قیامت یہ ہے کہ وہ کہنے والا حافظ

---

[1] یہ آیت آج کل کے نکاح نامے میں چھپی ہوئی نہیں ہوتی۔

قرآن حکیم ہوتا ہے' سارا قرآن حکیم حفظ ہوتا ہے' ہر ایک کے ہاتھ میں قرآن حکیم کا نسخہ ہوتا ہے اور اس کے بعد یہ آدھی آیت ہے اس کو لیے چلے جا رہے ہیں تو ہوتا ہی یہی ہے۔

میں عرض کر رہا تھا کہ یہاں تک تو آپ نے دیکھا۔ میں مفہوم بعد میں عرض کروں گا۔ اس کا مفہوم کیا ہے۔ ساتھ ہی اگلی آیت کا یہ حصہ پڑا ہوا ہے کہ الَّذِيۡنَ يَبۡخَلُوۡنَ وَيَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبُخۡلِ (57:24) یہ وہ لوگ ہیں جو ساری کی ساری دولت کو سمیٹ کر اپنی ملکیت سمجھ لیتے ہیں اور پھر خود ہی اس خیال سے یہ نہیں کرتے کہ لوگ ہمیں مطعون نہ کریں اس قسم کا کیپٹل ازم کا نظام قائم کر دیتے ہیں کہ سب یہی کرو وَمَنۡ يَّتَوَلَّ (57:24) یاد رکھو جو صحیح نظام سے اس طرح گریز کی راہیں نکالے گا' پھر اس کی جگہ ہم دوسری قوم لے آئیں گے۔ یہ بھی آگے لکھا ہے۔ تو اب ملاؤ دونوں آیتوں کو کہ جو کچھ کوئی لے جاتا ہے' جو کچھ کوئی اپنے پاس رکھ لیتا ہے' جس قدر کوئی لوٹ کھسوٹ مچاتا ہے' اس پہ کوئی افسوس نہ کرو۔ ہم نے ہی یہ سب کچھ کر رکھا ہے' پہلے سے لکھ رکھا ہوا ہے۔ تو یہ سارا کچھ Justify ہو گیا اور اگلی آیت میں یہ ہے کہ جو یہ کرتا ہے وہ جہنم میں چلا جاتا ہے۔ اوئے! آپے ای لکھ دتا اے سب۔ اوہدے بعد آپے ہی سانوں جہنم اچ بھیجیا جاندا اے (اپ! خود ہی یہ سب کچھ لکھ دیا۔ بعد ازاں وہ جہنم میں بھیجا جاتا ہے) اور ساتھ آیت پڑی ہوئی ہے۔

قرآن حکیم کی طرف سے انسانوں کی فریب دہی یا کم مائیگی کا تفصیلی جائزہ

اس سے اگلی آیت جب آئے گی تو پتہ چلے گا کہ یہ نظام جس میں یہ کہہ کر تمہیں فریب دیا جاتا تھا کہ اس کے ذمہ دار یہ نہیں ہیں۔ یہ سرمایہ دار' یہ مذہبی پیشوائیت' یہ ملوکیت ہے' جو تمہیں فریب دیا جاتا تھا۔ اگلی ہی آیت میں یہ ہے کہ اس فریب کو توڑنے کے لیے ہم نے کیا انتظام کر رکھا ہے' ایک ایک کی جڑیں کاٹ کے رکھ دیں گے۔ یہ ساری آیتیں آ رہی ہیں۔ وہاں تک کوئی نہیں جائے گا۔ ایک آیت اس کے اندر لے لیں گے۔ کہا کہ یہ ٹھیک ہے جہاں اس دنیا کے اندر تم نے رہنا ہے۔ یہاں یہ کچھ ہوگا۔ خارجی حوادث' زلزل' سیلاب' جھکڑ' قحط سالی بھی آئیں گے' خود ایک فرد کی زندگی میں بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ اپاہج ہو جائے' لنگڑا ہو جائے' لولا ہو جائے' کام کرنے کی سکت نہ رہے۔ فرد میں بھی ہو سکتا ہے اور خارجی دنیا میں بھی یہ چیزیں ہو سکتی ہیں۔ یہ جو چیز ہو گی اس پہ تمہارے رزق کے اوپر اثر پڑے گا' باہر کی دنیا میں ہوگا تو اجتماعی طور پر رزق کی تنگی ہو جائے گی۔

معاشرتی طور پر پیدا ہونے والے مسائل کا ذکر اور ان کی وجہ جواز

افراد میں یہ بات ہوگی تو اس فرد کے اوپر جو مصیبت آئی ہے' اس سے وہ بیچارہ بڑی مصیبت میں' تکلیف میں' زندگی بسر کرے گا۔ جس کو کسی طرح سے زیادہ سے زیادہ اس نے لوٹ کھسوٹ کے حاصل کر لیا' وہ اس سے بخل کرے گا' اپنی ملکیت سمجھ لے گا۔ کہا یہ جو تکلیفیں

ہونگی، تمہیں نقصانات پہنچیں گے' وہ اس لیے پہنچیں گے کہ جو نظام اس قسم کا ہے کہ جس میں جو ہر فرد ہے' اپنی اپنی ذمہ داریوں کے لیے آپ ذمہ دار ہے' کسی کی مصیبت میں کوئی دوسرا ہاتھ بٹانے والا نہیں ہے۔ کہا کہ چیزیں تو ہونگی۔ یہ نہیں کہ ہم تمہیں یہ کہیں کہ نہیں صاحب! اب ہمارے ہاں کا یہ نظام آ گیا' یہ چیزیں ہونگی ہی نہیں۔ یہ چیزیں ہونگی۔ ان کے ہونے سے جو ان کے نتائج نکلتے تھے کہ فرد اگر ہے تو وہ اس مصیبت میں پھنس گیا کہ بیچارہ بھوکا ہے' کوئی پرسانِ حال نہیں' دوسروں نے سمیٹ لیا ہے' کوئی اس سے چھیننے والا نہیں چنانچہ یہ سارا کچھ اس وجہ سے ہوگا۔

خدا کی طرف سے ملنے والا ضابطہ حیات تمام مشکلات کا واضح حل اپنے اندر لیے ہوئے ہے

یہ جو لفظِ کتاب ہے. یعنی فِيْ كِتٰبٍ (57:22) . یہ وہ الکتٰب نہیں ہے' یہ کوئی The نہیں ہے کہ یہ خدا کے ہاں کوئی ایک کتاب ہے۔ اس میں یہ سب کچھ لکھا ہے۔ کتاب کے معنی قانون ہوتا ہے۔ کہا کہ ہم نے قوانین اس قسم کے بنا دیئے ہیں کہ یہ کچھ ہوتا رہے' نہ کوئی فرد محروم رہے' نہ کوئی مملکت لوٹ کھسوٹ کر سکے۔ ہم نے قانون اس قسم کا بنا دیا ہوا ہے۔ کتاب کے معنی ہی قانون کے ہوتے ہیں اور وہ جو قانون ہے' وہ خدا کا نظامِ ربوبیت ہے کہ ایک فرد اپنی اور اپنے بچوں کی ضروریات کا ذمہ دار نہیں ہے' نظامِ حکومت ذمہ دار ہے' اسی کا یہ فریضہ ہے کہ باہر کی دنیا کے اندر سیلاب آئیں' زلزلہ آئے' یا کچھ آئے تو یہ حکومت کا فریضہ ہے کہ جا کر دیکھے کہ کوئی وہاں مصیبت زدہ نہ رہے' اسی کا فریضہ ہے کہ افراد میں بھی اگر کوئی معذور ہو گیا ہے' اس میں کمانے کی صلاحیت نہیں رہی یا استعداد نہیں رہی ہے' تو یہ کہ اگر تو وہ نظام سرمایہ داری ہو تو وہ تو بھگتے۔ کہا کہ ہم نے قانون ایسا بنا دیا ہے' ہمیں معلوم ہے کہ یہ چیزیں ہونگی' ہم نے تو ان واقعات کے پیش آنے سے پہلے ہی یہ قانون بنا کے دیدیا ہے کہ یہ ذمہ داریاں فرد کی نہیں ہیں' ذمہ داری (Responsibility) تو یہ ہماری تھی لیکن ہم اپنی ذمہ داریاں اس نظام کی وساطت سے پورا کیا کرتے ہیں جو ہمارے نام کے اوپر اقتدار قائم کرتا ہے۔ ہم نے قانون ایسا بنا دیا کہ یہ کچھ ہوتا ہے تو ہوتا رہے تو کوئی فرد متاثر ہی نہیں ہوگا' خارج میں یہ حوادث آئیں گے' نظامِ حکومت کا یہ کام ہوگا کہ جا کے فوراً دیکھے کہ کس کس کو مصیبت آئی ہے۔ افراد میں یہ چیز آئے گی تو انتظام ایسا' نظام ایسا' قائم کیا ہوا ہوگا کہ وہ یہ بات ہی نہیں کہ وہ کمائی کے قابل نہیں رہا تو وہ بھوکا مر جائے۔ وہ تو ہر ایک کو روٹی دینے کی ذمہ داری حکومت کے اوپر ہے۔ کمانے کے قابل ہے تو' کمانے کے قابل نہیں رہا تو۔ تو کہا کہ یہ جو نظام ہے' یہ ہے وہ قانون جو ہم نے ان چیزوں کے لیے بنا دیا' اور یہ ہے اللہ کی کتاب اور اس کی جڑ۔ یہ ہے نظامِ سرمایہ داری جس کے لیے کہا ہے کہ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ (57:24) کیا بات ہے!

نظام سرمایہ داری کی نوعیت جو بخل کی ترجمانی کرتی ہے اس کا علاج

کہا ہے کہ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (57:24) نظام سرمایہ داری جس میں ہر فرد کو یہ اجازت ہے یعنی اس کے اوپر کوئی پابندی نہیں ہے کہ وہ کتنی دولت جمع کر سکتا ہے۔ کہا کہ یہ ہے بخل۔ اب ایک فرد یہ کرے تو اس فرد کی بات ہے۔ کہا ہے کہ مصیبت یہ آ جاتی ہے کہ یہ جب اپنے ہاتھ میں اختیار لیتے ہیں تو وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (57:24) بخل کے معنی نظام سرمایہ داری ہے: انفرادی طور پر تم جتنا مال و دولت جی چاہے اکٹھا کر لو' یہ ہے نظامِ سرمایہ داری۔ اسی کو عربی میں بخل کہتے ہیں کہا کہ یہ خود چاہتا تھا کہ ایسا کرے اور اب جی میں کھٹکا یہ تھا کہ اس سے ذرا متکبر بن جاؤں گا' اس پہ انگلیاں اُٹھیں گی کہ کیسے یہ دولت جمع کر لی' کہاں سے لیا اتنا اور اس کے پاس تو پہلے کچھ تھا ہی نہیں' اب یہ اتنا کچھ کیا کر لیا' تو وہ کرتا کیا ہے۔ یہ ہوتا ہے صاحب اختیار۔ کہا کہ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (57:24) وہ معاشرے میں نظام ہی اس قسم کا رائج کر دیتا ہے کہ ٹھیک ہے جتنا کسی کو جی چاہے وہ جمع کر لے۔

سرمایہ داری ایک نظام کے سہارے پروان چڑتی ہے

عزیزانِ من! اب اس آیت کے غلط ترجمے نے' اس سب پہ پانی پھیر کر رکھ دیا ورنہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ جس کے پاس کچھ نہیں رہا' اس کو بھی اطمینان رکھنا چاہیے۔ افسوس اور گلہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ خدا کی طرف سے تھا جس نے اتنا جمع کر لیا ہے' اس کے خلاف بھی لب کشائی نہ کرو' خدا نے ہی دیا ہے' یہ ہونا چاہیے تھا۔ کہا کہ وہ اس کے خلاف ہے' اسی آیت میں' اگلی آیت میں' یہ کہتا ہے کہ یہ سارا کچھ اس لیے ہوتا ہے کہ یہاں نظام سرمایہ داری کا راج ہوتا ہے اور وہ چلتا ہے حکومت کے بل بوتے پر۔ اگر حکومت اسے قانوناً جائز نہ قرار دیدے' کوئی لٹنے والا بھی آسانی سے لٹ نہیں سکتا' زبردستی کوئی دوسرے سے ایک پیسہ نہیں لے سکتا' قانون یہ ہے۔ کہا ہے کہ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (57:24) کیا بات ہے اس قرآن حمید کی! اور یہ کون ہیں؟ کہا کہ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ (57:24) اپنے من میں یہ بات ہوتی ہے کہ ہم نے اتنا کچھ اکٹھا کرنا ہے اور اس کے لیے وجہ جواز کیا ہوتی ہے؟ معاشرے میں نظام ہی اس قسم کا پیدا کر دیتا ہے کہ یہ سب جائز ہے جتنے وہ مالک ہیں آپ اس میں Capitalistic Country میں دیکھیں گے۔ انہوں نے قانوناً اس کو جائز قرار دیدیا ہے۔

بخل کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا ارشاد

قرآن حکیم نے قانوناً یہ کچھ کہہ دیا کہ یہ ضرورت سے زیادہ مال جمع کرنا ہے۔ یاد رکھو! جہنم میں تپائے جائیں گے یہ سکے' داغا جائے گا تمہیں' اور کہا یہ جائے گا کہ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ (9:35) یہ وہ کچھ دولت ہے جسے تم نے اپنی ذات تک کے لیے محدود کر رکھا تھا اندازہ لگائیے۔ کہا ہے کہ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (57:24) جو اس سے گریز کی راہیں نکالے گا تو یہ بات نہیں ہے

کہ تم نے اللہ کا کچھ چھین لیا ہے' وہ یہ سب کچھ کرتا ہے اور تم سے چھین کے خود لے لے گا۔ نہیں یہ بات نہیں ہے۔ وہ تو غنی وحمید ہے۔ غنی ہے۔ چھیننے والا تو حمید نہیں ہوسکتا۔ اس کی تو کوئی تعریف نہیں کرسکتا۔ وہ غنی ہے اس لیے وہ اس قابل ہے کہ اس کی تعریف کی جائے۔ یہ جو چیز ہے کہ وَمَنۡ یَّتَوَلَّ (57:24) جو گریز کی راہیں نکالے گا تو پھر کیا ہوگا؟

قوموں کے عروج وزوال کا انحصار تمام تر اختیار کردہ نظام پر مبنی ہوتا ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ فرد کی نہیں' قوم کی بات ہے' نظام کی بات ہے۔ ایک ہی آیت میں پیش کروں گا: هٰۤاَنۡتُمۡ هٰۤؤُلَآءِ تُدۡعَوۡنَ لِتُنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ (47:38) تم وہ لوگ ہو کہ تمہیں نظامِ ربوبیت کی طرف بلایا جاتا ہے۔ اپنی ضرورت سے زائد جتنا کچھ بھی ہے وہ سارا دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے اس نظام کے حوالے کرو۔ اس کے لیے بلایا جاتا ہے۔ فَمِنۡكُمۡ مَّنۡ یَّبۡخَلُ (47:38) تو تم میں سے وہ ہیں کہ جن کا جی یہ چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہم اپنے لیے سمیٹ لیں۔ وَمَنۡ یَّبۡخَلۡ فَاِنَّمَا یَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِهٖ (47:38) جو اس طرح سے دوسروں کا کھسوٹ کے لے آتا ہے' اسے یاد رکھنا چاہیئے' یہ اپنی ذات کے خلاف یہ کچھ کررہا ہے۔ ذات کے خلاف کیوں کررہا ہو؟ اس لیے کہ اس نظام کے اندر ہی اس کو یہ اطمینان وامن حاصل ہے کہ کوئی نہیں دیکھ سکتا اور یہ نظام اور یہ حکومت ہی جب الٹ جائے گی' نہ تیرا نہ مجمد باشد نہ میرا' پھر تو بھوکا اور یہ امیر یکساں ہوجائیں گے۔ کہا کہ فَاِنَّمَا یَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِهٖ وَاللّٰهُ الۡغَنِیُّ وَاَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ (47:38) حقیقت میں محتاج تو تم ہو۔

جیسا نظام ویسی قوم ویسی زندگی

یہ ہے اگلی آیت کہ وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا (47:38) اگر تم اس نظام سے گریز کی راہیں نکالو گے جو ہم کہتے ہیں تو کیا ہوگا؟ کہا کہ یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَكُمۡ (47:38) تمہاری جگہ ایک دوسری قوم آجائے گی۔ کیسی ہوگی؟ کہا کہ ثُمَّ لَا یَكُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَكُمۡ (47:38)۔ وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ قوم بدل رہی ہے' وہ دوسری آرہی ہے' جو اس جیسی قوم نہیں ہوگی۔ قوم کیا ہوتی ہے۔ وہ نظام ہوتا ہے' جس کے تابع کوئی قوم زندگی بسر کرتی ہے۔ یہ جو نظام ہے یہ نظام الٹ جائے گا' جو بخل پر مبنی ہے۔ بخل کے معنی ہیں ہر فرد اپنی ذات کے لیے سب کچھ سمیٹ لے۔ یہ نظام بدل جائے گا اور وہ قوم آئے گی' جو اس کے برعکس نظام نافذ کرے گی' قائم کرے گی' وہ تمہارے جیسا نظام نہیں ہوگا۔ اس سے بالکل الٹ نظام ہوگا۔ وہ نظامِ ربوبیت ہوگا۔ ہم آگئے سورۃ الحدید کی آیت 24 تک۔

قانون مکافاتِ عمل کی آنکھ ہر لحہ قوموں کی موت وحیات کے پیمانے پر نظر رکھے ہوئے ہے

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کریم پھر بتاتا ہے کہ پھر یہ اس طرح سے اگر نہیں مانتے' جو کچھ ہم نے ان کو سمجھایا ہے'

دلائل و براہین سے بتایا ہے' یہ کچھ کیا ہے' یہ نہیں مانتے تو پھر یہ نہیں ہے کہ ہمارا قانون یا ہمارا نظام چپکے بیٹھ جائے گا کہ اچھا بھئی! تمہاری مرضی کیا کیا جائے اور راستے پہ بیٹھ جائے گا کہ دے جا بابا! اللہ واسطے کا' مجھے بھی کچھ دیدے۔ یہ بات نہیں ہے۔ ہم نے اسی قانون میں' اسی کتاب میں' یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اگر ایسی Situation ہو جائے تو اس وقت پھر کیا کرنا ہوگا؟ اگلی آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس نظام کی جگہ دوسرا نظام کس طرح سے آسکے گا۔ یہ کہا گیا ہے۔

عزیزانِ من! ہم موسم کے لحاظ سے یہاں وقت بدلا کرتے ہیں۔ اب تو درس نو بجے شروع ہوتا ہے' اگلا درس ساڑھے آٹھ بجے شروع ہو جائے گا تا کہ جاتے وقت یہ دھوپ زیادہ نہ ہو جائے صاحب! تو آئندہ جمعہ کو درس ساڑھے آٹھ بجے ہوگا۔ آپ بھی سن رکھیے' اخبار میں بھی دیدیا جائے گا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

ساتواں باب: **سورة الحديد** (آیات 25 تا 27)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جو احباب شروع سے درسِ قرآنِ کریم سنا کرتے ہیں ان کی اطلاع کے لیے چند تمہیدی گزارشات ضروری ہیں۔ آج مئی 1983ء کی 20 تاریخ ہے لیکن موسم بہت خراب ہے۔ اس خرابی کے باوجود درس تو شروع کیا گیا لیکن بجلی نہیں ہے جس کی وجہ سے یہ ویڈیو پہ درس حسب معمول ریکارڈ نہیں کیا جا سکا۔ اب کچھ وقت کے بعد بجلی آئی ہے تو یہ ریکارڈنگ شروع ہوا ہے تو درس کا پہلا مختصر سا ہی حصہ ہے وہ لیکن بہرحال ریکارڈ ہونے سے رہ گیا۔ میں ملخصاً اسے چند فقروں میں دہرادوں کہ اس اتنے حصے میں جو ریکارڈ نہیں ہوا تھا اس میں' میں نے کیا کہا تھا۔

ہنگامی حالات کے لیے قانونِ خداوندی کی وضاحت' امت کا فریضہ اور نظام عدل کی اہمیت

سابقہ آیات میں قرآن کریم نے کہا یہ تھا کہ یہ ٹھیک ہے کہ خارجی دنیا میں بھی حادثات آتے رہے ہیں' افراد کی زندگی میں بھی ایسے حوادث' ایسے سانحات آئیں گے' جس سے ایک فرد خود کمائی کرنے سے معذور ہو جائے تو اس سے تو یہ ہے کہ ایسے افراد رہ جائیں گے کہ جو ضروریاتِ زندگی سے محروم ہو جائیں اور ایسے ہو جائیں گے جو ان کے اس احتیاج سے فائدہ اٹھا کر دولت کے انبار جمع کر لیں لیکن ہم نے ایک ایسا نظام قائم کیا ہے کہ جس میں یہ چیز نہ ہونے پائے۔ یہ ساری ذمہ داری نظام اپنے سر لے گا اس لیے کسی فرد کو یا افراد کے گروہ کو نہ تو مایوس ہونے کی ضرورت ہے کہ اگر ایسے حوادث ہو گئے تو ہمارا کیا بنے گا اور نہ ہی کسی کو اتنی دولت جمع کرنے دی جائے گی کہ وہ دوسروں کی احتیاج سے فائدہ اٹھا سکے۔ کہا کہ اس کے باوجود ہم جانتے ہیں کہ وہ لوگ جو مفاد پرست ہیں' وہ اس نظام کو قائم نہیں ہونے

دیں گے۔ قائم ہوگا تو کوشش کریں گے کہ اس کو ناکام کردیں' تخریب کردیں' ان میں رکاوٹیں ڈال دیں تو کہا کہ یہ جو رکاوٹیں ڈالنے والے ہیں' ان کا بھی انتظام ہم نے کر رکھا ہے اور اس انتظام کے لیے کہا یہ تھا کہ صحیح نظام قائم کرنے کے لیے ہم نے انتظام کر رکھا ہے۔

عزیزانِ من! اب ہم آگے سورۃ الحدید کی آیت 25 پر جہاں سے آج کا درس شروع ہو رہا ہے' کہا ہے کہ ہم نے یہ انتظام کیا تھا کہ ہم اپنی طرف سے رسولوں کو بھیجتے تھے تو میں نے عرض کیا تھا کہ ختم نبوت کے بعد یہ جتنا مشن رسول ادا کیا کرتے تھے' وہ اب اس امت کے ذمہ دے دیا گیا تھا' جس کو کتاب اللہ کا وارث قرار دیا گیا تھا۔ امت مسلمہ کو کام کیا تھا؟ مشن کیا تھا؟ پروگرام کیا تھا؟ ان کام' مشن' پروگرام کے لیے انہیں بالبینت بھیجا گیا تھا۔ بیــنٰت یہ اس نظام تک پہنچنے کے لیے Stages گنائی ہیں کہ پہلی چیز تو یہ تھی کہ دلائل و براہین کی رو سے Rationale, Reason کے اعتبار سے ان لوگوں کو سمجھایا جائے کہ تمہاری روش بڑی غلط ہے' انسانیت کے خلاف جاتی ہے اس لیے اس سے باز آؤ تو جو لوگ اس طرح سے سمجھ جائیں وہ اپنی پچھلی روش کو خیرباد کہہ کر اس نظام کے اندر داخل ہو جائیں تو اس کے لیے انہیں وَ اَنۡـزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ (57:25) ضابطہ قوانین دیا جائے گا۔ ضابطہ قوانین الفاظ اور حروف کی شکل کے اندر قانون ہوتا ہے۔ وہ جب عملاً نافذ ہوتا ہے تو وہ نظام عدل کہلاتا ہے: لِيَـقُـوۡمَ الـنَّـاسُ بِـالۡقِسۡطِ (57:25) جس کے لیے قرآن کریم نے لفظ وَالۡـمِيۡزَانَ (57:25) استعمال کیا۔ عدل کا شعار یا اس کی Symptoms یا اس کی علامت میزان یا ترازو قرار دی گئی ہے' وہ ہم نے نافذ کیا۔ کہا کہ پھر اگر اس پہ بھی وہ لوگ مفاد پرست گروہ باز نہ آئیں اور اس کی مزاحمت کریں' مخالفت کریں' تو پھر یہ نہیں کہ ان کو جو جی میں آئے کرنے دیا جائے' مظلوم انسانوں کو پسنے دیا جائے' اس کے لیے ہم نے وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِيۡدَ فِيۡهِ بَاۡسٌ شَدِيۡدٌ (57:25). ہم نے الحدید نازل کیا۔

لفظ حدید کا مفہوم قوت ہے جبکہ قوت خیر بھی ہے اور شر بھی

یہاں لفظ الحدید ہے کہ ''ہم نے فولاد نازل کیا'' لیکن مادے [1] کے اعتبار سے اس کے معنی ہیں ''وہ قوت کہ جو ان کو حدود فراموش نہ ہونے دے اس کے اندر قوت ساتھ۔'' نافذ ہوئی''۔ اب قوت کا استعمال ہے اور قرآن کریم اس نظام کی خصوصیت ہی یہ بتاتا ہے کہ وہ جو چیزیں بھی دیتا ہے' ان کو وہ شر نہیں قرار دیتا' دولت کو وہ شر نہیں کہتا' یہ کوئی بری چیز نہیں ہے۔ وہ اسی طرح سے قوت کو وہ شر نہیں قرار دیتا۔ کہتا یہ ہے کہ ان کا استعمال' قوت کا استعمال ان کو خیر یا شر بنا دے گا۔ جب میں نے' جیسا پہلے کہا ہے' اگر وہ ظالم کی کلائی مروڑنے کے لیے ہے تو مظلوم کی منفعت کے لیے ہے اور اگر قوت کمزور کو کمزور تر کرنے کے لیے ہے تاکہ طاقتور اور زیادہ طاقتور ہو جائے تو یہ قوت وہ ہے کہ جو ابلیسیت ہے اور یہ ہے شر جس کی قرآن کریم اجازت نہیں دیتا۔ کہا کہ ہم نے انسانوں پر قوت نازل کی' عطا کی تاکہ اسے وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (57:25) نوع انسانی کی منفعت کے لیے استعمال کیا جائے۔

---

[1] ''الحدید'' کا مادہ ''ح د د'' ہے۔

عہد ملوکیت کے اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے جو قرآنی احکام کے خلاف ہے

اسی سے میں نے کہا تھا کہ ہمارے ہاں جو یہ تصور چلا آ رہا ہے کہ اسلام شمشیر کے زور سے پھیلایا گیا اور پھیلانے کے بعد جب لوگ مسلمان کر لیے گئے' انہیں اس باڑے میں بند کر دیا تو پھر ان کو اجازت نہیں ہے کہ اگر کسی وقت وہ یہاں سے نکلنا چاہیں تو اپنی مرضی سے نکل سکیں۔ نکلنے والے کی جو سزا ہے' وہ موت ہے۔ ہمارے ہاں کا وہ اسلام ہے جو عہد ملوکیت میں وضع ہوا اور وہ اب تک چلا آ رہا ہے میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کریم کی جو پہلی چیز ہے کہ وہ بزور پھیلا سارا قرآن کریم اس کی مخالفت کرتا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں ہے کہ ہم نے انسان کے سامنے دونوں راستے واضح کر دیئے اس کو عقل اور فہم دے دیا ہے۔ اختیار اور ارادہ دے دیا کہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔ اب یہی ہوگا کہ جونسا راستہ وہ اختیار کرے گا' اسی کی منزل کے اوپر وہ پہنچے گا۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (90:10) ہم نے انہیں دونوں راستوں کی راہنمائی دے دی' Sign Post (نشانات راہ) لگا دیئے چوراہے کے اوپر کہ یہ ادھر راستہ جاتا ہے' وہ اُدھر راستہ جاتا ہے۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (76:3) ہم نے راستہ دکھا دیا اب جس کا جی چاہے صحیح راستہ اختیار کرے' جس کا جی چاہے اس کو اختیار نہ کرے۔ تو ساری چیز انسان کے اختیار پہ ہے۔ باقی رہا یہ دین کے معاملے میں کہ وہ اس طرح سے شمشیر کے زور پہ اسلام کو پھیلایا گیا' آپ دیکھیے کہ قرآن کریم کیا کہتا ہے؟ یہ کہ مذہب کے معاملے میں جس قدر آزادی قرآن کریم کے منشور نے دی ہے' دنیا کے کسی منشور میں یہ بات نہیں ملے گی۔ ایک تو یہ ہے کہ صرف آزادی دے دی کہ جس کا جی چاہے' جونسا مذہب جی چاہے اختیار کر لے۔

غیر مسلم کے تحفظ کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا ارشاد

عزیزانِ من! اب یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔ آپ دیکھیے کہ قرآن حکیم کہاں تک جاتا ہے سورۃ الحج کی 40ویں آیت میں کہا کہ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (22:40) اگر ہم ایسا انتظام کرتے' ایسی امت پیدا نہ کرتے' اگر یہ انتظام نہ ہوتا تو مذہب کے معاملے میں' جبر کرنے والے کے ہاتھوں' تم دیکھتے کہ نہ کوئی گرجا محفوظ رہتا' نہ مندر محفوظ رہتا' نہ یہودیوں کی عبادت گاہ محفوظ رہتی' نہ مسلمانوں کی مسجد محفوظ رہتی۔ ہم نے اس قسم کا انتظام کیا ہے یہ نظام اور یہ امت پیدا کی ہے کہ وہ نہ کسی مندر کو گزند پہنچنے دے' نہ گرجے کو غیر محفوظ رکھے' نہ یہودیوں کی عبادت گاہ کے اوپر کوئی آ کر تسلط جمالے' یعنی وہ امت یہ ہے۔ وہ نظام جو قرآن کریم دے رہا ہے کہ اگر کوئی ایسی قوم زبردستی آ کر کسی غیر مذہب والے کی بات تو کہی ہے کہ عبادت گاہ کے اوپر تسلط نہ جمائے' اگر اس کے خلاف وہ کسی قسم کا جبر کرتا ہے تو یہ اپنے سینے میں گولیاں کھائیں گے' مندر کی حفاظت

کریں گے۔

عزیزانِ من! کیا جواز ہے اس کا کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا! میں نے عرض کیا تھا کہ جتنے منشور آپ دیکھیں گے ان میں مذہب کی آزادی کی حد تک تو یہ بات ہوگی کہ وہ غیر مذہب والوں کو ان کے مذہب کو تو وہ باطل قرار دیتا ہے مگر جن چیزوں کی وہ عبادت کرتے ہیں' ان کو وہ معبودِ باطل قرار دیتا ہے۔ وہ عبادت گاہیں تو خود ہی باطل قرار ہو گئیں لیکن حفاظت کی صورت یہ ہے کہ اگر کوئی آ کر زبردستی ان کی کسی عبادت گاہ کو بھی نقصان پہنچانا چاہتا ہے تو یہ اس امت کا فریضہ ہے کہ وہ قوت سے اس کا مقابلہ کرے اور ان کی عبادت گاہوں کو محفوظ کرے۔ کیا یہ چیز کہیں اور سے بھی ملتی ہے؟

پوری نوعِ انسانی کی بقا قرآن حکیم کا واضح تر منشور ہے

عزیزانِ من! یہ جو تھا کہ ہم نے شمشیرِ خارہ شگاف نازل کی تا کہ انسانیت کو فائدہ پہنچے اور اسے اس نے منفعت کی سب سے بڑی چیز قرار دیا ہے۔ جان اور مال اور دولت کی ان چیزوں کی حفاظت کی ذمہ داری تو قرآن کریم نے پہلے سے دے رکھی ہے کہ یہ اس نظام کا فریضہ ہے کہ وہ ان سب کی حفاظت کرے۔ معاملہ مذہب کا رہ جاتا تھا۔ صرف مذہب کے معاملے میں آزادی اور مذہب کی تو میں نے وہ آیات آپ کے سامنے پیش کیں کہ جن سے دونوں راستے واضح ہو گئے' جس کا جی چاہے یہ راستہ اختیار کرے' جس کا جی چاہے وہ راستہ اختیار کرے تو آزادی مذہب تو یہاں تک آ گئی۔ یہ بات کہ باطل کے جو مذاہب ہیں' ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت بھی ان کا ذمہ ہوگی تو قوت ان لوگوں کے خلاف استعمال کی جائے گی جو ان کو گزند پہنچانے کے لیے آئیں گے۔ کہا ہے کہ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (57:25) اصل یہ ہے کہ قرآن حکیم میں جسے ہم نیکی یا اچھائی یا بھلائی کہتے ہیں' اس کے لیے تو اصول ہی ایک مقرر کیا ہے کہ وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ (13:17) یعنی بقاء اسی عمل کیلیے ہے جو انسانیت کی منفعت کے لیے کیا جائے۔ جو مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ (13:17) ہے۔ یہ ہے بنیادی اصول کہ کسی کی یہ چیز جانچنے کا' پرکھنے کا' یہ عمل نیک ہے یا نہیں ہے۔ نیک عمل وہ ہے جو انسانیت کو فائدہ پہنچائے۔ جو یَنۡفَعُ النَّاسَ (13:17) ہے صرف مسلمانوں کو نہیں' اپنی قوم کو نہیں' اپنے قبیلے کو اپنے اہل وطن کو نہیں' بلکہ مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ (13:17) کے لیے ہے بقاء اس عمل کے لیے ہے۔ کیا الفاظ ہیں صاحب! جو نوعِ انسانی کو فائدہ پہنچاتا ہے بقاء اس کے لیے ہے۔ اب یہاں اس نے ایک چیز یہ بتا دی کہ مذہب کے معاملے میں آزادی تو ہم نے اس طرح سے گارنٹی کر دی یعنی مذہب کی اتنی آزادی ہے۔

حضرت عمرؓ فاروق کی خلافت کے چند ایک تاریخی واقعات

عزیزانِ من! حضرت عمرؓ کا ایک ملازم عیسائی تھا' وہ اکاؤنٹنٹ سا تھا۔ حضرتِ عمرؓ کے متعلق تصور یہ لیا جاتا ہے کہ ان کے ہاتھ میں درہ

(یعنی) ہنٹر ہوتا تھا اور مار مار کر لوگوں کی کھالیں ادھیڑ دیا کرتے تھے۔ ہاں تو وہ ان کا اکاؤنٹنٹ تھا۔ وہ عیسائی تھا اور وہ ساری عمر عیسائی رہا۔ عمرؓ نے کبھی اس سے کہا تک بھی نہیں' اس لیے کہ اسے بھی غالباً جبر تسلیم کیا جائے گا کہ تم اسلام کیوں نہیں لے آتے اور وہ جن کو کہا جاتا ہے' وہ یہی تھے جن کو آزادی ہوئی تھی؟ اسلام کے معنی ہیں جن کی حفاظت کی ذمہ داری انہوں نے لی ہوئی تھی اور حفاظت میں ان کے مال و دولت کی حفاظت ہی نہیں ہے بلکہ ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کا بھی ذمہ انہوں نے لیا ہوا ہے۔ اب ایک دوسری تاریخی بات سنیے۔ عمرؓ فاتح کی حیثیت سے بیت المقدس جاتے ہیں یہ وہاں عیسائیوں کا بہت بڑا گرجا تھا۔ وہاں نماز کا وقت آجاتا ہے تو وہ اِدھر اُدھر جگہ دیکھتے ہیں۔ وہ ادھر ہی کوئی قبہ کی سی چیز تھی' وہاں یہ بیت المقدس تھا اور اس قسم کے وہ جو قبے سے بنائے ہوئے ہیں۔ یہ مساجد وغیرہ بعد کی چیزیں ہیں' یہ کھنڈرات تھے۔ اِدھر اُدھر دیکھا کہیں نماز پڑھنے کو۔ گرجے کے پادری نے کہا کہ میں یہیں کپڑا بچھا دیتا ہوں اور آپ یہاں نماز پڑھ لیجیے۔ کہنے لگے کہ یہ ٹھیک ہے' مجھے اس پہ اعتراض نہیں ہے' یہ نہ سمجھ لینا کہ میں گرجے میں نماز نہیں پڑھنا چاہتا' میں تو پڑھ لوں گا۔ اگر میں نے یہاں نماز پڑھ لی تو میرے بعد آنے والے یہ سنت خلیفہ کے لحاظ سے تمہارے گرجے کو مسجد بنا دیں گے۔ میں یہاں نماز نہیں پڑتا صاحب! مجھے وہاں کھلی جگہ پہ نماز پڑھنے دو۔ جی! قوت کی یہ کیفیت ہے کہ وہ ایران اور روما تک کی تہذیبوں کو اکھیڑ کر رکھ دیا' آزادی کی حفاظت کی یہ کیفیت ہے کہ گرجے کے اندر سجدہ نہیں دینا چاہتے کہ میں تو نہیں' بعد میں آنے والوں کے متعلق ہوسکتا ہے کہ وہ یہ گرجا مسمار کر کے یہاں یہ مسجد بنا دیں آپؐ نے وہاں نماز پڑھی ہے۔ کہا ہے کہ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (57:25) یہ قوت منفعت الناس کے لیے' الناس کے لیے' استعمال کی جائے گی اس قوم کی صرف منفعت نہیں نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے یہ قوت ہے۔ وہ دین یہ ہے۔ نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے جو کچھ کیا جائے۔ لادین وہ قوت تو ہے مگر اس قوت میں دین ہے جو بنی نوع انسان کی منفعت کے لیے استعمال کی جائے:

لا دیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق
(اقبالؒ)

فکرِ قرآنی کی روشنی میں غیب کا وہ مفہوم جو عقل وفکر کے راستوں کو روشن کر دیتا ہے

وہ دین کی حفاظت کے لیے استعمال کی جانے والی قوت کو ہر زہر کا تریاق کہتا ہے اس لیے یہ کچھ دیا۔ قوت تو دی' بتا بھی دیا کہ یہ منفعت انسانیہ کے لیے استعمال کی جائے گی۔ آگے کہا کہ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ (57:25) یہاں یہ ہے کہ پھر یہ

جاننے کے لیے کہ کون خدا کی اور اس کے قائم کردہ نظام کی' مدد کرتا ہے۔ یہاں بالغیب ہے تو اس کے لیے غیب کا وہ مفہوم لے کر پھر عجیب عجیب معنی بنائے جاتے ہیں۔ بات بڑی صحیح ہے کہ کسان جو اتنی محنت کرتا ہے' موسم کی سختیوں میں ہل جوتتا ہے' بیج ڈالتا ہے' پانی دیتا ہے' حفاظت کرتا ہے۔ وہ یہ کیوں کرتا ہے؟ کوئی نتیجہ تو سامنے آ نہیں رہا۔ اس میں پہلی کونپل تک نہیں پھوٹ رہی پھر وہ روز یہ یہ کچھ کیوں کرتا ہے؟ وہ اس کے سامنے ان دیکھے نتائج ہیں اس کا اس پہ ایمان ہے کہ اس میں سے یہ خوشا اٹھے گا' پودا بڑھے گا' اور فصل لگے گی' ایک ایک دانے کے سات سات سو دانے بنیں گے۔ یہ ان دیکھے نتائج ہیں۔ اس نے ابھی یہ دیکھے نہیں لیکن اس کو یقین ہے کہ یہ ایسا ہوگا' یہ اس یقین اور ایمان کے اساس پر یہ ساری محنت اور مشقت کرتا ہے۔ اسے کہتے ہیں بالغیب یعنی وہ چیز جو ابھی مشہود طور پر سامنے نہیں آئی۔ اس کے متعلق اتنا یقین کامل ہے کہ یہ ایسا ہو کر رہے گا۔ اسے کہتے ہیں ایمان بالغیب اور وہ ہو کر رہتا ہے۔ وہ جو پھر ایمان ہوتا' وہ یقین کے درجے میں جاتا ہے وہ عین الیقین ہے جسے قرآن حکیم کہتا ہے کہ آنکھوں دیکھا ہے پھر یہ ہو جاتا ہے کہ واقعی میرا وہ یقین صحیح تھا لیکن جب اس کی وہ ابتدا ہوتی ہے اس وقت تو یہ ساری ایثار اور قربانی اور محنتیں اور مشقتیں اس ایمان کے سہارے ہوتی ہیں کہ یقیناً ایسا ہو کر رہے گا جو ابھی تک ہمارے سامنے نہیں ہے۔

جب یہ نظام قائم کیا گیا ہے تو اس کی ابتدائی زندگی' مکے کی زندگی میں' حضور ﷺ نے ابتداء کی' تو اس قوم نے جتنی مشقتیں اٹھائی ہیں اس کو دیکھنے کے بعد آج بھی روح کپکپا اٹھتی ہے۔ یہ ان لوگوں نے کیوں مشقتیں اٹھائیں؟ اس نظام کا کوئی نتیجہ ان کے سامنے نہیں تھا۔ یہ نظام بھی ان کے سامنے ابھی نہیں تھا۔ یہ تھا وہ اس کے ان دیکھے نتائج پر یقین اور ایمان' جس کی بنا پہ انہوں نے وہ جانیں تک دے دیں۔ یہ ہے بالغیب۔ قوت دی اور اس کے بعد پھر یہ دیکھنے کے لیے کہ اسے اس نظام کے قیام اور اس کے استحکام کے لیے جس کے نتائج ابھی ان کے سامنے نہیں آئے' اس کے لیے کون مدد کرتا ہے اور کس کی مدد کرتا ہے؟

خدا کے پروگراموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانا' اپنی زندگی کے الجھے مسائل کو ہی آسان بنانا ہے

خدا کی مدد کون کرتا ہے؟ سوچیے کہ کیا خدا ان کی مدد کا محتاج ہے؟ خدا کی مدد کرنا کیا ہے؟ یعنی خدا تو ہر ایک کی مدد کرتا ہے۔ یہ خدا کی مدد کرنا کیا ہے؟ مطلب وہی بات ہے جو میں نے کہی ہے کہ خدا اپنے پروگراموں کو انسانوں کے ہاتھوں سے بروئے کار لاتا ہے۔ جو اس کے پروگرم کو کامیاب کرنے کے لیے کچھ کرتا ہے' خدا کہتا ہے کہ وہ میری مدد کرتا ہے کیونکہ میرا پروگرام تھا' یہ نہ اٹھ کر ایسا کرتا تو یہ دھرے کا دھرا رہ جاتا۔ اللہ تمہیں خوش رکھے بھئی! تم نے بہت ہمارا کام کر دیا۔ وہ کون ہے جو خدا کی مدد کرتا ہے۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے' عزیزانِ من! قرآن کریم انسان کو اس کے صحیح مقام سے متعارف کراتا ہے۔ یہ اتنا بڑا مقام ہے کہ یہ اٹھ کر اگر یہ نہ کرے تو خدا کے

پروگرام دھرے کے دھرے رہ جائیں۔ وہ کہتا ہے کہ میں تمہاری مدد کا محتاج ہوں ''میں محتاج ہوں'' کی بات نہیں ہے! تو ساری یہ ہے کہ میں نے جو نظام، جو پروگرام، مقاصد متعین کیے ہیں، ان کو بروئے کار لانے کے لیے تمہارے دست وبازو کی ضرورت ہے۔ تم یہ کچھ کرو گے تو ہم کہیں گے کہ بھئی! شاباش!! اللہ تمہارا بھلا کرے، تم نے ہماری مدد کی، جو تم نے مدد کی ہے تو پھر ہم کیا کریں گے؟

خدا کی مدد حاصل کرنے کی ایک بنیادی شرط

یہ وہی آیت ہے جو میں نے ابھی سورۃ الحج کی 40ویں آیت تلاوت کی تھی۔ اس میں یہ ہے کہ **وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ** (22:40) جو ہماری مدد کے لیے اس طرح سے اٹھتا ہے ہم پھر اس کی مدد کرتے ہیں صاحب! بشرطیکہ وہ پہلے اٹھے، پھر ہمارا قانون، ہماری کائناتی قوتیں، ہمارے ملائکہ، یہ اس کے ساتھ اس کے نصیر ہو جاتے ہیں لیکن پہل اس نے کرنی ہے۔ یہ اٹھے گا تو یہ کہا کہ جو ہماری مدد کرے گا ہم اس کی مدد کریں گے اور کاہے کے لیے یہ مدد ساری ہو رہی ہے؟ کہا کہ **يَنْفَعُ النَّاسَ** (13:17) ہے نوع انسانی کی منفعت کے لیے ہے عزیزانِ من! حالانکہ کہا ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ** (22:40) یہ نہ سمجھو کہ ہم بہت کمزور ہیں، ہم تمہاری مدد کے محتاج ہیں، خدا تو بڑا صاحب قوت، صاحب غلبہ کا مالک ہے لیکن وہ ایک نظام ہے جو اس نے ایک دفعہ قائم کر دیا ہے پھر وہ اس کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ ہم نے یہ قائم کر دیا ہے کہ یہاں یہ چیزیں ان انسانوں کے ہاتھوں سے بروئے کار آئیں گی جو ہمارے اس پروگرام پہ یقین رکھتے ہوئے اٹھیں گے، اس کو قائم کرنے کے لیے، اس کو مستحکم کرنے کے لیے، ورنہ ہم تو قوی العزیز ہیں اور کہا تھا کہ ہم نے رسول بھیجے ان کا مقصد یہ تھا۔

حضرت نوح علیہ السلام کے ذکر کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ

اب یہاں پھر کچھ رسولوں کا ذکر آ رہا ہے۔ کہا ہے کہ **وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ** (57:26) یہ سلسلہ شروع سے ہی چلا آ رہا تھا حضرتِ نوح علیہ السلام سے یہ بات قرآن کریم نے شروع کی ہے۔ انہیں نبوت دی، کتاب دی، ان کو ذریت ملی، کچھ ہوا تو پھر ان کی امت میں سے کچھ لوگ تو ایسے رہے جو راہِ راست پہ چلتے رہے اور ان میں سے کثیر وہ بھی تھے کہ جو پھر اس راستے کو چھوڑ کر دوسرے راستوں پر نکل گئے۔ کہا کہ **ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ** (57:27) ان رسولوں کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہم نے بھیجا، انہیں انجیل دی۔ **وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً** (57:27) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جو تعلیم ہے اس میں بیشتر جو چیز اہم نظر آتی ہے، وہ ہے رافت محبت نرمی انکساری۔ کچھ زمانے کے حالات کا تقاضا یہ تھا۔ ان میں یہ چیز تھی لیکن یہ بات نہیں تھی کہ وہ باطل کی قوت کے سامنے جھکے ہوئے

تھے۔ یہ تصور غلط ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اوران کے جوحواری تھے وہ اس قدر کمزور تھے' اس قدر مضروب تھے' جھکے ہوئے تھے' منکسر المزاج تھے۔ وہ تعلیم کہ تمہارے ایک گال پہ کوئی طمانچہ مارے تو دوسرا گال سامنے کردو' اگر کوئی تمہارا کوٹ اتار کر لے جائے تو تم واسکٹ بھی اتار کر دے دو' یہ ساری چیزیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اوران کے حواریوں کا دین نہیں تھا۔ وہ تو وہی دین تھا جو تمام پیغمبروں کا دین تھا۔ رافت ومحبت اور چیز ہوتی ہے' قوت کا استعمال اور چیز ہوتی ہے۔

کچھ ذکر اورنگزیب کی شخصیت کا

عزیزانِ من! اب میں نے بتایا کہ ہمارے ہاں قوت کے غلط استعمال کے متعلق یہ عقائد ہوئے شمشیر ہاتھ میں لو اسلام پھیلاؤ اور وہ جو کہتے ہیں کہ جی! اورنگزیب روٹی اوہدوں کھاندا ہونداسی' جدوں سوامن زنارسوت کٹ لیندا ہونداسی۔ تہانوں پتہ کی ہوندی؟ اے سوت کا باریک سا نگا جسے کہتے ہیں' وہ ایک تا گا ہوتا ہے وہ ہندوؤں نے یوں ہاتھ میں باندھا ہوتا ہے؟ اسے ہندومت کی علالت سمجھا جاتا ہے جسے مسلمان کیا جائے تو اس کا وہ تاگہ توڑا جاتا ہے۔ وہ جو تاگا ہے وہ ماشہ بھر کا بھی نہیں ہوتا وہ سوت کا پتلا سا تاگہ ہوتا ہے تو آپ کے ہاں یہ ہے۔ اورنگزیب کو کہتے ہیں کہ اس نے شمشیر کے زور پہ اسلام پھیلایا تو ہر روز سوامن سوٹ کٹ لیندا اسی یہ جو تھے وہ کاٹ کے پھر روٹی کھاتا تھا یعنی اندازہ لگایئے وہ ماشے بھر کا تاگہ سوامن جو ہیں اس میں وہ کتنے آئے اور پھر روز یہ عمل جاری رہے

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ رندہ کنی خلق را و باز کشی

وہ تو یہی ہوتا ہے کہ وہ ہندوؤں کو قتل کر دیتا تھا وہ دوسرے دن پھر اٹھ بیٹھتے تھے' پھر یہ ان کو قتل کرتا تھا ورنہ وہ سوامن تو کہیں آ ہی نہیں سکتے تھے۔

ہمارے ہاں پھیلائے ہوئے اسلام کی نوعیت اسلام یا تلوار اور پھر تصوف

عزیزانِ من! آپ کے ہاں کا یہ دین' آپ کے ہاں کا یہ پھیلایا ہوا اسلام ہے اورنگزیب کا نام ایسا لیا جاتا ہے کہ یہ سب سے بڑے تھے ایک تو یہ تھی کہ قوت یہ آئے کہ افراد کی طرف آئے تلوار ہاتھ میں لی ہوئی ہے اور مارنے چلے آرہے ہیں دین کو زندہ کرنے والے: بتاؤ اسلام یا تلوار' اسلام یا تلوار؟ آپ کے ہاں کا یہ مذہب ہے۔ سارے یہی کہتے تھے یہ جتنی اسلامی فوجیں تھیں یہ اسلام یا تلوار پہ تھیں۔ ایک تو یہ قوت ہوئی دوسری طرف آ گیا آپ کا تصوف یہی تصوف کہ ہو جا ککھ مسیت دا۔ قوت تو ایک طرف رہی' ایسا بن جا کہ ہر ایک اپنے پاؤں کے نیچے لتاڑتا ہوا' ٹپتا ہوا چلا جائے اور جینوں کیندے ناں رڑ کے بھی ناں۔ مسیت دا ککھ رڑکدا نئیں ہیگا' وہ تمہیں روندتا جائے اور

تم محسوس تک نہ کرسکو یہ تصوف ہے اور اسلامی فوجوں کا یا اورنگزیب کا انداز کہ تلواری اسلام قوت ہے۔ یہ دونوں چیزیں افراط وتفریط ہیں جس طرح وہ اقبالؒ نے لکھا ہوا۔ پوت وہ پٹھان تھے کے شیرن پڑے رگ ناتھ وہ اس کے بعد تو یہ تصوف والوں کے قابو آ گیا تھا۔

تھے ہم پوت پٹھان کے دَل کے دَل دیں موڑ

شرن پڑے رگناتھ کے سکیں نہ تنکا موڑ

پٹھان کے پوت تو ان فوجوں کا رخ بدل دیا کرتے تھے وہ ان کے پاؤں جا کر لگ گئے تو اب تنکا بھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ طریقت یہ آ گئی۔ دوسری طرف تفریق ہے۔ جو آپ کے ہاں قوت کی آئی جسے قرآن کریم نے مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (57:25). کے لیے کہا کہ ہم نے نازل کی قوت' انسان کو یہ دی' اس قوت کے متعلق دوسری طرف یہ طریقت آپ کے ہاں آ گئی۔

رہبانیت کے متعلق قرآن حکیم کا اعلانِ عظیم

وہ پہلا عقیدہ جو قوت کے استعمال کا تھا وہ تو یہودیوں سے لیا۔ آپ لوگوں نے یہ دوسرا عقیدہ لیا' آپ کے ہاں کا تصوف کا عقیدہ ہے۔ یہ کہاں سے لیا؟ اس کے لیے زیادہ لمبی چوڑی ریسرچ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ جو ابھی میں نے آیت تلاوت کی ہے وہ آدھی ہے۔ بقیہ حصہ ہے کہ وَ رَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ (57:27) کہا کہ انہوں نے اپنے ہاں تصوف ایجاد کر لیا' اپنے ہاں رہبانیت [1] ایجاد کر لی۔ یہ عیسائیت سے ہے۔ کہا کہ ہم نے اسے فرض نہیں کیا تھا۔ ان کے اوپر تصوف کے سارے جتنے بھی نظریات ہیں اس کی جڑ کاٹ کر رکھ دی قرآن کریم نے یہ کہہ کر کہ ہم نے ان کے اوپر اس مسلک کو فرض نہیں کیا تھا مگر انہوں نے اسے بزعم خویش اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھ کر اختیار کر لیا مگر اسے جیسا نبھانا چاہیے تھا نبھا نہ سکے۔

کسی غلط کام کے لیے نیک نیتی کی سند عطا نہیں کی جا سکتی

عزیزانِ من! انہوں نے کیا کیا؟ کیا یہ ابْتَدَعُوْهَا (57:27) خود ایجاد کیا اسے نیک نیت سمجھے کہ اس سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوگی۔ نیک نیتی سے کیا اور رہبانیت (خانقاہیت) بڑی اہم چیز سامنے آئی۔ ہمارے ہاں یہ چیز ہے کہ صاحب! وہ ٹھیک ہے' ایسا ایسا وہ کچھ کرتا ہے' لیکن آپ جانتے ہیں کہ وہ ہے تو بڑا نیک نیت۔ یعنی غلط کام کو صحیح قرار دینے کی سند نیک نیتی ہے' نیک نیتی اور وہ تباہیاں جو نیک نیتی سے دنیا میں ہوتی ہیں بدنیتوں والے تو بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ بہرحال میں یہاں اس نکتے کو یہاں تک رکھتا ہوں۔ قرآن کریم میں محض کسی چیز کے حق ہونے کے لیے یہ دلیل یا سند دی کہ وہ نیک نیتی سے انہوں نے ایسا کیا ہے یا وہ کرتے ہیں۔ اس کو باطل

---

[1] دین' رہبانیت سکھانے کے لیے آتا ہی نہیں۔

قرار دیا۔ کہا کہ انہوں نے اس تصوف کو رہبانیت کو ایجاد کیا ہم نے ایسا نہیں ان کو فرض کیا' یہ مسلک ہمارا دیا ہوا نہیں تھا' انہوں نے خود اس کو ایجاد کیا' خود وضع کیا اور وہ وضع کیا بڑی نیک نیتی سے کہ اس سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوگی۔ اسے ایجاد کیا۔ کہا کہ **فَمَا رَعَوۡهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا**(57:27) اور اس کو پھر نبھا بھی نہ سکے۔

اسلحہ سازی کے سلسلہ میں عیسائیت کا جنون اور ہندو کے ہاں کی نمستے بھی اور اسلحہ کے ڈھیر بھی

یہ عیسائی ساری کی ساری دنیا میں سب سے زیادہ عقوبت کی پرستا ہیں اور استعمال کرنے والی جو قومیں ہیں' وہ ساری عیسائی قومیں ہیں۔ یہ کل کا آپ کے ہاں کا ہندوستان ہے' وہ بھارت والا گاندھی ہاتھ جوڑنے کا فلسفہ ہے۔ ساری عمر وہ فلسفہ دیتے چلے گئے۔ سب سے پہلے تو گاندھی جی خود اس پستول کے شکار ہوئے اور ان کی وہ قوم ایٹم بم میں سب سے آگے آگے چلی جا رہی ہے۔ اوتار بھی اسے مانا جا رہا ہے' اس کی تعلیم کے خلاف بھی سب کچھ کیا' کہا پھر انسان اس کو نبھا نہیں سکتا یہ جذباتی چیز ہے جب بھی حقائق کے ساتھ اس کا مقابلہ ہوگا' یہ ختم ہو جائے گی ساری چیز۔ **فَاٰتَيۡنَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡهُمۡ اَجۡرَهُمۡ ۚ وَكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ فٰسِقُوۡنَ** (57:27) ان میں سے جو لوگ حق کی راہ صحیح راستے پہ آ گئے انہوں نے اسلام قبول کیا۔ ان کے لیے ان کا اجر ہے۔

پادریوں سے جان بخشی کروا کر سیکولرازم کا حدود فراموش نظریہ حیات

باقی ان کی اکثریت کو تم دیکھو گے کہ وہ صحیح راستے سے نکلے ہوئے ہوں گے۔ اگر وہ عیسائیت کے اس مسلک پہ گامزن ہیں' جو تصوف یا رہبانیت سکھاتا ہے' تو ان کے ہاں سے تو دین بھی گیا اور دنیا بھی گئی' اور جو اس راستے کو چھوڑتے آئے ہیں' تو وہ پھر دوسری طرف آ گئے۔ وہ سیکولرازم کے اوپر آ گئے۔ انہوں نے لبادہ اٹھا کر رکھ دیا۔ انہوں نے پادریوں سے کہہ دیا کہ حضور! مہربانی کر کے آپ گرجے کی چاردیواری کے اندر تک رہیئے' آپ باہر نہیں قدم رکھ سکتے اور باہر کی دنیا کے اندر وہ اپنے طور پہ جس طرح جی چاہے' نظام بنائیں صاحب! فاسق کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس پیٹرن سے نکل جانے والا جو خدا نے ان کی پختگی کے لیے تجویز کیا تھا اس میں یہ دونوں قسم کے لوگ آ گئے۔

یہ اس سورۃ الحدید کی آیتیں تو دو تین ہیں اور آپ فرماتے ہیں کہ اس کے لیے (ٹیپ میں) اتنی جگہ نہیں ہے۔ وہ جو ہم ٹیپ کرتے ہیں' اس کے لیے اتنی بھی جگہ نہیں ہے۔ تو اس لیے ٹھیک ہے پھر ہم ان آیتوں کو آئندہ لے لیں گے۔ اس کے ساتھ سورۃ الحدید یعنی 57 ویں سورۃ ختم ہو جائے گی۔ آگے سورۃ المجادلہ ہے اور اس کے ساتھ ہی اٹھائیسواں پارہ بھی شروع ہوگا۔ یہ آئندہ درس یہ ستائیس پارے' ہم ختم کر لیں گے۔ اس سورۃ کی ان تین چار آیتوں کو ہم آئندہ درس کے لیے اٹھا رکھتے ہیں اور اس کے بعد پھر ہم اگلی سورۃ لے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ(2:127)

آٹھواں باب: **سورة الحديد** (آیات 28 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1983ء کی 27 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحدید کی آیت 28 سے ہو رہا ہے: (57:28)

شب برات کی مزید وضاحت

آغاز درس سے پہلے پھر عرض کر دوں، پچھلی دفعہ میں نے ایک استفسار کے جواب میں یہ بتایا تھا کہ یہ جو شب برات ہے، اس کے متعلق یہ حضرات بھی کچھ نہیں بتا سکتے کہ یہ کس واقعہ کی تقریب میں ہے۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ اس میں نوافل زیادہ پڑھے جاتے تھے، ایک دن کا روزہ رکھا جاتا تھا۔ اس دن میں یہ کیوں کیا جاتا تھا؟ ان کے پاس اس کا کچھ جواب نہیں تھا تو میں نے گزارش کیا تھا کہ دراصل یہ جو آتش پرست ایرانی مسلمان ہوئے اور ان میں سے یہ جو برامکا تھے، یہ عباسیوں کے وزیر بھی آ کر قائم ہو گئے تو انہوں نے اپنی وہ جو آتش پرستی کی ہوس تھی اور وہ جو مجوسیت کے جذبے تھے ان کی تسکین کے لیے آپ کا سارا اسلام ہی بدل دیا تھا اور اسی ضمن میں یہ ایک تہوار، جسے آپ آتش پرستی کہتے ہیں تو یہ اب تک جاری ہے آتش بازی آپ کے ہاں چلی آ رہی ہے۔ اصل میں ان کے ہاں جو تقدیر کا عقیدہ تھا اور ان کے مذہب کی بنیاد اس پہ تھی تو اس کو ایک اسلامی نام لینے کے لیے یہ روایات وضع کیں کہ اس رات سال بھر کے لیے جو کچھ کسی کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے، وہ لکھا ہوتا ہے تو وہ شروع سے ہی لکھا گیا ہوتا ہے۔ تو اس دنیا کی سطح پر اسے سال بہ سال نازل کیا جاتا ہے۔ تقدیر کے متعلق تو یہ عجیب چیز ہے۔ ہمارے ہاں کچھ عرصہ پہلے ان حضرات کو جب کچھ کہا جائے اور کوئی راستہ نہ ملے تو پھر وہ عجیب قسم کے دلائل دیتے ہیں۔

کوئی ان سے پوچھے کہ شب برات کا ذکر قرآن حکیم کی سورۃ الدخان میں کہاں ہے؟

یہ ریڈیو پہ بھی ایک دفعہ ایک صاحب نے تقریر کی تھی اور عام طور پہ یہ ہوتا ہے۔ پھر انہوں نے کہنا شروع کیا کہ صاحب! اس کا تو

قرآنِ کریم میں ذکر آیا ہے۔قرآن کریم سے ذکر!! بہر حال جی کہاں آیا ہے؟ کہنے لگے کہ سورۃ الدخان کو دیکھیے۔یہ 44 ویں سورۃ ہے۔ میں نے عرض کیا اور آپ حیران ہوں گے کہ اس تقریب کا ریڈیو پر چرچہ ہوا جو قرآن کریم کے درس کے سلسلے میں یہ چیز کی گئی اور پھر عام طور پہ یہ دہرایا جانے لگا کہ سورۃ الدخان میں ہے کہ اِنَّـآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنۡذِرِيۡنَ (44:3) اور فِيۡهَا يُفۡرَقُ كُلُّ اَمۡرٍ حَكِيۡمٍ (44:4) ہم نے قرآن کو نازل کیا ایک مبارک رات میں اور قرآن وہ ہے جو حق اور باطل میں تفریق کر کے امتیاز کر کے بتا دیتا ہے' الگ الگ کر کے دکھا دیتا ہے۔تو کہا کہ یہ ہے وہ رات' شب برات کی' جس میں قرآن حکیم نازل ہوا اور یہ سورۃ الدخان میں واضح ہے۔کہا گیا کہ صاحب! قرآن کریم نے تو خود کہا ہے کہ یہ لیلۃ القدر (97:1-3) میں نازل ہوا اور شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِىۡٓ اُنۡزِلَ فِيۡهِ الۡقُرۡاٰنُ (2:185). وہ رات رمضان کے مہینے میں آتی ہے تو وہ تو رمضان میں ہے۔قرآن حکیم کہتا ہے اور (بقول ان کے) یہ اس سے پہلے اس شعبان کی رات ہے۔

ہمارے علمائے کرام کے فیصلے کچھ اسی طرح کے ہوتے ہیں

آپ کہتے ہیں کہ پندرہ تاریخ تھی تو یہ تو قرآن کریم اس کے خلاف چلا گیا۔کہنے لگے: نہیں' آپ کو معلوم نہیں ہے۔یہ دونوں ہی ٹھیک ہیں۔اچھا' جی! وہ کیسے ٹھیک ہیں جی! یہ دونوں ہی۔وہ کہتا ہے کہ ہم نے رمضان کے مہینے میں نازل کیا۔تم کہتے ہو کہ شعبان کی اس تاریخ کو یہ نازل ہوا اور کہتے ہو کہ قرآن مجید میں یہ بھی ہے' قرآن حمید میں وہ بھی ہے تو کیا بات ہے قرآن مجید کی! کہ جی! یہ کیسے ہوا؟ دونوں کیسے ٹھیک ہوئے؟ کہنے لگے: دونوں ٹھیک ہیں۔یہ شعبان کی اس رات کو' جو یہ سورۃ الدخان میں کہا گیا ہے' قرآن کریم لوحِ محفوظ سے' پہلے آسمان پر نازل کیا گیا تو یہ وہاں آ گیا۔یہ تو آ گیا شب برات والا قرآن' اور وہ اس شہر رمضان والا جو ہے' وہ پہلے آسمان سے پھر آہستہ آہستہ تیئیس سال میں رسول اللہ تک پہنچا' تو یہ اس طرح سے نازل ہوا تھا قرآن۔عزیزانِ من! یہ حضرات بسم اللہ کے گنبد میں بستے ہیں' اپنے ساتھ ہی مباحثے کرتے ہیں' اپنے ہی ہاں مختلف فرقوں میں مناظرے ہوتے ہیں اور خود ہی مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے بالکل ٹھیک کیا۔ان کو کیا پتہ ہے کہ:

کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

دنیا کے مستشرق اور غیر مسلم دانشور' جو وہ اعتراض کرتے ہیں' ان کی ان خرافات کی بناء پر اسلام کے اوپر' جو اعتراض آپ کرتے ہیں وہ ان تک تو کبھی پہنچ ہی نہیں پاتے' اسی لیے ہم نے انگریزی کو حرام قرار دیدیا ہے کہ پتہ ہی نہ چلے کہ لوگ کہتے کیا ہیں لیکن جنہیں پھر ان کا جواب دینا پڑتا ہے' ان کے لیے تو دشواری ہوتی ہے تو وہ تو یوں سمجھیے اس دور میں اللہ تعالیٰ کا یہ فضل ہے کہ ایک چیز بہر حال عام ہو گئی کہ یہ

جو روایات ہیں' یہ دین کی بنیاد نہیں ہیں' ان کے لیے یہ سمجھیے کہ جو روایت قرآنِ کریم کے مطابق ہوگی اس کے متعلق تو کہا جا سکے گا کہ یہ رسول اللہ کی ہو سکتی ہے' یقینی طور پر اس کے متعلق بھی نہیں کہا جا سکتا کہ رسول اللہؐ نے تو اپنی روایت کا' ایک نسخہ بھی خود مستنبط کر کے امت کو نہیں دیا اور قرآن کریم سارے کا سارا مدون کر کے دیا لیکن بہر حال یہ بات تو ہوگئی کہ اس کے پرکھنے کا یہ ایک پیمانہ ہے کہ جو اس کے مطابق ہے اسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ صحیح ہے اور جو اس کے خلاف ہے اس کو تو فوراً ہی مسترد کر دینا چاہیے۔

علامہ غلام احمد پرویزؒ کا مشن اور غیر مسلم دانشوروں کے نزدیک اسلام کی شکل وصورت

یہ ہے وہ چیز جس کی بناء پہ آپ ان غیر مسلم معترضین کے اعتراضات کا جواب دے سکتے ہیں اور دعویٰ یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں کوئی چیز اختلافی نہیں ہے۔ یہ قرآن کریم کا دعویٰ ہے اور یہ مبنی بر حقیقت ہے۔ بہر حال میں کہا کرتا ہوں' چھوٹا منہ بڑی بات' میں نے چونکہ یہ ایک مشن اپنے ذمے لے رکھا ہے' میرے پاس یہ لوگ' باہر کے بھی' ان کے ہاں کے اچھے اچھے دانشور مستشرق آتے ہیں' انہوں نے بڑا ہی مطالعہ کیا ہوتا ہے۔ اسلام ان کے نزدیک انہی روایات پر اور فقہ پر ہی مبنی ہوتا ہے' تو ان کے سامنے جب قرآنِ کریم کا یہ اصول رکھا جاتا ہے تو آپ حیران ہونگے کہ اب تک ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی اعتراضات لے کر آیا ہو اور پھر دل کی تسکین کے ساتھ نہ گیا ہو۔ قرآن حکیم تو اطمینانِ قلب کر دیتا ہے تو بہر حال یہ اس کے لیے کہا کرتے ہیں کہ شب برات یہ ہے اور اصل مسئلہ تو حلوے کا ہی ہے۔

خلیل جبران (1883-1931ء) کی شاعری

عزیزانِ من! وہ آیا۔ وہ بات تو خلیل جبران کی ہے' وہ عجیب شخص تھا۔ یہ لبنان کا شاعر تھا' اس کی نظموں کے ترجمے بھی ہوگئے ہوئے ہیں۔ ترجمہ ہے کہ

جنت کی دیوار کے اوپر' میں اور شیطان جھانک رہے تھے

تو اندر کیا دیکھا۔

حلوے کے اک ڈھیر کے اوپر' ملاں بیٹھا اونگھ رہا تھا

کیا قرآن حکیم کے نزول کا ذکر سورۃ الدخان میں موجود ہے؟

یہ عجیب شخص تھا' بہر حال قرآن حکیم کی رو سے اس کی کوئی سند نہیں جو یہ کہتے ہیں کے قرآن حکیم عرشِ معلٰی سے' پہلے آسمان پہ آیا۔ عزیزانِ من! ان پہ بھی کوئی طنز کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ وہ بہر حال بالواسطہ کہیں قرآن حکیم تک نہ جا پہنچے ورنہ انہیں بتایا جائے کہ یہ کیا انداز ہے تمہارا بات کرنے کا کہ لوحِ محفوظ سے ایک دفعہ پہلے یہ آسمانِ اول کے اوپر آیا' تو کیا اس کے بعد معاذ اللہ تھک گیا' پھر آگے نہیں

چل پڑا' اور وہاں سے آسمانِ اول سے پھر آہستہ آہستہ تئیس سال میں رسول اللہ ﷺ تک پہنچا' اور قرآن حکیم اپنے متعلق کہتا ہے کہ جبریل نے اسے رسول اللہؐ کے قلب پر نازل کیا اور جب قرآن حکیم نے کہا کہ شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ (2:185) کے متعلق جو کچھ بھی کہو تو یہ رمضان کے مہینے میں آیا ہے لیکن (ان کے قول کے مطابق) یہ شعبان کے مہینے میں نازل ہو رہا ہے۔ اب جب یہ کہا کہ یہ صاحب! یہ تو اس کے خلاف جاتا ہے تو کہنے لگے: نہیں صاحب! یہ دو دفعہ نازل ہوا تھا۔ بہر حال یہ ہے اس کی ساری حیثیت۔

موجودہ اسلام عہدِ رسالت کے اسلام سے ہٹ کر عجمی اسلام کا رہین منت ہے

عزیزانِ من! یہ سارا عجمی اسلام ہے' قرآن کریم کا اسلام نہیں' رسول اللہ ﷺ کا دیا ہوا اسلام نہیں ہے' تو بہر حال اب درس میں یہ بات آ گئی۔ اب درس میں سورۃ الحدید کی آخری آیت آ گئی اور جیسا میں نے عرض کیا ہے' قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ آخری آیات جو سورۃ کی ہیں' ان میں کچھ ارتکاز کا ملخص (Concenntrate) کر کے بیان کر دیتا ہے۔ کوئی چیز جو کہنی ہوتی ہے' اسے وہ کہتا ہے اور پھر اگلی سورۃ آتی ہے۔ تو یہ آخری سورتیں ہیں جن میں کہا کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ (57:28) اور آگے ہے کہ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ (57:28)۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ اے ایمان والو یعنی یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ اے ایمان والو! اور ان سے کیا کیا جاتا ہے؟ یہ کہ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ (57:28) ایمان لاؤ! تم رسول پہ یعنی مخاطب کیا جاتا ہے: اے ایمان والو! تاکید کی جاتی ہے کہ ''ایمان لاؤ تم''، اور یہ ایک ہی مقام پہ ہی نہیں ہے۔ آپ کو یہ یاد ہوگا یہ متعدد مقامات پر درس میں کئی دفعہ آ چکا ہے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا (57:28) سے بھی کہا گیا' اور ایمان لانے کی بابت تو رسول اللہ ﷺ سے بھی کہا گیا ہے۔ کہا کہ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ (2:285)۔

عرب کے اعراب کی مانند یایھا الذین امنوا کے الفاظ ہم موجودہ مسلمانوں سے متعلق ہیں

یہ جو ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (57:28) یہ کہہ کر تو میں یہی کہا کرتا ہوں کہ 'اٰمَنُوْا' جو پہلا ہے' اس سے مراد ہم مسلمان ہیں کہ اے اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والو! تمہارا ایمان' ایمان نہیں ہے' ایمان لاؤ اور ہم پہ تو یہ آیات بالکل صحیح منطبق ہوتی ہیں صاحب! یعنی ویسے رسمی بھی اگر دیکھا جائے تو ہم میں سے کوئی رسمی طور پہ بھی ایمان نہیں لایا ہے۔ ایک غیر مسلم کو مسلمان ہونے کے لیے بہر حال ایک رسم تو ادا کرنا پڑتی ہے' چار کلمات جو ہیں یا یہ کلمے پڑھنے پڑھتے ہیں' اس کے بعد وہ مسلمان ہوتا ہے۔ ہم نے تو وہ بھی نہیں کیا ہوتا چہ جائیکہ جو ایمان کی شرط ہے' اس کو پورا کیا جائے اور آپ کو یاد ہے کہ قرآن کریم نے جو اعراب کو' ان بدوؤں کو' کہا تھا کہ یہ کہتے ہیں: اٰمنا (49:14) ''ہم ایمان لے آئے''، ان سے کہو کہ یہ نہ کہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ یہ کہیں کہ صاحب! ہم نے اسلامی مملکت کے

سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ کیوں نہ کہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں؟ وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ (49:14) ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں تک نہیں پہنچا تو مسلمان کہلانے کا تو حق اس کو ہوگا جس کے دل کی گہرائیوں تک ایمان پہنچا ہوا ہو۔ قرآن حمید ان سے خود کہہ رہا ہے کہ ابھی یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ ہم تو ویسا ایمان بھی نہیں لائے جیسا کہ وہ اعراب لے آئے ہوئے تھے۔ بہرحال انہوں نے اپنے آپ کو سرنڈر (Surrender) تو کر دیا تھا ان قوانین کے سامنے اور عزیزانِ من! نہ تو صرف قوانین' اسلام کہلا سکتا ہے اور نہ قوانین کی اطاعت صرف اسلام کہلا سکتی ہے۔ یہ تو پورے کا پورا اسلام ہے جو آپ کو ساری زندگی کے اندر نافذ کرنا ہوگا۔ اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً (2:208) اسلام کے اندر پورے کے پورے داخل ہو جاؤ گے تو پھر اسلامی کہا جائے گا۔ تو بہرحال کہا ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ (57:28) قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کے نتائج سے ڈرو۔ یہ جو اللہ سے ڈرو ہے' یہ بڑا غلط تصور دیتا ہے۔

خوف وحزن میں پرورش پانے والی قوم ذہنی طور پر مفلوج ہو کر عقل وفکر کی لازوال دولت سے محروم ہو جاتی ہے

عزیزانِ من! اللہ ایسی شے نہیں ہے کہ جس سے ہر وقت آدمی ڈرتا ہی رہے' کانپتا ہی رہے۔ قرآن کریم تو اس معاشرے کی' جس میں نظامِ خداوندی پورے کا پورا نافذ ہو' اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (2:38) اس میں کوئی کسی قسم کا خوف نہیں ہوگا۔ خوف کیا' وہ تو حزن بھی نہیں ہوگا۔ بہرحال اس معاشرے کی خصوصیتِ کبریٰ یہ ہے کہ خوف نہیں ہوگا' ڈر نہیں ہوگا۔ ایک طرف تو وہ یہ بتائے اور دوسری طرف ہم قدم قدم پہ کہیں کہ صاحب! وہ ڈرتے رہتے ہیں خدا سے' خوف ہوتا ہے ان کو۔ یہ بات نہیں ہے' عزیزانِ من! خدا ڈر اور خوف کا مقام نہیں ہے۔ یہ تو ہم اپنے بچوں کو ان کے دل میں بچپن ہی سے خدا کے متعلق ایسا ڈر ڈالتے ہیں' کہ او! بھاگ کر آ جا' او! نیکی آئی۔ او پتہ نئیں کی کچھ آ گیا۔ اوناں نوں ڈرا ڈرا کر کچل کر رکھ دیتے ہیں۔ (اور معلوم نہیں کہ کیا کچھ آ گیا۔ انہیں ڈرا ڈرا کر کچل کر رکھ دیتے ہیں) ان کی ذات کو ابھر کر نشو ونما پانے ہی نہیں دیتے اور پھر ہمارے ہاں تو شروع سے آخر تک ڈر ہی ڈر ہے۔ باہر ایک قدم بھی آپ بے خوفی سے نہیں نکل سکتے' ڈر تو چھلاوے کی طرح ہم سب کے ساتھ چپکا ہوا ہے۔

شرکا عمل ہمیشہ خوف وحزن کو جنم دیتا ہے جب کہ تقویٰ کے دیئے گئے مفہوم میں اس کا بہترین علاج مضمر ہے

قرآن حمید نے کہا تھا کہ وہ دور بھی آئے گا جب شرا اثر کر لگ جایا کرے گا تو خوف تو شرک کی سب سے پہلی علامت ہے تو قرآن حمید نے ان لوگوں سے یہ چیز کہی کہ جہاں بھی تقویٰ کا ترجمہ کیا جاتا ہے ''ڈرو اللہ سے'' وہ اللہ سے ڈرو نہیں ہے۔ تقویٰ کے معنی ہوتا ہے

''احتیاط سے' خطرناک گھاٹیوں سے' Carefully and Consciounsly احتیاط کے ساتھ بچ کر جانا'' یہ ڈرنا نہیں ہوتا۔ کسی چیز سے جو احتیاط برتی جاتی ہے' وہ ہوتا ہے (مثلاً) آپ آگ کے پاس سے گزرتے ہیں تو ذرا ہٹ کر گزرتے ہیں۔ اس کو تقویٰ کہتے ہیں۔ کانٹوں والی باڑ پر سے آپ نے گزرنا ہو اور عربوں والے وہ کپڑے ہوں' ڈھیلے ڈھالے تو یہ اس کا مفہوم خود حضرت عمرؓ نے اس تشبیہہ سے سمجھایا تھا کہ جب تم ایسی پگڈنڈیوں سے گزرتے ہو جہاں دونوں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں تو کیسے گزرا کرتے ہو؟ انہوں نے تو بتایا کہ صاحب! ہم یوں کپڑے کو لپیٹتے ہیں' اس طرح سے' احتیاط سے' جاتے ہیں۔ آپؓ کہتے ہیں کہ اسی کو تو تقویٰ کہتے ہیں تو ''اتقو اللہ'' جہاں آئے گا' اس کے معنی ہوں گے کہ قوانینِ خداوندی کے توڑنے کی سرکشی سے' ان کی خلاف ورزی سے' جو تخریبی نتائج پیدا ہوتے ہیں ان سے بچنے کے لیے جو راستہ اختیار کیا جائے گا' وہ خدا کا اور اللہ کا تقویٰ ہوگا' اس لیے وہ کسی غیرِ خداوندی کے قانون کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ اس کو تسلیم کرو اور اس کی اطاعت کرو۔ اس کا تو سوال ہی نہیں۔ اطاعت تو قوانینِ خداوندی کی ہے اور اس میں تاکید یہ ہے کہ اس کی خلاف ورزی کے جو نتائج نکلتے ہیں' سنکھیا کھانے سے جو نتیجہ نکلتا ہے' اس کو ذہن میں رکھو اور پھر سنکھیا نہ کھاؤ۔ یہ ہوگا تقویٰ۔

قوانین خداوندی پر عمل کرنے کے عوض دہرے ثواب کی وضاحت

کہا ہے کہ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ (57:28) اس پیغام پر' اس تعلیم پر اس انداز سے ایمان لاؤ جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے رسول کے ذریعے بھیجی ہے۔ اگر ایسا کرو گے تو يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ (57:28) تمہیں دو حصے وہ دے گا' اپنی رحمت سے دہرا ثواب دے گا۔ رحمت تو آپ کو پتہ ہے کہ سامانِ نشو ونما کو کہتے ہیں۔ یہ سامانِ نشو ونما دہرا دے گا اور وہ تو قرآن کریم میں ہے کہ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (2:201) اس دنیا کے اندر بھی شادابیاں' کامرانیاں' کامیابیاں اور اس کے بعد کی زندگی کے اندر بھی فلاح اور فوز۔ تو یہ دونوں زندگیوں' دونوں جہانوں' کی برکات نعمات جہاں ملتی ہیں' قرآن حمید میں اسے کفلین کہا ہے۔ تمہیں دو حصے ملیں گے۔ تمہیں دہرا حصہ ملے گا یہاں بھی اور وہاں بھی یہ ملے گا اس زندگی میں تمہاری کیا پوزیشن ہوگی۔ عزیزانِ من! جماعتِ مومنین کی ذمہ داری ملاحظہ فرماؤ۔ ایک تو یہ چیز ہے کہ خود قرآن حمید پر ایمان لاؤ' قرآن کریم پہ غور و فکر کرو' سمجھو' اس کے مطابق عمل کرو۔ یہ تو ایک فرد کی زندگی ہوگی۔ فرد ہی کی نہیں' آگے بھی بڑھیں گے' تو مسلمانوں کی جماعت کی' جماعتِ مومنین کی' زندگی بھی یہی سمجھو۔ خود قرآن کریم کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ اگر تم اس طرح سے تقویٰ اختیار کرو گے تو تمہیں اس زندگی کی حسنات دی جائیں گی تو پھر تمہارا فریضہ کیا ہوگا؟ کہا کہ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ (57:28) ایک ایسی روشنی تمہیں دی جائے گی' وہ قرآنِ کریم نے ہر مقام' مختلف مقامات پر' خود قرآن حکیم کو روشنی کہا ہے' نور کہا ہے' خدا کی رہنمائی کو نور کہا ہے اور اسی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس

نے کہا ہے کہ قرآن حکیم کا' اسلام کا' منشاء یہ ہے کہ تمہیں ظلمات سے نور کی طرف لے آئے' تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے۔ اس سے زیادہ جامع' اس سے زیادہ واضح مثال' کوئی نہیں ہو سکتی۔

قرآن حکیم تو خود روشنی کا مینار ہے اس کے باہر سے روشنی مستعار لینے کی ضرورت نہیں

میں نے عرض کیا تھا کہ ہر جگہ قرآن حکیم نے جمع کے صیغے میں ظلمات کہا ہے' تاریکیاں کہا ہے اور روشنی' نور' واحد کے صیغے کے اندر ہے۔ تاریکیاں ہزار قسم کی ہو سکتی ہیں' روشنی ایک ہی قسم کی ہوتی ہے' صحیح جواب ہمیشہ ایک ہوتا ہے' غلط جواب بیسیوں ہو سکتے ہیں' صحیح نشانہ ایک ہی ہو سکتا ہے' غلط نشانے سینکڑوں ہو سکتے ہیں' وہ سارے ظلمات ہیں' تاریکیاں ہیں نور واحد کے صیغے میں ہے۔ قرآن حمید نور کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ وہ خود روشن ہوتا ہے' اسے کسی دیئے کی ضرورت نہیں۔ اب تو دیئے ہوتے ہی نہیں' گھروں میں' ضرورت نہیں ہوتی کسی بلب کے متعلق بتانے کے لیے ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر وہ جلتا ہو تو یہ ہے کہ وہ بلب ہے۔ یہ تو حماقت ہے کہ اسے دیا لے کر تلاش کیا جائے۔ آفتاب خود دلیلِ آفتاب ہے۔ وہ بلب خود اپنی ذات' اپنی ہستی کا اعلان کر رہا ہوتا ہے' اس روشنی سے جو وہ دے رہا ہوتا ہے' اس کو کوئی دیا لے کر آپ روشنی کے بلب کو تلاش نہیں کرتے پھر رہے یا اگر لوگوں کو دکھانا ہو کہ یہ کوئی بلب ہے وہ تو یہ نہیں ہوتا کہ آپ موم بتی جلا کے کہیں کہ یہ بلب ہے۔

جس گھر میں یا جس محفل میں جہاں بھی قرآن حکیم ہوگا' وہاں روشنی یقیناً ہوگی

قرآن حکیم اپنے سمجھنے اور سمجھانے کے لیے خود نور ہے۔ اس کو کسی اور کی محتاجی نہیں ہے۔ وہ تو تمہاری راہیں روشن کرتا ہے چہ جائیکہ ہم اس کو دکھانے کے لیے دیئے اور موم بتیاں جلاتے پھریں۔ کہا ہے کہ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا (57:28) پہلی بات تو یہ ہے بڑی عجیب چیز ہے کہ قرآن حمید کی راہنمائی میں اگر ہم چلیں گے تو کہیں ہمارے راستے میں کوئی تاریکی نہیں آئے گی لیکن جیسا میں نے عرض کیا کہ اس نے یہی نہیں کہا کہ تمہاری اپنی راہیں روشن ہو جائیں گی۔ تمہارا یہی فریضہ ہے۔ کہا ہے کہ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ (57:28) اس نور کو' اس شمع کو' اس ٹارچ کو' لے کر تمہیں دنیا میں پھرنا چلنا ہوگا تاکہ دوسرے لوگوں کے راستے بھی روشن ہوں۔ تمام زندگی کی راہیں تاباں ہو جائیں' درخشندہ ہو جائیں۔ اس نور کو لے کر تم نے پھرنا ہے مجھے معاف رکھیے گا' اسے لے کر تم نے پھرنا ہے' دوسری قوموں کی زندگی کی راہیں بھی روشن کرنی ہیں۔ یہ ہے تمہارا فریضہ۔

ہاتھ میں قرآن حکیم لیے ایک اونٹ کی سواری کے ساتھ دنیا بھر کی تاریک راہوں کو منور کر دینے والی ہستی کا شہر

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ صدرِ اول میں' جب قرآن کریم کی روشنی سے امتِ مسلمہ کی اس جماعت کی' اپنی راہیں روشن ہوئیں تو پھر وہ

وہیں مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ گئے کہ ہماری راہیں روشن ہو گئی ہیں۔ وہ اس چراغِ مصطفوی ﷺ کو لے کر، نورِ آسمانی کی قندیل کو لے کر، پھر وہ ساری دنیا میں چل نکلے۔ اس تھوڑے سے عرصے کے اندر اس زمانے میں جب وسائلِ رسل مواصلات کے طریقے اتنے محدود تھے، سفر کی رفتار اتنی سست تھی کہ جب میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ تیز ترین سواری اونٹ ہوتی تھی، ان سواریوں پہ اس سامان کے ذریعے رسل و رسائل تھے وہ وہاں سے اس شمع قرآن کو لے کر چین تک آ پہنچے، افریقہ تک جا پہنچے، اسپین تک چلے گئے، صاحب! جہاں جہاں آپ کو اب بھی کہیں کوئی چمک نظر آتی ہے، کسی قوم کی تہذیب اور کلچر میں، یہ اسی شمع نورانی کا صدقہ ہے، جسے لے کر وہ جماعتِ صحابہ والذین معہٗ پھری تھی۔ دورِ اول کے، صدرِ اول کے، مسلمان اس چراغ کو لے کر جو پھرے تھے تو ساری دنیا کو انہوں نے روشن کر دیا تھا۔ وہ پھرے تھے اس طرح سے۔ شکوہ میں اقبالؒ کوئی چیز لے لیتا ہے۔ اشارہ کہیں سے ہے۔ شکوہ میں اس نے جو خدا سے یہ چیز کہی ہے کہ پھر ہم نے کیا کچھ کیا، ہم نے سے مراد ہے "اس قوم نے، صدرِ اول والی قوم نے تو اس میں یہ بھی کہا ہے کہ وہ قوم پھر ہوں ہوئی:

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے
مئے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے
کوہ میں، دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے
اور معلوم ہے تجھ کو، کبھی ناکام پھرے

(اقبالؒ: بانگِ درا (شکوہ)

کیا انداز تھا اس کا بات کرنے کا! اور "معلوم ہے تجھ کو، کبھی ناکام پھرے۔" یہ وہ اس طرح سے پھرے تھے تو وہ کیا جذبہ تھا؟ وہ تو قرآن کریم کا یہ حکم تھا کہ يَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ (57:28) وہ اس ہدایتِ قرآنی کی تعمیل میں پھرے۔ کوئی اور مقصد نہیں تھا، اور پھرے کی کوئی اور غرض نہیں تھی اور وہ جو کہہ رہا ہے کہ تجھے "معلوم ہے کبھی ناکام پھرے"، کہیں سے ناکام نہیں پھرے، صاحب! اتنی بڑی روشنی جو ہو، سرچ لائٹ جو ہو، وہ ناکام نہیں رہے گی۔ بات تو روشنی پہنچانے کی تھی، ان کے راستوں کو روشن کرنا تھا۔ انہوں نے ان کے راستے روشن کیے۔ اس کو چھوڑ دیا تو ہماری اپنی راہیں تاریک ہو گئی ہیں، دوسروں کو ہم نے روشنی کیا دینی ہے۔

اب کیا ہو رہا ہے؟ اس روشنی کو اپنی بغل میں رکھنے کے مدعی، طاقوں پہ رکھنے کے یا بغل میں رکھنے کے مدعی کہا جا سکے گا۔ اب بھی دنیا میں پھر رہے ہیں جن حضرات کے متعلق پڑھیے کہ صاحب! کہاں گئے؟ کہ جی! یہ تین مہینے سے انگلینڈ میں گئے ہوئے ہیں، اسلام کے مشن پر، پیرس پہنچے ہوئے ہیں، جرمنی گئے ہوئے ہیں، سوئٹزرلینڈ میں پھر رہے ہیں، ناروے اور سویڈن تک چلے جا رہے ہیں، امریکا میں گئے ہوئے ہیں، کینیڈا میں گئے ہوئے ہیں۔ صاحب! پھر رہے ہیں۔ کیا لے کر پھر رہے ہیں؟ شمعِ قرآنی تو ان کے اپنے نصیب میں نہیں

ہے۔ یہ تو انہوں نے دیئے اپنے لیے بجھا رکھے ہیں تو کیا لے کر پھر رہے ہیں' ساری دنیا کے اندر؟ آپ فنڈامنٹل ازم' یورپ اور امریکہ کی استعمار پرست قوموں کا تراشیدہ اسلام' انہی کے ایما پر۔ یہاں کس میں ہمت ہے' عزیزانِ من! کہ وہ ٹکٹ لے کر تو راول پنڈی تک جانے کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ ان کے پاس چھ چھ مہینے کے لیے ایک ایک دورہ فائیو اسٹار ہوٹل کے اندر قیام میں ہے۔ پہلے تو یہ اس سفر کا سوال ہی نہیں ہے مگر چل رہے ہیں' پھر رہے ہیں کہ کہیں قرآن کریم کی روشنی پھیل نہ جائے۔ کیا بات اس [1] نے کہدی تھی کہ اس دور میں تیرا مسلمان کیا کرتا ہے۔

اقبالؒ کی دل خراشی کا منظر

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد

ایسا دور بھی آسمان نے کم دیکھا ہوگا کہ

جبریل امیں را دل خراشد

اور تو اور جبریل امین کا بھی جو دل ہے' اس میں خراش آ رہی ہے کہ کیا ہو رہا ہے' کیا ہو رہا ہے' یہ پھر کس قدر کرب سے' اضطراب سے' فغاں سے' آہ سے' نالا سے' سوز سے' گداز سے' اقبالؒ نے یہ کہا کہ ''جبریل امیں را دل خراشد''

کیا ہوا کہ

خوش بیر بنا کرزند آں جا

کیسا عمدہ' انہوں نے ایک منظر عبادت گاہ پرستش گاہ پہ ہے! کیسا عجیب بنایا ہے! کیا ہے اس کی خصوصیت؟ کیوں یہ ایسا عجیب ہے؟ کہ

پرستش مومن و کافر تراشد

اس مندر میں کافر بت تراشتا ہے' مسلمان اس کو پوجتا ہے۔ ان کے اس تراشیدہ بت کو اسلام کا نام لے کر ساری دنیا میں گھوم رہے ہیں' پھر رہے ہیں' وہ شعر تو تھا' وہ تھا اقبالؒ کا شعر

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بو لہبی

وہ تو یہ تھا لیکن اب کیا ہو رہا ہے۔

---

[1] یہ اشارہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ کی طرف ہے۔

کسے خبر تھی کہ لے کر چراغِ مصطفویؐ
جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بو لہبی

کہ لے کر چراغِ مصطفویؐ چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد کہ جبریلِ امین را دل خراشد۔ کیا بات ہے!

قندیل آسمانی کے روشن چراغ کی ترجمانی قرآن حکیم کی زبانی

''پرستش مومن و کافر تراشد'' ❶ اس قوم کی کیفیت پھر یہ ہے۔ اس کے متعلق کہتا تھا کہ **يَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ** (57:28) تمہاری حفاظت کا پورا پورا سامان کیا ہوا ہوگا۔ کہیں سے ڈرنے کی بات نہیں ہے اس لیے کہ یہ جو چراغ تھا' وہ سورۃ النور میں دیکھیے قرآن کریم میں ایک تمثیل یا تشبیہ سے جو بتایا ہے کہ ایک روشن چراغ ہے۔ وہ ایک طاق کے اندر رکھا ہوا ہے۔ بڑی عجیب تمثیل ہے اور خدا کی دی ہوئی تمثیل ہے' معاذ اللہ میں کہوں کہ بڑی عجیب ہے' اس سے عجیب تر کیا ہو سکتی ہے! چراغ' قرآن روشن چراغ' ایک طاق میں رکھا ہوا کہ ہر طرف کے جھکڑ سے محفوظ رہے' اور روشنی اس کی نکلتی چلی جائے۔ کیا مثال دی ہے! پھر اس کے سامنے بھی یہ نہیں کہ کھلا ہے' نہایت شفاف شیشہ لگا ہوا ہے' اتنا محفوظ ہے' جلتا ہے کسی آگ سے نہیں' اپنے اندر کے تیلِ دروں سے' اس تیل سے کہ جو نہ شرقی ہے' نہ غربی ہے۔ یہ ہے وہ چراغ **يَغْفِرْ لَكُمْ** (57:28) تو ہو گیا۔ کہا کہ **وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** (57:28) حفاظت ہے س کی۔

آج یہودی سرمایہ داروں کے تاج بادشاہی کی کیفیت

اب اگلی بات آئی کہ مدینہ میں یہ مملکت قائم ہو رہی تھی۔ یہ جو اس طرح سے یہودی (Jews) ستا رہے ہیں' یہ آج کی بات نہیں ہے۔ یہ ازل سے تا امروز ان کی یہی کیفیت رہی ہے۔ ان کی سلطنت چھٹی' مملکت گئی' قوت چلی گئی' دربدر پھرتے رہے' یہ Wandering Jews بھی ہوئے لیکن اس کے باوجود اس قوم کی سرمایہ پرستی مسلط ہے۔ Jews (یہودیوں) کا تو محاورہ ہی ہو گیا ہوا ہے کہ یہودی سرمایہ پرست ہیں' اب دیکھیے کہ اپنے لیے سر چھپانے کو جگہ نہیں' دنیا کی حکومتوں کے اوپر حکومت کر رہے ہیں۔ آج بھی ان (امریکیوں) کے طفیل ایک ذرہ سی ٹکڑی ان کو زمین کی مل گئی ہے۔ یہ نہ بھی ملتی جب بھی یہ کیفیت ہے کہ امریکا کی حکومت ان کے تسلط میں' یورپ کی حکومتیں ان کے تسلط میں ہیں' اتنی سرمایہ داری اور مدینے میں تو ان کا یوں کہیے کہ تسلط تھا۔

عہد رسالت میں یہودیوں کی کیفیت اور قرآن حکیم کی طرف سے نوید سحر

حضور ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لے گئے ہیں تو وہاں کے انصار' وہاں کے مسلمان' تو بڑے غریب سے تھے' محنت کش تھے' چھوٹی

---

❶ اس مندر میں کافر بت تراشتا ہے' مسلمان اسے پوجتا ہے۔

موٹی کھیتی باڑی کرتے تھے۔ یہی یہودی وہاں بھی پھیلے ہوئے تھے۔ وہاں ساری جگہ پر ان کا تسلط تھا۔ یہاں آنے کے بعد سب سے پہلے ٹکراؤ' سب سے بڑا ٹکراؤ' ان سے ہوا۔ مشرکین عرب تو مکے میں رہ گئے تھے۔ انصار کے ساتھ ٹکراؤ کی صورت نہیں تھی۔ سب سے زیادہ ان کے ساتھ ٹکراؤ ہوا۔ قرآنِ کریم میں آپ دیکھیے ان یہودیوں کے ساتھ ٹکراؤ سے آدھا قرآن حکیم بھرا ہوا ہے' جو کچھ کرتے تھے۔ یہ ہر قسم کی تکنیک اور منافقت استعمال کرتے تھے' ہر قسم کے منافقانہ حربے تھے۔ ہر قسم کی سازشیں تھیں اور سرمایہ کی بناء پر ان لوگوں کا کاروبار بھی ان کے ہاتھ میں تھا۔ وہاں یہ ایک خوف تھا کہ ان کے ساتھ بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اور معاش کی صورتیں تو انہی کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ کیا صورت ہوگی؟ آخری آیت ہے۔ اس آیت میں یہ کہا لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ (57:29) ان اہلِ کتاب' ان یہودیوں کو معلوم ہو جائے گا کہ جو نظام ہم دیتے ہیں' ان میں ان کی محتاجی نہیں رہے گی اور یہ دیکھ لیں گے کہ خدا کے نظام کے تابع پھر کس طرح سے رزقِ فراواں ملتا ہے۔ ان سے مت ڈرو یہ ربٰو اور سود کے زور پر اس طرح سے تمہارے کاروبار پر مسلط ہیں۔ تمہارے ہاں یہ چیز نہیں ہوگی لیکن رزق اتنا فراوانی سے ملے گا کہ یہ بھی دیکھ کر کہیں گے کہ ہاں کچھ ہے۔

غیر قرآنی معاشرے میں حضرت انسان کی حالت

کہا ہے کہ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (57:29) جو رزق ہے' وہ خدا کے قانون کے مطابق جب ملتا ہے تو پھر جو لینا چاہے' اسے ملتا ہے۔ باطل کے نظام میں تو یہ بات نہیں۔ وہ مزدور سارا دن محنت کرتا ہے کہ پانچ چار بچوں کا پیٹ پال سکے۔ رزق لینے کے لیے سارا دن محنت کرتا ہے' شام کو اس کو رزق نہیں ملتا' جو ملتا ہے اس میں اس کی روٹی تک نہیں چل سکتی۔ یہاں اس نظام میں یہ ہے کہ جو لینا چاہتا ہے' اس کو ملے گا' کوئی کسی کی محنت کا استحصال نہیں کر سکے گا۔ ایسا رزق ملے گا۔ کہا ہے کہ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (57:29) کیا بات ہے فضل العظیم کی۔ وہ محدود رکھنے والا نہیں ہے' تنگ نظر نہیں ہے' کھلا ہوا ہے۔ عظیم تو عظم سے ہے' جس کی بنیادوں کے اندر رزق دینا ہے۔

سورۃ الحدید کی آخری آیت بھی آ گئی' عزیزانِ من! اس کے بعد یہ سورۃ المجادلہ آ رہی ہے۔ یہ 58 سورۃ ہے اور پارہ بھی نیا ہے۔ اس سے 28 واں شروع ہو رہا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم دوسرے دور میں ستائیس پارے ختم کر چکے ہیں' اٹھائیسواں شروع ہے۔ یہ 28,29,30 تھوڑی سی منزل ہی رہ گئی ہے۔ اللہ توفیق عطا فرمائے تو۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀......❀......❀

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں
ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن
فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی
کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان
ہے۔لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح
نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور
جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے' وہ میرے
ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔معراجِ انسانیت)